ماہنامہ

مسٹری میگزین

اس ماہ کی خاص کہانی

نور جہاں

اس ماہ پڑھیے دنیا کی بہترین اور منتخب کہانیاں

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

8 — روشنی — عنایت اللہ سبحانی
قلب و روح کو منور کرتا ہوا اصلاحی سلسلہ

15 — نور جہاں — پروفیسر محمد احمد
گزرے دور کی تاریخی ... مگر دلچسپ تحریر

60 — دھاک — امان اللہ
وہ پھول گرم ہوا کس میں کھلا تھا

77 — بھوت کہانی — ذوالنورین
وہ قہقہے لگانے لگی ہائے ری قسمت

104 — آگ بگولہ — راشد سعید
انتقام کے جنون میں مبتلا ایک عمر رسیدہ عورت کی ایک سنسنی خیز کہانی

118 — سہل نگاری — امان اللہ
کون کس کا منتظر ہے کون کس گھاتوں میں ہے

12 — مدیر نامہ — فہمیدہ
کچھ تنقیدیں، کچھ تعریفیں قارئین کی آراء پر مشتمل خطوط

48 — بخت آور — راشد سعید
ایک پرتجسس تحریر، جسے پڑھتے ہوئے آپ کو اپنے گرد و پیش کا خیال نہ رہے گا

69 — تلافی — رقیہ خانم
یہ مسرت بھی کیا دل برباد

81 — گلابوں کی جنگ — اشتیاق فاطمہ
تاریک یورپ کے رخ سیاہ سے پردہ اٹھاتا منفرد سلسلہ

114 — انگش بنگش — شکیل صدیقی
اس کی خاموشی نے اسے بچا لیا

122 — دہرا مذاق — شکیل صدیقی
دو شاطروں کے شاطرانہ ذہنوں کی دلچسپ روداد

133 — چکر باز — ایم الیاس
دنیا کی چال بازیوں پر مبنی سلسلے وار داستان

188 — پیوند زمین — امان اللہ
وہ انجام سے بے خبر تھا اسے نہیں معلوم تھا کہ آگے کیا ہوگا

201 — کھڑپنچ — منزہ خان
کہتے ہیں لوہے کو لوہا کاٹتا ہے

216 — حسن اتفاق — ذیام مصطفیٰ
عجیب اتفاق کی عجیب و غریب داستان

126 — شجرہ نسب — ذوالنورین
جرم آدم نے کیا اور نسل آدم کو سزا

183 — بدخصال — سلیم فرخی
لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

195 — بھاگ دوڑ — نصرت جہاں
حرکت میں برکت اسی کا نام ہے؟

208 — خویش ہوشیار — رقیہ خانم
الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

225 — نیا لباس — ریحانہ عرفان
ایک دلچسپ تحریر

227 — دلدل — الف صدیقی
موجودہ حالات و واقعات پر مبنی سلسلے وار کہانی

قلب و رُوح کو منور کرتا ہوا اسلامی سلسلہ

روشنی

مشعل توحید پر آندھیوں کی یلغار

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تحقیق کے لیے ایک آدمی دوڑایا۔ وہ پہنچا تو وہاں بڑی دھوم دھام تھی۔ ایک عجیب جوش وخروش تھا۔ اور ہر ایک جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اطمینان کے لیے پھر سعد بن عبادہؓ اور سعد بن معاذؓ کو بھیجا کہ قریظہ کے سردار سے مل کر بات کریں۔ سعد بن عبادہؓ خزرج کے سردار تھے اور سعد بن معاذؓ اوس کے۔ یہ قریظہ کے حلیف بھی تھے۔ ان دونوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اگر خبر صحیح ہو تو آکر چپکے سے بتانا کہ مسلمانوں میں بے دلی نہ پھیلے۔ ورنہ بلند آواز سے اعلان کر دینا۔"

یہ لوگ وہاں پہنچے تو بہت افسوسناک حالت دیکھی۔ کیونکہ وہ لوگ بے وفائی اور غداری کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اور سردار کی حالت تو سب سے زیادہ شرمناک تھی، کہ وہ پوری بے باکی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے ادبی کر رہا تھا۔ اس بدبخت نے یہاں تک کہا کہ:

"کون ہے اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی عہد معاہدہ نہیں!"

یہ کلمات سن کر جاں نثاروں کو جوش آ گیا۔ اور صورتحال بہت نازک ہو گئی۔ اور قریب تھا کہ جھگڑا برپا ہو جائے۔ مگر سعد بن معاذؓ نے اپنے ساتھی کو سنبھالا اور یہ کہتے ہوئے روانہ ہو گئے کہ:

"یہ کیا؟ ہمارے اور ان کے تعلقات تو اس سے بھی زیادہ بگڑ چکے ہیں!"

پھر دونوں جاں نثار لوٹ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور چپکے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو صورت حال بتا دی۔ لیکن یہ خبر چھپنے والی کب تھی؟ ساری فوج میں اس کا چرچا ہو گیا۔ اور مدینہ میں ہر طرف اس کا شہرہ ہو گیا۔ اس طرح آن کی آن میں سب پر بے دلی چھا گئی اور ہر طرف مایوسی پھیل گئی جسے دیکھیے یہی کہہ رہا تھا:

"خندق تو خوب تیار ہوئی۔ لیکن اب خندق سے کیا ہوتا ہے؟ اب تو قریظہ کے قلعہ سے حملہ ہو گا۔ ہائے اب کیا بنے گا؟"

اب محاصرہ بہت سخت تھا۔ دشمن مدینہ کے گرد گھیرا ڈالے رہے اور اسی حال میں مسلمانوں پر کئی کئی فاقے گزر گئے۔ بالآخر تاب نہ لا کر وہ بلبلا اٹھے۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ساتھی ہمت نہ ہار جائیں چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غطفان کے پاس ایک آدمی بھیجا:

"اگر تم لوگ جنگ نہ کرو اور واپس چلے جاؤ تو مدینہ کی تہائی پیداوار ہم تم کو دیں گے۔"

اس پر غطفان بخوشی راضی ہو گئے اور بات پکی کرنے کے لیے انہوں نے اپنے آدمی بھیجے۔ البتہ انہوں نے تہائی کے بجائے

آدھی پیداوار کا مطالبہ کیا۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا، مگر ابوسفیان ان باتوں سے بالکل بے خبر تھا۔ غطفان کی طرف سے آدھی پیداوار کا مطالبہ ہوا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد بن معاذؓ اور سعد بن عبادہؓ کو بلایا۔ اور ان سے مشورہ کیا۔ سعد بن معاذؓ نے عرض کیا:

"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اگر یہ خدا کا حکم ہے۔ تو انکار کی مجال نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خواہش ہے جب بھی تسلیم ہے اور اگر یہ ارادہ ہم لوگوں کے خیال سے ہے، تو کچھ عرض کروں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"یہ تو تم ہی لوگوں کے لیے کر رہا ہوں۔ کیوں کہ میں نے سوچا کہ اس طرح دشمن کا دباؤ کچھ کم ہو جائے گا۔"

سعد بن معاذؓ نے عرض کیا:

"اللہ کے رسول! جب ہم کافر تھے، تب تو کوئی ہم سے کچھ نہ لے سکا اور اب تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ہمارا درجہ بلند ہو گیا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ان کے لیے ہمارے پاس اب صرف تلوار ہے۔"

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہمت دیکھی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان ہوا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غطفان سے معاہدہ کا ارادہ چھوڑ دیا۔ اور ان کے آدمی واپس چلے گئے۔

قبیلہ غطفان کا ایک رئیس تھا نعیم بن مسعود وہ اندر ہی اندر مسلمان ہو چکا تھا۔ مگر قبیلہ والوں کو خبر نہ تھی۔ وہ چھپ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اور اپنے مسلمان ہونے کی خوش خبری سنائی۔ پھر عرض کیا:

"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میرے اسلام لانے کی کسی کو خبر نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو چاہیں مجھ سے کام لیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"نعیم! تم تنہا آدمی ہو، جس طرح بھی ہو سکے، یہ مصیبت دور کرو اور اس کے لیے تم جو چاہو، کرو تمہیں اجازت ہے۔"

نعیم اب واپس گئے اور سوچنے لگے کہ کیا کروں؟ کس طرح دشمن میں پھوٹ ڈالوں؟ اور کس طرح ان کے ناپاک عزائم کو ناکام کروں؟

دشمنوں میں اب ایک نیا جوش تھا۔ اب ان کے حوصلے پہلے سے کہیں زیادہ بلند تھے۔ اب انہیں سردی کی سختی کی ذرا فکر نہ تھی۔ اور خندق کی بھی کوئی پرواہ نہ تھی۔ کیونکہ اب قریظہ ان کے ساتھ تھے اور اب دل کے ارمان نکالنا آسان تھا۔ پیدل فوج تین حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اور وہ ہر طرف سے اسلامی فوج کو گھیرے ہوئی تھی۔ کہ وہ کہیں آ جا نہ سکیں۔ اور بے بس ہو کر رہ جائیں۔ مگر سوار فوج ادھر ادھر پھر رہی تھی اور مسلمانوں پر بے دردی سے تیر برسا رہی تھی۔

مسلمان سخت پریشان تھے۔ کیونکہ وہ بالکل گھر کر رہ گئے تھے خوف اور بے چینی الگ تھی کیونکہ دن رات یہودیوں کا خطرہ تھا اور یہ خطرہ خندق کے خطرہ سے بڑھ کر تھا۔ عورتیں اور بچے شہر کے ایک قلعہ میں تھے۔ لہٰذا بنو قریظہ سے خطرہ تھا کہ کہیں وہ رات میں ان پر حملہ کر دیں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ آدمیوں کو مقرر فرمایا، کہ رات بھر مدینہ میں گھوم پھر کر پہرہ دیں۔

یہودیوں نے غداری کی، تو مسلمانوں کی خبریں جاننے کی بھی انہیں فکر ہوئی۔ انہوں نے چاہا کہ کمزور جگہیں معلوم ہو جائیں، تاکہ حملہ میں آسانی ہو۔ اور ناکامی بھی نہ ہو۔ چنانچہ یہودیوں کی ایک ٹولی اسی غرض سے نکلی۔ مگر مسلمانوں کو پتہ چلا تو انہوں نے پیچھا کیا اور وہ بھاگ نکلے۔

عورتیں اور بچے جس قلعہ میں تھے، وہ قلعہ بنی قریظہ کے قریب ہی تھا۔ بنی قریظہ نے سوچا:

"مسلمان تو فوجوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اس لیے موقع اچھا ہے، قلعہ پر قبضہ کر لیا جائے۔"

چنانچہ ایک یہودی قلعہ تک آ گیا۔ اور چاروں طرف چکر لگانے لگا قلعہ میں حضرت صفیہ بھی تھیں۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی تھیں۔ یکا یک ان کی نظر اس یہودی پر پڑ گئی۔ عورتوں کی حفاظت کے لیے حضرت حسانؓ مقرر تھے۔ وہی حضرت حسانؓ جو بہت اچھے شاعر تھے اور پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دشمنوں کا جواب دیا کرتے تھے۔ یہودی کو دیکھ کر حضرت صفیہؓ گھبرائیں اور حسان سے بولیں:

"دیکھئے' یہ یہودی یہاں گھوم رہا ہے۔ جلدی سے اُتر کر اسے قتل کر دیجیے۔ ورنہ یہ جا کر دشمنوں کو پتہ دے گا۔ مسلمان تو لڑائی میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اگر یہ بچ کر چلا گیا تو مصیبت آ جائے گی۔"

مگر حضرت حسانؓ ذرا ہمت کے کچے تھے۔ بولے:

"عبدالمطلب کی بیٹی! اللہ تجھے معاف کرے! تجھے معلوم ہے کہ میں اس کام کا آدمی نہیں۔"

اور کوئی شکل تھی نہیں۔ مجبوراً حضرت صفیہؓ نے خود خیمہ کا ایک بانس اکھاڑا اور چپکے چپکے نیچے اتریں۔ پھر جا کر یہودی کے سر پر اس زور سے مارا کہ اس کا سر پھٹ گیا۔

پھر لوگ کر وہ قلعہ آئیں۔ اور حضرت حسانؓ سے کہا:

"وہ مرد ہے۔ اس لئے میں نے اسے ہاتھ لگانا اچھا نہ سمجھا۔ آپ جائیے' اس کے ہتھیار اور کپڑے اتار لائیے۔"

حضرت حسانؓ نے کہا:

"عبدالمطلب کی بیٹی! جانے بھی دو۔ مجھے اس کی چیزوں کی کوئی ضرورت تو ہے نہیں۔"

حضرت صفیہؓ نے کہا:

"اچھا جائیے۔ اس کا سر کاٹ کر میدان میں پھینک دیجیے تا کہ یہودی مرعوب ہو جائیں۔"

حضرت حسانؓ اس کے لیے بھی نہ تیار ہوئے۔ مجبوراً یہ کام بھی حضرت صفیہؓ ہی کو کرنا پڑا۔ اس طرح یہودی سمجھے کہ قلعہ میں بھی کچھ فوج ہے۔ اور پھر انہیں حملہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

جوں جوں دن گزر رہے تھے' حالات سخت ہوتے جا رہے تھے۔ ذرا تصور تو کرو۔ فاقے پر فاقے! پھر راتوں کو سونا حرام! اور پھر ہر آن جان کا اندیشہ! اسلامی فوج میں منافق بھی موجود تھے۔ بھلا ایسے میں وہ کہاں چھپ سکتے تھے۔ آ آ کر پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگنے لگے کہ ہمارے گھر محفوظ نہیں اور بال بچے خطرہ میں ہیں۔ لہٰذا ہمیں شہر جانے دیجیے۔ خود تو وہ لوٹنا چاہتے ہی تھے۔ مسلمانوں کو بھی بہکاتے اور جان کا خوف دلاتے۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے انہیں بدگمان کرتے ہوئے کہتے:

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی خوب بہلایا۔ خوب سبز باغ دکھائے کہتے تھے کہ قیصر و کسریٰ کے خزانے ملیں گے۔ آج یہ حال ہے کہ 'ضرورت' کے لیے بھی جانا جان کا خطرہ ہے!"

بنی قریظہ کی غداری کو کئی دن گزر گئے۔ فوجیں بے تاب تھیں اور ان کے تیار ہونے کا شدت سے انتظار کر رہی تھیں تا کہ وہ قلعہ میں سے حملہ کا راستہ دیں اور یہ دل کے ارمان پورے کریں۔ لیکن اس وقت تک وہ کیا کرتیں' کہ خندق کو پار کرنا تو ان کے بس سے باہر تھا۔ مجبوراً باہر سے ہی وہ تیر پتھر برساتی رہیں۔

خندق کی چوڑائی ایک جگہ سے کچھ کم تھی۔ پہرہ بھی کمزور تھا۔ دشمنوں نے موقع کو غنیمت جانا اور اسی طرف سے حملہ کرنا چاہا۔ چنانچہ وہ پوری تیاری سے آگے بڑھے اور گھوڑے کو دکر اس پار پہنچے۔ غرور سے سینے تنے ہوئے تھے۔ ان میں ابوجہل کا بیٹا عکرمہ اور ضرار بھی تھے اور عرب کا سب سے مشہور بہادر عمرو بن عبدوُد بھی تھا۔ جو ایک ہزار سوار کے برابر مانا جاتا۔ یہی پہلے آگے بڑھا۔ اور پکارا

کر کہا۔

"مقابلہ میں کون آتا ہے؟"

حضرت علیؓ نے اٹھ کر کہا:

"میں"

لیکن پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے روکنے پر حضرت علیؓ بیٹھ تو گئے۔ مگر کسی دوسرے کی ہمت نہ ہوئی۔ عمرو نے دوبارہ پکارا۔

حضرت علیؓ پھر بولے۔

"میں"

تیسری بات بھی یہی ہوا۔ اس وقت پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"یہ عمرو ہے۔ کچھ خبر بھی ہے؟"

حضرت علیؓ نے عرض کیا:

"ہاں میں خوب جانتا ہوں کہ یہ عمرو ہے۔"

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی۔ اور خود ہی مبارک ہاتھوں سے تلوار عنایت کی اور سر پر عمامہ باندھا اور اب حضرت علیؓ عمرو کے مقابلے میں تھے۔ عمرو ہنسا اور بولا:

"کیوں بھتیجے! میرا تو دل چاہتا نہیں' کہ تمہیں ماروں!"

حضرت علیؓ نے جواب دیا:

"لیکن میرا تو دل چاہتا ہے۔"

اب کیا تھا۔ عمرو نے غصہ سے بے تاب ہو کر پوری طاقت سے تلوار کا وار کیا۔ حضرت علیؓ نے اسے ڈھال پر روک لیا۔ اور پھر خود بڑھ کر وار کیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ عمرو اب خاک و خون میں لتھڑا پڑا تھا۔ مسلمانوں نے اسی وقت اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ اور فتح کا اعلان ہو گیا۔ کچھ دیر عمرو کے ساتھیوں نے بھی مقابلہ کیا۔ لیکن پھر سب بھاگ کھڑے ہوئے۔

اس حملہ میں دشمنوں کو ناکامی تو ہوئی۔ لیکن خندق کو پار کر لینا ان کے لیے کم خوشی کی چیز نہ تھی۔ چنانچہ اب بہتوں کے حوصلے بڑھے اور دوسرے بہادروں نے بھی جان پر کھیلنے کا فیصلہ کیا' اور خندق کے اس پار جا کر مسلمانوں سے مقابلہ کرنا چاہا۔ سورج ڈوب چکا تھا' اور تاریکی پھیل چکی تھی۔ اسی وقت دشمنوں کا ایک دستہ خندق کی طرف بڑھا۔ آگے آگے نامی بہادر نوفل تھا۔ خندق پر پہنچ کر نوفل نے گھوڑا کودایا کہ اس پار ہو جائے مگر گھوڑا خندق میں گرا' اور نوفل کا سر پس کر رہ گیا۔ یہ عبرت ناک انجام سامنے تھا۔ لہٰذا اب ساتھیوں کو کہاں ہمت ہو سکتی تھی۔ الٹے پاؤں وہ واپس ہو گئے۔

ابوسفیان کو اطلاع ہوئی تو اس نے مسلمانوں کے پاس کہلایا کہ نوفل کی لاش واپس کر دی جائے۔ بدلہ میں خون بہا (سو اونٹ) ملے گا۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا:

"اُٹھا لے جاؤ اسے۔ ہمیں اس کا خون بہا نہیں چاہیے اس کی لاش بھی پلید ہے۔ اس کا خون بہا بھی پلید ہے۔"

(جاری ہے)

ماخذ کتاب، محمد عربی ﷺ ..... مترجم، محمد عنایت اللہ سبحانی

مدیر نامہ

محترم ومعزز قارئین کرام! السلام علیکم!

سب سے پہلے آپ سب کو ادارے کی طرف سے رمضان المبارک کی آمد بے حد مبارک ہو۔ صد شکر ہے اس ذات باری تعالیٰ کا کہ جس نے ہمیں ایک بار پھر رمضان المبارک کے فضائل سے فائدہ اٹھانے کی سعادت نصیب کی اور تمام مسلمانان عالم کی رحمت' مغفرت ونجات کے لیے ایک موقع اور عنایت کیا۔ یہ عظمت وبرکت والا مہینہ خدا کی خصوصی عنایت ورحمت کا مہینہ ہے اسی لیے روزے کے بارے میں خاص اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔'' اس مبارک مہینے کی آمد کے ساتھ ہی ایک خوش آئند خبر یہ بھی ہے کہ طویل عرصے کے بعد اس سال پورے ملک میں رمضان کا آغاز ایک ہی دن سے ہوگا۔ اس کے لیے ہمارے مفتی صاحبان اور خصوصاً خیبر پختونخواہ کی حکومت مبارک باد کی مستحق ہے صوبائی حکومت کے اس عمل سے فرقہ واریت کو فروغ دینے والے دشمنانِ اسلام کے حوصلے یقیناً پست ہو جائیں گے۔ گزشتہ ماہ کے شمارے کے حوالے سے ہمیں آپ کے بہت سے خطوط موصول ہوئے۔ تاریخی کہانی ''محمد بن قاسم'' کو قارئین نے بے حد پسند کیا اس کے لیے ہم آپ کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں۔ حسب روایت اس ماہ بھی مختصر کہانیوں کا بہترین انتخاب شائع کیا جا رہا ہے پڑھ کر اپنی رائے سے آگاہ کیجیے گا۔ اب چلتے ہیں آپ کے خطوط کی جانب' آپ کی رائے کی منتظر

مدیرہ

محمد مشتاق حیدر آباد سے لکھتے ہیں۔ مسٹری میگزین کے ساتھ رشتہ کئی برس پرانا ہے۔ اس میں کئی اتار چڑھاؤ بھی آئے لیکن مسٹری میگزین کے ساتھ ایک تعلق ایک رشتہ ہمیشہ برقرار رہا۔ تینوں سلسلے وار کہانیاں اچھی جا رہی ہیں مگر گلابوں کی جنگ کی بات ہی کچھ اور ہے۔ ہر ماہ کہانی ایک نئے موڑ پر آ جاتی ہے اور کہانی کی دلچسپی میں اضافہ ہو جاتا ہے اس سے مصنف کی قلم پر مضبوط گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔ چکر باز میں مصنف نے ہمیں اتنے چکر دیے ہیں کہ کبھی کبھار تو ہم خود بھی چکرا کر رہ جاتے ہیں لیکن ایم الیاس اتنے منجھے ہوئے مصنف ہیں کہ ہمیں ان سے پوری امید ہے کہ وہ ان بھول بھلیوں سے خوش اسلوبی سے نکل آئیں گے۔ اس میں تاریخی کہانی محمد بن قاسم ہمارے لیے توشہ خاص ثابت ہوئی۔ مصنف نے سندھ کی تاریخ بہت اچھے انداز میں بیان کی ہے۔ اس طرح کی تاریخی کہانیاں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہنی چاہئیں۔ مختصر کہانیاں بھی اچھی تھیں مگر ایک دو کہانیاں ایسی تھیں جو زیادہ متاثر نہیں کر سکیں۔ کہانیوں کے انتخاب پر مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ کافی عرصے سے صالحہ عبدالکریم کی کوئی کہانی شائع نہیں ہوئی اگر وہ بھی رسالے کے انتخاب میں شامل ہو تو کیا ہی بات ہے۔ بے چینی کے ساتھ اگلے شمارے کا منتظر ہوں' اللہ حافظ۔

قمر علی ہاشمی لاڑکانہ سے خطوط کی اس محفل میں شامل ہوئے ہیں۔ لکھتے ہیں خلوصِ دل سے سلام' جون کی اسی تپتی گرمی میں مسٹری میگزین کے سرورق پر نگاہ پڑتے ہی دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ اپنا پسندیدہ

میگزین ہاتھ میں آتے ہی گرمی کا ہر احساس ختم ہو گیا۔ سب سے پہلے اپنے پسندیدہ سلسلے روشنی کا مطالعہ کر کے قلب وجان کو روح کی خوراک فراہم کی۔ روشنی ایک بہت خوبصورت سلسلہ ہے جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس کے بعد سلسلے وار کہانیوں کی طرف بڑھا۔ ویسے تو چکر باز' گلابوں کی جنگ اور دلدل تینوں ہی کہانیاں مجھے بے حد پسند ہیں۔ لیکن اس ماہ دلدل کی قسط بے حد متاثر کن تھی مصنف نے آج کے معاشرے کی بالکل حقیقی تصویر کشی کی ہے۔ مختصر کہانیوں میں حسن تدبیر اور آنکھ اوجھل اچھی کہانیاں تھیں۔ حرماں نصیب گو کہ مغربی پس منظر میں لکھی گئی تھی مگر ایسے کردار ہمارے معاشرے میں بھی موجود ہیں۔ واقعی کامیابی کی بھی ایک قیمت ہوتی ہے جو ہر کامیاب انسان کو چکانی پڑتی ہے۔ اس مرتبہ میں نے کافی تفصیل سے کہانیوں پر تبصرہ کیا ہے۔ تاریخی کہانی محمد بن قاسم کا مطالعہ ابھی تک نہیں کر سکا کیوں کہ میں اس کو فرصت اور اطمینان سے پڑھنا چاہتا ہوں۔ جولائی کے شمارے کا ابھی سے انتظار ہے۔ آپ سب کے لیے بہت سی دعائیں۔

عمر فاروق کراچی سے لکھتے ہیں محترم ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم' ہر لمحہ آپ کی سلامتی کے لیے دل سے دعا گو رہتا ہوں۔ ہمارے شہر میں بدامنی کا یہ عالم ہے کہ دنیا کے خطرناک ترین شہروں میں اسی کا نام آتا ہے ویسے تو خیر پورا ملک ہی دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔ ان مایوس کن حالات میں مسٹری میگزین ہمارے لیے امید کی کرن بن کر طلوع ہوتا ہے۔ رسالہ ہاتھ میں آتے ہی سارے تفکرات اور پریشانیاں پس پشت چلے جاتے ہیں۔ مسٹری میگزین میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ اس میں شامل کہانیوں کا معیار بہت اچھا ہوتا ہے۔ مستقل سلسلے کی کہانیاں بھی دلچسپی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ خاص طور پر گلابوں کی جنگ مجھے بے حد پسند ہے۔ میری طرف سے مصنفہ کو بے حد مبارک باد' جولائی کے شمارے میں شامل تاریخی کہانی محمد بن قاسم نے بے حد متاثر کیا۔ لوگوں کی اکثریت یہ تو جانتی ہے کہ محمد بن قاسم نے سندھ فتح کیا تھا لیکن اس کے بعد کے واقعات کے بارے میں لوگ بے حد کم جانتے ہیں۔ آپ نے یہ کہانی شائع کر کے تاریخ کے ان گوشوں پر روشنی ڈالی ہے جن پر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ مختصر کہانیوں میں من پسند' آپ کا خلوص اور نشان جرم زیادہ پسند آئیں۔ دعا ہے کہ میرا پسندیدہ رسالہ مزید ترقی اور کامیابی حاصل کرے۔ اس دعا کے ساتھ اب اجازت چاہوں گا' اللہ حافظ۔

شاہد جمال جھنگ سے خطوط کی اس محفل میں شریک ہو رہے ہیں۔ لکھتے ہیں جناب عالی السلام وعلیکم' پہلی مرتبہ آپ کی اس محفل میں شریک ہو رہا ہوں ویسے تو گزشتہ 5 سال سے میگزین زیر مطالعہ ہے مگر آج سے پہلے کبھی خط لکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس مرتبہ کی تاریخی کہانی پڑھ کر میں خود کو روک نہیں سکا واقعی مصنف نے اتنے اچھے انداز میں سندھ کی تاریخ بیان کی ہے کہ کہیں کوئی تشنگی نہیں چھوڑی۔ روشنی ایک بے حد ایمان افروز سلسلہ ہے جسے پڑھ کر ہمارا ایمان بھی تازہ ہو جاتا ہے۔ مسٹری میں شامل تینوں مستقل سلسلے مجھے بے حد پسند ہیں لیکن پچھلے چند ماہ سے گلابوں کی جنگ بے حد سست رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ اب اس سلسلے کو بند کر کے کوئی نیا سسپنس اور تھرل سے بھرپور ناول شروع کر دیں تو زیادہ اچھا ہوگا۔ مختصر کہانیوں میں آپ کا انتخاب بہت عمدہ ہوتا ہے مگر مغرب کی عکاس کہانیوں کے ساتھ کچھ کہانیاں اگر ہمارے معاشرے کے پس منظر میں بھی لکھی گئی ہوں تو میگزین کی خوبصورتی کو چار چاند لگ جائیں گے۔ جون کے شمارے میں حرماں

نصیب' آپ کا مخلص اور من پسند مجھے زیادہ اچھی لگیں۔ ہمارے شہر میں آپ کا رسالہ ہمیں کافی تاخیر سے ملتا ہے۔ اگر یہ مسئلہ حل کر دیں تو بے حد عنایت ہوگی۔ اپنے خط کے شائع ہونے کا انتظار ہے اگر یہ خط شائع ہو گیا تو آئندہ بھی تبصرہ ارسال کرتا رہوں گا۔ اگلی ملاقات تک کے لیے اللہ حافظ۔

حشمت علی سکھر سے لکھتے ہیں۔ محترم ایڈیٹر صاحب السلام علیکم امید ہے کہ آپ اور ادارے کے تمام اراکین خیریت سے ہوں گے۔ گزشتہ کچھ عرصے کی غیر حاضری کے بعد اس ماہ بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر خدمت ہوں۔ یہ کہنے کی تو ضرورت نہیں ہے کہ مسٹری میگزین مجھے کس قدر پسند ہے۔ اس میں شامل تمام ہی سلسلے بہت خوب ہیں۔ جون کا شمارہ ملتے ہی نظر سب سے پہلے سرورق پر پڑی۔ مسکراتی ہوئی حسینہ کے ساتھ سرورق بے حد جاذب نظر تھا۔ اس کے بعد اپنے پسندیدہ سلسلے روشنی کا مطالعہ کیا۔ مستقل سلسلوں میں دلدل اور گلابوں کی جنگ بہت اچھے جا رہے ہیں۔ گلابوں کی جنگ کی کہانی اب ایک نئے موڑ پر پہنچ چکی ہے۔ دلدل میں مصنف نے جاگیردارانہ نظام کی بالکل درست منظر کشی کی ہے۔ مختصر کہانیوں کے لیے آپ کا انتخاب لاجواب ہوتا ہے اور سب سے آخر میں بات کرتے ہیں اس ماہ کی خاص کہانی کی جو واقعی میں بے حد خاص تھی میں بہت عرصے سے کسی ایسی کتاب کی تلاش میں تھا جو مجھے سندھ کے اس بہادر سپہ سالار کے حالات زندگی کے بارے میں آسان لفظوں میں کچھ بتا سکے۔ مصنف نے کہانی لکھنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ مجموعی طور پر رسالہ بہت اچھا تھا اور رسالے کی مزید کامیابیوں کے لیے دعا گو ہوں۔ نیک تمناؤں کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں' اللہ حافظ۔

شاہد بٹ فیصل آباد سے ہماری اس بزم میں شریک ہوئے ہیں لکھتے ہیں کچھ مصروفیات کی وجہ سے خطوط کی اس محفل میں شامل نہ ہو سکا لیکن میگزین کا مطالعہ باقاعدگی سے جاری رہا۔ ماہ جون کا ٹائٹل بے حد پسند آیا۔ اس کے بعد اس ماہ کی خاص کہانی محمد بن قاسم کا مطالعہ کیا' سچ پوچھیں تو میں یہ رسالہ ہر ماہ کی خاص کہانی کی وجہ سے ہی خریدتا ہوں۔ پھر اس کے بعد روشنی ایک ایسا ایمان افروز سلسلہ ہے جو اسے دوسرے رسالوں سے منفرد بنا دیتا ہے۔ اس میں شامل مستقل سلسلے بھی بے حد دلچسپ ہیں۔ گلابوں کی جنگ یورپ کے تاریک دور سے پردہ اٹھا رہی ہے تو دلدل اور چکر باز ہمارے آج کے معاشرے کی حقیقی تصویر کشی کر رہی ہیں۔ جون کے شمارے میں دلدل کی کہانی اب ایک نئے موڑ پر آ چکی ہے۔ دلدل میں دیہی علاقوں سے تعلق رکھنے والوں کے مسائل کی حقیقی تصویر کشی کی گئی ہے۔ مختصر کہانیوں میں من پسند' مرض لاعلاج اور شکستہ منصوبہ اچھی کہانیاں تھیں۔ آپ کا انتخاب ہر بار بے حد منفرد ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر پورا میگزین ہی بے حد شاندار تھا۔ آئندہ بھی آپ کی محفل میں شرکت کرتا رہوں گا۔ بہت سی دعاؤں کے ساتھ اجازت دیجیے' اللہ حافظ۔

یہ تھے قارئین کے خطوط اب اگلے ماہ تک کے لیے اجازت

فہمیدہ

نور جہاں

پروفیسر محمد احمد

گزرے دور کی تاریخی ..... مگر دلچسپ تحریر

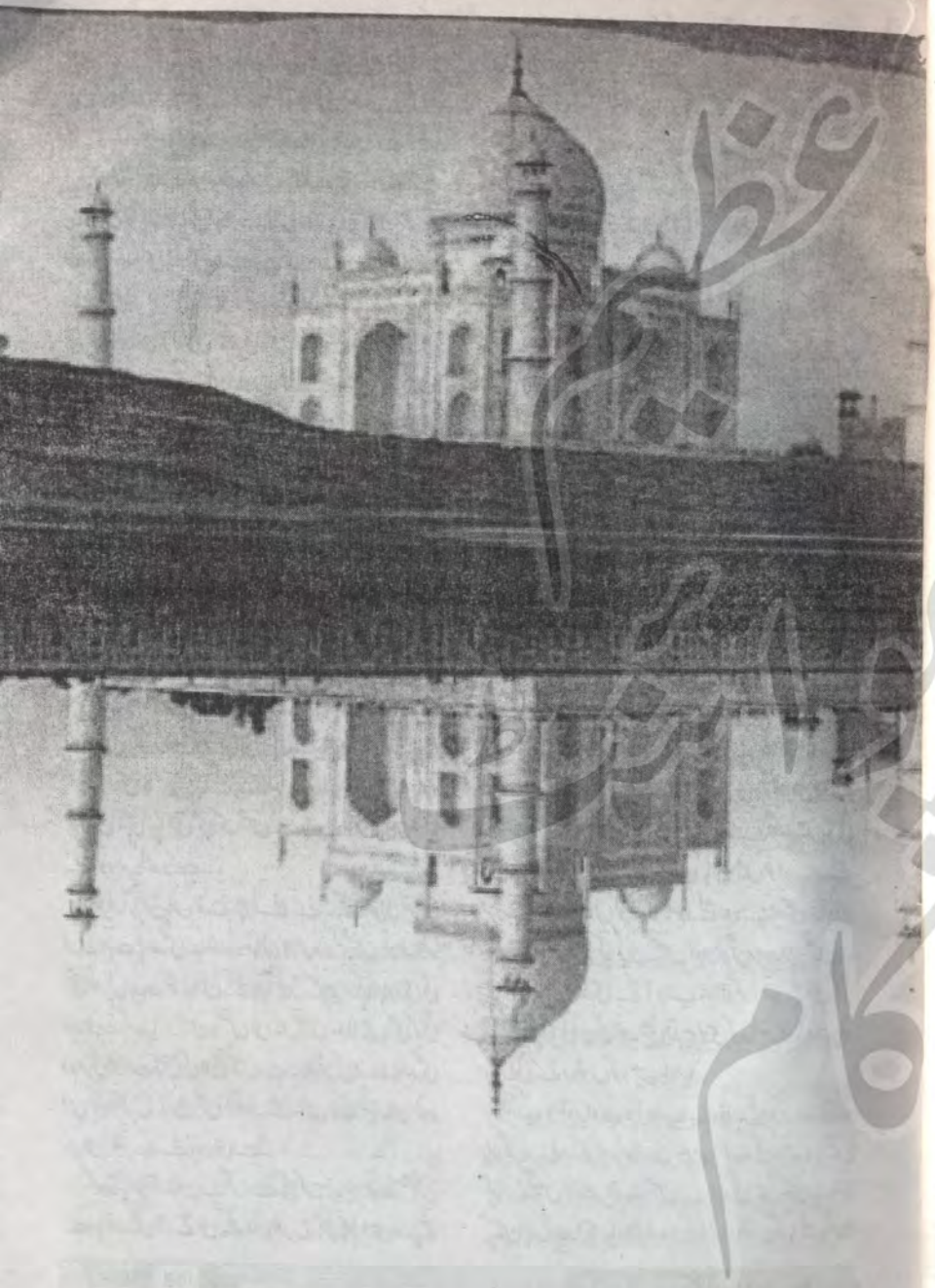

نور جہاں

پروفیسر محمد احمد

دوپہر کے وقت لاہور کے ایک مجتہد کو بلاکر وصیت کی کہ میرا مقبرہ سادہ سا بنایا جائے اور میری قبر پر کوئی کتبہ نصب نہ کیا جائے۔ اسی روز سورج غروب ہونے سے پہلے وہ سونے کے لئے لیٹ گئی..... کوئی بیماری نہیں تھی، کوئی عارضہ لاحق نہیں ہوا تھا لیکن ایسی سوئی کہ کسی کے اٹھائے نہ اٹھی

گزرے دور کی تاریخی .....مگر دلچسپ تحریر

غریب اور مفلوک الحال خوش نویس کے ہاں پیدا ہونے والی مہرالنساء اتنی بخت آور تھی کہ ادھر دنیا میں آئی اور ادھر باپ کے لئے دولت کے دروازے کھلنا شروع ہوگئے۔ خوبصورت اتنی تھی کہ بقول جہانگیر، پھول اس کے غیر معمولی حسن کو دیکھنے کی آرزو کرتے تھے۔ ذہن اتنا وسیع پایا تھا کہ جہاں تک کبھی بقراط زماں اور ارسطو کے دوران کی نظریں نہیں پہنچتی تھیں، وہ پلک جھپکتے میں اس کا احاطہ کرلیتی تھی۔ شیر افگن سے شادی ہوئی تو اسے اپنا ملجا ملاذ سمجھ لیا۔ جب تک زندہ رہا۔ اس کی وفاداری رہی۔ مرگیا تو مروجہ قانون کے مطابق لاوارث بیوہ کی حیثیت سے شاہی قلعہ میں شوہر کی واحد نشانی لاڈلی بیگم کو لے کر منتقل ہوگئی۔

عقد ثانی کے بارے میں کبھی سوچا تک نہیں تھا لیکن مینا بازار میں جہانگیر نے دیکھا اور اسے اپنی ملکہ بنانے پر تیار ہوگیا۔ جہانگیر کے اصرار اور مادر ملکہ سلیمہ بیگم کی سفارش نے اچانک اسے زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچادیا۔ وہ مہرالنساء سے ملکہ نور جہاں بن گئی۔

جہانگیر میں اگر خوبیاں تھیں تو اس کی ان خوبیوں کو شراب وکباب کی لت چاٹ گئی تھی۔ اب یہ حقیقت کھل کر سامنے آچکی ہے کہ جہانگیر صرف نام کا بادشاہ رہ گیا تھا۔ جگہ جگہ بغاوتیں ہورہی تھیں۔ رعایا بادشاہ سے جو گمبھیر سے گمبھیر مسئلہ کو ایں دفتر بے معنی، غرق لئے تاب اولی کہہ کر نظر انداز کردیا کرتا تھا، نالاں ہوچکی تھی۔ بادشاہ کا بڑا بیٹا خرم باغی ہوگیا تھا اور باپ کو فوج کی مدد سے قتل کرکے خود عنان حکومت سنبھالنا تھا۔

مہرالنساء نور جہاں بنی تو اسے احساس ہوا کہ اس نے

کس وادی پرخار میں قدم رکھا ہے۔ بادشاہ کو اس کی محبت چاہئے تھی۔ سو اس نے اسے بھرپور محبت دی اور ملک کو سلطنت مغلیہ کے استحکام و بقاء کی ضرورت تھی۔ پس بادشاہ کی حالت زار دیکھتے ہوئے نور جہاں نے اسے اپنی تمام تر توجہات کا مرکز بنالیا۔ بنگال، بہار اور چتوڑ کی بغاوتوں کو کچلا۔ باغی مہابت خاں اور باغی شہزادہ خرم کو للکارا..... کیسی انوکھی بات ہے کہ جب وہ شہزادہ خرم سے مقابلہ کرنے کے لئے میدان جنگ میں گئی تو شیر خوار نواسی (لاڈلی بیگم کی بیٹی) اس کی گود میں تھی۔ دل سے چاہتی تھی کہ داماد بادشاہ بنے لیکن جہانگیر کا انتقال ہوا تو امرائے سلطنت کو پیغام بھیجا کہ اصل حقدار شہزادہ خرم ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ نور جہاں نہ ہوتی تو سلطنت مغلیہ پارہ پارہ ہوجاتی۔ نور جہاں نے ایسی حکمت عملی سے کام لیا کہ حکومت مستحکم ہی نہیں ہوئی کسی حد تک اس میں وسعت بھی آئی۔ عدل اس نے کیا، عادل جہانگیر کہلایا۔ شیعہ سنی بھائی چارے کی بنیاد اس نے رکھی، تعریف جہانگیر کی ہوئی۔ بگڑے اور بپھرے ہوئے ہندوؤں کو رام نور جہاں نے کیا، مساوات کی علمبرداری کا سہرا جہانگیر کے سر بندھا..... اور شاید وہ خود بھی یہی چاہتی تھی کہ جس نے اسے نور جہاں بنایا ہے، وہ سربلند رہے۔

برمزار ما غریباں، نے چراغے نے گلے۔ والی غزل اسے بہت پسند تھی۔ اٹھارہ سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا۔ مگر اتنی طویل مدت تک اس نے جہانگیر کے مزار کی مجاوری کی اور ثابت کردیا کہ حسن و عقل ہی میں نہیں، وفا میں بھی کوئی دوسری عورت اس کی ثانی نہیں ہے۔ جو غزل اسے پسند تھی اس کی تشریح آج بھی لاہور میں اس کے سنسان اور ویران مقبرے سے ہورہی ہے۔

کبوتر پالنا آسان ہے مگر اسے پکڑ کر سنبھالنا بہت مشکل ہے، ہاتھ میں آتے ہی کچھ اس طرح پھڑ پھڑاتا اور پنجے چلاتا ہے کہ اچھے اچھوں کی گرفت ڈھیلی پڑجاتی ہے اور کبوتر آزاد ہوکر اڑ جاتا ہے۔

درحقیقت کبوتر کو پکڑنا اور پکڑ کے قابو میں کرنا ایک فن ہے۔ اسے باقاعدہ سیکھنا اور سمجھنا پڑتا ہے۔ پیٹ اور پوٹے کے نیچے ہتھیلی کرکے، کبوتر کی دونوں ٹانگوں کو احتیاط سے کہ بے زبان کو اذیت نہ ہو، دم کی جانب موڑتے ہیں گرفت کچھ ایسی ہو کہ انگوٹھا دائیں جانب کے اور چھنگلی بائیں جانب کے پروں کو نرم و نازک پنکھڑیوں کی مانند دبالے۔ اس طرح کبوتر کو کوئی تکلیف و اذیت نہیں ہوتی، پھڑ پھڑاتا ہے، نہ گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ اسے تو ہتھیلی کے نیچے ایسا آرام و سکون ملتا ہے گویا ماں کے پروں میں جاکر اس کے سینے سے لگ گیا ہو۔ اکثر کبوتروں کو اس حال میں آنکھیں بند کرتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے۔ کبوتر باز جتنا تجربہ کار ہوتا ہے۔ اس کی گرفت اتنی ہی آرام دہ ہوتی ہے اور کبوتر کو اتنا ہی زیادہ سکون حاصل ہوتا ہے۔

گیارہ سالہ مہرالنساء کبوتروں کو بے ضرر تو سمجھتی تھی لیکن ان حسین و معصوم پرندوں کو پیار و احتیاط سے پکڑنے کے فن سے ناواقف تھی۔ گھڑی دو گھڑی کو ماں کے ساتھ مہارانی جودھا بائی کو سلام کرنے قلعہ میں آتی تھی۔ مہارانی اس وقت پائیں باغ میں فوارے کے قریب بیٹھی کنیزوں کو جھولا جھولتے اور بے موسمی ساون گاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں اور خوش ہورہی تھیں۔ پیغام رساں لونڈی نے آداب بجالا کر اطلاع دی کہ غیاث مرزا کی بیوی اور بیٹی قدم بوسی کو حاضر ہوئی ہیں تو مہارانی نے دونوں کو وہیں بلالیا۔

حسب دستور ادب و آداب سے فارغ ہوکر اور نذر و نیاز گزارنے کے بعد مہارانی اور مہرالنساء کی والدہ باتیں کرنے لگیں اور مہرالنساء جس نے زندگی میں پہلی بار اتنا حسین باغ اور اتنا پیارا فوارہ دیکھا تھا دونوں کو باتیں کرتا

چھوڑ فوارے کی دوسری سمت جا کھڑی ہوئی۔ جھولا جھولنے اور ساون گانے والی رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس تیتریوں جیسی کنیزوں میں وہ کشش نہیں تھی جو فوارے سے نکلنے والی موتیوں کی جھالر جیسی پھوار میں تھی۔ دل ہی دل میں حیرت زدہ ہورہی تھی کہ فوارے میں پانی کہاں سے آرہا ہے اور اتنی خوبصورت پھوار میں کس طرح تبدیل ہورہا ہے۔

اسی عالم استعجاب میں گم صم سی کھڑی تھی کہ نہ جانے کس طرف سے تیکھی مونچھوں والا ایک سانولا نوجوان تقریباً بھاگتا ہوا آیا اور مہرالنساء کے چہرے کی طرف دیکھے بغیر اس نے اسے دو کبوتر تھما دیئے۔

ابھی آتا ہوں۔ اس نے کہا اور جس طرح بھاگتا ہوا آیا تھا۔ اسی طرح بھاگتا ہوا غائب ہوگیا۔

مہرالنساء نے کبوتروں کو سنبھالنے اور دبوچنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن کبوتر اس طرح پھڑ پھڑائے اور اس طرح پنجے چلائے کہ ایک آزاد ہوکر اڑ گیا۔ دوسرے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر سینے میں نہ بھینچتی تو پہلے کی طرح وہ بھی ہاتھوں سے نکل کر فضا میں تحلیل ہوجاتا۔

کبوتروں کو تھمانے والا سانولا نوجوان چند ہی لمحوں میں واپس آگیا۔ مہرالنساء کے ہاتھوں میں دو کی بجائے ایک ہی کبوتر دیکھا تو تعجب اور غصے کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ پوچھا۔

دوسرا کبوتر کہاں گیا۔

مہرالنساء نے بڑی اعتنائی کے ساتھ کہا۔ اڑ گیا۔

کیسے.....!

مہرالنساء نے سینے سے پیوست کبوتر کو ہوا میں اچھال کر کہا ایسے۔

تیکھی مونچھوں والا اتنے عجیب و غریب، بے تکلفی کے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ گستاخی کے جواب پر چند لمحوں کے لئے گونگا سا ہوکر رہ گیا۔ دونوں کبوتر اعلیٰ نسل کے تھے۔ کسی مہاراجہ نے بھجوائے تھے۔ ابھی پر قینچ نہیں ہوئے تھے اور آئے ہوئے اتنا عرصہ نہیں گزرا تھا کہ کابک کو پہچان کر اس سے مانوس ہوتے۔ افسوس کے ساتھ تعجب بھی ہورہا تھا کہ سامنے کھڑی لڑکی اس سے رائی کے دانے کے برابر بھی مرعوب اور متاثر نہیں تھی بلکہ ایک طرح سے تو اس نے دوسرے کبوتر کو چھوڑ کر نوجوان کا مذاق اڑایا تھا کہ احمقانہ سوال کا یہی حکیمانہ جواب ہوسکتا ہے لیکن چہرے پر مذاق کے نہیں معصومیت اور بھولپن کے آثار نمایاں تھے اور چہرہ اتنا حسین تھا کہ نوجوان نے غصے سے اس کی طرف دیکھا تو ایک ہی نظر میں سارا غصہ ہوا ہوگیا اور وہ دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا۔ کئی طویل لمحوں کی خودفراموشی کے بعد اسے احساس ہوا کہ سامنے کھڑی ہوئی بے تکلف اور بے پرواہ لڑکی کنیز تھی، نہ کوئی کنیز زادی تھی اور قلعے میں پہلی بار نظر آئی تھی۔

اعلیٰ نسل کے بیش قیمت کبوتروں کو بھول کر اس نے پوچھا۔ کیا ہم آپ سے آپ کا اسم گرامی دریافت کرسکتے ہیں۔

مہرالنساء نے اسی بے تکلفی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ہاں، ہاں دریافت کرسکتے ہیں۔

جیسا سوال، ویسا جواب۔ نوجوان اس کی معصومیت پر لٹو ہوگیا۔ سنبھل کر بولا۔ زحمت نہ ہو تو اپنے نام نامی سے آگاہ فرمائیں۔

لڑکی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ بھلا نام بتانے میں بھی کسی کو زحمت ہوتی ہے۔ ہمارا نام مہرالنساء ہے۔

مہرالنساء نوجوان نے چٹخارہ بھر کر کہا۔ آپ کہاں کی شہزادی ہیں۔

مہرالنساء ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگئی۔ وہ عمر کے اس حصے سے گزر رہی تھی جب لڑکیوں کو اجنبی مردوں سے محتاط اور پچاس ہاتھ دور رہنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ نوجوان بیوقوف تھا لیکن اسے اچھا لگا اور کچھ زیادہ ہی اچھا لگا۔ بے اختیار دل چاہا کہ اس سے باتیں کی جائیں اور عقل و خرد کی

تعلیم دے کر اسے انسان بنایا جائے لیکن ماں کی نصیحت یاد آ گئی۔ جس نے سختی کے ساتھ اسے مردوں سے گفتگو کرنے سے منع کیا تھا۔ پس وہ بڑی ادا کے ساتھ مسکرائی اور نوجوان کی طرف پشت کر کے گویا اس نے اس کے احمقانہ استفسار کو درخور اعتنا نہ سمجھا ہو، باوقار انداز میں ٹہلتی ہوئی فوارے کی اس جانب چلی گئی۔ جہاں مہارانی اور اس کی والدہ مصروف گفتگو تھیں۔

سانولے نوجوان کے لئے یہ وار ناقابل برداشت تھا تلملا کر آگے بڑھا کہ اس نئی کبوتری کو گردن سے دبوچ لے مگر یہ دیکھ کر ٹھٹک گیا کہ وہ مہارانی کے سامنے جا بیٹھی ہے۔ دل مسوس کر پلٹا اور جاتے جاتے فیصلہ کر لیا کہ بھولی بھالی صورت والی کے حسن بے پناہ کے غرور کو خاک میں نہیں ملایا تو کچھ بھی نہیں کیا۔

مہارانی نے مہرالنساء اور مہرالنساء کی والدہ نے نوجوان کو آتے، پھر تیزی سے پلٹ کر واپس جاتے دیکھا۔ مہارانی جودھا بائی نے مہمان ماں بیٹی کے چہروں پر استفہامیہ آثار کا اندازہ لگا کر کہا۔ بھگوان سلامت رکھے۔ شہزادہ سلیم تھے۔ ایک بچے کے باپ بن چکے ہیں لیکن ابھی تک اجنبی خواتین کے سامنے جاتے ہوئے شرماتے ہیں۔ شاید ہم سے کچھ کہنے سننے آ رہے تھے۔ آپ کو دیکھ کر واپس چلے گئے۔

مہرالنساء کو بیر بہوٹی بنانے اور سرتاپا لرزا دینے کے لئے اتنی وضاحت کافی تھی۔ جس بیوقوف کو اس نے قلعہ کا معمولی ملازم سمجھا تھا۔ وہ ولی عہد سلیم تھا۔ مہرالنساء اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی باتوں کی ہنسی اڑائی تھی اور یہی نہیں بلکہ کبوتروں کو اڑا کر اتنا بڑا جرم کیا تھا، جس کی پاداش میں اسے سولی پر چڑھا دیا جاتا تو کم تھا۔

اسے کچھ پتہ نہیں چلا کہ مہارانی جودھا بائی نے کیا خاطر تواضع کی اور ماں بیٹی کو کون کون سے تحائف دیئے۔ دستور یہی تھا کہ سلام کے لئے آنے والیوں کو مہارانی کی طرف سے بیش قیمت تحفے عطا کئے جاتے تھے۔ ماں ٹھوکے لگاتی رہی اور مہرالنساء لکڑی کے بے جان کھلونے کی طرح ماں کے اشاروں پر آداب کرتی رہی اور اسی سوتی جاگتی کیفیت میں ماں کے ساتھ گھر واپس آ گئی۔

گھر آ کر بھی کئی روز تک احمق شہزادہ نظروں میں گھومتا رہا۔ ایک بار خواب میں بھی دکھائی دیا۔ پوچھ رہا تھا۔ تم کس ملک کی شہزادی ہو، مہرالنساء۔ اور مہرالنساء اس کے سوال پر بے تحاشہ قہقہے لگا رہی تھی۔

چند ہفتوں بعد بات آئی گئی ہوئی۔ مہرالنساء اپنی گستاخیوں اور شہزادے کی حماقتوں کو بھول گئی۔ کبھی کبھار، بھولے بھٹکے، کبوتر اڑانے اور شہزادے کے سامنے اٹھلانے اور اترانے کا واقعہ یاد آ جاتا تو بے اختیار مسکرا پڑتی۔ چند لمحوں تک لطف لیتی پھر سر جھٹک کر اپنے روزمرہ کے کام میں مصروف ہو جاتی۔

مغلوں کی اس خوبی کا اپنوں اور غیروں سبھی نے اعتراف کیا ہے کہ وہ اڑتی چڑیا کے پر کاٹتے اور رگ گل سے بلبل کے پر باندھتے تھے۔ مہارانی جودھا بائی مغل نہیں تھی لیکن مغلوں میں آ کر مغلوں جیسی ہو گئی تھی۔ اس نے جس سراسیمگی کے عالم میں شہزادہ سلیم کو مہرالنساء کے پیچھے آتے دیکھا تھا اسے دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ بیٹے کی غیر معمولی جمالیاتی حس اور مہرالنساء کا غیر معمولی بے داغ حسن اسے ادھر کھینچ لایا ہے۔ ماں بیٹی سے تو مہارانی نے بہانہ بنا دیا کہ ولی عہد اجنبی خواتین سے شرماتے ہیں لیکن ان دونوں کے جاتے ہی ساری کنیزوں اور سارے خواجہ سراؤں اور سارے دربانوں کو خصوصی ہدایت کر دی کہ شہزادے کو ہرگز پتہ نہ چلنے پائے کہ مہرالنساء کون تھی اور کہاں سے آئی تھی۔

شہزادے نے اپنی سی پوری پوری کوشش کر ڈالی لیکن

مہرالنساء کا پتہ نشان معلوم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ کنیزوں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا اور صاف مکر گئیں کہ وہ کسی مہرالنساء سے واقف ہیں۔ خواجہ سراؤں نے تالیاں بجا بجا کر اپنے اپنے سروں کی قسمیں کھائیں کہ قلعہ میں کوئی مہرالنساء آئی، نہ گئی۔ دربانوں نے البتہ ایمانداری سے کام لیا۔ اس روز مہارانی کو سلام کرنے ایک درجن سے زیادہ عورتیں آئی تھیں۔ شہزادے کو سب کے پتے بتا دیئے۔ بس مہرالنساء اور اس کی ماں کا پتہ گول کر گئے۔

تھک ہار کر شہزادے نے مہرالنساء کو صبر کر لیا لیکن دل سے اس حسین و جمیل معصوم چہرے کو نہیں نکال سکا جو پتھر کے نقش کی طرح ثبت ہو چکا تھا۔

☆

رقبے اور آبادی کے لحاظ سے شیراز نہ پہلے کبھی بہت بڑا تھا نہ اب ہے لیکن وہاں کے لوگ بہت بڑے تھے۔ شاعروں، ادیبوں، دانش وروں، سخن فہموں اور قدر دانوں سے پاٹم پاٹ بھرا ہوا تھا۔ اوسط نکالا جائے تو صدیوں سے ہر ساتویں آٹھویں گھر میں کوئی نہ کوئی ممتاز شاعر، حکیم، مصور، منجم یا مفکر ضرور پیدا ہوتا آیا تھا۔ نظام الدین طوسی کے درس نظامی کی جو ابھی تک دنیا بھر کے دینی مدارس میں رائج ہے، اول اول داغ بیل بھی شیراز ہی میں پڑی تھی۔

اسی مردم خیز شہر میں غیاث مرزا کی پیدائش ہوئی۔ وہ وہیں پلا اور بڑا ہوا۔ سات بھائیوں اور دو بہنوں میں وہ پانچواں تھا۔ بھائیوں نے آبائی پیشہ اپنایا اور فنون سپہ گری سیکھ کر ایران کے مختلف صوبوں کی فوجوں میں شمولیت اختیار کر لی۔ ایک بہن بیاہ کر اصفہان چلی گئی اور دوسری کا شوہر قسمت آزمائی کے لئے ٹھٹھہ گیا اور سمہ خاندان کا محافظ بن گیا۔ چند ماہ بعد بیوی کو بھی وہیں بلا لیا..... اس طرح غیاث مرزا کے سارے بھائی بہن تتر بتر ہو گئے۔ ماں باپ شیراز ہی میں رہے اور مر کر وہیں کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

غیاث مرزا بچپن ہی سے حسن کا عاشق تھا۔ خون خرابے سے نفرت کرتا تھا اور آنکھوں کو اچھی لگنے والی ہر حسین شے دوسروں سے کچھ زیادہ ہی اچھی اور حسین لگتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے باپ دادا کا پیشہ چھوڑ کر خوش نویسی کے فن کو اپنایا اور اس فن میں اتنا کمال حاصل کیا کہ جو دیکھتا، واہ واہ کئے بغیر نہ رہتا۔

خوش نویسی اور خوش نصیبی میں ازلی اور ابدی بیر ہے۔ دونوں ایک دوسری کی ایسی ظالم سوکنیں ہیں کہ مل جل کر ایک ہی گھر میں نہیں رہ سکتیں۔ غیاث مرزا کو اس تلخ حقیقت کا احساس اس وقت ہوا جب وہ ایک لڑکی اور دو لڑکوں کا باپ بن چکا تھا۔ اس سے قبل اس لئے بے خبر رہا کہ بوڑھا باپ زندہ تھا اور بہت ہی معقول معاوضے پر شہر کے نوجوان لڑکوں کو شمشیر زنی اور گھڑ سواری کی تربیت دیا کرتا تھا۔ دو چار دام و درہم غیاث مرزا بھی اپنی خوش نویسی سے کما لیتا لیکن اللے تللے باپ کی کمائی پر تھے۔ باپ کی آنکھیں بند ہوئیں تو غیاث مرزا کی آنکھیں کھلیں۔ اس نے جس فن کو اپنایا تھا وہ یقیناً قابل تعریف تھا لیکن خالی پیٹ تعریفوں سے نہیں بھرا کرتے۔ پیٹ بھرنے کے لئے رقم کی ضرورت پڑتی ہے اور رقم ملتی ہے کام کرنے سے۔ کام کرنے سے کسے انکار تھا۔ کام کرانے والے ہی نہیں تھے۔ تعریف اور توصیف سبھی کرتے لیکن کام اکا دکا لوگ ہی کراتے۔ مہینے میں بیس بائیس دن ہاتھ پر ہاتھ دھرے گزر جاتے۔ کبھی تو پورے مہینے کام نہ ملتا۔

غیاث مرزا قلم کا مزدور تھا۔ شہر میں اس جیسا زریں رقم کوئی اور نہیں تھا عموماً وہاں کے باشندے اپنے نام کا ایک سطری سجع لکھوانے آ جاتے تھے۔ لیکن سجع روز روز تو نہیں لکھوایا جاتا۔ ایک سجع ساری عمر کے لئے کافی ہوتا تھا۔ چین میں چھاپے خانے ہوں تو ہوں شیراز چھوڑ

پورے ایران میں کوئی چھاپہ خانہ نہیں تھا۔ قلمی کتابوں کی نقل کرلیا کرتے تھے۔ غیاث مرزا پندرہ سال کی عمر سے خوش نویسی کررہا تھا اور تیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اس سے صرف دو کتابوں کی نقل تیار کرائی گئی تھی۔ ایک نماز روزے کے ضروری مسائل کی ساڑھے پانچ صفحات کی کتاب تھی اور دوسری کلام حافظ پر مشتمل دوسو سترہ صفحات کی۔ دونوں کتابوں کو نقل کرتے ہوئے غیاث مرزا نے کاغذ پر اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا تھا لیکن پہلی کا معاوضہ اس لئے کم ملا کہ دینی کام تھا اور دین کے کام میں معاوضہ نہیں، ہدیہ لیا جاتا ہے اور دوسری کا معاوضہ کم ملنے کی وجہ یہ تھی کہ اصطبل کے داروغہ کا حکم تھا جو گھوڑوں اور انسانوں میں امتیاز کرنے کا قائل نہیں تھا۔ اس کے دوست کو وقتاً فوقتاً فال نکالنے کے لئے ذاتی دیوان حافظ کی ضرورت تھی۔

باپ کی موت کو دو سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ فاقوں تک نوبت پہنچ گئی۔ جن دکانداروں سے ادھار پر آٹا دال مل جاتا تھا۔ انہوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ بڑی بے مروتی سے سوکھا سا منہ بنا کر کہا۔ پہلے پچھلا حساب چکتا کرو۔ بعد میں کچھ اور مانگنا۔

دوست پہلے ہی نالاں ہوچکے تھے۔ صورت دیکھتے ہی ادھر ادھر ہوجاتے تھے۔ گھر میں ہوتے مگر اندر سے کہلوا دیتے تھے کہ کسی ضروری کام سے باہر گئے ہیں۔ بھولے بھٹکے یا زور زبردستی مڈبھیڑ ہوجاتی تو ملنے والا چھوٹتے ہی اپنی پریشانیوں اور مصیبتوں کا رونا رونے لگتا۔ اتنا موقعہ ہی نہیں دیتا کہ غیاث مرزا اس سے ایک یا نصف درہم مانگتا۔

حالت بہت ہی زیادہ ابتر ہوگئی تو غیاث مرزا نے آبائی مکان اونے پونے داموں بیچا اور سفر وسیلہ ظفر کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے بچشم پرنم بیوی اور تینوں بچوں سمیت ہجرت کرکے مشہد منتقل ہوگیا۔

حضرت امام رضا علیہ الرحمتہ کے مزار مبارک کی وجہ سے مشہد کو ایران کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں خصوصی اہمیت وفوقیت حاصل تھی۔ اللہ والوں کا شہر تھا۔ دنیا بھر کے عقیدت مند مرادیں مانگنے اور چڑھاوے چڑھانے وہاں آتے تھے۔ آج بھی یہی کہا جاتا ہے اور کل بھی یہی کہا جاتا تھا کہ مشہد جانے والا کبھی تہی دامن اور خالی ہاتھ واپس نہیں آتا۔ غیاث مرزا کو بھی مایوسی نہیں ہوئی۔ مرزا اقدس مجاوروں میں سے ایک مجاور کا سجع لکھ کر دیا۔ اس کے بعد تو سجع لکھوانے والوں کا ہجوم لگ گیا۔ جو شخص بھی زیارت کے لئے آتا۔ برکت کے طور پر اپنا سجع ضرور لکھواتا۔ سجع کو تبرکات میں شامل کیا جانے لگا۔ یک سطری سجع کا نرخ بڑھتے بڑھتے ایک درہم ہوگیا۔ پھر بھی آنے جانے والوں کی تعداد میں کمی نہیں ہوئی۔

پھر نہ جانے کس طرح حاکم شہر نے غیاث مرزا کی بیوی کو دیکھ لیا، دیکھتے ہی لٹو ہوگیا۔ بیوی کے پاس کٹنی کو بھیجا کہ تم تو محلوں میں رہنے کے قابل ہو خوش نویس کے گھر میں اپنے حسن و جوانی کو کیوں ضائع کررہی ہو۔

غیاث مرزا کی بیوی وفادار تھی۔ اس نے کٹنی کو خوب جلی کٹی سنائی۔ کھڑے کھڑے گھر سے نکال باہر کیا۔ شام کو حسب معمول ہار پھول اور مٹھائیوں سے لدا پھندا غیاث مرزا گھر پہنچا تو کٹنی کی آمد اور حاکم شہر کے پیغام کا علم ہوا۔ سمجھ گیا کہ قسمت میں اس مقدس شہر کا مزید دانہ پانی نہیں ہے۔ دریا میں رہ کر مگرمچھ کو دشمن نہیں بنایا جاسکتا۔ حسن پرست حاکم اپنی ہوس پوری کرنے کے لئے جان تک لینے سے گریز نہیں کرے گا..... پس راتوں رات سامان سمیٹا اور صبح ہوتے ہی خاموشی سے مشہد کو چھوڑ دیا۔ بیوی بچوں کو لے کر دوبارہ شیراز جانا چاہتا تھا لیکن جو قافلہ ملا وہ ہندوستان جارہا تھا۔

پچھلے دنوں ہندوستان کے کچھ زائرین مشہد آئے تھے

اور انہوں نے غیاث مرزا کے فن کو دیکھ کر مشورہ دیا تھا کہ اکبر کے دربار تک اس کی رسائی ہوجائے تو دن پھر جائیں گے۔ غیاث مرزا کو زائرین کی بات یاد آگئی۔ اس نے شیراز جانے کا ارادہ ملتوی کردیا اور ہندوستان کے قافلے میں شامل ہوگیا۔

چند ہفتوں کا سفر تھا لیکن موسلا دھار بارشوں اور دریاؤں میں آئے ہوئے سیلابوں کے باعث ہندوستان پہنچتے پہنچتے کئی ماہ لگ گئے۔ مشہد سے چلا تو بیوی تین ماہ کی امید سے تھی۔ ہندوستان پہنچا تو دوسرے ہی پڑاؤ پر جو قندھار میں کیا گیا تھا ایک اور بچی کی ماں بن گئی۔

قافلے میں شامل عورتوں نے کوئی دائی میسر نہ ہونے کے باعث زچگی کرانے کے فرائض انجام دیئے۔ بچی کی بخیر وخوبی پیدائش ہونے پر سبھی نے غیاث مرزا کو مبارک باد دی۔ مبارک باد دینے والیوں میں ایک عورت ایسی تھی جس نے یہ پیش گوئی بھی کی کہ نوزائیدہ بچی قسمت کی ایسی دھنی ہے کہ ساری زندگی راج کرے گی اور راج کرائے گی۔ وجہ یہ بتائی کہ بچی کی دسوں انگلیوں کے پوروں پر مکمل دائرے ہیں۔

غیاث مرزا پیش گوئی سن کر ہنس پڑا۔ راج کرنے اور راج کرانے والی لڑکی نے ایسے ماں باپ کی آغوش میں آنکھیں کھولی تھیں کہ ان کی ساری جمع پونجی طویل ترین سفر کی نذر ہوچکی تھی۔ بچی کا عقیقہ کرنا تو درکنار رہا ان کے پاس تو اتنی رقم بھی نہیں تھی کہ زچہ کے لئے روئی اور گوڑ کا انتظام کرتا۔

میر قافلہ تک خبر پہنچی کہ غیاث مرزا کے ہاں بچی کی ولادت ہوئی ہے۔ اس لئے سفر ایک شب اور ایک روز کے لئے ملتوی کرنا پڑے گا۔ میر قافلہ بہت نیک اور خدا ترس انسان تھا اور غیاث مرزا کی حالت زار اس سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ اس نے غیاث مرزا کے پاس جاکر مبارک باد دی۔ پیڑوں کے گردتنی ہوئی چادروں کے پیچھے سے نوزائیدہ بچی کو باہر بلا کر اس کی گود میں سونے کا ایک سکہ ڈال دیا اور غیاث مرزا سے پوچھا۔ بچی کا نام کیا تجویز کیا ہے۔

نام تو اس وقت تجویز کیا جاتا، جب غیاث مرزا کو اس کی پیدائش کی کوئی خوشی ہوئی ہوتی۔ وہ تو بالکل گم صم سا ہوکر رہ گیا تھا۔

حیرت ہے، ابھی تک بچی کا نام ہی نہیں رکھا۔ میر قافلہ نے کہا۔ پھر بچی کے ماتھے کو چوم کر کہا۔ کتنی پیاری چاند جیسی بچی ہے۔ کہو تو میں اس کا نام تجویز کروں۔

ہمارے ہاں کا دستور ہے کہ بچوں کے نام اپنے بزرگوں سے تجویز کراتے ہیں۔ اس وقت قافلے میں آپ ہی ہمارے بزرگ ہیں۔ اس لئے اس سے اچھی بات کیا ہوگی کہ آپ بچی کا نام تجویز فرمائیں۔

مہرالنساء۔ میر قافلہ بولا۔ بچی کو دیکھتے ہی یہ نام میرے ذہن میں آیا تھا۔ تمہیں اور تمہاری بیوی کو پسند ہو تو یہی نام رکھ لو۔ انشاء اللہ دنیا بھر کی عورتوں میں یہ بچی چاند کی طرح چمکے گی۔

اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔

اس طرح بچی کا نام مہرالنساء رکھ دیا گیا۔ ادھر قافلے والوں میں جس جس کو بچی کی ولادت کا علم ہوتا گیا، وہ غیاث مرزا کو مبارک باد دینے اور حسب توفیق مہرالنساء کو نقدی کی صورت میں کچھ نہ کچھ پیش کرنے آنے لگا۔

بچی کی پیدائش شب چہاردہم میں ہوئی تھی۔ اس وقت غیاث مرزا کی جیب میں پانچ یا چھ درہم پڑے تھے لیکن صبح ہوتے ہوتے اتنی رقم مل گئی کہ اسے رکھنے کے لئے تھیلی تک چھوٹی پڑ گئی۔ صبح ہوئی تو غیاث مرزا نے ایک مسافر سے گھوڑا لیا، قریبی بستی میں گیا اور سامان سے لدا پھندا ہوا واپس آیا۔ سامان میں زچہ کی ضروریات کی چیزیں ہی نہیں لڈوؤں کے دو ٹوکرے بھی تھے۔ پورے قافلے میں لڈو تقسیم کئے گئے۔

شام کے وقت جس غیاث مرزا کو روٹی کے لالے پڑے تھے وہی صبح کے وقت قافلے میں لڈو تقسیم کر رہا تھا اور وہ تھیلی، جس میں رقم رکھی گئی تھی ایک چوتھائی سے زیادہ خالی نہیں ہوئی تھی.....اور تینوں بڑے بچے (ایک لڑکی اور دو لڑکے) زرق برق نئے لباس پہنے خوشی سے قافلے میں کودتے پھر رہے تھے۔

دائی کے فرائض انجام دینے والی قافلے کی عورتوں میں سے ایک عورت نے جس وقت اسے بچی کے راج کرنے اور راج کرانے کی خوش خبری پیش گوئی کے طور پر سنائی تھی وہ کھسیانی سی ہنسی ہنسنے لگا تھا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ غیاث مرزا کو پیش گوئی کی صداقت پر یقین آتا چلا گیا۔ اس نے درجنوں بار بچی کی انگلیوں کے پوروں پر بنے ہوئے دائرے نما نشانات ہی نہیں دیکھے، قافلے میں شامل کم وبیش سبھی افراد کی انگلیوں کے پوروں کو دیکھ ڈالا۔ دس دائرے ہونا تو درکنار کسی کے پوروں پر تین اور چار سے زیادہ مکمل دائرے نہیں تھے۔

انگلیوں کے پورے بے وجہ نہیں دیکھے گئے تھے۔ اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ سفر کے دوران لوگوں پر نفسا نفسی کا عالم طاری ہوتا ہے اور کسی کو ایک دام خرچ کرنا ہو تو وہ دس مرتبہ سوچتا ہے کہ خرچ کرے یا نہ کرے لیکن غیاث مرزا کے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا۔ مہر النساء کی پیدائش کے بعد اچانک قافلے والوں کو پتہ چلا تھا کہ نوزائیدہ بچی کا باپ بیج لکھنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ انہوں نے اچانک اپنے اور اپنے اعزہ اور احباب کے بیج لکھوانے شروع کر دیئے تھے۔ تین سے زیادہ بیج لکھوانے والے کئی افراد تھے جبکہ ایسا کوئی بھی نہیں تھا جس نے تین سے کم بیج لکھوائے ہوں..... آگرہ اس حال میں پہنچا کہ چار تھیلیاں چاندی کے سکوں سے لبا لب بھر چکی تھیں اور ایک تھیلی، جس میں سونے کے سکے تھے۔ تھوڑی ہی سی خالی رہ گئی تھی۔ آگرہ پہنچنے سے قبل دو پڑاؤ اور پڑ جاتے تو شاید وہ بھی بھر جاتی۔

قافلے میں ملک مسعود نامی ایک تاجر بھی تھا۔ اس نے اعزہ واقارب کو تحفے میں دینے کے لئے ان کے ناموں کے گیارہ بیج لکھوائے تھے اور ہر بیج کے لکھوانے کا معاوضہ نصف اشرفی دیا تھا۔ پورے قافلے میں وہ واحد شخص تھا۔ جس کی انگلیوں کے پوروں پر چھ دائرے تھے۔ چار دائرے دائیں ہاتھ کے پوروں پر اور دو دائرے بائیں ہاتھ کے پوروں پر آگرے سے ایک منزل پہلے اس نے غیاث مرزا سے اس کے سفر کا مقصد پوچھا۔

قسمت آزمائی کے لئے آگرہ جا رہا ہوں۔ غیاث مرزا نے بتایا۔ ہوسکتا ہے دربار تک رسائی ہو جائے۔ رسائی نہیں ہوئی تو کاغذ قلم لے کر کسی سڑک کے کنارے بیٹھ جاؤں گا، اللہ نے فن عطا فرمایا ہے۔ اس کی بدولت دو وقت کی روٹی مل ہی جائے گی۔

قیام کہاں کرو گے۔

فی الحال تو کسی سرائے میں ٹھہر جاؤں گا پھر کوئی چھوٹا موٹا گھر کرائے پر لے لوں گا۔

دارالخلافہ میں تمہارا کوئی عزیز یا دوست نہیں ہے۔

جی نہیں.....!

ملک مسعود مسکرانے لگا۔ سنو مرزا جی.....! اس نے کہا۔ آگرے کے بارے میں تم نے جو توقعات قائم کی ہیں وہ محض سنی سنائی باتوں تک محدود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سے آگرے کو پایہ تخت بنایا گیا ہے۔ کرائے کے مکانوں کا کال پڑ گیا ہے۔ دنیا بھر کے لوگ یہاں کھنچے چلے آ رہے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ ابتر حالت سراؤں کی ہے۔ ایک ایک چارپائی کے لئے بھٹیاروں کے آگے ہاتھ جوڑنا پڑتے ہیں۔ تم تو ماشاء اللہ کئی افراد ہو۔ کھینچ تان کر بھی کم سے کم تین چارپائیوں کی ضرورت پڑے گی۔ بے پردگی الگ ہوگی اور بچوں کی دیکھ بھال بھی صحیح

طور پر نہیں ہو سکے گی۔

تاجر نے آگرے کا کچھ ایسا نقشہ کھینچا کہ غیاث مرزا کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ پریشان ہو کر بولا پھر کیا کروں۔ وطن واپس چلا جاؤں۔

کوئی دوسرا شخص ہوتا تو میں اسے واپسی ہی کا مشورہ دیتا۔ ملک مسعود نے کہا۔ لیکن نہ جانے کیوں تم سے کچھ عجیب سا انس ہو گیا ہے۔ اتنی صعوبتیں جھیل کر یہاں تک پہنچے ہو اس کا کوئی نہ کوئی پھل تو تمہیں ملنا ہی چاہئے۔ نا مناسب نہ سمجھو تو میرے اہل خانہ کے ساتھ کچھ دنوں قیام کرو۔ کوشش کروں گا کہ تم دربار تک پہنچ جاؤ۔ باقی تمہاری قسمت۔ بادشاہ فن کا قدرداں ہے، ممکن ہے تمہارے دن پھر جائیں۔

ملک مسعود کی پیشکش پر غیاث مرزا کے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ اس نے اس کے ہاں ٹھہرنے اور اس کی وساطت سے دربار اکبری میں جانے پر آمادگی ظاہر کر دی۔

آگرہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ ملک مسعود نے دارالخلافے کے بارے میں کسی قسم کی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا تھا.....اور یہ بھی معلوم ہوا کہ افراتفری کے اس دور میں بھی دنیا نیک دل اور مخلص افراد سے خالی نہیں ہوئی تھی۔ ملک مسعود نے غیاث مرزا کے بیوی بچوں کو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ٹھہرایا اور خود مردانے میں غیاث مرزا کے ساتھ ٹھہرا اور جب تک غیاث مرزا کو دربار تک نہیں پہنچایا۔ سکون کا سانس نہیں لیا۔

☆

یہ جو ہم قصے کہانیوں میں پڑھتے ہیں کہ ایک معمولی سا لکڑہارا بادشاہ کے دربار میں پہنچ گیا یا ایک غریب ضعیفہ دربار میں گھس کر بادشاہ کو کھری کھری باتیں سنا آئی۔ حقیقت سے اس کا کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ بادشاہ تک جانا کبھی اور کسی بھی دور میں آسان نہیں تھا۔ دربانوں اور محافظوں کی جیب گرم کرنا پڑتی تھی۔ امراء کے گھروں کی خاک چھاننا ہوتی تھی۔ حلف اٹھائے جاتے تھے کہ کسی کی شکایت کرنا مقصود نہیں ہے۔ مقربین شاہ کی خوشامدیں کی جاتی تھیں کہ وہ بادشاہ سے متعارف کرا دیں۔ ان منازل سے گزر کر منزل پار کرنا ہوتی تھی۔ جس میں بادشاہ کے سامنے جانے، مجرا بجالانے۔ ادب کے ساتھ دھیمی آواز میں بولنے اور بادشاہ کی طرف پشت نہ کرنے کی کم وبیش ایک ہفتے تک تربیت دی جاتی تھی.....اور اتنی جان جوکھوں کے باوجود کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ بادشاہ کو دیکھتے ہی اس کے حضور پیش ہونے والے کی سٹی گم ہو جاتی، پسینے آ جاتے، منہ سے آواز ہی نہ نکلتی۔ بادشاہ نفرت و حقارت سے دوسری طرف منہ پھیر لیتا۔ غلام وخدام پیش ہونے والے کو ڈنڈا ڈولی کر کے باہر لے جاتے اور باہر جا کر خوب کھری کھری سناتے۔

ملک مسعود نے کسی لالچ سے نہیں، محض مروت واخلاص کے باعث دل کھول کر رقم خرچ کی۔ بیربل جیسے مقرب درباری کو بیش قیمت تحائف دے کر رام کیا۔ اپنی نگرانی میں بادشاہ کے حضور پیش ہونے کے آداب کی تربیت دلوائی اور تربیت دینے والوں کو معقول قسم کا معاوضہ دیا۔

اللہ اللہ کر کے تقریباً دو ماہ بعد دربار میں جانے کی اجازت ملی۔ اجازت ملتے ہی غیاث مرزا کی حالت غیر ہو گئی۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ پوری رات نیند نہیں آئی۔ دربار میں جانے کا وقت آیا تو ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے اور ڈر لگ رہا تھا کہ کوئی گستاخی اور بے ادبی نہ ہو جائے۔ ملک مسعود تسلی دلاسہ نہ دیتا اور ہمت نہ بندھاتا تو دربار میں جانے کے بجائے غیاث مرزا ایران واپس جانے کو زیادہ ترجیح دیتا۔

دربار میں اس کی ترجمانی کے سارے کام بیربل نے انجام دیئے۔ غیاث مرزا تعظیمی سجدہ کر کے اور سات بار فرشی آداب بجالا کر خاموش کھڑا رہا۔ بیربل نے وہ بیج اور طغرے دکھائے جو غیاث مرزا نے تحریر کئے تھے۔ اکبر نے

تعریفی نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر اچانک پوچھا۔
خط شکست بھی جانتے ہو۔
کہنے والے کہتے ہیں کہ اکبر جاہل مطلق تھا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ علوم مروجہ میں اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کی تھی تاہم ذہین اتنا تھا کہ اچھے اچھے تعلیم یافتہ افراد کے کان کاٹتا تھا۔ شکستہ رسم الخط اس زمانے میں شاہی اہمیت و حیثیت کا حامل تھا اور بادشاہ کی طرف سے اسی رسم الخط میں خصوصی فرمان جاری کئے جاتے تھے۔
اکبر کے سوال پر غیاث مرزا نے تھوک نگل کر کہا۔ جانتا ہوں، عالم پناہ۔
ہمیں تمہاری تحریر کے جو نمونے دکھائی گئے ہیں ان میں خط شکست کا تو ایک نمونہ بھی نہیں ہے۔
جہاں پناہ ارشاد فرمائیں تو ابھی، یہیں لکھ کر، حضور والا کے سامنے پیش کر سکتا ہوں۔
اکبر نے خشمگیں نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر بڑبڑا کر کہا۔ جنگلی۔
اکبر کے التفات پر کسی حد تک غیاث مرزا کی جان میں جان آئی تھی۔ لیکن جونہی اکبر نے گھور کر دیکھا اور جنگلی کہا اسے ایسا معلوم ہوا گویا پیروں تلے کی زمین نکل گئی ہو۔ تربیت دینے والوں نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ بادشاہ کسی خامی اور کمزوری کی نشان دہی کرے تو فوراً ہاتھ جوڑ کر اعتراف کر لینا۔ اپنی غلطی کی تاویل کرو گے تو عتاب شاہی کے مستحق ٹھہرو گے۔
بادشاہ نے کہا تھا تحریر کے نمونوں میں خط شکست کا نمونہ نہیں ہے۔ جواب میں اپنی غلطی تسلیم کرنا تھی۔ نمونہ پیش کرنے کا دعویٰ نہیں کرنا تھا..... مگر اب پچھتانے سے کیا فائدہ، اس کی حماقت سے چڑیاں پہلے ہی کھیت چگ گئی تھیں۔ اکبر نے جنگلی کا خطاب دے کر اسے نا اہل قرار دے دیا تھا۔
اس جنگلی کو خلعت دی جائے۔ اکبر نے نجانے کس سے مخاطب ہو کر کہا۔ پھر غیاث مرزا کی طرف چہرہ کر کے بولا۔ کل سے باقاعدہ دربار میں حاضری دو۔ پھر ایسا معلوم ہوا گویا ہوا کو خطاب کر رہا ہو۔ اسے پچاس اشرفیاں دے دو۔
غیاث مرزا دربار سے اس طرح واپس ہوا کہ خوشی سے زمین پر پاؤں نہیں ٹک رہے تھے۔ خزانچی نے جو پچاس اشرفیاں دی تھیں۔ ان میں سے چالیس اشرفیاں باہر والوں نے مٹھائی کھانے کے بہانے سے اینٹھ لی تھیں مگر اسے کوئی قلق نہیں تھا۔ اس کی تسلی اور اعزاز کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ اسے دربار اکبری میں حاضری کی اجازت مرحمت فرما دی گئی۔ یہ بات تو اسے کئی روز بعد معلوم ہوئی کہ جن لوگوں کو پابندی سے دربار میں حاضر ہونے کے لئے کہا جاتا تھا انہیں ماہانہ مشاہرہ بھی ملتا تھا جو چالیس اشرفیوں سے کم نہیں ہوتا تھا۔ منصب دار مقربین سمجھے جاتے تھے اور اپنے اپنے منصب کے مطابق تنخواہ پاتے تھے۔ سب سے بڑا منصب ہفت ہزاری تھا جو شہزادہ سلیم کو تفویض کیا گیا تھا۔ منصب داروں کو ذاتی فوج رکھنے کی بھی اجازت تھی۔ سب سے بڑی فوج شہزادہ سلیم کی تھی جو چالیس ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔
اکبر نے غیاث مرزا سے کبھی کوئی فرمان تحریر نہیں کرایا۔ فرمان تحریر کرنے والے تین خوش نویس پہلے ہی موجود تھے۔ اس کا کام محض اتنا تھا کہ دربار کی آخری صف میں ادب سے بیٹھا رہے اور ماہ بماہ کھنکتے سونے کی چالیس اشرفیاں وصول کر لیا کرے۔ کچھ درباریوں کا کہنا تھا کہ حفظ ماتقدم کے طور پر اس کی تقرری عمل میں آئی ہے۔ کاتب اور محرر اچانک بیمار پڑ جائیں یا کسی غیر معمولی افتاد کے باعث دربار میں نہ پہنچ سکیں اور جہاں پناہ کو کوئی ضروری فرمان تحریر کرانا ہو تو اس کی خدمات حاصل کی جائیں گی۔ مگر بیربل کہتا تھا۔ تم نے ان داتا کے

جود وسخا کی تعریفیں سن کر ایران سے آگرے تک کا طویل ترین سفر کیا ہے۔ ان داتا نے مناسب نہیں سمجھا کہ تمہیں مایوس کیا جائے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کوئی کام نہ ہوتے ہوئے بھی تمہیں درباریوں میں شامل کرلیا ہے۔

کچھ ہی دنوں میں غیاث مرزا نے ذاتی مکان خرید لیا۔ دل سے وہ مہرالنساء کی خوش بختی کا قائل ہو چکا تھا جو گھٹنوں چلنے لگی تھی۔ اس کی پیدائش سے پہلے وہ گدا گر نہیں تھا تو گداگروں سے بہتر بھی نہیں تھا۔ ادھر وہ دنیا میں آئی اور ادھر غیاث مرزا کی دنیا ہی بدل گئی۔ اس نے تو کبھی بھول کر بھی نہیں سوچا تھا کہ اکبر کے دربار میں خود کو پائے گا اور دیکھتے ہی دیکھتے آگرے جیسے شہر میں جہاں رہائشی مکانات کی قیمتیں آسمان سے باتیں کررہی تھیں۔ ایک معقول قسم کے مکان کا مالک ہوجائے گا۔

مہرالنساء تین سال کی ہوئی تو اچانک اکبر نے اسے بندوقوں کے ایک کارخانے کا منتظم بنادیا۔ عزت بھی بڑھی اور تنخواہ میں بھی اضافہ ہوا۔ مہرالنساء سات سال کی ہوئی تو اسے دیوان بیوقات یعنی آگرے سے دہلی تک کے سارے اسلحہ کے کارخانوں کا منتظم مقرر کردیا گیا۔ یہ عہدہ وزیر کے عہدے کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ تنخواہ بھی وزیر جتنی ہی ملتی تھی فرق صرف اتنا تھا کہ وزیر فوج رکھ سکتا تھا۔ دیوان کو فوج رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ تاہم دس سے پچیس تک ذاتی ملازم اور محافظ اپنی اور اپنے اہل خانہ کی خدمت اور حفاظت کے لئے رکھنے پر کوئی قدغن نہیں تھی۔

ملک مسعود نے غیاث مرزا پر جو احسان کیا تھا اسے اس نے کبھی نہیں بھلایا۔ جن دنوں وہ دیوان بیوقات ہوا کرتا تھا ملک مسعود نے داعی اجل کو لبیک کہا اور دو بیویاں اور نو بچے بچیاں چھوڑیں۔ غیاث مرزا نے دونوں بیواؤں کا سو سو اشرفیاں اور ہر بچے کا دس دس اشرفیاں ماہانہ وظیفہ مقرر کردیا جو تادم آخر جاری رہا۔ حالانکہ غیاث مرزا پر کڑا وقت بھی پڑا اور تقریباً چھ ماہ تک وہ زیر عتاب رہا لیکن کیا مجال ملک مسعود کی بیواؤں اور بچوں کے وظائف میں ایک دن کی بھی دیر ہوئی ہو۔

غیاث مرزا شروع ہی سے سخی تھا۔ دن پھرے تو سخاوت میں چار چاند لگ گئے۔ سخاوت اس حد تک بڑھی کہ فضول خرچی میں شمار ہونے لگا۔ جو کماتا، دونوں ہاتھوں سے لٹادیتا۔ غلاموں اور کنیزوں کو خریدنے اور خریدتے ہی انہیں آزاد کردینے میں اسے خاص لطف آتا تھا۔ اسی سخاوت یا فضول خرچی نے اسے تنگ دست بنادیا۔ وزیر جتنی تنخواہ پانے کے باوجود تنخواہ کم لگنے لگی۔ بھرم قائم رکھنے کے لئے ماتحتوں سے رشوت لینا شروع کردی لیکن تابکے.....! سودن چور کے تو ایک دن شاہ کا۔ مخبری ہوئی۔ عزت بھی گئی۔ عہدہ بھی گیا۔ اکبر نے بیوی بچوں سمیت آگرے سے کوسوں دور بہار کے صوبے میں پھنکوادیا۔

اکبر کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ مجرم کو سخت سزا دیتا تھا اور بعد میں کڑھتا تھا کہ اتنی سخت سزا کیوں دی۔ حقیقت میں وہ جرم کا دشمن تھا لیکن مجرم کو بہرحال انسان ہی سمجھتا تھا۔ ایک بار نہیں، کئی بار اس نے متعلقہ محکموں کے سربراہوں سے کہا تھا جرم کا قلع قمع کردو، مجرم از خود ختم ہوجائیں گے۔ یہ ایسی منطق تھی جو مشکل ہی سے سمجھ میں آتی تھی۔ تاہم اسی اصول کا نتیجہ تھا کہ اگرچہ پورے ملک میں قید خانوں کا جال پھیلا ہوا تھا لیکن قیدی خال خال ہی تھے۔ سب سے بڑا قید خانہ دہلی کا تھا اس پر متعین عملے کی تعداد پونے دو سو تھی جبکہ قیدیوں کی تعداد پورے اکبری دور میں کبھی ایک سو تک بھی نہیں پہنچی۔ حکام چوکس تھے۔ چوری یا قتل یا کوئی اور جرم ہی نہیں ہونے دیتے تھے۔ پھر چور یا قاتل یا دوسرے جرائم میں ملوث افراد کہاں

سے آتے۔

غیاث مرزا کے ساتھ بھی کم وبیش ایسا ہی سلوک کیا گیا۔ رشوت خوری ختم کرنے کے لئے اس کی جلاوطنی ضروری تھی۔ دوسرے رشوت خوروں کے بھی کان کھڑے ہوگئے دیوان کے ساتھ یہ سلوک ہے تو ہمارے ساتھ تو نہ جانے کیا سلوک ہوگا۔ ادھر اکبر نے غیاث مرزا کو بیوی بچوں سمیت انتہائی کسمپرسی کے عالم میں آگرے سے نکالا اور ادھر حاکم بہار کے پاس ہرکارہ دوڑایا کہ غیاث مرزا زیادہ عرصے تک پریشان اور تباہ حال نہ رہنے پائے، جونہی یہ محسوس کرو کہ اس کے ہوش ٹھکانے آگئے ہیں اور اب وہ کبھی رشوت کے قریب نہیں پھٹکے گا اسے کوئی معقول قسم کی ملازمت دے دینا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پٹنہ پہنچے ہوئے دس دن بھی نہیں گزرے تھے کہ حاکم بہار نے غیاث مرزا کو طلب کیا اور بتایا کہ اس شرط پر کہ آئندہ کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جو قانون کی نظروں میں جرم ہو، اسے تحصیلدار مقرر کیا جاتا ہے۔

غیاث مرزا بہت ذہین اور زیرک انسان تھا۔ مہرالنساء گیارہ سال کی ہوگئی تھی اور اسی لحاظ سے اکبر کے شاہی مزاج کو سمجھنے میں غیاث مرزا کو بھی تقریباً اتنے ہی سال گزر گئے تھے۔ سمجھ گیا کہ بظاہر حکم حاکم بہار نے دیا ہے لیکن پس پردہ اکبر ہے۔ اس کی ایما کے بغیر حاکم اتنا بڑا قدم ہرگز نہیں اٹھا سکتا تھا، اٹھاتا تو باغی ٹھہرتا۔

حقیقت حال کو سمجھتے ہی حوصلہ بڑھ گیا۔ جیسے تیسے دو چار روز گزارے کہ مزید اطمینان کرے۔ پھر بیوی سے کہا۔ بڑے بیٹے آصف خاں کے ہمراہ آگرے جاؤ اور نور چشمی مہرالنساء کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ اور سلام کرنے کے بہانے مہارانی جودھا بائی سے ملو اور ان سے کہو کہ وہ شہنشاہ سے سفارش کرکے مجھے ایک بار پھر آگرہ بلوالیں۔

بیوی بولی۔ کہتے تو ٹھیک ہو۔ مہارانی کو رام کرنا میرے دائیں ہاتھ کا کام ہے۔ وہ رام ہوگئیں تو سمجھو شہنشاہ رام ہوگئے لیکن مہرالنساء کو لے جانا کیا ضرور ہے۔ ہزار کوس کا سفر ہے۔ بیچاری ہلکان ہوجائے گی۔ اسے تو یہیں رکھو۔ آگرہ جانے کی اجازت مل جائے تو اپنے ساتھ ہی لے آنا۔

مہرالنساء کا تمہارے ہمراہ جانا اس لئے ضروری ہے کہ تمہاری چرب زبانی اور منت وسماجت جو کام انجام نہیں دے سکے گی، اسے اس کی انگلیوں کے پورے انجام دیں گے۔

مہرالنساء کی انگلیوں کے پورے۔ بیوی نے پوچھا۔ کیا کہہ رہے ہو۔

اتنی جلدی بھول گئیں۔ مہرالنساء کی پیدائش کے بعد قافلے کی ایک عورت نے اس کی انگلیوں کے پوروں والے دائرے دیکھ کر کیا کہا تھا۔

کیا کہا تھا۔

اس نے کہا تھا۔ ہماری بیٹی جس کی جانب ہاتھ اٹھادے گی، وہ سرنگوں ہوجائے گا۔

نہیں اس نے تو صرف یہ کہا تھا کہ مہرالنساء راج کرے گی اور راج کرائے گی۔

راج وہی کرتے اور کراتے ہیں، جن کے آگے دنیا سرنگوں ہوتی ہے۔ غیاث مرزا نے سمجھایا۔ اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ مہرالنساء کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔

بیوی نے شوہر کی ادہام پرستی کا خوب مذاق اڑایا لیکن دل سے وہ بھی اس بات کی قائل تھی کہ سارے اللے تللے بیٹی کی خوش بختی ہی کہ بدولت ہیں اور ان لوگوں پر جو مصیبتیں آتی ہیں وہ بیٹی ہی کی برکت سے دور ہوجاتی ہیں۔

بڑا بیٹا آصف خاں بنگال میں فوجی عہدے پر فائز تھا۔ اسے پٹنہ بلایا گیا اور باپ کے حکم پر وہ ماں اور بہن کو

آگرے لے گیا۔

آگرے میں ماں بیٹی قلعہ میں گئیں۔ پائیں باغ میں جودھابائی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ بیٹی، مہارانی اور ماں کو باتیں کرتا چھوڑ کر فوارے سے ابلتی ہوئی پھوار سے لطف اندوز ہوتی اور حیرت کرتی دوسری طرف جا کھڑی ہوئی۔ جہاں کبوتروں والا وہ واقعہ پیش آیا۔ جس کا آغاز میں ذکر ہو چکا ہے۔ اسی رات مہارانی نے خلوت میں غیاث مرزا کی سفارش کی اور اگلے روز ایک مختصر سے شاہی فرمان کے ذریعہ غیاث مرزا کو نہ صرف معاف کر دیا گیا بلکہ اس کی وہ جائیداد جو بحق سرکار ضبط ہو گئی تھی ،واگزار کر دی گئی اور اسے دوبارہ شاہی کارخانوں کا دیوان بنا دیا گیا۔

شہزادہ سلیم بہترین جمالیاتی ذوق رکھتا تھا۔ مہرالنساء کے غیر معمولی حسن سے متاثر ہونا قدرتی بات تھی۔ جودھابائی دور اندیشی سے کام نہ لیتی تو شہزادہ نہ جانے کیا کچھ کر گزرتا۔ مایوس ہو کر اس نے مہرالنساء کو فراموش کر دیا..... ہاں، کہنے والے یہی کہتے ہیں کہ شہزادہ مہرالنساء کو بھول گیا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ پہلی ہی ملاقات میں مہرالنساء نے اس کے دل میں کچھ اس طرح گھر کیا تھا کہ نکالے نہیں نکلی۔ کبھی کبھی دو آتشہ کے نشے کی ترنگ میں وہ اپنے قریبی دوست بختیار سے کہا کرتا تھا۔ بڑی بڑی طرح دار حسین لڑکیاں دیکھی ہیں لیکن مہرالنساء جیسا حسن کہیں نہیں دیکھا۔ تم یقین نہیں کرو گے کہ اس کے حسن کے سامنے چاندنی پھیکی ہے اور اس کی مترنم آواز کے مقابلے میں جھرنوں کی موسیقی بے سری ہے اور جب وہ ہنستی ہے تو بجلیاں گراتی ہے۔

اور ایک بار اس نے بختیار سے کہا۔ اگر کوئی شخص کہے کہ اپنی ساری دولت مجھے دے کر کشکول گدائی اٹھانے اور بھیک مانگنے پر راضی ہو جاؤ تو میں تمہیں مہرالنساء کے پاس پہنچا سکتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میں فوراً اس کی بات مان لوں گا اور پھر بھی یہی سمجھوں گا کہ بہت ہی سستا سودا ہوا ہے۔ مہرالنساء چیز ہی ایسی ہے بختیار۔ اس کو اپنانے کے لئے دونوں عالم قربان کئے جا سکتے ہیں۔

غیاث مرزا کی طرح علی قلی استجلو بھی طالع آزمائی کے لئے ہندوستان آیا۔ سلسلہ نسب رستم و زال تک پہنچتا تھا۔ شمشیر زنی میں بیک وقت درجن بھر افراد سے مقابلہ کرتا، تلوار اتنی تیزی سے چلتی کہ نظر ہی نہیں آتی۔ برق کا ایک ہالا سا بن جاتا جو چہار اطراف چمکتا ہوا نظر آتا تھا۔

تکلیف اسے ایران میں بھی نہیں تھی۔ شاہی دستے کا سردار تھا۔ تنخواہ اچھی خاصی ملتی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اسے ہر طرح کا آرام و سکون حاصل تھا تو اس نے اچھی بھلی شاہی ملازمت چھوڑ کر ہندوستان کا رخ کیوں کیا۔ اور جواب اس کا یہ ہے کہ ایران کا شمار دنیا کی گنی چنی بڑی طاقتوں میں ہوتا تھا۔ ہر طرف دھاک بیٹھی تھی۔ کسی ہما شما کی ایران پر حملہ کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ ماضی میں جن احمقوں نے یہ غلطی کی تھی۔ انہیں ایران کی بہادر افواج نے چیونٹیوں کی طرح روند ڈالا تھا۔ دنیا کی عظیم تر طاقت ہونے کے باوجود ایران کے حکمراں امن پسند واقع ہوئے تھے اور جیو اور جینے دو کے اصول پر عمل پیرا تھے۔ دوسرے حکمراں ایران کی طاقت سے خائف ہونے کے باعث حملہ کرتے ہوئے ڈرتے تھے تو خود ایرانیوں کی امن پسندی انہیں دوسروں پر حملہ کرنے سے روکتی تھی۔ بہادر سپاہی میدان جنگ کی گھن گرج کے عادی ہوتے ہیں۔ دشمن کے خون کو بہتا دیکھ کر روح کو بالیدگی نصیب ہوتی ہے۔ دوران جنگ بہادروں کو اپنے اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملتا ہے..... لیکن ایران کی امن پسندی اور دوسروں کی بزدلی کے باعث ایرانی

فوجیں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھیں۔ ہتھیاروں ہی کو نہیں صلاحیتوں کو بھی زنگ لگ رہا تھا۔

اس کے برعکس ہندوستان میں روزانہ سر پھٹول ہوتی رہتی تھی۔ کہیں بغاوت کا قلع قمع کیا جارہا ہے۔ کہیں خراج کی بازیابی کے لئے چڑھائی ہورہی ہے۔ کہیں کسی نئی ریاست کو مملکت میں شامل کیا جارہا ہے غرضیکہ روزانہ کہیں نہ کہیں تلواروں کی بجلیاں کوندتی ہی رہتی تھیں۔ سپاہیوں کو مرہم پٹی کرنے اور تلوار کو میان میں ڈالنے کی بمشکل تمام تھوڑی سی مہلت ملتی تھی کہ کوئی نہ کوئی، چھوٹا یا بڑا معرکہ پیش آجاتا تھا۔ رستم وزال کی نسل سے تعلق رکھنے والے علی قلی استجلو کے لئے ایران کی غیر معمولی طاقت اور ضرورت سے زیادہ امن پسندی دونوں ہی سم قاتل تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کرنے اور اپنی شجاعت کا لوہا منوانے کے لئے اس نے ہندوستان کا رخ کیا اور شاہی ملازمت چھوڑ چھاڑ آگرے پہنچ گیا۔

آگرے میں متعدد ایرانی مقیم تھے۔ انہی میں سے کسی ایک کی وساطت سے علی قلی دربار اکبری میں جانا چاہتا تھا۔ خوش قسمتی سے دوسرے ہی روز غیاث مرزا سے ملاقات ہوگئی۔ وطن سے باہر جب ہم وطن ملتے ہیں تو اس طرح ملتے ہیں گویا ایک ہی ماں کے بیٹے ہوں۔

غیاث مرزا اور علی قلی کی کوئی سابقہ شناسائی نہیں تھی لیکن ہم وطن ہونے کا اتنا گہرا رشتہ تھا کہ غیاث مرزا اسی روز علی قلی کو سرائے سے اپنے گھر لے آیا۔ رات کے کھانے کے بعد اس نے علی قلی سے آگرہ آنے کا مقصد دریافت کیا۔ علی قلی نے بتایا کہ وہ اکبر کی فوج میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ غیاث مرزا نے کہا۔ اکبر کنجوس ہے۔ کم تنخواہ دیتا ہے۔ شہزادہ سلیم کا ہاتھ کھلا ہوا ہے۔ کہو تو اس سے تمہاری سفارش کروں۔

شہزادہ سلیم کو کوئی علم نہیں تھا کہ غیاث مرزا اس لڑکی کا باپ ہے جو اس کے دل و دماغ پر اپنے حسن کا کبھی نہ مٹنے والا نقش چھوڑ گئی ہے۔ علم ہوتا تو جس وقت غیاث مرزا اپنے ہم وطن نوجوان کو لے کر اس کے پاس پہنچا وہ درخواست وصول کرنے کے بجائے خود درخواست دینے پر تیار ہوجاتا اور جب تک غیاث مرزا ہاں نہ کہتا۔ اس کے قدموں کو نہ چھوڑتا۔

علی قلی جوان تھا، حسین تھا، فنون سپہ گری میں مہارت رکھتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایران سے تعلق رکھتا تھا۔ بابر اور ہمایوں کی جس طرح ایران نے مالی اور فوجی امداد کی تھی اس کے لئے سارے مغل دل کی گہرائیوں سے سپاس گزار تھے۔ کوئی وجہ نہیں تھی کہ غیاث مرزا کی سفارش قبول نہ کی جاتی۔

علی قلی کو شہزادہ سلیم کی فوج میں انتہائی مناسب مشاہرے پر کمان دار کا عہدہ حاصل ہوگیا۔ بعد میں اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بدولت علی قلی سپہ سالار کے رتبے تک پہنچا اور شہزادے کی ناک کا بال سمجھا جانے لگا۔

شیرنی اور ناگن میں ایک قدر مشترک ہے۔ دونوں اپنے نر سے بے انتہا محبت کرتی ہیں اور اگر کوئی ان کے نر کو ماردے تو انتقام کی آگ سے جل اٹھتی ہیں۔ انتقام کے سوا کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ مارنے والے کا شہر تک پیچھا کرتی ہیں اور یا تو انتقام لینے میں کامیاب ہوجاتی ہیں یا انتقام لینے کی کوشش کرتی ہوئی ماری جاتی ہیں۔

شہزادہ سلیم کو شکار کا کبھی شوق نہیں رہا۔ حسن و شراب کا رسیا تھا اور اکثر اپنے مورث اعلیٰ کا مصرعہ پڑھ کر کہ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرتا رہتا تھا لیکن بہرحال ولی عہد تھا۔ ولی عہد کی بے شمار ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری یہ بھی تھی کہ وہ ملک کے حالات و واقعات سے بخوبی واقف رہے۔ واقفیت کے کئی طریقے تھے۔ طول و عرض سے پرچہ نویس تازہ ترین

خبریں بہم پہنچاتے تھے۔ مخبروں کے پاس سے اطلاعات موصول ہوتی رہتی تھیں کہ رعایا کس انداز میں سوچ رہی ہے۔ مختلف علاقوں سے آنے والے مسافر اپنے اطراف کا حال بیان کرتے تھے..... اسی ضمن میں ایک طریقہ سیر و شکار کا تھا۔ سیر و شکار تو بہانہ ہوتا تھا۔ دراصل اس بہانے کسی مخصوص خطے کی واقفیت مقصود ہوتی تھی۔ بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوجاتی تھیں جن کا مذکور پرچہ نویس کرتے تھے۔ نہ مخبران کے بارے میں کچھ بتاتے تھے۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ کانوں سنی اور آنکھوں دیکھی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔

بہار کا علاقہ ان دنوں انتہائی حساس تھا۔ دور ہمایوں میں شیر شاہ نے اسی علاقے سے سر اٹھایا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے ملک پر قابض ہوگیا تھا۔ اکبر کے دور میں بھی وہاں سے بغاوت کی خبریں آتی رہتی تھیں لیکن وہ اپنی حکمت عملی سے ہمیشہ باغیوں کو کچلتا یا خریدتا آیا تھا..... اور جیسا کہ اوپر عرض کیا پرچہ نویسوں اور مخبروں سے زیادہ وہ آنکھوں دیکھی کو ترجیح دیتا تھا۔ کبھی خود کسی بہانے بہار چلا جاتا اور وہاں کے حالات کا جائزہ لیتا اور کبھی ولی عہد کو خصوصی ہدایات دے کر کسی تقریب میں شرکت کے لئے بہار بھیج دیتا۔

مغلوں کے دور کا پٹنہ آج کے پٹنہ سے بالکل مختلف تھا۔ آج تو وہاں کے چپے چپے پر آبادی ہے۔ کوئی غیر آباد یا ویران و سنسان علاقہ نظر نہیں آتا جبکہ کل کا پٹنہ تین اطراف سے جنگلوں میں گھرا ہوا تھا۔ جن میں بھانت بھانت کے بکثرت خونخوار جانوروں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔

کچھ مرہٹوں نے اپنا صدر مقام چھوڑ کر بہار کو مستقر بنایا تو اکبر نے ولی عہد بیٹے کو حکم دیا کہ وہ سیر و شکار کے بہانے بہار جائے اور مرہٹوں کو وہاں سے نکال باہر کرے۔ شہزادہ سلیم نے سر تسلیم خم کردیا اور اگلے ہی دن اس کا قافلہ عازم بہار ہوگیا۔ قافلہ تیس ہزار جاں باز سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ جن کی قیادت علی قلی کررہا تھا۔

بہار میں مقیم مرہٹوں کو جو اپنی دانست میں بہت خاموشی سے باغی فوجوں کو ترتیب دینے میں مصروف تھے اطلاع ملی کہ شہزادہ سلیم تیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ سیر و شکار کے لئے بہار آرہا ہے۔ سمجھ گئے کہ اب وہ بچ نہیں سکیں گے۔ پیٹھ پیچھے سے وار کرنے والے سامنے آنے کی جرات کس طرح کرسکتے تھے۔ جس کا جدھر سر اٹھا ادھر ہی بھاگ کھڑا ہوا۔ شاہ گنج کی منزل پر شہزادے کو مرہٹوں کے فرار کی خبر ملی مگر اس نے ظاہر یہی کیا کہ بہار کا سفر تو محض سیر و شکار کے لئے کیا گیا ہے اور اپنا سفر جاری رکھا۔

بہار کی سیر میں اس کی معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوا۔ خاص طور پر بودھ مت کی آگہی ہوئی اور ان کی اہم اور قدیم عبادت گاہیں دیکھنے کو ملیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بہار کے باشندے اپنے طور پر امن پسند ہیں اور خواہ مخواہ لڑنے جھگڑنے سے گریز کرتے ہیں..... تاہم کسی سے ٹھن جائے تو پیچھے بھی نہیں ہٹتے، مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔ انہوں نے مغلوں کی حکومت کو نہ صرف دل سے تسلیم کرلیا تھا بلکہ اس کے صحیح معنی میں وفادار بھی تھے۔ مرہٹے ہی نہیں دنیا کی کوئی بھی قوم ان کی وفاداری کو کسی بھی قیمت پر خرید نہیں سکتی تھی۔

سیر و تفریح کے بعد شکار کی باری آئی۔ پٹنہ کے صوبے دار نے شکار کا انتظام کیا اور خاص طور پر ایک ایسا نواحی جنگل منتخب کیا جہاں قدرے کم خونخوار جانور تھے۔

شہزادہ ایک درخت کی مچان پر سارے مروجہ ہتھیاروں سے لیس جن میں توڑے دار طپنچہ بھی تھا لیس ہوکر بیٹھا۔ ہانکے والوں نے شور مچا کر اور ڈھول بجا کر ایک شیر کو مچان کی سمت بھگایا۔ ہانکا رات کے تین پہر تک جاری رہا۔ چوتھے اور آخری پہر میں پریشان حال شیر مچان کی طرف آیا۔ شہزادے نے طپنچہ داغا پھر اس کے جسم کو تیروں سے

پرودیا اور جب دیکھا کہ شیر دم توڑ رہا ہے تو تلوار لے کر مچان سے نیچے کودا اور ایک ہی وار میں اس کی گردن اڑا دی۔

وہ انتہائی فخر و غرور کے ساتھ مچانوں پر بیٹھے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ ایک بھیانک چنگھاڑ نے پورے جنگل کو لرزا دیا۔ شیرنی اپنے شیر کا انتقام لینے آ پہنچی تھی اور اگرچہ شہزادے نے تلوار سونت کر اس کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی تھی پھر بھی مچانوں میں بیٹھا ہوا ہر شخص اچھی طرح سے جانتا تھا کہ شہزادہ شیرنی کے انتقام سے بچ نہیں سکے گا۔

اسی لمحے مچان سے ایک نوجوان نیچے کودا۔ شیرنی بپھرے ہوئے انداز میں اپنی اگلی ٹانگوں سے زمین کو ادھیڑتے ہوئے شہزادے پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہی تھی۔ نیچے کودنے والے نوجوان نے شیرنی کو للکارا۔ شیرنی کا رخ بدل گیا۔ اس نے غراتے ہوئے زمین میں پنجے گاڑ دیئے جبکہ دوسری جانب علی قلی نے پینترے بدل بدل کر تلوار کو ہوا میں لہرانا اور ہر پینترے پر یا علی کا نعرہ لگانا شروع کر دیا۔ جاں نثاروں نے چاہا کہ وقت سے فائدہ اٹھائیں اور جس طرح بھی بن پڑے شہزادہ سلیم کو کسی مچان پر کھینچ لیں مگر شہزادے نے مچان پر جانے سے انکار کر دیا اور تلوار سونتے ہوئے کھڑا رہا۔ تاہم اس نے علی قلی کی طرح شیرنی کو للکار کر اپنے اوپر حملہ کرنے کی دعوت نہیں دی۔

بپھری ہوئی شیرنی اچانک کئی قدم پیچھے ہٹی۔ پھر وہ برق رفتاری سے بھاگی، زوردار چنگھاڑ مار کر چھلانگ لگائی اور پینترے بدلتے ہوئے علی قلی پر جا گری۔ علی قلی چند لمحوں کے لئے نظروں سے اوجھل ہو گیا اور کچھ ایسا لگا گویا کچھ دیر قبل پنجوں سے زمین ادھیڑنے والی شیرنی علی قلی کے جسم کو ادھیڑ رہی ہو لیکن اگلی ہی ساعت اس کے منہ سے ایسی خوفناک آواز نکلی جیسے وہ غرارہ کر رہی ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پیٹھ کے بل ایک طرف کو لڑھک گئی اور اس کے نیچے سے خون میں نہایا ہوا علی قلی برآمد ہوا۔ جس نے وقت ضائع کئے بغیر شیرنی کے سر کو دولخت کر دیا۔ علی قلی کا لباس تار تار ہو چکا تھا اور شیرنی نے پنجہ مار کر اس کی دائیں ران سے گوشت کا خاصا بڑا ٹکڑا نوچ لیا تھا لیکن اس عالم میں بھی علی قلی نے ہمت نہیں ہاری اور جونہی شیرنی نے اسے دبوچا۔ اس نے پوری طاقت سے اس کا پیٹ چاک کر کے خنجر کی انی شیرنی کے دل میں اتار دی۔ ایک لمحے کے لئے بھی سراسیمہ ہوتا تو شیرنی کا اگلا تھپڑ اس کی گدی پر پڑ کر گردن کا منکا توڑ دیتا۔

اپنے اور شیرنی دونوں کے لہو میں نہائے ہوئے علی قلی کی فوری طور پر مرہم پٹی کی گئی۔ شہزادہ سلیم نے اس کے زخمی کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھا اور مسکرا کر کہا۔ ہم تمہیں شیر افگن کا خطاب دیتے ہیں۔

علی قلی کا سیروں خون بہہ چکا تھا۔ تکلیف و نقاہت سے آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں پھر بھی اٹھ کھڑا ہوا اور جیسا کہ اظہار تشکر کا دستور تھا، اسی طرح آداب بجا لایا۔ شہزادہ اور بھی زیادہ متاثر ہوا اور بولا۔ کوئی خواہش، کوئی تمنا ہو تو بتاؤ شیر افگن۔

علی قلی کی جو شیر افگن بن چکا تھا، ایک آرزو تھی، آج کی نہیں اس وقت کی جب وہ تازہ تازہ آگرے میں وارد ہوا تھا۔ سمجھ گیا کہ آرزو پوری ہونے کی نیک ساعت آ چکی ہے لیکن کمزوری اتنی تھی کہ نیم بیہوش ہو کر قریب کھڑے ایک سپاہی کے بازو میں جھول گیا۔ غشی طاری نہ ہوتی، تب بھی آرزو کا برسر عام اظہار نہ کر پاتا تھا۔ اظہار کے لئے تخلیئے کی ضرورت تھی۔

☆

عشق کا جذبہ اتنا ہی قدیم ہے، جتنی قدیم ہماری دنیا ہے لیکن قدیم ہونے کے باوجود ہر دور اور ہر زمانے میں اسے نیا ہی سمجھا گیا ہے..... نوجوانوں کے لئے تو یہ نیا ہی

ہوتا ہے۔ نیا بھی اور اتنا سرور انگیز بھی کہ پائی جانے والی ساری شرابیں مل کر بھی عشق کی طرح مست و بے خود نہیں بنا سکتیں۔

کوئی زمانہ بھی عاشقوں سے خالی نہیں رہا۔ مغلیہ دور میں بھی عاشق پائے جاتے تھے۔ عشق کی قدریں ہر زمانے میں بدلتی رہی ہیں، مغلوں کے زمانے میں پردے کا رواج تھا اور اس حد تک تھا کہ غیر مسلم خواتین بھی لمبے لمبے گھونگھٹ نکالتی تھیں مگر عشق ضروری تھا، اس لئے اس زمانے کے لوگ لباس کی جھلک دیکھ کر یا آواز سن کر یا محض یہ معلوم کر کے کہ فلاں گھر میں نوجوان لڑکی پائی جاتی ہے، عاشق ہو جاتے تھے اور بسا اوقات نوبت خودکشی یا خون خرابے تک پہنچتی تھی۔ عشق کی شادی کم ہی ہوتی تھی کیونکہ لڑکی کے گھر والے لڑکی کو ایسے جوان کے نکاح میں دینا جو شادی سے پہلے ہی لڑکی کو دل و جان سے چاہتا ہو، باعث عار سمجھتے تھے جبکہ لڑکے والے کسی بھی قیمت پر اس لڑکی کو اپنے گھر میں لانے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے جسے ان کے لڑکے نے چاہ کر باسی کر دیا ہو۔

لڑکی کو دیکھ کر عاشق ہونے والے نوجوان نہ ہونے کے برابر تھے مگر تھے۔ اور ایسے ہی دیکھ کر عاشق ہونے والے خوش نصیب نوجوان میں علی قلی استجلو بھی تھا۔ اس نے ایک بار نہیں، دو بار مہر النساء کو دیکھا تھا۔ پہلی بار دیکھا تو دل پر بجلی گری اور اسے راکھ کر گئی۔ دوسری بار دیکھا تو دوسری بجلی گری تو دل کے آس پاس جو کچھ راکھ ہونے سے بچ رہا تھا اسے بھی راکھ کر دیا..... یہ ان دنوں کی بات ہے جب غیاث مرزا، سرائے سے نکال کر علی قلی کو اپنے گھر لے گیا اور مردان خانے میں ٹھہرایا۔ اتفاق سے اس وقت مہر النساء مردان خانے میں تھی جو باپ کی غیر موجودگی میں جھاڑ فانوس کی گرد صاف کرنے اور فرش پر نئی چاندنی بچھانے گئی تھی۔

غیاث مرزا مردان خانے کے دروازے پر رک کر کسی پڑوسی سے بات کرنے لگا۔ علی قلی سے کہا کہ وہ اندر جا کر آرام کرے۔ اندر پہنچا تو مہر النساء پائنچے چڑھائے چاندنی کی سلوٹیں درست کر رہی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا مہر النساء چیخ مار کر اس دروازے کی طرف بھاگی جو زنان خانے میں جاتا تھا۔ حسن اور اتنا بھرپور حسن علی قلی نے پہلے کہاں دیکھا تھا، یوں لگا سفید و شفاف کانچ کی ایک گڑیا کو برق سے گوندھا گیا تھا جو اس کی آنکھ کو خیرہ، دل کو زخمی اور دماغ کو ماؤف کر کے پلک جھپکتے میں غائب ہو گئی۔ کچھ دیر بعد غیاث مرزا اندر آیا تو اس نے علی قلی کو عالم بے خودی میں چاندنی کے پاس کھڑا پایا۔ علی قلی نے اس کی بیٹی پر ہزار جان سے عاشق ہونے میں ایک پل بھی ضائع نہیں کیا تھا۔ غیاث مرزا کی آمد پر علی قلی قدرے ہوش میں آیا اور مسکرانے کی ناکام کوشش کرتا ہوا اس چاندنی پر بیٹھ گیا۔ جس میں کسی کے ہاتھوں کا لمس گھلا ہوا تھا۔ غیاث مرزا نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھنے کے لئے کہا اور خود زنان خانے سے کھانے پینے کی چیزیں بھجوانے اندر چلا گیا۔ علی قلی نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ حور شمائل بیٹی کی بے پردگی کا علم غیاث مرزا کو نہیں ہوا۔ وہ دور ایسا ہی تھا بے پردگی جان بوجھ کر ہو یا انجانے میں عورتوں کے لئے سم قاتل سے کم نہیں تھی۔

غیاث مرزا کی وساطت سے شہزادہ سلیم کے پاس جانے اور ملازمت ملنے میں علی قلی کو گیارہ روز لگ گئے۔ اس دوران اس نے غیاث مرزا کے مردان خانے ہی میں قیام کیا۔ انہی دنوں کسی کا کنکوا کٹ کر مردان خانے کی چھت پر آ گرا۔ کنکووں سے علی قلی کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پڑوس کے ایک بچے نے آ کر خوشامد کی کہ وہ اسے کنکوا اتار دے۔ بچے کی درخواست پر علی قلی چھت پر گیا تو زنان خانے کی

چھت پر اسے بال سکھاتی ہوئی وہی پری پیکر ایک بار پھر دکھائی دے گئی جس نے راتوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں..... پری زاد تو اسے دیکھتے ہی رفو چکر ہوگئی لیکن علی قلی کی حالت غیر ہوگئی۔ جیسے تیسے بچے کو کنکوا تھمایا اور نیچے جا کر بستر پر ایسا گرا کہ کئی گھنٹوں تک نہیں اٹھ سکا۔

شہزادے کی فوج میں ملازمت مل گئی۔ غیاث مرزا کا مردانہ چھوڑ کر چھاؤنی میں منتقل ہوگیا لیکن ہر ممکن کوشش کے باوجود لڑکی کی تصویر کو اپنے دل سے نہ نکال سکا۔ لڑکی کا تصور اس کے لئے پیر تسمہ پا بن گیا جو سوتے جاگتے ہر وقت اس کے ذہن پر سوار ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ بات تو اسے غیاث مرزا کی زبانی ہی معلوم ہوگئی تھی کہ ایک کے علاوہ وہ اپنی ساری لڑکیوں کے فرض سے سبکدوش ہو چکا ہے۔ لڑکی کا نام نہ اسے غیاث مرزا نے بتایا نہ کسی دوسرے ذریعہ سے معلوم ہوا۔ جس ملک میں غرارے کا پائینچہ دیکھ کر عاشق ہونے کا رواج ہو وہاں محبوب کا نام معلوم نہ ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ وہ نامعلوم الاسم حسینہ کے فراق میں اندر ہی اندر گھلتا رہا۔ اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ شادی کا پیغام دیتا۔ دل میں چور تھا کہ پیام دیتے ہی بے پردگی کا راز فاش ہو جائے گا اور لڑکی ہی کی شامت نہیں آئے گی خود اسے بھی آوارہ و بدمعاش سمجھا جائے گا۔

اور تب پونے دو سال بعد پٹنہ کے جنگل میں شہزادہ سلیم نے اسے شیر افگن کا خطاب دیا اور کہا کوئی خواہش، کوئی تمنا ہو تو ہمیں بتاؤ، شیر افگن۔

اگلے روز اس نے تنہائی پا کر شہزادے سے کہا۔ غیاث مرزا نے مجھے باپ جیسی پرخلوص محبت دی ہے۔ اگر وہ مجھے اپنی فرزندی میں لے لیں تو شاید بیٹا بن کر ان کی محبت کا قرض اتار سکوں۔

اس نے شہزادے کو یہ نہیں بتایا کہ نہ صرف وہ غیاث مرزا کی بیٹی کے دیدار سے فیض یاب ہو چکا ہے بلکہ اس کے فراق میں اس کی جان پر بنی ہوئی ہے۔

کیسی عجیب بات ہے کہ شہزادہ سلیم نے بہار سے آگرہ واپس پہنچ کر اپنے حضور طلب کیا اور شیر افگن کے لئے اس لڑکی کا رشتہ مانگا جس کو حاصل کرنے کے لئے وہ خود اپنی ساری دولت و جائیداد نچھاور کرنے کو تیار تھا۔

شیر افگن جیسا ہونہار داماد مل رہا ہو اور ولی عہد جیسا عظیم المرتبت شہزادہ پیغام دے رہا ہو، غیاث مرزا اتنے بڑے اعزاز کو کیسے ٹھکرا سکتا تھا۔ اس نے فوراً آمادگی کا اظہار کر دیا۔

کہنے لگا۔ مہر النساء میری سب سے چھوٹی بیٹی ہے اور بڑی نصیبوں والی ہے۔ نصیبوں والی نہ ہوتی تو حضور والا شیر افگن کے لئے اس کا رشتہ کیوں مانگتے۔ چاند سورج کی جوڑی ہے ان دونوں کی۔

ماتھا تو شہزادہ سلیم کا اسی وقت ٹھنک گیا تھا۔ جب اس نے غیاث مرزا کے منہ سے اس کی بیٹی کا نام سنا تھا۔ غیاث مرزا اپنی خوشنودگی ظاہر کر کے چلا گیا تو شہزادے نے خواجہ سرا گلفام کو بلایا اور ضروری ہدایت دے کر غیاث مرزا کے ہاں روانہ کیا۔

خواجہ سرا گلفام نے واپس آ کر تصدیق کی۔ مہر النساء وہی لڑکی ہے جو ایک بار اپنی ماں کے ساتھ مہارانی جودھا بائی سے ملنے آئی تھی۔ کبوتر اڑانے کا واقعہ اسے ابھی تک یاد ہے۔ جس وقت وہ یہ واقعہ سنا رہی تھی اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ رہی تھی۔

شہزادہ سلیم نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹ لیا۔ لاعلمی میں اس نے خود اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دیئے تھے۔

بختیار نے کہا۔ غیاث مرزا کو اصل بات بتا دو کہ مہر النساء سے تم شادی کرنا چاہتے ہو اور اگر صاف گوئی کی ہمت نہیں ہے تو کچھ لوگوں کو بھیج کر مہر النساء کو اٹھوا لو۔ میں جانتا ہوں اگر مہر النساء تمہیں نہیں ملی تو تم ساری زندگی تڑپ تڑپ کر گزار دو گے۔

شہزادہ نے کہا۔ مہر النساء کے بغیر ہم نے خود کو ادھورا محسوس کیا ہے مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہم ادھورے تھے، ادھورے ہیں اور ادھورے ہی رہیں گے۔ جذبات کا ریلا کتنا ہی تند و تیز کیوں نہ ہو۔ ہمارے قدموں کو متزلزل نہیں کر سکتا۔ اگر ہم نے اپنے فیصلوں کو بدلنا شروع کر دیا تو رعایا کس سے داد رسی چاہے گی۔ نہیں بختیار، ہم اپنا فیصلہ ہرگز نہیں بدلیں گے۔ مہر النساء کو شیر افگن کے لئے مانگا جا چکا ہے۔ جس طرح پتھر پر نقش کی ہوئی لکیر نہیں مٹ سکتی، اسی طرح ہمارے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ میں کوئی ردو بدل نہیں ہو سکتی۔ قضا و قدر کو بھی شاید یہی منظور ہے کہ ہمیں دہکتے ہوئے انگارے ملیں اور کسی دوسرے کا دامن گوہر مراد سے لبالب بھر جائے۔ پھر اس نے گہری آہ بھری اور چھت کو گھورتا ہوا بولا۔ تمہیں کبھی پتہ نہیں چلے گا شیر افگن، ہم نے اپنا دل نکال کر تمہارے ہاتھوں پر رکھ دیا ہے۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ شہزادے نے برسر اقتدار آ کر مہر النساء کو حاصل کرنے کے لئے شیر افگن کو قتل کرا دیا۔ دن کو رات کہنے سے رات نہیں ہوا کرتی۔ شہزادہ شیر افگن کو قتل کرانا چاہتا تو اس کے لئے سب سے اچھا وقت وہ تھا جب شیر افگن اور مہر النساء کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ دوسرا مناسب وقت وہ تھا جب اکبر کے انتقال کے بعد شہزادہ تخت نشین ہوا تھا۔ تخت نشینی کے تین ساڑھے تین سال بعد جبکہ مہر النساء نو سال کی ایک بیٹی کی ماں تھی۔ اسے کون سے باؤلے کتے نے کاٹا تھا کہ مہر النساء کو بیوہ اور اس کی بیٹی کو یتیم کرانے کا گناہ کرتا۔ وہ تو کبھی کا مہر النساء کی محبت کو سرد خانے میں ڈال چکا تھا۔ اسے شیر افگن کی موت کا تو بے شک علم ہوا لیکن عرصہ دراز تک خیال بھی نہیں آیا کہ مہر النساء بیوہ ہوگئی ہے اور بالفرض محال اگر اس نے مہر النساء کو حاصل کرنے کے لئے شیر افگن کو قتل کرایا تھا تو عدت پوری ہوتے ہی شادی کیوں نہیں کی۔

حقیقت یہ ہے کہ شہزادہ سلیم نے تخت پر بیٹھتے ہی شیر افگن کو بردوان کی جاگیر عنایت کی۔ جاگیر ملتے ہی شیر افگن کے پر نکل آئے۔ وہ حکومت کے خواب دیکھنے لگا اور بنگالیوں اور افغانوں سے مل گیا۔ شرط یہ رکھی کہ بادشاہ کا تختہ الٹتے ہی وہ بنگال کا خود مختار حکمراں بن کر اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کرے گا۔ بادشاہ نے مخبروں کی اطلاع کی تصدیق کرنے کے لئے بنگال کے صوبے دار قطب الدین خان کو مقرر کیا۔ قطب الدین خاں بردوان گیا تو شیر افگن نے اسے قتل کر دیا۔ صوبے دار کے محافظوں کے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی۔ وہ شیر افگن پر پل پڑے اور اس کے ٹکڑے اڑا دیئے۔

شیر افگن کے قتل کے بعد اس کی بیوہ اور نو سالہ لڑکی کو مروجہ قانون کے مطابق آگرے لایا گیا۔ مہر النساء کا باپ غیاث مرزا ان دنوں کابل میں تھا چنانچہ بادشاہ کی سوتیلی ماں سلیمہ بیگم نے مہر النساء اور اس کی بیٹی لاڈلی بیگم کو اپنی تحویل میں لے لیا۔

چار سال تک مہر النساء اور لاڈلی بیگم مادر ملکہ سلیمہ بیگم کے پاس رہیں لیکن حیرت ہوتی ہے کہ نہ بادشاہ نے مہر النساء کو دیکھا، نہ کبھی مہر النساء نے بادشاہ کے سامنے آنے کی کوشش کی۔

پھر اچانک چار سال بعد بادشاہ نے مینا بازار میں مہر النساء کو گلاب کے پھولوں کی دکان پر پھول فروخت کرتے ہوئے دیکھا۔ یہاں پر یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ پردے کا سخت ترین اہتمام ہونے کے باوجود شاہی خاندان کے مردوں کو انہیں رعایا کا مائی باپ کہا جاتا تھا، مینا بازار میں جانے کی اجازت تھی۔ جہانگیر نے مہر النساء کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ زمانے کے سرد و گرم سہنے پر بھی مہر النساء کا حسن ماند نہیں پڑا تھا۔ جن گلابوں کو وہ فروخت کر رہی تھی ان سے

کہیں زیادہ خود حسین وتر وتازہ نظر آ رہی تھی۔ جہانگیر کو بے اختیار ہندی کا ایک دوہا یاد آ گیا۔ جس کا مفہوم کچھ یوں تھا۔

کسی روز میرے باغ میں آؤ۔

میرے باغ کے پھول تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔

وہ ٹہلتا ہوا مہرالنساء کی دکان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ مہرالنساء ہڑبڑا کر اٹھی اور آداب بجالائی۔

آپ وہی مہرالنساء ہیں، جنہیں ہم نے حفاظت کے خیال سے دو کبوتر تھمائے تھے۔ اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

تہہ دل سے ممنون ہوں کہ جہاں پناہ نے ناچیز بندی کو ابھی تک یاد رکھا ہے۔ مہرالنساء نے ادب سے سر جھکا کر کہا۔ حضور والا کے دونوں کبوتر ابھی تک محفوظ ہیں۔

محفوظ ہیں۔ جہانگیر نے حیرت سے دریافت کیا۔ کہاں۔

خانہ زاد کے نہاں خانہ دل میں۔

جواب ایسا تھا کہ جہانگیر لوٹ پوٹ ہو گیا۔

اگلے روز سورج غروب ہونے کے بعد جہانگیر مادر ملکہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہا۔ کیا ہم مہرالنساء سے مل سکتے ہیں۔

سلیمہ بیگم کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ مرحوم باپ کی جگہ پر بیٹھنے کے بعد اب آپ کھلنڈرے لڑکے نہیں رہے۔ کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ آپ اس دکھیاری سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔

کیا آپ کو ہم پر اعتماد نہیں ہے۔

سلیم کی حیثیت سے آئے ہیں تو بے شک ہمیں آپ پر اعتماد نہیں۔

اور اگر ہم جہانگیر کی حیثیت سے آئے ہوں۔

تو یہ ایسی جگہ نہیں ہے، جہاں دربار عام یا دربار خاص منعقد کیا جا سکے۔

تھوڑی دیر کے لئے جہانگیر لاجواب سا ہو گیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔ ہم نے آج تک آپ سے کوئی بات نہیں چھپائی ہے۔ آج بھی نہیں چھپائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں مہرالنساء اچھی لگتی ہے۔

اچھی تو وہ سبھی کو لگتی ہے۔ مادر ملکہ نے کہا۔ کسی نیک، شریف اور حیاء دار خاتون سے ملنے کے لئے اسے جواز نہیں بنایا جا سکتا۔

آپ سمجھتی کیوں نہیں امی حضور۔ ہم اسے چاہتے ہیں، اس سے محبت کرتے ہیں۔

گویا مینا بازار میں اسے دیکھتے ہی آپ اپنا دل اس کی نذر کر چکے ہیں اور اب اسے حکومت و دولت کا لالچ دے کر بھڑکانے اور ورغلانے آئے ہیں۔

بات آج کی نہیں، برسوں پرانی ہے۔ جہانگیر نے بتایا۔ خرم کی پیدائش کے چند ہی دنوں بعد پائیں باغ میں ہماری اور مہرالنساء کی ملاقات ہوئی تھی۔ ماشاء اللہ خرم اب جوان ہے اور راجپوتانے میں مغلیہ افواج کی قیادت کر رہا ہے۔

ہمیں یاد نہیں پڑتا کہ آپ نے کچھ حاصل کرنا چاہا ہو اور اسے حاصل نہ کر لیا ہو۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ کم و بیش پندرہ سولہ سال قبل آپ نے مہرالنساء کو اپنے دل میں جگہ دی لیکن اسے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔

ہر ممکن کوشش کی مگر تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ رانی ماں نے اور ان کے ارشاد پر قلعہ کے ہر چھوٹے بڑے فرد نے فیصلہ کر لیا کہ مہرالنساء کے بارے میں بالکل انجان بن جائیں گے۔ اس کے اتے پتے کی ہمارے کانوں میں بھنک تک نہیں پڑنے دیں گے۔ پتہ اس وقت چلا جب کمان سے تیر نکل چکا تھا اور لاعلمی کے باعث ہم اسے اس کے باپ سے شیر افگن کے لئے مانگ چکے تھے اور یہ بات کسی طرح بھی مناسب نہیں تھی کہ شاہی بھرم کو ٹھیس پہنچائی جائے۔ حالانکہ شیر افگن کی مجال نہیں تھی کہ وہ ہمارے

حکم کی خلاف ورزی کرتا۔ رہا غیاث مرزا تو اس کے لئے اس سے بڑھ کر فخر و مباہات کی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ اس کی چہیتی بیٹی ولی عہد کی بیوی بنے اور کچھ دنوں بعد ہندوستان کی ملکہ کہلائے۔ پھر بھی ہم نے دل پر پتھر رکھ لیا اور خاندان کی روایات پر آنچ نہیں آنے دی۔

سلیمہ بیگم سوتیلے بیٹے کی کتھا سن کر خوش بھی ہوئیں اور متاثر بھی۔ دھیمی اور گلوگیر آواز میں بولیں۔ آپ کے جنت مکانی بابا کہا کرتے تھے کہ شاہوں کی زبان سے ادا ہونے والا ہر جملہ قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ نے خاندانی روایات کا پاس کیا، بہت ہی اچھا کیا۔ چند لمحوں کے لئے وہ خاموش ہو گئیں۔ شاید خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ پھر کہنے لگیں۔ آپ کو یقین ہے کہ جس طرح پندرہ سولہ سال سے آپ مہرالنساء سے خاموش محبت کرتے آئے ہیں۔ اسی طرح وہ بھی آپکو چاہتی رہی ہے۔

یقین تو نہیں، البتہ گمان ضرور ہے۔ جہانگیر نے کہا۔ ملاقات کے ذریعہ ہمیں اس سے یہی معلوم کرنا مقصود ہے۔

اگر اس نے کہہ دیا کہ میں نے آپ کو کبھی نہیں چاہا تو آپ کے دل پر کیا گزرے گی۔

جہانگیر مسکرانے لگا۔ تو ہم کہیں گے کہ اب چاہنے لگئے کیونکہ ہم آپ کو اپنی ملکہ بنانے والے ہیں۔

یہ اندازہ تو سلیمہ بیگم کو پہلے ہی ہو گیا تھا کہ جہانگیر کسی برے ارادے سے نہیں آیا ہے لیکن جب اس نے مہرالنساء کو ملکہ ہند بنانے کی تمنا کا اظہار کیا تو تھوڑی دیر کے لئے وہ دم بخود سی ہو کر رہ گئیں۔ ہندوؤں کے میل جول کے باعث مسلمانوں میں بھی بیواؤں کی شادی کو معیوب سمجھا جانے لگا تھا۔ بیوہ کو منحوس ہی نہیں کہا جاتا بلکہ اسے خوشی کی تقاریب میں بھی شریک نہیں کیا جاتا۔ لوگ ڈرتے تھے کہ نحوست کے سائے خوشی کو غم میں تبدیل کر دیں گے۔ سلیمہ بیگم اس احمقانہ اور سفاکانہ خیال کی حامی نہیں تھیں۔ پھر بھی ہندوؤں کے تصورات کا تھوڑا بہت اثر تو پڑنا ہی تھا۔ اسلام بیواؤں کو شادی کرنے کی اجازت دیتا تھا، اس لئے وہ بخوشی مہرالنساء کی شادی پر بشرطیکہ جہانگیر سے نہ ہو، راضی ہو سکتی تھیں اور دامے، درمے سخنے ہر قسم کی مدد بھی کر سکتی تھیں۔ پریشان کن مسئلہ تو جہانگیر اور نور جہاں کی شادی کا تھا۔ اگر ہندو قوم بیوہ کو منحوس، سبز قدم، چڑیل اور ڈائن سمجھتی تھی تو یونہی تو نہیں سمجھتی تھی کوئی نہ کوئی برائی تو بیواؤں میں ہوتی ہی ہوگی۔ جہانگیر پہلے ہی مصائب کا شکار تھا۔ ایک طرف مرہٹے تھے کہ نہ خود چین سے بیٹھتے تھے نہ چین سے بیٹھنے دیتے تھے۔ دوسری جانب دکنی حکمراں تھے جو کسی طرح بھی مغلوں کی بالادستی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے اور جس طرح بھی ممکن ہو سکتا تھا تنگ کرتے رہتے تھے۔ راجپوتانے کی دو ریاستوں نے خراج دینا بند کر کے خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ ملتان میں شورش پسند اسماعیلی، سکھوں اور ہندوؤں کو ملا کر پنجاب پر حکومت کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ایسے نامساعد حالات میں مہرالنساء کی نحوست سے جہانگیر کسی بھی بڑی افتاد کا شکار ہو سکتا تھا۔

لیکن جہانگیر مطلق العنان بادشاہ تھا۔ اگر وہ مہرالنساء کو اپنانے کا تہیہ کر چکا تھا تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اسے اپنے ارادے پر عمل کرنے سے نہیں روک سکتی تھی۔ بچوں کی طرح اسے بہلایا اور پھسلایا تو جا سکتا تھا، ٹکا سا جواب نہیں دیا جا سکتا تھا۔ پس خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر انہوں نے کہا۔ ہم آپ کے ممنون ہیں کہ آپ نے اپنے دل کا راز ہمیں بتایا اور ماں سمجھ کر ہمیں اتنی اہمیت دی کہ مہرالنساء سے ملنے کے لئے ہم سے اجازت مانگی۔ حالانکہ بادشاہ وقت کو کسی سے، چاہے سگے ماں باپ ہی کیوں نہ ہوں، اجازت

مانگنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ آپ کے ذرا سے اشارہ چشم وابرو پر ترکیں مہرالنساء کو ایک پل میں آپ کی خواب گاہ میں پہنچا سکتی ہیں۔ آپ نے جس احسن طریقے پر حق فرزندگی ادا کیا ہے، اس کی جتنی تعریف کی جائے، بخدا کم ہی ہوگی، مگر آپ جانتے ہیں اور ماشاء اللہ ہم سے زیادہ جانتے ہیں کہ شادی بیاہ گڑیوں کا کھیل نہیں ہے۔ راجہ بھگوان داس کی بیٹی مان بائی سے، جسے ہم سب پیار سے شاہ بیگم کہتے ہیں آپ کا رشتہ کرنے سے قبل چھ مہینے تک آپ کے جنت مکانی بابا نے خود بھی غور کیا تھا اور ہندوستان کے بڑے بڑے جیوتشیوں، منجموں اور زائچہ نویسوں کی خدمات بھی حاصل کی تھیں۔ چھ مہینے کی نہیں، ہم آپ سے صرف چھ دن کی مہلت مانگتے ہیں۔ بعدازاں آپ کو اپنی رائے سے آگاہ کردیں گے جس پر عمل کرنے یا نہ کرنے کا آپ کو کلی اختیار ہوگا۔

جہانگیر کے پاس جواب تھا کہ اول وآخر فیصلہ ہمیں ہی کرنا ہے تو چھ دن کی قدغن کیوں لگائی جارہی ہے، مگر وہ اپنی سگی ماں مہارانی جودھا بائی کی بات تو ٹال سکتا تھا، سوتیلی ماں ملکہ سلیمہ بیگم کے حکم کو پس پشت نہیں ڈال سکتا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ دنیا میں ان سے بڑھ کر کوئی اور اس کا ہمدرد، بہی خواہ نہیں ہے۔ اس نے ادب سے سر جھکایا اور آداب بجالا کر رخصت ہوا۔

☆

ذکاوت اور ذہانت مہرالنساء پر ختم تھی۔ صوبہ بہار میں کسی غلط فہمی کی بناء پر وہاں کے صوبے دار نے شیر افگن کو گرفتار کرلیا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ کسی کو آگرے بھیج کر بادشاہ کو صورت حال سے آگاہ کیا جاتا۔ مجبوراً مہرالنساء نے اپنے بڑے بھائی آصف خاں کو صوبے دار کے پاس بھیجا کہ شیر افگن کی جاں بخشی کی جائے۔ آصف خاں منہ لٹکائے ہوئے واپس آیا۔ صوبے دار نے موت اور زندگی کا فیصلہ شیر افگن ہی پر چھوڑ دیا تھا اور طریقہ اس کا یہ اختیار کیا تھا کہ ایک میدان میں شیر افگن کو لے جایا جائے گا۔ میدان کے دو دروازے ہوں گے۔ ایک موت کا دروازہ، دوسرا زندگی کا دروازہ اور اسی میدان میں دو غلام بھی ہوں گے۔ ایک غلام وہ جو سچ بولے گا اور دوسرا وہ جو جھوٹ بولے گا۔ شیر افگن کو کوئی علم نہیں ہوگا کہ موت کا دروازہ کون سا ہے اور زندگی کا دروازہ کدھر ہے۔ اسی طرح اسے یہ بھی نہیں معلوم ہوگا کہ دونوں میں سے کون سا غلام سچا ہے اور کون سا جھوٹا..... تاہم وہ دونوں سے ایک ایک سوال پوچھ سکے گا۔

سزا اور جزا کے لئے جو طریقہ کار اختیار کیا گیا تھا وہ بڑا مضحکہ خیز تھا لیکن اس زمانے میں اس قسم کے تماشے عام تھے اور اکثر صوبے دار مقدمہ سننے کی جھنجھٹ میں پڑنے کے بجائے ملزم کو موت یا زندگی کا فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا کرتے تھے۔ کوئی بیچارہ بے گناہ مارا جاتا تو اسے گناہگار سمجھ لیا جاتا اور کوئی گناہگار بچ نکلتا تو سارے الزامات سے بری ہوکر معصوم و بے گناہ ٹھہرتا۔

آصف خاں پریشان تھا کہ اس عجیب وغریب طریقہ انصاف سے اس کے بہنوئی کی موت یقینی ہے مگر مہرالنساء نے سزا اور جزا کے انوکھے اصول کے بارے میں سنا تو مسکرانے لگی۔ اس نے بھائی سے کہا۔ زنداں جاکر اپنے بہنوئی سے ملو اور انہیں میرا یہ پیغام پہنچادو۔

اگلے روز میدان میں مہرالنساء کے مشورے کے مطابق شیر افگن نے دونوں غلاموں سے ایک ہی سوال کیا۔ اگر میں دوسرے غلام سے پوچھوں کہ زندگی کا دروازہ کون سا ہے تو اس کا جواب کیا ہوگا۔

دونوں نے موت کے دروازے کی طرف اشارہ کردیا۔ جھوٹے نے جھوٹ بولا اور سچے نے حق گوئی سے کام لیا اور اس طرح شیر افگن کو معلوم ہوگیا کہ زندگی بچانے کے

لئے اسے کس دروازے کا انتخاب کرنا چاہئے۔ مہرالنساء کی غیر معمولی ذہانت نے شوہر کو غلط فیصلہ کرنے اور مرنے سے بچالیا۔

جہانگیر کو اطلاع ملی تو اس نے صوبے دار کو معطل کرکے قید خانے میں ڈلوادیا اور نئے صوبے دار کو حکم دیا کہ انصاف کا نام بدنام کرنے کے لئے جو طریقہ کار اختیار کیا گیا تھا اس سے ملتا جلتا ہوا طریقہ استعمال کیا جائے اور سابق صوبے دار کے سامنے تہہ کئے ہوئے دو پرچے، جن میں ایک پر موت اور دوسرے پر زندگی لکھا ہو رکھ دیئے جائیں اور جس طرح وہ دوسروں کو موت اور زندگی کا اختیار دیا کرتا تھا اس طرح اسے بھی جینے یا مرنے کا اختیار دیا جائے۔

سابق صوبیدار کو معلوم ہوا کہ جیسے کو تیسا والا اصول انصاف کے لئے بروئے کار لایا جائے گا تو بہت پریشان ہوا۔ اس نے شیر افگن سے کہلوایا۔ نیا صوبے دار مجھے ختم کرنے کا فیصلہ کرچکا ہے اور باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ وہ دونوں پرچوں پر موت ہی لکھے گا۔ اس طرح کوئی سا بھی پرچہ کیوں نہ اٹھاؤں، میری موت یقینی ہے..... بظاہر تو بچنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ پھر بھی جس طرح تمہاری بیگم نے مشورہ دے کر تمہاری زندگی بچائی ہے اسی طرح ان سے کہو کہ وہ مجھے بھی بچالیں۔ ساری زندگی تمہارا اور تمہاری بیگم کا غلام رہوں گا۔

مہرالنساء نے اسے بھی ترکیب بتادی۔

یوم مقررہ پر سابق صوبیدار کے آگے دو پرچے رکھ دیئے گئے۔ اس نے خاموشی سے ایک پرچہ اٹھایا۔ اس کی گولی بنائی اور اس سے پہلے کہ نیا صوبے دار روکتا، اس گولی کو نگل گیا۔ دوسرے پرچے پر موت لکھا تھا اس لئے نئے صوبے دار کو بادل ناخواستہ تسلیم کرنا پڑا کہ سابق صوبے دار نے جو پرچہ اٹھا کر اپنے حلق کے نیچے اتارا ہے اس پر زندگی لکھا ہوا تھا۔

ایک دو نہیں، مہرالنساء کی ذہانت کے ایسے متعدد واقعات ہوں گے، جن میں سے معدودے چند ہی منظر عام پر آسکے ہیں۔ بلا کی ذہین تھی اور یہ اس کی ذہانت ہی تھی، جس کی بدولت، سلیمہ بیگم نے کچھ بتایا، نہ جودھا بائی سے کوئی سن گن ملی، مگر وہ سمجھ گئی کہ دال میں کالا ہے۔ اس نے اپنی بیٹی لاڈلی بیگم سے، جو نو برس کی عمر میں قلعہ میں آئی تھی اور اب تیرہ سال کی ہونے والی تھی، سرگوشی میں کہا۔ غیب کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن آثار ایسے ہیں، جن کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ ہمیں حکومت ملنے والی ہے۔

ادھر سلیمہ بیگم نے مہرالنساء کے سقم ڈھونڈنے میں اپنی سی پوری کوشش کر ڈالی۔ جیوتشیوں کو بلایا، زائچہ کھچوایا، طالع اور نحس ستاروں کی چال معلوم کی، قلعہ کے مفتی سے مشورہ کیا اور خود ایک بار نہیں تین بار استخارہ کیا۔

جیوتشیوں نے کہا۔ ہاتھی اس کے آگے پیچھے چلیں گے۔

زائچہ نویسوں نے بتایا۔ ہم نے اتنا اچھا زائچہ آج تک نہیں نکالا۔

منجموں نے کہا۔ طالع ستارے ہیں، نحوست ان سے دور بھاگتی ہے۔

مفتی نے فتویٰ دیا۔ بارہ اماموں کو ماننے والی کی چار خلفاء کو ماننے والے سے اور چار خلفاء کو ماننے والی کی بارہ اماموں کو ماننے والے سے شادی ہوسکتی ہے۔

استخارے میں تینوں مرتبہ ہاں میں جواب ملا۔

سلیمہ بیگم کو نہ جہانگیر سے کوئی پرخاش تھی، نہ مہرالنساء سے۔ انہیں تو ہندوؤں کی توہم پرستی کے اثرات نے پریشان کر رکھا تھا، ہر جگہ سے خیر ہی خیر کی صدائیں آئیں تو چھٹا دن ختم ہونے سے پہلے ہی انہوں نے جہانگیر سے کہلوادیا کہ مہرالنساء سے ملنے کے لئے تشریف لاسکتے ہیں۔ دوسری طرف مہرالنساء سے کہا۔ نوک پلک سے درست ہوجاؤ۔ خوش بختی تمہاری گود میں آنے والی ہے۔

مہرالنساء کے لئے اتنا اشارہ کافی تھا، سمجھ گئی کہ بہت جلد تاریخ کا ایک اہم باب بننے والی ہے۔

یہ کہنا تو مشکل ہے کہ مہرالنساء، شہزادہ سلیم سے ملنے اور کبوتروں والا دلچسپ واقعہ ہونے کے بعد سے شہزادے کو دل کی گہرائیوں سے چاہنے لگی تھی۔ لڑکپن میں قلعہ سے واپس آ کر تیکھی مونچھوں والا سانولا نوجوان اسے کئی روز تک یاد آتا رہا۔ اس کے بعد وہ بالکل نہیں تو بڑی حد تک اس نوجوان کو بھول گئی۔ شیر افگن سے شادی کے بعد اپنی محبت اور توجہ کا مرکز اسی کو بنالیا اور جب تک وہ زندہ رہا اس کی وفادار رہی..... اور اس کی موت کے بعد، جیسا کہ عام طور پر ہوتا آیا ہے، اس نے عہد کیا کہ دوسری شادی نہیں کرے گی اور شیر افگن کی واحد نشان لاڈلی بیگم کی مرتے دم تک خدمت کرتی رہے گی۔

قلعہ میں آنے اور اچھی طرح معلوم ہونے کے باوجود کہ تیکھی مونچھوں والا نوجوان ہندوستان کا بادشاہ بن چکا ہے اور اسی قلعہ میں مقیم ہے، اس نے جانے یا انجانے میں کبھی بادشاہ کے سامنے جانے کی کوشش نہیں کی..... گلاب کے پھولوں سے اسے جنون کی حد تک محبت تھی۔ گجروں سے لے کر پازیبوں تک ایسا کون سا زیور تھا جو اس نے گلاب کے پھولوں سے نہ بنایا ہو۔ اس کی اس خوبی کو دیکھ کر قلعہ کی کسی خاتون نے مینا بازار میں دکان لگانے کا مشورہ دیا، کون جانتا تھا کہ پھولوں کی بدولت مہرالنساء کی رسائی اس تک ہو جائے گی جو اس کے لئے برسوں پہلے دیکھا ہوا ایک حسین خواب بن چکا تھا۔

مینا بازار میں جہانگیر نے مہرالنساء کو دیکھا تو مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔ سراسیمہ تو مہرالنساء بھی ہوئی لیکن چند ہی لمحوں میں اس کی خوش طبعی پلٹ آئی۔ جہانگیر کی آنکھوں میں اسے واضح طور پر وہ حسرت ناک تڑپ دکھائی دی جو کئی وقت کے بھوکے شخص کی نظروں میں اس وقت ہوتی ہے جب وہ کھانے کے خوان دیکھتا ہے اور جانتا ہے کہ خوان دیکھ تو سکتا ہے مگر شکم سیر نہیں ہو سکتا۔

مہرالنساء کو اپنا وہ عہد جو اس نے شوہر کی موت پر کیا تھا ٹوٹتا محسوس ہوا اور جب اس نے کہا۔ حضور والا کے دونوں کبوتر خانہ زاد کے نہاں خانہ دل میں محفوظ ہیں تو اس جملے کے ساتھ ہی اس کا عہد کانچ کی طرح کرچی کرچی ہو گیا۔ اس نے حقیقت بیانی سے کام لیا تھا۔ کبوتر والے کو تو اس نے بھلا دیا تھا لیکن کبوتروں والی بات کو کہ اس میں سادگی اور معصومیت تھی، ہمیشہ یاد رکھا تھا اور کبھی کبھی تو یہ سوچ کر کہ وہ اپنے لڑکپن میں کتنی سادہ لوح اور بیوقوف تھی، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑنے لگتی تھی..... تاہم باکردار اتنی تھی کہ شوہر کے سوا کسی غیر مرد کا تصور اس کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے کردار کی بلندی اور غیر معمولی حیاء اور شرم کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ران پر بند منہ کا پھوڑا نکلا، اطباء کے مرہموں سے کوئی فائدہ نہیں ہوا تو جہانگیر نے انگریز ڈاکٹر ٹینی سن سے جو کئی ماہ سے دربار میں پابندی سے سلام کے لئے حاضر ہو رہا تھا، مشورہ کیا۔ اس نے کہا کہ پھوڑے کو دیکھے بغیر علاج کرنا مشکل ہے۔ میں اپنی بیوی کو قلعہ میں بھیج دوں گا اور وہ پھوڑے کو دیکھ کر مجھے اس کی نوعیت سے آگاہ کر دے گی۔ جہانگیر نے یہ بات مہرالنساء کو جو اس وقت ملکہ نور جہاں بن چکی تھی، بتائی تو اس نے ڈاکٹر کی بیوی کو اپنی ران کا پھوڑا دکھانے سے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگی مرنا قبول ہے لیکن یہ قبول نہیں کہ غیر مرد کے سامنے میرے جسم کے کسی عضو کا ذکر کیا جائے۔ بعد میں کسی کنیز کے خاندانی ٹوٹکے سے پھوڑا پھوٹ گیا اور سارا زہریلا مواد ایک ہی دن میں بہہ گیا۔ ملکہ کو شب و روز کی اذیت سے نجات ملی اور کنیز کو اتنا انعام و اکرام کہ چھوٹی موٹی جاگیردارنی بن گئی۔

مادر ملکہ سلیمہ بیگم نے نوک پلک سے درست ہو کر جہانگیر کا استقبال کرنے کے لئے کہا تو اسے یہ سمجھنے

میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگی کہ چند روز قبل اس نے لاڈلی بیگم سے جو کچھ کہا تھا اس کی تکمیل کا وقت آ گیا ہے۔

ذہنی طور پر اس نے مینا بازار میں ہونے والی ملاقات کے فوراً بعد ہی اپنے آپ کو حالات سے سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار کر لیا تھا، جس کا اظہار اس نے اپنی بیٹی اسے کیا تھا۔ کئی عوامل تھے جنہوں نے اسے دوسری شادی نہ کرنے کے عہد کو توڑنے پر آمادہ کیا۔ اسلام بیوہ کو شادی کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتا تھا خصوصی حالات میں ضروری بھی قرار دیتا تھا۔ درست ہے کہ اس نے گہرے سانولے رنگ اور تیکھی مونچھوں والے شہزادے سے عشق نہیں کیا تھا، تاہم وہ اسے اچھا لگا تھا اور جب وہ شہنشاہ کے روپ میں تشنہ اور گرسنہ نظروں سے دیکھتا نظر آیا تو پہلے سے بھی زیادہ اچھا معلوم ہوا۔ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملکہ ہند کہلائے جانے کا روح پرور تصور بھی اس پر غالب آیا ہوگا۔ غریبوں، یتیموں، بیواؤں اور بے آسراؤں کی مدد کے مستحسن جذبے اور باپ اور بھائی کے لئے اعلیٰ ترین مناصب حاصل کرنے کے خیال نے بھی اسے مغلوب کیا ہوگا۔ ان سب سے سوا نظر چہیتی بیٹی لاڈلی بیگم کا مستقبل اسے عزیز تر تھا جسے عقد ثانی کے بعد ہی روشن و تابناک بنایا جا سکتا تھا۔

سلیمہ بیگم کی اجازت و وساطت سے تخلیئے میں جہانگیر سے ملاقات ہوئی تو مہرالنساء نے جہانگیر کی درخواست سن کر فوری طور پر اپنی مرضی اور آمادگی کا اظہار نہیں کیا بلکہ دو ٹوک انداز میں گفتگو کی۔

جہاں پناہ.....! اس نے کہا۔ سنا ہے کہ مغل بڑے حساس ہوتے ہیں۔ ناچیز لونڈی بیوہ اور ایک بچی کی ماں ہے جو جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی ہے۔ کیا کبھی آپ کو یہ احساس نہیں ہوگا کہ جسے آپ نے اپنی ملکہ بنانے کا شرف بخشا ہے وہ کئی سال تک کسی اور کا گھر آباد کر چکی ہے اور کیا یہ تصور حضور اقدس کو مجھ سے نفرت کرنے پر مجبور نہیں کر دے گا۔

ہرگز نہیں۔ جہانگیر نے جواب دیا۔ ہم نے دل کی گہرائیوں سے آپ کو چاہا ہے اور خدا گواہ ہے کہ آپ کے بال سفید ہو جائیں گے تب بھی ہم اسی طرح آپ کو چاہتے رہیں گے۔ ہماری بھول کہہ لیجئے یا رواداری، جس پھول کو ہم اپنے تاج پر سجانا چاہتے تھے وہ ہم سے چھن گیا تھا لیکن یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ اب وہی پھول حاصل ہو سکتا ہے، امید و بیم کے باعث ہماری حالت دگرگوں ہو چکی ہے۔ امید اس بات کی کہ آپ ہماری محبت کی قدر افزائی فرمائیں گی اور خوف یہ ہے کہ آپ نے ٹھکرا دیا تو ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔

حضرت والا کو اچھی طرح ناچیز کے مسلک کا علم ہے۔ کیا میں توقع کر سکتی ہوں کہ ساری زندگی نہ مجھ سے مسلک چھوڑنے کے لئے کہا جائے گا نہ اشاروں، کنایوں میں کوئی ایسی بات کی جائے گی جس سے مسلک کی تحقیر و توہین ہوتی ہو۔

انشاء اللہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ جہانگیر نے جواب دیا۔ آپ ہم پر اعتماد کر سکتی ہیں۔ تعصب تو کبھی ہمارے قریب ہو کر بھی نہیں گزرا۔ شاہ بیگم ہندو دھرم سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہم نے کبھی انہیں دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرنے سے نہیں روکا۔ اس کے برعکس ہنسی خوشی ہمیشہ ان کے مذہبی تیوہاروں میں برابر کے شریک ہوتے رہے ہیں۔

قلعہ میں شاہ بیگم کے ہوتے ہوئے، میری کیا حیثیت ہوگی۔

ان کی طرح آپ بھی ملکہ کہلائیں گی اور آپ کو انہی جیسے اختیارات حاصل ہوں گے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ ایک میان میں بیک وقت دو تلواریں سما سکیں۔

تلواروں کی حد تک آپ کی بات درست ہوسکتی ہے مگر انسانوں کے معاملے میں ایسا نہیں ہے۔ ایسا ہوتا تو اسلام جو دین فطرت ہے، کبھی اجازت نہ دیتا۔ آپ تو ماشاءاللہ ہم سے زیادہ دین کو سمجھتی ہیں۔ یقیناً جانتی ہوں گی کہ یہ اجازت دے کر اسلام نے معاشرے کو متعدد برائیوں سے بچالیا ہے۔

بس ایک بات اور بتا دیجئے عالیجاہ.....! مہرالنساء نے کہا۔ قلعہ میں ہماری لاڈلی بیگم کی حیثیت کیا ہوگی۔

اس کی ماں ہماری شریک حیات بن گئی تو وہ ہماری بیٹی کہلائے گی اور اسے شہزادیوں والی ساری مراعات حاصل ہوں گی۔

مہرالنساء مسکرانے لگی۔ حسین چہرے پر زندگی و مسرت سے بھرپور سرخی دوڑ گئی۔ ادب و حیا کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ گردن جھکا کر اس نے ہاں کردی۔

جہانگیر کا اصل نام نورالدین محمد تھا۔ اپنے نام کی مناسبت سے اس نے مہرالنساء کو اپنانے کے بعد نور محل کا لقب دیا۔ مہرالنساء زیادہ دنوں تک نور محل نہیں رہ سکی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد بادشاہ نے اپنے نام نورالدین سے نور اور اپنے لقب جہانگیر سے جہان لے کر اسے نور جہاں بنا دیا اور یہ شعر جو شاید اسی دن کے لئے موزوں کیا گیا تھا اپنے مخصوص پیار بھرے انداز میں پڑھا۔

من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری

دل پر تو پہلے ہی قابض ہوچکی تھی، آہستہ آہستہ اپنی بے پایاں محبت سے نور جہاں نے جہانگیر کے دماغ پر بھی قبضہ کرلیا۔ نشے میں سرشار جہانگیر سارا وقت اس کے ساتھ گزارنے لگا۔ دربار میں بھی اس طرح جاتا کہ تخت شاہی کے عقبی جھروکے میں نور جہاں بیٹھ کر اپنا ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ لیتی۔ ہاتھ کا لمس جہانگیر کو سکون و طمانیت بخشتا۔

ہمہ وقت نور جہاں کو اپنے ساتھ رکھ کر جہانگیر نے ملک کے سارے انتظامی امور اسے سونپ دیئے۔ شراب کے جام اور نور جہاں کے لمس کے سوا اسے کسی شے سے دلچسپی نہیں رہی۔ دربار عام ہو یا دربار خاص، جھروکے سے نور جہاں کا دست حنائی اس کے کندھے پر ہوتا اور ملک کے انتظامی امور میں اثبات و نفی کے فیصلے نور جہاں کے اشاروں پر کئے جاتے۔ ہاں اور نہیں کے انداز میں کندھا وہ ہلاتی اور فیصلہ اس کی مرضی و منشا کے مطابق جہانگیر کے ہونٹوں سے صادر ہوتا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ نور جہاں نے جانبداری سے کام لے کر جہانگیر سے کوئی غلط فیصلہ صادر کرایا ہو۔ جہانگیر نے شاہی مہر پر بھی نور جہاں کا نام کندہ کرادیا تھا اور اکثر کہا کرتا تھا کہ نور جہاں کے ہوتے ہوئے مجھے ایک سیر شراب اور آدھا سیر گوشت سے زیادہ کچھ اور نہیں چاہئے۔

نور جہاں خوب صورت تھی اور اتنی زیادہ خوبصورت تھی کہ شاید ہی کسی عورت کو اس جیسا حسن ملا ہو۔ عموماً حسین عورتیں بیوقوف ہوتی ہیں لیکن قدرت نے حسن کے ساتھ نور جہاں کو عقل و فہم کی دولت سے بھی نوازا تھا۔ وہ مضبوط قلب اور زبردست قوت ارادی رکھتی تھی۔ جہانگیر کے ساتھ اکثر شکار پر گئی اور تین بار اس نے خوفناک شیر اپنے ہاتھ سے ہلاک کئے۔ مہابت خاں نے بغاوت کرکے جہانگیر کو حراست میں لیا تو فوج کی کمان سنبھال کر وہ ہاتھی پر سوار ہوئی اور بادشاہ کو چھڑا لائی۔ شہزادہ خرم کی بغاوت کو کچلنے میں بھی اس نے بڑی مستعدی دکھائی۔

خرم کی بغاوت کا اصل سبب نور جہاں کی بیٹی لاڈلی بیگم تھی۔ نور جہاں چاہتی تھی کہ لاڈلی بیگم اور شہزادہ خرم کی شادی ہوجائے مگر خرم نور جہاں کے بھائی آصف خاں کی بیٹی ممتاز بانو پر بری طرح فریفتہ تھا۔ ممتاز بانو وہی لڑکی ہے جو خرم

(شاہجہاں) سے شادی کے بعد ممتاز محل کہلائی اور چودہ بچوں کی ماں بنی۔ پندرہویں بچے کی پیدائش پر انتقال ہوگیا۔ بیوی کے لئے شاہجہاں نے مقبرہ بنوایا جو تاج محل کہلاتا ہے اور دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

نور جہاں کو خرم اور ممتاز بانو کے عشق کا پتہ چلا تو اس نے خرم کو نظر انداز کرکے جہانگیر کے چھوٹے بیٹے شہریار کو اپنا داماد بنایا اور اسے ولی عہد بنانے کی کوشش شروع کردی۔ خرم کے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی اس لئے وہ باغی ہوگیا اور حکومت پر قبضہ کرنا چاہا..... مگر نور جہاں نے بڑی کامیابی سے بغاوت کو کچل دیا تاہم خرم کو کوئی گزند نہ پہنچا سکی۔ اسے آصف خاں نے اپنی امان میں لے لیا تھا۔

جہانگیر کے بعد اگر نور جہاں کو کسی اور سے جنون کی حد تک محبت تھی تو وہ گلاب کے پھول تھے۔ سب سے پہلے اسی نے اپنے غسل کے لئے عرق گلاب کشید کرایا۔ اطباء نے بعد میں اس کے گوناگوں خواص دریافت کئے۔ عطر گلاب بھی نور جہاں نے عطاروں سے پوچھ پوچھ کر تیار کیا۔ قلعہ کے مکینوں کو اس کی آمد و رفت کا پتہ گلاب کی اس خوشبو سے ہوجاتا تھا جو ہر وقت نور جہاں کے جسم سے پھوٹتی رہتی تھی۔ ایک قول کے مطابق گلقند بھی نور جہاں ہی کی ایجاد ہے جسے تقویت دل و دماغ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

دور جہانگیری کا سب سے اہم واقعہ وہ سمجھا جاتا ہے جس میں نور جہاں کے ہاتھ سے انجانے میں رامو نامی ایک دھوبی مارا گیا۔ واقعہ تو درست ہے لیکن مختلف لوگوں نے اسے مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ فلم پکار کے مصنف کمال امروہی کے خیال میں نور جہاں نے کسی پرندے کو مارنے کی لئے تیر چلایا جو قلعہ کے قریب گھاٹ پر بیٹھے ہوئے دھوبی کے دل میں پیوست ہوگیا۔ جہانگیر کو علم ہوا کہ ملکہ کے تیر سے دھوبی ہلاک ہوا ہے تو اس نے ترنگوں کو حکم دیا کہ نور جہاں کو گرفتار کرکے قید میں ڈال دیں۔ شبلی نعمانی کہتے ہیں کہ نور جہاں نے طپنچہ چلایا تھا اور دھوبی گولی کا نشانہ بنا تھا..... اور اس کی موت کا سب سے پہلے ملکہ کو علم ہوا تھا اور وہ خود ہی اپنے آپ کو بستہ زنجیر و رسن کرا کے بادشاہ کے سامنے حاضر ہوگئی تھی۔

بہرکیف، طپنچہ چلایا ہو یا تیر، دھوبی ہلاک ہوا تھا اور بادشاہ نے ملکہ کو گرفتار کرایا ہو یا ملکہ نے خود کو مجرم کی حیثیت سے پیش کیا ہو، گرفتاری عمل میں آئی تھی.....

کردار کی بلندی کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ نور جہاں جو ملک کے سیاہ و سپید کی مالک تھی، کس طرح ہنسی خوشی اپنی موت کا فیصلہ سننے کے لئے تیار ہوگئی۔ دھوبی کی حیثیت ہی کیا تھی .....! وہ اس کے پورے خاندان کو ختم کرا سکتی تھی اور کوئی اس کا بال تک بیکا نہیں کرسکتا تھا۔

لیکن جن کے دلوں میں خوف خدا ہوتا ہے وہ آخرت کی سزا بھگتنے کے بجائے دنیا ہی میں اپنے گناہ کی سزا بھگتنے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ دھوبی کی موت کے بعد نور جہاں ملکہ ہند نہیں رہی، ایک معمولی سی عورت بن گئی۔ اس نے جہانگیر سے کہلوایا کہ دیکھو قدم نہ ڈگمگائیں، میری چاہت تمہیں فرض سے غافل نہ کردے۔ عدل و انصاف کا دامن نہ چھوڑنا۔

فلم کی بات چھوڑو، فلم کے کچھ مخصوص اصول و قواعد ہوتے ہیں، ادیب اور ہدایت کار دونوں کو رنگ آمیزی کے لئے ڈرامائی انداز اختیار کرنا پڑتا ہے۔ تاریخ کہتی ہے کہ جہانگیر نے فیصلہ سنایا اور ایسا حکم دیا کہ اس سے عدل و انصاف کو کوئی گزند پہنچتی تھی نہ اس کی عزیز از جان ملکہ پر کوئی آنچ آتی تھی۔

اس نے کہا۔ دھوبی کی بیوہ کو طپنچہ دیا جائے اور اس سے کہا جائے کہ جس طرح ملکہ نے تمہارے شوہر کو قتل کیا ہے

اسی طرح تم بھی ملکہ کے شوہر کو قتل کر کے ملکہ کو بیوہ کر دو۔

نور جہاں چیخ اٹھی کہ اس کی چاہت نے بادشاہ کو مغلوب کر لیا ہے۔

اراکین حکومت لرز اٹھے کہ بادشاہ کو مارا گیا تو قیامت آ جائے گی۔

دھوبی کی بیوہ نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دو مگر میں بادشاہ پر گولی نہیں داغوں گی۔

مفتی نے کہا۔ بادشاہ کا فیصلہ قابل تعریف ہے اور انصاف کے تقاضوں پر پورا اترتا ہے لیکن احکام شریعت کے مطابق نہیں ہے۔ شریعت خون کے بدلے خون کا حکم دیتی ہے سزا وہ ہی بھگتے گا جس نے قتل کرنے کا گناہ کیا ہوگا۔ اس لحاظ سے سزا کی مستحق ملکہ عالیہ ٹھہرتی ہیں۔

شہنشاہ کی سٹی گم ہو گئی، حواس باختہ ہو گیا۔ اپنی دانست میں اس نے اپنے قتل کا فیصلہ سنا کر نور جہاں کو بچا لیا تھا مگر قانون شریعت آڑے آ گیا۔ آنکھ کے بدلے آنکھ، ہاتھ کے بدلے ہاتھ اور جان کے بدلے جان

پھر ایک پنڈت اٹھا۔ بادشاہ کے سامنے جھک کر زمین کو چوما اور ہاتھ جوڑ کر گویا ہوا۔ اگرچہ میں اسلام سے بیگانہ ہوں، تاہم جس حد تک میں نے مطالعہ کیا ہے اس کی روشنی میں کہتا ہوں کہ اسلام میں خون کا بدلہ صرف خون ہی نہیں ہے۔ اس کے لئے خون بہا کا بھی قانون موجود ہے۔ میں نے ہمیشہ اس قانون کا مذاق اڑایا ہے لیکن آج پہلی مرتبہ محسوس کیا ہے کہ یہ قانون کتنا اہم اور کتنا مفید ہے۔ شہنشاہ کو مارا جائے یا ملکہ معظمہ کو تہہ تیغ کیا جائے۔ دھوبی کی بیوہ ساری زندگی پریشان ہی رہے گی۔ لیکن اسے خون بہا کے طور پر وہ رقم دے دی جائے جو اسلامی شریعت نے مقرر کی ہے تو بڑی حد تک اس کے آنسو پونچھے جا سکیں گے اور اس کی پریشانی کو دور کیا جا سکے گا۔

شہنشاہ نے استفہامیہ نظروں سے مفتی کی طرف دیکھا
جائز ہے۔ مفتی نے کہا۔ مقتول کی بیوہ اور اولاد خون
لینے پر راضی ہوں تو اس کے جواز سے انکار نہیں
جا سکتا۔

وزیر نے لپک کر رامو کی بیوہ کے پاؤں پکڑ لئے
پہلے تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہا جا رہا ہے۔
جب یہ معلوم ہوا کہ اسے ایک بڑی رقم پیش کی جا
ہے تو اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ رقم دو یا نہ
بادشاہ یا ملکہ دونوں میں سے میں کسی کی جان نہیں
چاہتی۔ میں زور زبردستی یا لالچ کے بغیر اپنے
خون معاف کرتی ہوں۔

دربار اللہ اکبر اور مرحبا کے نعروں سے گونج اٹھا۔

دھوبن کو خون بہا کی رقم دی گئی..... اور اس کے بعد
پر انعامات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ کیا ہندو، کیا مسلمان
دربار میں جتنے بھی افراد تھے انہوں نے اپنی جیبیں خا
کر دیں۔ شاہ بیگم نے جو نور جہاں کی سوکن اور راجہ بھگوان
داس کی بیٹی تھی، دس ہزار طلائی اشرفیاں پیش کیں اور
نور جہاں نے خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے دھوبن کو زر
نقد اور بیش قیمت زیورات کے علاوہ تین گاؤں نذر کئے۔

جس پنڈت نے خون بہا کا حوالہ دیا تھا وہ بھی انعام
مستحق ٹھہرا مگر اس نے کہا۔ سب سے بڑا انعام مجھے
ایمان کی صورت میں مل چکا ہے۔ میں اسلام کی حقانیت
قائل ہو گیا ہوں اور صمیم قلب سے کلمہ پڑھتا ہوں، تم سب
گواہ رہنا۔

پھر اس نے کچھ اس طرح کلمہ پڑھا کہ پورا دربار توحید
کی شراب سے سرشار ہو گیا۔

مبارک سلامت سے فرصت ملی تو جہانگیر قلعہ میں گیا اور
نور جہاں کو گلے سے لگا کر وہ جملہ کہا جو تاریخ کا ایک حصہ
بن چکا ہے۔

اس نے کہا تھا۔ تو اگر کشتہ شدی، آہ چہ می کردم من۔
یعنی تمہیں سزا کے طور پر ختم کر دیا جاتا تو خدا جانے میرا

کیا حشر ہوتا۔

☆

کثرت شراب نوشی کے باعث جہانگیر کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ دمے کے دورے پڑنے لگے تھے اور ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ سا بن کر رہ گیا تھا۔ اطباء کے مشورے پر نور جہاں اسے تبدیلی آب و ہوا کے لئے کشمیر لے گئی۔ دو شاہی طبیب بھی ہمرکاب تھے۔

سری نگر پہنچ کر کافی افاقہ ہوا۔ جہانگیر، نور جہاں کے سہارے کے بغیر چلنے پھرنے لگا۔ شراب نوشی بھی جس حد تک ممکن ہو سکا کم کر دی۔ پھر ایک روز اچانک واپسی کا قصد کر لیا۔ طبیبوں نے بہت کہا کہ کچھ روز اور ٹھہر جائیں لیکن وہ بچپن ہی سے بلا کا ضدی واقع ہوا تھا کسی کی نہ سنی۔

واپس آتے ہوئے راجوری کے مقام پر دمے کا دورہ پڑا۔ دو دن تک تڑپتا رہا۔ تیسرے روز وہیں وفات پائی۔ نور جہاں اسکی نعش کو لے کر لاہور آئی اور اپنی نگرانی میں اس کا عالیشان مقبرہ بنوایا۔

عوام اور خواص دونوں کا خیال تھا کہ نور جہاں مطلب پرست ہے اور جہانگیر سے محض دکھاوے کی محبت کرتی ہے۔ کوئی شخص بھی یہ باور کرنے کے لئے تیار نہیں تھا کہ عورت پہلے شوہر کے مقابلے میں دوسرے شوہر سے زیادہ محبت کر سکتی ہے۔ مقبرے کی تعمیر کے دوران بھی اسی قسم کی چہ می گوئیاں ہوتی رہیں۔ مقبرہ تعمیر ہونے کے بعد نور جہاں نے اعلان کیا کہ مرتے دم تک وہیں رہے گی اور مقبرے کی مجاوری کرے گی۔ تب کہیں لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور انہیں یقین آیا کہ وہ حقیقت میں جہانگیر کی عاشق زار تھی۔

خرم نے جو شاہجہاں کے نام سے تخت شاہی پر بیٹھ چکا تھا، اسے قلعہ میں لے جانے اور مراعات و اعزازات دینے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں اپنے شوہر کو تنہا چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ لاڈلی بیگم کی منت سماجت پر چند روز کے لئے اس کے گھر جانے پر تیار ہوئی لیکن قافلہ لاہور سے باہر نہیں نکلا تھا کہ بے اختیار روتی ہوئی مقبرے پر واپس آ گئی۔ بیٹی سے کہا۔ سفر میں، حضر میں، خلوت میں، جلوت میں جہاں پناہ مجھے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے۔ تم نظروں کے سامنے نہ ہو تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔ جب تک سانس ہے، میں ان کی نظروں کے سامنے ہی رہنا چاہتی ہوں۔

جہانگیر کی وفات کے بعد اس نے اٹھارہ سال تک مقبرے کی مجاوری کے فرائض انجام دیئے۔ روزانہ پابندی سے فجر کے وقت بیدار ہو کر مقبرے میں جھاڑو لگاتی، مزار کو دھوتی، تازہ پھول چڑھاتی اور دن بھر اس بات کا خیال رکھتی کہ مقبرہ صاف ستھرا رہے۔ جہاں گرد دیکھتی، جھاڑن لے کر وہیں پہنچ جاتی۔ شام کو پابندی سے مزار کے سرہانے چراغ روشن کرتی اور وہیں مزار کی پائینتی پر سر رکھ کر سو جاتی۔

ایک روز سو کر اٹھی، معمول کے مطابق مقبرے میں جھاڑو لگائی، مزار کو غسل دیا، پھر مالی کی بیوی کو بلا کر کہا۔ آج سے تم روزانہ شام کو مزار پر چراغ روشن کرو گی اور صبح کو پورے مقبرے کی جھاڑو دو گی۔ یہ نولکھا ہار میں نے آج ہی کے لئے سنبھال کر رکھا تھا۔ اپنی محنت کا پیشگی معاوضہ سمجھ کر اسے اپنے پاس رکھ لو۔

دوپہر کے وقت لاہور کے ایک مجتہد کو بلا کر وصیت کی کہ میرا مقبرہ سادہ سا بنایا جائے اور میری قبر پر کوئی کتبہ نصب نہ کیا جائے۔ اسی روز سورج غروب ہونے سے پہلے وہ سونے کے لئے لیٹ گئی..... کوئی بیماری نہیں تھی، کوئی عارضہ لاحق نہیں ہوا تھا لیکن ایسی سوئی کہ کسی کے اٹھائے نہ اٹھی۔

☆☆☆

بخت آور

راشد سعید

"اب دیکھ لیا آپ نے- یہ فلیٹ گزشتہ چھ ماہ سے بند ہے- وہ یہاں نہیں آسکتی-" جمعدار نے کہا اور دروازہ بند کرنا چاہا- "ٹھہرو- ایک منٹ-" میں نے کہا- "وہ یہیں آئی تھی-" پھر میں نے کمرے کے اندر جاکر اسے پکارا- "ہیلن ..... ہیلن-"

"جناب کچھ عقل سے کام لیجئے- جب یہاں کوئی نہیں ہے تو پھر کوئی شخص جواب کیسے دے سکتا ہے؟"

"وہ یہاں آئی ہے- ٹھہرو مجھے تسلی کرلینے دو-" میں نے کہا- "جب نیچے سے اس نے گھنٹی بجائی تھی تو شیشے کا دروازہ کھل گیا تھا-"

"ممکن ہے انہوں نے کسی اور فلیٹ کی گھنٹی بجادی ہو- معلوم نہیں کیوں آپ کے دماغ میں ای ۴۵ جم گیا ہے- اس فلیٹ سے نچلے دروازے کو نہیں کھولا جاسکتا-"

ایک پرتجسس تحریر، جسے پڑھتے ہوئے آپ کو اپنے گردوپیش کا خیال نہ رہے گا

اس کی صورت دیکھ کر تو مجھے کبھی غصہ نہیں آتا تھا البتہ یہ بات باعث برہمی ضرور ہوتی تھی کہ وہ اپنے آفس سے سب سے بعد میں کیوں نکلتی ہے؟ بہر حال یہ کلفت بھی چند روز تھی اور اس کے بعد ہم شادی کرنے والے تھے اور میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ وہ شادی کے بعد ملازمت برقرار رکھے-

میں بے چینی سے فٹ پاتھ پر ٹہل رہا تھا- حد یہ ہے کہ اس کا سخت گیر باس بھی عمارت سے نکل آیا اور ایک طرف کو چل پڑا- پھر اس کی صورت دکھائی دی- اس کے بعد یہ محسوس ہونے لگا جیسے اس کے سوا دنیا میں کوئی نہ ہو- کائنات میں جیسے صرف ہم دو ہوں- دور دور تک کوئی اور نہ ہو- غالباً اسے ہی محبت کہتے ہیں-

اس کی آنکھیں شربتی، ہونٹ یاقوتی اور بال شہد جیسی رنگت کے تھے- اس لیے تو میں اسے دل دے بیٹھا تھا- وہ اس وقت نیلا اسکرٹ، گلابی بلاؤز اور نیلی جیکٹ پہنے ہوئے- اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا- جب میرے قریب پہنچی تو میں نے کہا- "یہ کیا ہے؟"

"اوہ رالف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم کافی دیر سے کھڑے تھے- میں نے بہت جلدی کی لیکن .... ہاں یہ پیکٹ ہے- میں نے مسٹر کروگر سے وعدہ کرلیا ہے کہ جاتے ہوئے اسے مارٹن اسٹریٹ کے ایک فلیٹ پر پہنچادوں گی-"

"لیکن ہم یہاں سے گھر تو نہیں جارہے ہیں- میرا پروگرام یہ ہے کہ تمہیں ایک اچھے سے ریستوران میں کھانا کھلاؤں گا اس کے بعد فلم دکھاؤں گا- میں نے دو ٹکٹ بک کرالیے ہیں- لیکن ایسا لگ رہا ہے کہ اس کام میں دیر لگے گی-"

"قطعی دیر نہیں لگے گی اور ہم کھانا بھی کھالیں گے-" اس نے دلاسا دیا- "مارٹن اسٹریٹ پر اپارٹمنٹ نمبر ای-۴۵ میں جانا ہے- وہاں مسٹر گیفورڈ کو یہ پیکٹ دینا ہے-"

"ہیلن تم نے دن گنے، کتنے رہ گئے ہیں؟"

"صرف تیرہ دن رہ گئے ہیں ہماری شادی میں- صرف تیرہ دن رہ گئے ہیں-" اس نے خوشی سے گنگنا ہو کر کہا-

ہم اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے مارٹن اسٹریٹ پر پہنچ گئے- اور وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا- ہم اس عمارت کے بیرونی ہال میں چلے گئے جہاں سے تین زینے اوپر چلے گئے تھے- اس میں ایک شیشے کا دروازہ بھی

تھا جسے مکین اپنے مہمانوں کے لیے کھلوا سکتے تھے؟ ورنہ وہ کھل ہی نہیں سکتا تھا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم یہ پیکٹ چوکی دار کے حوالے کردو اور یہاں سے چلو۔“ میں نے تجویز پیش کی۔

”یہاں تو کوئی چوکی دار نظر ہی نہیں آرہا ہے۔“ اس نے گرد و پیش پر نظر ڈال کر کہا۔ ”اور یہ پیکٹ میں خود دے کر آتی ہوں۔ اس کی رسید بھی تو لانا ہے۔“ اس نے لیٹر بکس دیکھ کر کہا۔ ”یہ رہا ای ۴۵ مگر اس کا کارڈ گر گیا ہے.... خیر کوئی حرج نہیں ہے...“ اس نے برابر والا بٹن دبایا تو شیشے کا دروازہ کھل گیا۔ اس نے مڑ کر میرا بوسہ لیا اور بولی۔ ”واپس آکر ایک اور لوں گی۔“

شیشے کا دروازہ کھلا تو وہ اندر چلی گئی۔ دروازہ لاک ہوگیا۔ لفٹ نیچے آئی تو وہ اس میں بیٹھ گئی۔ پھر خود کار لفٹ چلی گئی اور ہم ایک دوسرے سے کٹ گئے۔

وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تو میں نے دیوار سے بایاں شانہ ٹکالیا اور ایک سگریٹ سلگالیا۔ جب بایاں شانہ درد کرنے لگا تو دائیں سے ٹیک لگالی۔ جب دونوں درد کرنے لگے تو سیدھا ہوگیا اور پیٹھ دیوار سے ٹکالی۔ میں نے اس سے پہلے کبھی یہ حساب نہیں لگایا تھا کہ میں ایک سگریٹ کتنی دیر میں پیتا ہوں۔ مگر اس روز ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سگریٹ پیتے ہوئے مجھے طویل عرصہ گزر گیا ہو۔ بالآخر میں نے اسے فرش پر گرا کر بوٹ سے مسل دیا۔

”آخر اتنی دیر سے وہ کیا کر رہی ہے؟ کہیں کافی پینے تو نہیں بیٹھ گئی؟“

تھوڑی دیر بعد ایک پوسٹ مین آیا اور لیٹر بکسوں میں ڈاک ڈال کر چلا گیا۔ اس کے بعد ایک خاتون اپنے بیٹے کے ساتھ آئی۔ اس نے اپنے لیٹر بکس سے ڈاک نکالی اور زینوں کی طرف چلی گئی۔ مجھ پر جب انتظار بھاری گزرنے لگا تو میں نے فرش پر بنے دائرے، مثلث اور مربع گننا شروع کردیے۔ اس سے بھی اکتا گیا تو میں نے دوسرا سگریٹ سلگایا اور اس کے بعد گھنٹی بجانے لگا تاکہ وہ اس کی آواز سن کر نیچے آجائے۔

میں نے تین بار گھنٹی بجائی، مگر دروازہ نہیں کھلا۔ معلوم نہیں وہ اسے جان بوجھ کر نظر انداز کر رہے تھے یا پھر اس کی آواز وہاں تک نہیں پہنچی تھی۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ کہیں گھنٹی خراب تو نہیں ہوگئی۔ میں نے اتنی دیر کے لیے اس پر انگلی رکھی تھی کہ پڑوسی تک جاگ گئے ہوں گے۔

میں اسی ادھیڑ بن میں مبتلا تھا کہ اچانک خیال آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی اس کے ساتھ زیادتی کر رہا ہو۔ اس قسم کے واقعات امریکہ میں بہت ہوتے رہتے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ میں خود جا کر اسے دیکھوں۔

میں نے ایک بٹن دبایا تو شیشے کا دروازہ کھل گیا، میں اندر چلا گیا۔ جب لفٹ نیچے آگئی تو اس میں جا کر میں نے چوتھی منزل کا بٹن دبادیا۔ راہ داری میں پہنچ کر پہلے میں مخالف سمت میں گیا۔ وہاں کوئی بھی دروازہ نہیں کھلا تھا۔ اس کا مطلب یہ کہ میں نے کسی اور منزل کی گھنٹی بجادی تھی۔

ای ۴۵ پر پہنچ کر میں نے دروازے سے کان لگادیے۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ کمرے ساؤنڈ پروف بھی نہیں تھے اس لیے کہ ایک فلیٹ سے ریڈیو کی آواز آرہی تھی۔

پھر میں نے اطلاعی گھنٹی بجائی۔ اس کی آواز اندر گونجی۔ میں منتظر تھا کہ کب دروازہ کھلے گا اور کوئی شخص باہر جھانک کر دیکھے گا۔ میں اس سے کہوں گا۔ ”ذرا وہ محترمہ جو اندر بیٹھی ہیں ان سے کہیے کہ آپ کے منگیتر باہر انتظار فرما رہے ہیں۔ کیا ارادے ہیں؟ چلیے گا یا نہیں؟ کیا میں ساری رات باہر ہی ٹہلتا رہوں گا؟“

متعدد بار گھنٹی بجانے پر بھی دروازہ نہیں کھلا تو میں نے جھنجلا کر دروازے پر لاتیں مارنا شروع کردیں۔ اس پر بھی کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ البتہ اس راہ داری میں دوسرے دروازے کھلنا شروع ہوگئے اور لوگوں نے جھانکنا شروع کردیا۔ میں نے سوچا یقیناً ہیلن کے ساتھ کچھ ہوگیا ہے۔

کوئی واقعہ پیش آگیا تھا اس لیے جمعدار کو بلا کر لانا چاہیے تاکہ وہ دروازہ توڑ دیتا۔ میں نے لفٹ کا انتظار نہیں کیا اور زینوں کی طرف لپکا۔

جمعدار عمارت کے تہ خانے میں تھا۔ وہ اپنا کھانا، کھانے ہی جا رہا تھا کہ میں پہنچ گیا۔ ”کھانا بعد میں کھانا پہلے میرے ساتھ آؤ۔ اگر فلیٹوں کی چابیاں ہوں تو لیتے آؤ۔ تم سے ایک فلیٹ کا دروازہ کھلوانا ہے۔“

”کیا کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے جناب؟“ اس نے چونک کر کہا۔

”میری منگیتر ہیلن ایک فلیٹ میں پیکٹ لے کر گئی تھی۔ ابھی تک واپس ہی نہیں آئی۔“ میں نے کہا۔

وہ بادل ناخواستہ اٹھا۔ پھر اس نے چابیوں کا گچھا بھی لے لیا۔ اس کی رفتار سست تھی اس لیے مجھے الجھن ہو رہی تھی۔ وہ لفٹ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر زینوں کی طرف کھینچا۔ ”وہ کون سی منزل پر ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”چوتھی منزل پر۔“

وہ طوعاً و کرہاً میرے ساتھ گھسٹتا ہوا اوپر تک گیا۔ جب میں نے اسے ای ۴۵ کے سامنے جا کر کھڑا کردیا تو اس نے کہا۔ ”یہ نہیں ہوسکتا۔“

”کیوں نہیں ہوسکتا؟“ میں نے بگڑ کر کہا۔

”بس نہیں ہوسکتا۔“ اس نے بہ ضد ہو کر کہا پھر چابیوں کے گچھے میں سے ایک چابی نکال کر دروازہ کھول دیا اور ایک طرف ہٹ گیا تاکہ میں خود دیکھ لوں، مگر تاریکی تھی اس لیے کچھ نظر نہیں آیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ آن کردیا۔ کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ وہ بالکل خالی تھا۔ اور وہاں ہر ایک چیز پر گرد جمی ہوئی تھی۔ فرش پر قالین کا نشان تھا۔ دیواروں پر کیلوں کے نشانات تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہاں کبھی تصویریں ٹنگی رہتی ہوں گی۔ کمرے کے در و دیوار سے سیلن زدہ بو آرہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کافی دنوں سے بند ہو۔

”اب دیکھ لیا آپ نے۔ یہ فلیٹ گزشتہ چھ ماہ سے بند ہے۔ وہ یہاں نہیں آسکتی۔“ جمعدار نے کہا اور دروازہ بند کرنا چاہا۔

”ٹھہرو۔ ایک منٹ۔“ میں نے کہا۔ ”وہ یہیں آئی تھی۔“ پھر میں نے کمرے کے اندر جا کر اسے پکارا۔ ”ہیلن.... ہیلن۔“

”جناب کچھ عقل سے کام لیجیے۔ جب یہاں کوئی نہیں ہے تو پھر کوئی شخص جواب کیسے دے سکتا ہے؟“

”وہ یہاں آئی ہے۔ ٹھہرو مجھے تسلی کر لینے دو۔“ میں نے کہا۔ ”جب نیچے سے اس نے گھنٹی بجائی تھی تو شیشے کا دروازہ کھل گیا تھا۔“

”ممکن ہے انہوں نے کسی اور فلیٹ کی گھنٹی بجادی ہو۔ معلوم نہیں کیوں آپ کے دماغ میں ای ۴۵ جم گیا ہے۔ اس فلیٹ سے نچلے دروازے کو نہیں کھولا جاسکتا۔“

”ٹھہرو۔ مجھے اطمینان کر لینے دو۔“ میں نے کہا۔ ”زیادہ قوت کا بلب لے کر آؤ، تاکہ یہاں مناسب روشنی ہوسکے۔“

وہ شانے جھٹک کر بڑبڑانے لگا۔ پھر میری تسلی کے لیے اس نے راہ داری سے ایک بلب نکالا اور کمرے میں لے جا کر لگادیا۔ وہاں مناسب روشنی ہونے لگی۔ وہ دو کمروں کا فلیٹ تھا جس میں ایک باتھ روم اور کچن بھی تھا۔ کھڑکیوں پر گرد جمی تھی اور اطلاعی گھنٹی کے سوئچ پر مکڑی نے جالا بن دیا تھا۔

دائیں جانب ایک وارڈ روب تھا۔ میں نے اس کے نزدیک جا کر اس کا دروازہ کھولا تو اس میں ایک ہینگر لٹکتا دکھائی دیا۔ اس کے علاوہ کونوں کھدروں میں کیڑے مکوڑے تھے۔

”آپ کیسے آدمی ہیں جو اپنی عقل سے کام نہیں لے رہے ہیں۔“ جمعدار نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”ہیلن اگر یہاں ہوتی تو آپ کو ضرور جواب دیتی۔“

میں نے اپنا ہیٹ اتار کر ہاتھ میں لے لیا۔ سمجھ میں نہیں

آ رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ جمعدار کا خیال تھا کہ ہیلن مجھے دھوکا دے کر گھر پہنچ گئی ہے۔ جب میں گھر جاؤں گا تو وہ مجھے دیکھ کر خوب ہنسے گی۔ ''احمق آدمی'' میں نے غصے سے کہا۔ ''جب وہ یہاں سے نکل کر گئی نہیں ہے تو پھر گھر پہنچنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟''

''مگر جناب وہ اندر بھی نہیں ہو سکتی۔''

''کیا اس عمارت کا کوئی عقبی دروازہ ہے؟''

''نہیں۔''

''یہاں گیلورڈ نام کا کوئی شخص رہتا ہے؟''

''گزشتہ دس سال سے اس نام کا کوئی شخص یہاں نہیں آیا ہے۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہاں کوئی چھپا بیٹھا ہو۔ اور جب وہ دروازہ کھول کر.....''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔'' اس نے دخل در معقولات کر کے کہا۔ ''دروازہ تو لاک تھا۔ میں نے آپ کی نظروں کے سامنے اسے کھولا تھا۔ وہ اندر کیسے جا سکتی ہے؟''

''آؤ دوسرے لوگوں سے پوچھتے ہیں، ممکن ہے وہ کسی اور فلیٹ کی طرف چلی گئی ہو۔''

وہ شانے ہلا کر رہ گیا کہ میں چاہوں تو اپنا اطمینان کر سکتا ہوں۔ میں نے پہلے دائیں طرف کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس طرف سے ایک نوجوان عورت نکلی لیکن اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں نے دوسری طرف کے دروازے پر دستک دی یہاں بھی ایک بڑھیا نے نکل کر وہی جواب دیا۔ ''ہاں میں نے گھنٹی کی آواز ضرور سنی تھی۔''

''وہ تو میں نے ہی بجائی تھی۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔ پھر میں نے دوسروں سے پوچھا، لیکن کسی نے امید افزا جواب نہیں دیا۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس کے بالکل نیچے والے فلیٹ پر کسی نے کوئی آہٹ سنی ہو۔'' میں نے جمعدار کو زینوں کی طرف گھسیٹا۔ وہ ناچار میرے ساتھ چلا گیا۔ ایک منزل نیچے والے فلیٹ کی گھنٹی بجانے پر کسی نے دروازہ کھولا۔ ''ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ کہیں گئے ہوئے ہوں۔'' جمعدار نے ماسٹر کی سے دروازہ کھولا تو اس کی تصدیق ہو گئی۔ وہ فلیٹ خالی تھا۔ اس کے مکین کہیں گئے ہوئے تھے۔ ''اب آپ گھر جائیے۔'' جمعدار نے کہا۔ ''کھانا، کھانے دیجیے۔'' میں وہاں سے اس طرح کیسے جا سکتا تھا۔ میں سڑک پار کر کے گیا اور ایک کانسٹیبل بلا لایا۔ وہ کانسٹیبل بھی یوں ہی سا تھا۔ اس نے مجھ سے سرسری سوالات کیے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ میری خاطر بچا کر کہیں چلی گئی ہے۔ ''اس نے گھنٹی بجائی اور اوپر چلی گئی۔'' میں نے کہا۔

''مگر آپ نے اسے ای ۴۵ میں داخل ہوتے تو نہیں دیکھا تھا؟''

''نہیں۔''

''جمعدار کا کہنا ہے کہ فلیٹ کئی مہینوں سے بند ہے اس لیے آپ کی منگیتر ہیلن اس میں داخل نہیں ہو سکتی۔'' وہ بولا۔

پھر اس نے میرے اطمینان کی خاطر ہر فلور پر جا کر ہر فلیٹ کی گھنٹی بجائی اور ہیلن کے بارے میں پوچھا۔ لیکن ہر جگہ سے مایوسانہ جواب ملا۔ تین فلیٹوں کے مکین باہر گئے ہوئے تھے، کانسٹبل نے ان فلیٹوں کے دروازے کھلوا کر تلاشی لی لیکن وہاں ہیلن تو درکنار اس کا سایہ تک نظر نہیں آیا۔

''میرا کام تو ختم ہو گیا۔'' کانسٹیبل نے مجھ سے کہا۔ ''لیکن ممکن ہے کوئی پہلو میں نے نظر انداز کر دیا ہو اس لیے ہیڈ کوارٹر سے میں ایک سراغ رساں کو بلوائے لیتا ہوں۔''

میں نے اس سے اتفاق کیا۔ اس نے جا کر ایک جنرل اسٹور سے فون کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک نوجوان آ گیا۔ اس کا نام پائرس تھا۔ اس نوجوان کی آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ اس نے اپنے انداز سے تحقیق و تفتیش کی اور

لوگوں سے سوالات کیے، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

''میرا خیال ہے کہ لڑکی یہاں نہیں آئی ہے۔'' اس نے تھک ہار کر حتمی لہجے میں کہا۔

میں نے اسے بتایا کہ ہیلن نے فلیٹ ای ۴۵ کی گھنٹی بجائی تھی اور جب دوسری طرف سے بٹن دبایا گیا جب ہی تو شیشے کا دروازہ کھلا اور وہ اوپر تک گئی۔

''وہ آپ کے ساتھ یہاں نہیں آئی ہے۔'' سراغ رساں پائرس نے کہا۔ ''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔'' اس نے ایک نئی بات کہہ دی۔

میں اس کی بات پر گھبرا گیا۔ پھر میں نے جیب سے دو ٹکٹ نکال کر اسے دکھائے۔ ''ہم دونوں یہاں سے فلم دیکھنے جا رہے تھے۔''

''ٹھیک ہے تو پھر ہم ابتدا سے سراغ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کا نام آپ نے ہیلن فیراڈے بتایا تھا نا؟''

''ہاں۔''

''اس کا پتا؟'' اس نے اپنی ڈائری جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔

''۱۳۰ فریکٹ اسٹریٹ۔''

''حلیہ؟''

اس کا حلیہ بیان کرتے وقت میرا دل بھر آیا۔ سراغ رساں نے مجھے دلاسا دیا۔ ''حوصلہ رکھیے۔'' اس نے میرا شانہ تھپک کر کہا۔ ''اچھا تو آپ اس سے فرگوسن اسٹریٹ پر ملے پھر وہ ایک پیکٹ لے کر یہاں آئی۔ وہ کہاں کام کرتی ہے؟''

''ریڈ اسٹار نامی ایک ادارے میں کام کرتی ہے جسے ایک شخص کروگر چلاتا ہے۔''

''یہ ادارہ کیا کرتا ہے؟''

''صحیح طور پر معلوم نہیں۔ ہیلن نے بتایا تھا کہ وہاں صبح و شام کے سارے اخبارات آتے ہیں اور وہ ان کے تراشے کاٹ کر جمع کرتے ہیں۔ اپنے گاہکوں کے نام وہ ایک رجسٹر میں لکھ کر محفوظ رکھتے ہیں۔ جب ان شخصیتوں کے تراشے کافی ہو جاتے ہیں تو وہ انہیں ارسال کر دیتے ہیں۔ سو تراشوں کی قیمت ایک ڈالر ہے۔ یہ قیمت ادا کرتے ہوئے کسی کو تامل نہیں ہوتا۔'' میں نے بتایا۔

''اس سے ان لوگوں کو کیا آمدنی ہو جاتی ہے؟''

''معلوم نہیں۔ مگر وہ لوگ ہیلن کو معقول تنخواہ دیتے تھے۔''

''میرا خیال ہے کہ وہاں چل کر دیکھ لیتے ہیں کہ وہ کیسا ادارہ ہے؟'' سراغ رساں پائرس نے تجویز پیش کی۔ میں نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔ ہم دونوں اس جگہ گئے جہاں ہیلن کے ادارے کا آفس تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو آفس بند ہو چکا تھا۔ پائرس نے اپنا کارڈ چوکی دار کو دکھایا۔ اور اسے حکم دیا کہ وہ آفس کا تالا کھولے۔ چوکی دار نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ وہ آفس سے زیادہ گودام معلوم ہوتا تھا۔ ہر طرف اخبارات اور تراشوں کی فائلیں تھیں۔ وہ ایک بڑا سا کمرا تھا جہاں تین چار میزیں تھیں۔ کمرے میں کھڑکیاں نہیں تھیں۔ البتہ ایک بڑا سا روشن دان تھا۔ ایک میز پر فون رکھا تھا جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کروگر کی میز ہو سکتی ہے۔ دائیں جانب چند کیبنٹس تھیں جن میں فائلیں بھری ہوئی تھیں۔

''آفس سے زیادہ یہ کباڑ خانہ معلوم ہوتا ہے۔'' پائرس نے تبصرہ کیا۔

میں نے ایک کیبنٹ کھول کر دیکھا اور اس کی فائل اٹھالی۔ فائل کی ورق گردانی کرنے پر معلوم ہوا کہ اس میں بھی تراشے بھرے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بہت سی چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا لیکن کہیں سے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ ہیلن وہاں ملازمت کرتی ہے۔ چوکی دار اس کی گواہی نہیں دے سکتا تھا اس لیے کہ جب آفس کے سارے لوگ چلے جاتے تھے اور ہیلن بھی گھر کو روانہ ہو جاتی تھی تو چوکی دار وہاں آتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ہیلن کو جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکا ہوگا۔

لفٹ آپریٹر بھی کچھ نہیں بتا سکتا تھا اس لیے کہ ہیلن لفٹ کے سامنے سے نہیں گزرتی تھی- سراغ رساں پائرس نے وہاں سے کروگر کا پتا لیا اور پھر چلتے وقت ایک چاقو سے اس کی میز کے ایک پائے میں لگی ہوئی کوئی چیز کھرچ کر اپنی جیب میں ڈال لی- ''آؤ اب اس کے مکان پر چلتے ہیں- ممکن ہے وہ ہیلن کی گم شدگی پر کوئی روشنی ڈال سکے-''

اس کا بنگلا آسولڈ ایونیو پر تھا- اس کی طرز تعمیر جاپانی انداز کی تھی- اور اس کی کھڑکیوں پر دبیز پردے تھے-

''کبھی اس سے ملاقات کا اتفاق ہوا ہے؟'' اس نے مجھ سے سرگوشی میں سوال کیا-

''نہیں البتہ میں اسے شکل سے پہچانتا ہوں-'' میں نے تھوک نگل کر کہا- ایک بار پھر مجھے احساس ہونے لگا کہ میرا کیس بہت کم زور پڑتا جا رہا ہے- پائرس نے اطلاعی گھنٹی بجائی تو ایک گنجا اور بوڑھا شخص نمودار ہوا- اس نے ہماری بات سن کر انتظار کرنے کو کہا اور پھر اندر چلا گیا- تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ آیا اور اس نے ہمیں چلنے کو کہا-

ہم ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے- وہاں ایک نوجوان شخص جو اکڑے ہوئے جسم کا مالک تھا' چشمہ لگائے ایک کتاب ہاتھ میں تھامے صوفے پر بیٹھا ہمارا انتظار کر رہا تھا- اس کے سر کے بال سیاہ تھے اور نقوش جاذب نظر-

''آپ نے انہیں پہلے کبھی دیکھا ہے؟'' پائرس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا-

''نہیں- اس نے کیا کیا ہے؟'' وہ مسکرا کر بولا- اس کی دونوں آنکھوں کے نیچے ہلکے نشانات تھے- مسلسل چشمہ لگانے سے ایسے نشانات بن جاتے ہیں-

''آپ کسی ایسے شخص کو جانتے ہیں جس کا نام گیفورڈ ہے اور جو مارٹن روڈ پر رہتا ہے؟'' سراغ رساں پائرس نے دوسرا سوال کیا-

اس شخص گیفورڈ کا نام پتا ہمیں تراشے جمع کرنے والی کمپنی کی کس فائل سے نہیں مل سکا تھا-

''نہیں البتہ ایک مسز مورگن ہیں جو شادی بیاہ اور [illegible] کے چکروں میں رہتی ہیں- ان کی طرف ہمارے تمیں [illegible] واجب الادا ہیں-''

''آپ نے چھ بجے مسٹر گیفورڈ کے پتے پر [illegible] پیکٹ دے کر بھیجا تھا؟''

''نہیں-'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا- میں لاشعو[illegible] طور پر آگے بڑھا لیکن سراغ رساں پائرس نے اشار[illegible] سے مجھے روک دیا- ''میں اس کی تصدیق ابھی کرائے[illegible] ہوں-'' وہ بولا- پھر اس نے بلند آواز میں کہا- ''[illegible] ذرا یہاں آنا-''

برابر کے کمرے سے ٹائپ رائٹر کی کھڑکھڑاہٹ آر[illegible] تھی- وہ تھم گئی پھر کرسی کھسکانے کی آواز آئی- ''ہیلن [illegible] میں نے زیر لب کہا- ''اگر ہیلن یہاں ہے تو میں خواہ[illegible] پریشان ہو رہا تھا-''

''ہیلن میری اسسٹنٹ ہے اور ہر کام میں میری مدد کر[illegible] ہے- آج اتفاق سے کام زیادہ تھا اس لیے میں نے اسے یہاں بلایا-'' کروگر کہہ رہا تھا-

قدموں کی آواز آئی- ملحقہ کمرے سے ایک لڑکی وہا[illegible] آ گئی- کروگر نے میری طرف اشارہ کر کے کہا- ''[illegible] انہیں جانتی ہو؟''

''جی نہیں-'' اس نے کہا-

مجھے حیرت تھی کہ اگر وہ واقعی ہیلن تھی- ایک لمحے [illegible] لیے مجھے چکر سا آ گیا- اگر سراغ رساں پائرس نے مجھے [illegible] سہارا نہ دیا ہوتا تو شاید میں گر پڑتا-

''یہ ہیلن نہیں ہے-'' میں نے سنبھل کر کہا- ''یہ شخص خواہ مخواہ اسے ہیلن کے نام سے پکار رہا ہے-''

''میرے آفس میں تو صرف یہی ایک لڑکی کام کر[illegible] ہے-'' کروگر نے سراغ رساں پائرس کی طرف دیکھ[illegible] ہوئے کہا- پائرس مجھے روکے ہوئے تھا ورنہ میں کروگر [illegible] جیسے دھوکے باز پر حملہ کر دیتا- وہ لڑکی جس کو کروگر نے [illegible] ہیلن کے نام سے پکارا تھا- تذبذب کے عالم میں وہاں [illegible]

کھڑی تھی جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہو کہ اسے کیا کرنا چاہیے-

''تم یہاں کب سے کام کر رہی ہو؟'' پائرس نے سوال کیا-

''اس سال اکتوبر سے؟''

''تمہارا نام ہیلن کارٹ لینڈ ہے؟''

''ہاں-'' اس نے مسکرا کر کہا- جیسے ہم لوگوں کو احمق سمجھتی ہو- اس نے ایک بڑا سا پرس اٹھا کر اسے کھولا- پرس استعمال شدہ تھا- پرس پر H.C لکھا تھا- اس نے پرس کھول کر ایک چیونگم نکالی لیکن ایک لفافہ بھی نکل کر فرش پر گر پڑا-

وہ کچھ جھینپ سی گئی-

سراغ رساں پائرس نے اس لفافے کو اٹھانے میں کوئی اضطراب ظاہر نہیں کیا، مگر اس لڑکی سے پہلے اسے اٹھا لیا- ہر چند کہ میری آنکھیں دھندلا رہی تھیں تاہم میں اس لفافے پر لکھے ایڈریس کو پڑھنے میں کامیاب ہو گیا- مس ہیلن کارٹ لینڈ ۱۳۰ افریکٹ اسٹریٹ-

پائرس نے لفافے سے ایک کاغذ نکال کر پڑھا اور اسے دوبارہ لفافے میں رکھ دیا-

لڑکی نے چیونگم کے دو ٹکڑے کیے- ایک ٹکڑا منہ میں رکھ لیا اور دوسرا اس کاغذ میں لپیٹنے لگی- پائرس نے لاشعوری طور پر اس طرح اپنی جیب پر ہاتھ مارا جیسے وہ بھی چیونگم تلاش کر رہا ہو- لڑکی نے اس بات کو محسوس کر لیا- وہ خوش دلی سے بولی- ''لیجیے- یہ لے لیجیے-''

''شکریہ- میرا منہ خشک ہو رہا ہے-'' اس نے چیونگم کا ٹکڑا لے کر منہ میں ڈال لیا- ''اچھا تو آپ مارٹن اسٹریٹ پر کوئی پیکٹ لے کر نہیں گئی تھیں؟''

''نہیں جناب مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ مارٹن اسٹریٹ کہاں ہے-''

تفتیش وہاں پر ختم ہو گئی- ہم دونوں باہر آ گئے- کار میں بیٹھتے وقت پائرس نے کہا- ''آپ کی منگیتر کس قسم کی چیونگم چباتی تھی؟''

''وہ چیونگم نہیں کھاتی تھی-'' میں نے اسے بتایا-

پائرس حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا- اس کے بعد اس نے منہ سے چیونگم کا وہ ٹکڑا نکالا جو سیاہ بالوں والی لڑکی سے لیا تھا- اس کے بعد جیب سے ایک کاغذ نکالا- اس میں بھی چیونگم کا ایک ٹکڑا لپٹا ہوا تھا- اس نے دونوں ٹکڑوں کی خوشبو سونگھ کر کہا- ''یہ ٹکڑا میں نے آفس کی میز کے نیچے سے کھرچ کر نکالا تھا- چیونگم کھا کر اس نے لاشعوری طور پر اسے میز کے نیچے چپکا دیا ہوگا- اس سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ وہ سیاہ بالوں والی لڑکی اسی آفس میں کام کرتی ہے- اس کے پرس میں وہ لفافہ بھی تھا جس پر اس کا نام اور پتا لکھا تھا- اب تم بتاؤ کہ کیا معاملہ ہے؟ کہیں تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے؟ کیا تم اس شخص کروگر کے خلاف کوئی سازش کر رہے ہو؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی سنہرے بالوں والی لڑکی تمہاری دوست تھی- تم نے اس کے ساتھ کوئی ایسی ویسی حرکت کر ڈالی- اب تم اپنا بچاؤ کرنے کے لیے یہ چکر چلا رہے ہو- ممکن ہے وہ کل پرسوں تک منظر عام پر آ جائے اور تمہیں ذلیل کرے-''

میرا سر ایک بار پھر چکرانے لگا- میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا- ''اوہ خدایا-'' اس نے میرا کالر پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا- ''سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ کیا ہو گیا- چند گھنٹوں پہلے وہ میری تھی مگر اب کہیں نہیں ہے- کوئی شخص میری بات پر اعتبار بھی نہیں کر رہا ہے-''

''اس سارے عرصے میں تم نے کسی ایسے شخص کو میرے سامنے پیش نہیں کیا جس نے تمہارے ساتھ اس سنہرے بالوں والی لڑکی کو دیکھا ہو-'' وہ رکھائی سے بولا-

''مجھے اس کا نام اور پتا کیسے ملا؟'' میں نے الٹا اسی سے سوال کیا-

''ٹھیک ہے- آؤ اس لڑکی کے گھر چلتے ہیں جسے تم اپنی منگیتر بنا رہے ہو-'' وہ بولا- پھر میری طرف یوں دیکھنے

اسے غائب کردیا ہے- جب گاڑی اس کے گھر کی طرف جانے لگی تو اس نے کہا- ''کیا وہ اپنے والدین کے ساتھ رہتی ہے؟''

''وہ ہارس برگ سے آئی ہے اور اس کے والدین ساتھ نہیں رہتے مگر اسے وہ مکان .....'' میں اچانک خاموش ہوگیا کیوں کہ اچانک مجھے یاد آیا تھا کہ اسے مکان کروگر نے دلایا تھا-

''تم اب اس کے گھر کی طرف چل رہے ہو یا پولیس اسٹیشن چلو گے؟'' اس نے سوال کیا- ''اگر تم مجھ سے چالاکی کروگے تو میں تمہیں اچھا سبق سکھاؤں گا-'' اس نے مٹھیاں بھینچ کر کہا-

''دیکھو- میری بات سنو-'' میں نے کہا- ''میں اس کے کمرے میں ایک بار دو تین منٹ کے لیے گیا ہوں- اس نے آئینے کے اوپر مقدس مریم کی ایک تصویر چپکا رکھی ہے- اس کے علاوہ کارنس پر ایک گڑیا رکھی ہے جو میں نے ہی اسے دی تھی- تم سن رہے ہو نا؟ کیا یہ سب باتیں میں نے گھڑلی ہیں؟''

اس اثنا میں' ہم مطلوبہ مکان پر پہنچ گئے- پائرس نے مالکہ مکان کو بلوایا-

''آپ کے مکان میں ہیلن کارٹ لینڈ نامی لڑکی رہتی ہے؟'' اس نے سوال کیا-

''ہاں چوتھی منزل پر-''

''کتنے عرصے سے؟''

''ہیلن یہاں چھ مہینے سے مقیم ہے-''

''اس کا حلیہ؟''

''اس کی آنکھیں سیاہ اور بال بھی سیاہ اور قامت اس نوجوان جتنی-'' بڑھیا نے کہا-

''میں ذرا اس کا کمرا دیکھنا چاہتا ہوں-'' پائرس بولا- ''میرا تعلق پولیس سے ہے-''

''آیئے- میرے پیچھے آجایئے-'' بڑھیا نے خوش خلقی اوپر پہنچ کر بڑھیا نے اس کا کمرا کھولا اور لائٹ آن کردی- مجھے ایک بار پھر چکر آنے لگا اس لیے کہ آئینے پر مقدس مریم کی کوئی تصویر تھی اور نہ ہی کارنس پر گڑیا رکھی تھی-

''کیا اس کمرے میں کوئی تبدیلی کی گئی ہے؟'' سراغ رساں نے سوال کیا-

''جی نہیں- ہمیشہ سے ایسا ہی رہتا ہے- وہ بہت صفائی پسند ہے- بس ایک عادت مجھے پسند نہیں ہے-'' اس نے کہا اور واش بیسن کی طرف گئی- اس کے نچلے حصے میں چیونگم کا ایک ٹکڑا چپکا ہوا تھا- اس نے پکڑا اور وہاں سے اکھاڑ کر سراغ رساں کے حوالے کردیا- پائرس نے اسے بھی کاغذ میں لپیٹ لیا اور سونگھ کر دیکھا- ''لکمبر'' اس نے زیر لب کہا-

''ارے! اپنے ساتھی کو سنبھالیے-'' بڑھیا نے چونک کر کہا-

پائرس نے میری کمر میں ہاتھ ڈال دیا اس طرح سے میں فرش پر گرنے سے بچ گیا- وہ مجھے شعلہ بار نگاہوں سے گھور رہا تھا-

''کیا اس نے ہیلن کو قتل کردیا ہے؟'' بڑھیا نے سوال کیا-

''نہیں- کسی اور لڑکی کو یہ نام اتفاق سے منتخب کرلیا ہے-''

''یہ دیکھنے میں تو قاتل نہیں لگتا-'' بڑھیا نے تبصرہ کیا-

اچانک میری نگاہ زینے کے قریب رکھی ہوئی ایک واکنگ اسٹک پر پڑی- غالباً کسی کرائے دار کی تھی- میں تیز قدمی سے اس طرف گیا اور میں نے اسے اٹھا کر پائرس پر وار کردیا- وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگا اور بڑھیا ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی- میں نے اس چھڑی کو ایک طرف اچھال دیا اور تیزی سے باہر بھاگا- باہر پہنچ کر میں دائیں جانب چلا گیا- آگے ایک موڑ تھا- میں اس طرف

مڑتا چلا گیا-

ایک بار پھر میں مارٹن اسٹریٹ پہنچ گیا- بالکل لاشعوری طور پر غالباً اس وجہ سے کہ آخری بار میں نے ہیلن کو وہیں دیکھا تھا- گلیوں گلیوں سے ہوتا ہوا میں وہیں پہنچ گیا-

میں نے جا کر تہ خانے کی گھنٹی بجائی تو جمعدار باہر آیا- وہ شب خوابی کا لبادہ پہن چکا تھا- ''ارے پھر آگئے! لڑکی ابھی تک نہیں ملی؟ اچھا وہ سراغ رساں صاحب کہاں گئے؟'' اس نے ایک ہی سانس میں بہت سے سوالات کیے-

''انہوں نے ہی مجھے دوبارہ یہاں بھیجا ہے-'' میں نے کہا- ''میرے ساتھ اوپر جانے کی ضرورت نہیں ہے بس مجھے ڈپلی کیٹ چابی دے دو-''

وہ میری باتوں میں آگیا اور اس نے چابی لاکر میرے حوالے کردی- میں اسے لے کر اوپر چلا گیا- میں وہ کمرا کھول کر اندر چلا گیا- پھر میں نے تلاش شروع کردی- مگر میں کیا تلاش کر رہا تھا یہ مجھے خود معلوم نہیں تھا- دیواریں ٹھونک کر دیکھیں کہ وہاں سے کوئی خفیہ دروازہ تو نہیں نکلتا؟ فرش کے ٹائلوں کو غور سے دیکھا اور اگر کہیں ہلکی سی درز بھی نظر آئی تو اسے ناخنوں سے اکھیڑنے کی کوشش کی، لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا-

ابھی مجھے وہاں آئے ہوئے دس منٹ گزرے تھے کہ میں نے زینوں پر قدموں کی آہٹ سنی- میں کمرے سے نکل کر اس طرف گیا تو میں نے پائرس کو ایک کانسٹیبل اور جمعدار کے ساتھ اوپر آتے دیکھا- ''وہ دس منٹ پہلے آپ کا نام لے کر مجھ سے چابیاں لے گیا تھا-''

جمعدار کہہ رہا تھا- پائرس کے سر پر پٹی بندھی تھی اور ہاتھ میں ریوالور تھا- وہ غضب ناک معلوم ہوتا تھا-

میں نے بجائے نیچے اترنے کے اوپر چڑھنا شروع کردیا- پائرس نے بھی یہ بات جان لی- اس نے چیخ کر کہا- ''بدمعاش نیچے آجاؤ ورنہ میں فائر کردوں گا-''

میں جانتا تھا کہ وہ خواہ مخواہ دھمکیاں دے رہا ہے- ورنہ جب میں اسے نظر ہی نہیں آرہا ہوں تو وہ مجھے گولی کیسے مارے گا؟ میں چھت پر پہنچ گیا- چھت کا دروازہ کھلا ہوا تھا حالانکہ اسے بند ہونا چاہیے تھا- ملحقہ عمارت کی چھت اس چھت سے تین فٹ بلند تھی- میں دوڑتا ہوا اس کے قریب گیا اور میں نے چھلانگ لگا کر اس پر چڑھنا چاہا لیکن ناکام رہا- میرا گھٹنا اس دیوار سے ٹکرا گیا- میں وہیں لڑھک کر گر پڑا- میری آنکھوں کے آگے شرارے ناچنے لگے- پیروں سے بھاری آوازیں نکالتا ہوا پائرس بھی وہاں آگیا-

اس نے مجھ پر دور ہی سے جست لگائی اور مجھے دبوچ لیا، لیکن پھر ساکت ہوگیا- میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو مجھے بھی وہ پیکٹ نظر آیا جو ہیلن وہاں مسٹر گیلورڈ کے لیے لائی تھی- وہ ہم سے چند گز کے فاصلے پر پڑا تھا-

پائرس میرے اوپر سے اٹھ گیا- وہ وقتی طور پر ساری دشمنی بھول گیا تھا- ہم بیک وقت اس پیکٹ کی طرف لپکے- اسے پھاڑنے پر اندر سے تراشے نہیں نکلے بلکہ تراشے کاٹنے کے بعد جو ردی بچ جاتی تھی وہ فالتو کاغذ بھرا تھا- یقیناً وہ جعلی پیکٹ اس لیے تیار کیا گیا تھا تاکہ ہیلن کو وہاں بھیجا جاسکے-

''اب تمہاری بات میرے لیے قابل قبول ہے-'' پائرس نے کہا- ''کہ اس سنہرے بالوں والی ہیلن کارٹ لینڈ کو یہاں بھیجا گیا جو ۱۳۰ فریکٹ اسٹریٹ پر رہتی ہے- جب وہ یہاں آئی تو اوپر سے بٹن دبا کر شیشے کا دروازہ کھول دیا گیا- جب وہ چوتھی منزل پر پہنچ گئی تو اسے اوپر لے جایا گیا- پھر اس چھت سے ملحقہ عمارت کی چھت پر اس کے بعد زینے استعمال کیے گئے اور اسے نیچے لے جاکر کسی کار میں بٹھا دیا گیا- جس کا انجن اسٹارٹ تھا- وہ کار یہاں سے چلی گئی اور تم نیچے کھڑے اس کا انتظار کرتے رہ گئے-'' اس نے کانسٹیبل سے کہا- ''اینڈرسن

تم نیچے جا کر فون کرو کہ کروگر کے مکان کی نگرانی کی جائے اب میں ذرا آفس دیکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ پولیس کار میں آیا تھا۔ جب وہ آفس کی طرف کار ڈرائیو کر رہا تھا تو میں نے اندیشے کا اظہار کیا اور کہا۔

"کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہیلن کو ٹھکانے لگا دیا گیا ہو؟"

"اگر اسے ٹھکانے لگا دیا گیا ہوتا تو اس کی لاش عمارت کی چھت پر پڑی رہنے دیتے تاکہ تم پر اس کے قتل کا الزام آجاتا.... نہیں مسٹر وہ اسے یہاں سے کہیں اور لے گئے ہوں گے۔ اس کی جان بہرحال خطرے میں ہے۔"

کروگر کے آفس پہنچ کر وہ ایک بار پھر فائلوں میں سر کھپانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے مجھ سے کہا۔ "ارے دیکھو ..... اس کے گاہکوں میں ہر تیسرا شخص غیر ملکی ہے۔ آخر غیر ملکیوں کو ہمارے اخباری تراشوں سے کیا دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ مجھے یہ لمبا ہی چکر معلوم ہوتا ہے۔ ہیلن نے تم کو کوئی بات تو نہیں بتائی تھی؟ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس نے کوئی اہم بات دریافت کر لی تھی۔"

"ہیلن نے مجھے کوئی بات نہیں بتائی تھی البتہ کروگر سے یہ کہہ دیا تھا کہ اس کی شادی دو ہفتے بعد ہونے والی ہے۔ اس لیے وہ ملازمت چھوڑ دے گی۔"

"ہوں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہیلن کو کوئی خاص بات نہ معلوم ہو لیکن کروگر یہی سمجھ رہا ہو اور اسے اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا ہو۔ اس نے ہیلن کے اغوا کا منصوبہ تیار کر لیا۔ مگر آخری وقت وہ جعلی پیکٹ اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ اسے اٹھانے کا انہیں موقع نہیں مل سکا۔ ہوسکتا ہے کوئی کرائے دار اس وقت چھت پر اپنے کپڑے پھیلانے آگیا ہو۔ اب ہم ہیلن کے گھر چلیں گے۔ وہاں میں اس کی مالکہ مکان کو گرفتار کرنا چاہتا ہوں اس لیے کہ وہ کروگر کی شریک کار معلوم ہوتی ہے۔"

"جلدی چلو۔" میں نے کہا۔

ہیلن کے فلیٹ پر پہنچ کر ایک اور ثبوت مل گیا۔

"لڑکیاں اپنے بالوں کو شیمپو بھی تو کرتی ہیں۔" پائرس نے کہا۔ پھر اس نے ماچس کی ایک تیلی واش بیسن کی جالی میں ڈال کر کھینچی تو وہاں سے دو سنہرے بال نکل آئے۔ "یہ بال تمہاری منگیتر کے ہوسکتے ہیں۔"

اس نے بڑھیا یعنی مالکہ مکان کو گرفتار کر لیا۔

"آؤ اب کروگر کے مکان کی طرف چلتے ہیں۔" اس نے کہا۔

جب ہم اس کے مکان پر پہنچے تو وہ تاریکی میں ڈوبا نظر آیا۔ اس کا کیٹیبل کا کوئی پتا نہ تھا جسے نگرانی کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ پائرس نے مجھے ایک ریوالور تھما دیا اور آگے جا کر دروازے پر لاتیں ماریں تو اس کی کنڈی ٹوٹ گئی اور وہ کھل گیا۔ پائرس نے اندر جا کر سارا مکان چھان مارا۔ لیکن کسی شخص کا کوئی سراغ نہ لگا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہیں فرار ہوگیا ہے۔" اس نے مکان سے نکل کر کہا۔

"مجھے غسل خانے کی ٹنکی سے ایک ٹرانسمیٹر ملا ہے۔" اس نے بتایا۔ "غسل خانے کی وہ ٹنکی خالی پڑی تھی۔"

"وہ کون ہوسکتا ہے اور اس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ کوئی غیر ملکی جاسوس معلوم ہوتا ہے۔" اس نے کہا۔ "ان تراشوں سے وہ خفیہ قسم کے اشارے دیتا ہے۔ سستے قسم کے اخبارات میں وہ خفیہ رپورٹیں خبروں کے انداز میں شائع کرا دیتا ہے۔ اور پھر ان کے تراشے کاٹ کر غیر ملکیوں کو بھیج دیتا ہے۔ ممکن ہے اس کے دو چار گاہک ایسے بھی ہوں جنہیں ان تراشوں سے دلچسپی ہو لیکن حقیقی طور پر وہ یہی کام کرتا تھا۔ بہرحال یہ ایف بی آئی کا کیس معلوم ہوتا ہے۔ مجھے تو اس وقت تمہاری منگیتر کی فکر ہے۔"

پائرس نے وہیں سے ایف بی آئی کو فون کر دیا۔

میں نے اس کے مکان میں جا کر ساری چیزوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی وہاں کچھ عجیب سی بو آرہی تھی۔ میرے نتھنوں میں کھجلی سی ہونے لگی۔ میں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی اور باہر آگیا۔ ہمیں ایک کار اس مکان کی طرف آتی نظر آئی۔ نزدیک آکر کار رکی اور اس میں سے وہ

کانسٹیبل اترا جو اس مکان کی نگرانی پر مامور تھا۔

"تم کہاں مر گئے تھے؟" پائرس نے اسے دیکھتے ہی غصے سے کہا۔

"میں ان لوگوں کی نگرانی کر رہا تھا پھر ان کے تعاقب میں چلا گیا تھا۔"

"وہ کہاں ہیں؟" پائرس نے اضطراب سے کہا۔

"ساحل کی طرف چلے گئے۔ وہاں وہ سب ایک اسٹیمر پر سوار ہوئے اور چلے گئے۔"

"کیا ان کے ساتھ سنہرے بالوں والی کوئی لڑکی بھی تھی؟"

"نہیں۔ دو مرد اور ایک لڑکی تھی لیکن لڑکی کے بال سیاہ تھے۔"

"معلوم نہیں وہ کہاں پہنچ چکے ہوں گے۔" میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"فکر نہ کرو پولیس کی لانچ ان لوگوں کو پکڑ لے گی۔" اس نے مجھے دلاسا دیا۔ پھر فون کرنے مکان میں چلا گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہاں پھر ایسی بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی کہ میرے نتھنوں میں کھجلی سی ہونے لگی۔

میں نے پائرس کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تو وہ بولا۔ "یہ تو گیسولین کی بو ہے۔ خدا خیر کرے یہ لوگ کیا انتظام کر کے گئے ہیں .... اللہ کرے تمہاری منگیتر صحیح حالت میں ہو.... اینڈرسن یہاں آؤ۔"

"اوپر اور نیچے کی منزلیں تو ہم دیکھ چکے ہیں۔" پائرس نے اسے سمجھایا۔ "اب تم جا کر تہ خانے کو چیک کر لو۔"

اینڈرسن نے سر ہلایا اور چل پڑا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ اس نے وہاں پہنچ کر بتی جلائی اور گردوپیش پر نگاہ ڈالنے لگا۔ تہ خانے میں کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ ہم نے ان کے پیچھے اور درمیانی جگہوں پر دیکھنا شروع کیا۔ بالآخر دو بڑے صندوقوں کے درمیان ایک تھیلا نظر آیا۔ ہم دونوں نے کھینچ کھانچ کر اس تھیلے کو اٹھایا۔ وہ بہت بھاری تھا۔

اس کا منہ کھولنے پر ہیلن کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

اسے اس حالت میں دیکھ کر مجھ سے برداشت نہ ہوسکا۔ میں نے ایک چیخ ماری اور سر تھام کر تہ خانے کے زینوں پر بیٹھ گیا۔ میرا سر بری طرح سے چکرا رہا تھا۔

اس اثنا میں پائرس بھی آگیا۔ اس نے ہیلن کو ہلا جلا کر دیکھا اور پھر پرمسرت لہجے میں بولا۔ "ارے یہ تو زندہ ہے۔ اسے اٹھا کر باہر کھلی ہوا میں لے چلو۔ جلدی.... یہ جو ٹک ٹک ٹک کی مسلسل آواز آرہی ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ کہیں کونے کھدرے میں کوئی ٹائم بم نصب کیا گیا ہے۔"

میری مدد سے اینڈرسن نے اس تھیلے کو وہاں سے نکالا پھر ہم اسے کار تک لے گئے لیکن ابھی ہیلن کو اس پلاسٹک کے تھیلے سے نکال رہے تھے کہ اچانک ایک ہولناک دھماکا ہوا۔ وہ مکان اپنی بنیادوں سے تقریباً ایک فٹ اوپر اٹھ گیا پھر نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی ہوئی اور اس کے پرخچے اڑ گئے۔

سراغ رساں پائرس نے کہا۔ "اگر ہم اس کے اندر ہوتے تو ہمارے بھی ٹکڑے اڑ جاتے۔"

میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور دل تھرتھرا رہا تھا۔

وہ تھیلے سے نکل آئی تو میں نے کار سے باہر آکر اس کا دروازہ پوری طرح سے کھول دیا۔ اینڈرسن دوسری طرف سے اتر گیا۔ میں نے ایک اسٹور پر جا کر پانی کا ایک گلاس لیا اور ہیلن کے چہرے پر چھینٹے مارے تو وہ ہوش میں آگئی۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

اس کی وقتی جدائی سے میں کتنا پریشان ہوگیا تھا۔ بہرحال یہ جدائی ختم ہونے والی تھی اور اس میں صرف بارہ دن رہ گئے تھے۔ جی ہاں آج کا دن تو بھاگ دوڑ میں ختم ہوچکا تھا۔ اس وقت رات کے بارہ بج کر آٹھ منٹ ہوچکے تھے اور نیا دن شروع ہوگیا تھا۔

☆☆☆

دھاک

امان اللہ

ہیلو ڈاکٹر آسٹن.....! میں ٹیڈ پوف بول رہا ہوں۔ زارینہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا میں اسے صبح اسپتال لے آؤں۔ میں چاہتا ہوں کہ بچے کی ولادت تک وہ اسپتال میں ہی رہے تاکہ اس کی حسب ضرورت دیکھ بھال ہوتی رہے۔ ٹھیک ہے میں صبح دس بجے تک زارینہ کو لے کر اسپتال پہنچ جاؤں گا۔

وہ پھول گرم ہواؤں میں کھلا تھا

سائبیریا کے علاقے میں تو بارہ مہینے ہی برف پڑتی ہے لیکن موسم سرما میں اس وسیع و عریض برف زار میں زندگی مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ قطب شمالی کا یہ برفستان ویسے بھی ساری دنیا سے الگ تھلگ، تنہا، ویران اور خاموش ہے۔ اس میں دور دور تک سوائے برف کے اور کچھ نہیں۔ نہ درخت، نہ جانور، نہ انسانی آبادیاں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کسی اور دنیا میں ہیں، کسی ایسے سیارے پر ہیں جو برف سے بنا ہے۔

سائبیریا کے سرحدی قصبوں میں دور دور تھوڑی بہت انسانی آبادیاں ہیں ان کے آس پاس چند ایک جنگل بھی ہیں جہاں شکار کے شوقین ہر موسم میں آتے ہیں مگر موسم گرما میں یہاں آنے والوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ موسم گرما کا مطلب یہ نہیں کہ اس علاقے میں ٹھنڈے مشروبات ملنے لگتے ہوں یا لوگ خالی قمیص پہن کر پھرتے ہوں بلکہ موسم گرما سے مراد وہ موسم ہے جب انسان اس علاقے میں آسکے، یہاں چل پھر سکے اس موسم میں بھی۔ یہاں کا موسم انتہائی سرد اور خشک ہوتا ہے۔

سائبیریا کے سرحدی قصبے اتاز میں آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ان میں اکثریت شکاریوں کی تھی۔ یہ شکاری بھی صرف دن میں اتاز میں رہتے اور شام ہونے سے پہلے ہی اتاز سے ۲۰۰ کلومیٹر دور تیزان چلے جاتے جہاں کا موسم ان لوگوں کے لیے قدرے قابل برداشت ہوتا تھا۔ صبح کو یہ پھر آجاتے۔ حکومت نے ویسے تو اس علاقے میں شکار پر پابندی عائد کر رکھی تھی کیونکہ اس علاقے میں زیادہ شکار کی وجہ سے جانوروں کی نسلیں معدوم ہو رہی تھیں پھر بھی چند ایک جانوروں کے شکار کی اجازت تھی جن میں برفانی لومڑی، برفانی سور اور قطبی ریچھ کے علاوہ سیل، والرس اور مختلف اقسام کے بکرے اور ہرن شامل تھے۔

اتاز کا گیم وارڈن ٹیڈ پوف لمبا تڑنگا، چوڑے شانوں والا صحت مند جوان تھا۔ وہ طاقتور اور جسیم ہونے کے ساتھ بہادر، بے خوف اور نڈر بھی تھا اپنے علاقے پر کڑی نظر رکھتا تھا۔ غیر قانونی شکار کرنے والوں کی اس سے روح فنا ہوتی تھی۔ اس کے علاقے میں مجرم یا جرائم پیشہ افراد کا گزر نہ تھا۔

گزشتہ دنوں معلوم ہوا تھا کہ ایک مشہور شکاری لاپتا ہو گیا ہے۔ یہ بات جب ٹیڈ پوف کے علم میں آئی تو وہ اس لاپتا شکاری کے کھوج میں لگ گیا۔ لاپتہ ہونے والا شکاری کوئی معمولی انسان نہ تھا۔ نہایت تجربہ کار، طاقتور اور بہادر انسان تھا۔ ایسے انسان کی یکا یک گمشدگی اور وہ بھی ٹیڈ پوف کے علاقے میں اس کے لیے باعث بدنامی و شرمندگی تھی۔ وہ اس بات کو تسلیم کرنے کو تیار ہی نہیں تھا کہ اس جدید دور میں جبکہ ہر سہولت اور آسانی موجود ہے کوئی ماہر شکاری اس کے علاقے میں اتنی آسانی سے لاپتا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ٹیڈ پوف اس گتھی کو سلجھانے میں لگ گیا اور اس

نے اپنے حساب سے معاملے کی چھان بین شروع کردی۔
میرا دل یہ کہتا ہے کہ وہ شکاری مارا جاچکا ہے۔ ٹیڈ پوف نے اپنی بیوی زارینہ سے کہا۔
لیکن اگر ایسا ہے تو اس کی لاش ملنی چاہیے تھی۔ زارینہ نے کہا۔
بس یہی تو مسئلہ ہے کہ اس کی لاش کس نے چھپائی ہے اور کہاں۔
کیا تمہیں کسی پر شک ہے۔ زارینہ نے پوچھا۔
ہے تو سہی مگر فی الحال کچھ کہہ نہیں سکتا۔
دونوں میاں بیوی چپ ہوگئے۔ ٹیڈ پوف اور زارینہ کی شادی کو ابھی صرف تین ماہ کا عرصہ ہوا تھا۔ زارینہ بے حد حسین، دبلی پتلی اور سبز زمرد جیسی آنکھوں والی لڑکی تھی۔ اسے پاکر ٹیڈ پوف کو ایسا لگا تھا جیسے اس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا پوری ہوگئی ہے مگر جب زارینہ نے اسے بتایا کہ اس سال کے آخر تک وہ دو نہیں رہیں گے بلکہ تین ہو جائیں گے تو ٹیڈ پوف خوشی سے اچھل پڑا تھا۔
غرض ٹیڈ پوف لاپتا شکاری کی تلاش میں لگا رہا اس نے اپنے علاقے کے برفانی صحرا کا چپہ چپہ چھان مارا مگر نہ تو لاپتا شکاری کی لاش ملی اور نہ کوئی ایسا نشان جس سے اس کی گمشدگی کا راز کھل پاتا۔ ریاستی پولیس نے تھک ہار کر اس مہم کو ختم کردیا مگر ٹیڈ پوف نے ہمت نہ ہاری۔ اس کا کہنا تھا کہ لاپتا شکاری کا راز وہ کھول کر رہے گا۔
اتاز کے علاقے میں روسو نام کا ایک شکاری بھی آتا تھا مگر وہ شکاری کم اور دہشت گرد زیادہ لگتا تھا۔ بے حد طاقتور.....! اس میں سانڈ جیسی طاقت، جنگلی بھینسے جیسی وحشت اور سانپ جیسی پھن مارنے کی فطرت تھی۔ روسو کبھی بھی ٹیڈ پوف کو پسند نہیں آیا تھا اس کا خیال تھا کہ روسو غیر قانونی شکاری ہے اور ایسی سرگرمیوں میں ملوث ہے جن کا شکار سے کوئی تعلق نہیں ہے مگر وہ اپنی بات کو ثابت کرنے میں ناکام رہا تھا۔
اسی تفتیش کے دوران ٹیڈ پوف نے ریاستی پولیس کے سربراہ کو یہ اطلاع دی کہ روسو قاتل ہے اور اس نے اس کے خلاف شواہد جمع کرلیے ہیں۔ چنانچہ ریاستی پولیس کے سربراہ نے اسے ہدایت کی کہ وہ کسی نہ کسی طرح روسو کو گرفتار کرکے اس کی فائل بند کردے۔
دراصل ہوا یہ تھا کہ اپنی تفتیش کے دوران ٹیڈ پوف نے ایک جگہ برف کی کھدائی کرکے لاپتا شکاری کی لاش کھوج نکالی تھی۔ شکاری کی بندوق بھی اس کے ساتھ ہی دفن تھی۔ لاش کی پشت میں گولی کا سوراخ تھا۔ لاش کے اندر گولی موجود تھی۔ ٹیڈ پوف نے وہ گولی نکلوائی اور پھر وہ بندوق تلاش کی جس سے وہ گولی چلائی گئی تھی۔ اس نے روسو کے خیمے کے اندر کھدائی کرواکے وہ بندوق بھی برآمد کرلی تھی۔ چنانچہ یہ ثابت ہوگیا تھا کہ روسو، لاپتا شکاری کا قاتل ہے۔ اس کے بعد ٹیڈ پوف کی مدد سے ریاستی پولیس نے روسو کو گرفتار کرلیا اور اسے عدالت میں پیش کردیا گیا۔ عدالت نے کیس کی سماعت کی اور چند ماہ بعد ہی روسو پر جرم ثابت ہوگیا عدالت نے اس خطرناک مجرم کو عمر قید کی سزا سنائی۔
عدالتی فیصلہ سنتے ہی روسو کسی جنگلی بھینسے کی طرح ڈکرانے لگا۔ وہ بری طرح چیخ رہا تھا اور پولیس اہلکاروں اور عدالت کو مغلظات سنا رہا تھا۔ اس نے ٹیڈ پوف کو بھی دھمکیاں دیں۔ عدالت کے کٹہرے میں گو کہ چار چار پولیس اہلکار اسے پکڑے ہوئے تھے اور وہ ہتھکڑیاں بھی پہنے ہوئے تھا۔ اس کے باوجود وہ بے قابو ہوئے جارہا تھا۔
ٹیڈ پوف.....! اس نے گیم وارڈن کی طرف انگلی سے اشارہ کرکے کہا تھا۔ کسی جیل کی دیواریں اتنی بلند نہیں کہ وہ مجھے، روسو کو ساری عمر اپنے اندر روک کر رکھ سکیں۔ میں ایک دن تمہارے سر پر پہنچوں گا اور اپنا انتقام لے لوں گا۔ میری بات یاد رکھنا.....! میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں، اپنا انتقام ضرور لوں گا۔
وہ چیختا رہا اور پولیس والے بڑی مشکل سے اسے گھسیٹ کرلے گئے۔ پولیس وین میں سوار ہوتے تک ٹیڈ پوف کے کانوں میں روسو کی دھمکی کی آوازیں آتی رہیں۔ غصے کی

ت میں روسو زخمی شیر لگ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اور آنکھیں خ ہورہی تھیں۔ ٹیڈ پوف ان آنکھوں کو کافی عرصے تک بھول سکا۔
اسی دوران ٹیڈ پوف کے کارنامے کی سارے علاقے دھوم مچ گئی۔ ایسے رسالوں نے ٹیڈ پوف سے رابطہ کیا جرائم پر مبنی کہانیاں چھاپتے تھے۔
انہوں نے ٹیڈ پوف کو معقول معاوضے کی آفر کی اور اس ے کہا کہ روسو کے بارے میں پوری کہانی تمام حقائق کے تھ لکھ دے۔ یہ ایک ایسی پیشکش تھی جسے رد کرنا بے وقوفی بات تھی مگر ٹیڈ پوف نے اسے رد کردیا۔
میں نے کوئی ایسا کارنامہ انجام نہیں دیا جس کو میں اس رح کیش کراؤں کہ اس کی کہانی لکھوں اور اس کا معاوضہ ں وصول کروں۔ ٹیڈ پوف نے زارینہ سے کہا۔
لیکن ٹیڈ.....! ہمیں رقم کی ضرورت ہے۔ بہت جلد ہم ں ہوجائیں گے۔ تمہاری تنخواہ اتنی نہیں کہ اچھی زندگی بسر ا جاسکے اور پھر ہمارے تیسرے ممبر کو تو اچھی زندگی زارنے کا حق ہوگا۔ اس کے لیے تمہیں یہ پیشکش قبول لینی چاہیے۔ زارینہ نے ٹیڈ پوف کو قائل کرنے کی کافی شش کی مگر وہ ناکام رہی۔
میں نے صرف اپنا فرض ادا کیا ہے۔ ٹیڈ پوف نے ہا۔ اور فرض کی ادائیگی کی تنخواہ مجھے حکومت کی طرف سے ملتی ہے۔
روسو کون تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا۔ بعض لوگ اسے مقامی ھتے تھے اور بعض کا خیال تھا کہ اس کا تعلق آذر بائیجان ے ڈکیت خاندان سے ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ کوہ ف کے علاقے کا رہنے والا ہے۔ ایک خبر یہ بھی ملی تھی کہ ں کی ماں آرمینیائی تھی اور باپ از بک لٹیرا۔ مگر اس کی لیت کسی کو معلوم نہ ہوسکی۔ وہ وحشی درندہ تھا ایسا درندہ جو وں کو آزار پہنچا کے، انہیں اذیت میں مبتلا کرکے خوش تا تھا۔ کئی بار اس نے ٹیڈ پوف کو یہ جتانے کی کوشش کی تھی ہ اس کی نظر میں قانون محض ایک کھلونا ہے جسے وہ جب چاہے توڑ سکتا ہے۔
ٹیڈ پوف کے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی۔ اس نے بچپن سے ہی قانون کا احترام کرنا سیکھا تھا اور دوسروں کو اس کے احترام کی ہدایت کرتا تھا۔ وہ قانون شکنوں اور قانون کا مذاق اڑانے والوں کا دشمن تھا۔ اسی دشمنی نے اس کو مجبور کیا کہ وہ روسو کو گرفتار کرائے اور اسے اس کے انجام تک پہنچائے۔
عدالت نے کئی ماہ تک روسو کے مقدمے کی سماعت کی تھی اور آج ہی اسے عمر قید سنائی گئی تھی۔ عدالت نے اس خطرناک مجرم کو فوری طور پر ریاستی مرکزی جیل منتقل کرنے کی ہدایت کی تھی۔ پولیس کے اہل کار اسے عدالت سے سیدھے ریاستی جیل لے جارہے تھے جو وہاں سے ڈھائی تین گھنٹے کی مسافت پر تھا۔
زارینہ پہلے ہی ٹیڈ پوف کو یہ خوشخبری سنا چکی تھی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اس کا یہ آخری مہینہ چل رہا تھا۔ کسی بھی وقت اسے اسپتال لے جانے کی ضرورت پڑسکتی تھی۔ اس دوران ٹیڈ پوف، روسیو کے مقدمے میں الجھ کر زارینہ پر توجہ نہ دے سکا اور اسے پابندی سے تیزان نہ لے جاسکا۔
اس شام یکا یک برف کا طوفان آگیا جس کی رفتار خطرناک حد تک تیز تھی۔ اس طوفان نے اتاز کے ساتھ ساتھ تیزان کے علاقے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دور دور تک سفید برف نظر آرہی تھی۔ آسمان سے برف روئی کے گالوں کی طرح گر رہی تھی۔ سردی ناقابل برداشت ہوگئی تو زارینہ رونے لگی۔
ارے.....! تم رو رہی ہو.....! ٹیڈ پوف نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ تم تو بہت بہادر ہو اور ایسے موسم..... ٹھہرو میں آتش دان میں آگ تیز کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر ٹیڈ پوف نے آتشدان میں مزید لکڑیاں ڈال دیں۔ آگ جل رہی تھی مگر اس کے شعلے بے جان سے لگ رہے تھے۔ ان کی حرارت کا پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ کہاں جارہی ہے ٹیڈ نے دیوار پر لگے ہوئے تھرمامیٹر پر نظر ڈالی، درجہ حرارت

نقطۂ انجماد سے منفی چالیس درجے سینٹی گریڈ تک جا چکا تھا۔ یہ دیکھ کر ٹیڈ پوف کی آنکھوں میں تشویش کی لہر پیدا ہوئی۔

یہ سردی کب کم ہوگی۔ زارینہ نے رندھے ہوئے گلے سے پوچھا۔

ایک ڈیڑھ ہفتہ تو لگے گا۔

کیا تم جانتے ہو کہ میرے پاس وقت کم ہے اور کسی بھی وقت مجھے اسپتال جانے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ تیزان یہاں سے کافی دور بھی تو ہے۔ زارینہ کی آواز میں نقاہت تھی۔

اوہ زارینہ.....! فکر مت کرو۔ ٹیڈ پوف نے اس کا سرد اور کپکپاتا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے سہلا سہلا کر حرارت پہنچانے کی کوشش کرنے لگا مگر درحقیقت وہ خود بے حد خوفزدہ تھا۔ اس نے بیوی کو تو تسلی دی مگر اپنے آپ کو تسلی کیسے دیتا۔

ایسا کرتے ہیں کہ ہم کل ہی تیزان چلتے ہیں۔ اچانک ٹیڈ پوف نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ بچے کی ولادت تک تم وہیں اسپتال میں قیام کرنا۔ اس دوران تمہاری عمدہ دیکھ بھال بھی ہوتی رہے گی اور مجھے کوئی فکر یا تشویش بھی نہیں رہے گی۔

خدا کرے ہم کل بحفاظت تیزان پہنچ جائیں۔ زارینہ نے کہا۔ کل کو کوئی نیا طوفان نہ آئے۔

ہاں۔ نیا طوفان نہ آئے.....! ٹیڈ پوف بڑبڑایا۔

وہ وحشی مجرم روسو تو اب تک مرکزی جیل پہنچ گیا ہوگا۔ زارینہ نے پوچھا۔

ہاں، وہ پہنچ گیا ہوگا یا پہنچنے والا ہوگا۔ اس کے بعد وہ ساری عمر جیل سے باہر کی دنیا نہیں دیکھ سکے گا۔ ٹیڈ پوف نے کہا۔

لیکن میرا دل ڈر رہا ہے۔

وہ کیوں۔

اس نے تمہیں دھمکیاں دی تھیں نا۔

ارے تم اس کی گیدڑ بھبکیوں سے پریشان ہو رہی ہو.....! وہ اب قانون کی قید میں ہے۔ ٹیڈ پوف نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر وہ اپنے کیبن کی کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا۔ شیشے سے باہر کا منظر دیکھنے لگا۔

باہر ہر طرف سفید برف تھی۔ اتاز کی واحد جھیل کو جما چکی تھی۔ برف باری چونکہ ابھی تک جاری تھی اس لیے جھیل کے اوپر لگ بھگ چار پانچ فٹ اونچی برف کی تہہ جما چکی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ علاقہ برف سے ہی بنا ہو۔ جھیل کے گرد ایک سڑک تھی جو نصف دائرے کی شکل میں گھوم کر تیزان جا رہی تھی۔ اس وقت اس سڑک پر کوئی ونشان نظر نہیں آتا تھا۔ اس پر بھی برف کی موٹی تہہ جما ہوئی تھی۔ نوبت یہاں تک آن پہنچی تھی کہ علاقے میں صاف کرنے والی مشین منگائی گئی تھی، وہ مشین بھی برف کو صاف کرنے میں ناکام رہی تھی۔

ٹیڈ پوف.....! نہ جانے کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے۔ زارینہ نے پھر کہا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ سفاک درندہ اپنا انتقام لینے ضرور آئے گا۔

کیسے آئے گا۔ مذاق ہے کوئی.....! وہ پولیس کی تحویل میں ہے۔ عدالت اسے عمر قید کی سزا سنا چکی ہے۔ تم دماغ پر خواہ مخواہ کا بوجھ مت ڈالو، تمہاری طبیعت ویسے ٹھیک نہیں ہے۔ اپنے آپ کو خوش اور مطمئن رکھنے کی کوشش کرو۔

اس نے بھری عدالت میں تمہیں دھمکی تھی۔

میں ایک گیم وارڈن ہوں۔ قانون کی حفاظت اور اس کا نفاذ میرا فرض ہے۔ اس طرح کی دھمکیاں میں آئے دن سنتا رہا ہوں اور آئندہ بھی سنوں گا۔ اس ملازمت میں ایسا تو ہوتا ہے۔ اب تم بھی خود کو اس طرح کی باتوں کا عادی بنا لو۔

ہماری شادی کو سال بھر ہونے کو ہے۔ مجھے آج تک کبھی ڈر محسوس نہیں ہوا۔ زارینہ نے پھر کہا۔ مگر اس بار جانے کیوں۔

تم خواہ مخواہ اپنے آپ کو ہلکان کر رہی ہو۔ ٹیڈ پوف نے کہا۔ اپنے لیے نہ سہی اس ننھی جان کے لیے ہی خود کو پرسکون رکھو۔

ایسے وحشی درندوں کو تو عمر قید کے بجائے موت کی سزا ملنی چاہیے۔

زارینہ.....! اب تک وہ وحشی درندہ مرکزی جیل پہنچ چکا ہوگا۔ ٹیڈ پوف نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ آخر وہ تم سے اس قدر نفرت کیوں کرتا ہے۔

میں نے اس کے جرم کو بے نقاب جو کیا ہے اور پھر عدالت سے عمر قید کی سزا دلوائی ہے۔ اس کے بعد کیا وہ مجھ سے محبت کرے گا۔ ٹیڈ پوف نے کہا اور پھر سوچنے لگا کہ ایک نامعلوم خوف نے مجھے پریشان کر دیا ہے، کہیں ایسا تو نہیں ہے میں واقعی اس جنونی قاتل سے خوفزدہ ہو گیا ہوں۔

میں ڈاکٹر آسٹن کو فون کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے ٹیلی فون پر ایک نمبر ملایا۔

ہیلو ڈاکٹر آسٹن.....! میں ٹیڈ پوف بول رہا ہوں زارینہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا میں اسے صبح اسپتال لے جاؤں۔ میں چاہتا ہوں کہ بچے کی ولادت تک وہ اسپتال میں ہی رہے تاکہ اس کی حسب ضرورت دیکھ بھال ہوتی رہے۔ ٹھیک ہے میں صبح دس بجے تک زارینہ کو لے کر اسپتال پہنچ جاؤں گا۔

اس نے ریسیور رکھ کر ایک انگڑائی لی اور گھڑی پر نظر ڈالی۔ اچانک اس کی جیب میں رکھے ہوئے ٹرانسمیٹر کی بیپ بپ بولنے لگی۔ اس نے ٹرانسمیٹر کان سے لگایا اور دوسری طرف سے آنے والی آواز سننے لگا۔

ٹیڈ پوف! میں کیپٹن کرچیف بول رہا ہوں۔ تمہیں ایک اہم اطلاع دینی ہے۔

تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔ کیا بات ہے۔ ٹیڈ پوف نے پوچھا۔

روسو پولیس کے قبضے سے نکل بھاگا ہے۔

کیا مطلب۔ کیوں۔ کب۔ کیسے۔ ٹیڈ پوف ایک دم بڑبڑا گیا۔

ہم اسے لے کر تیزان جا رہے تھے۔ تیزان تک خیریت سے پہنچ گئے۔ اس کے بعد جب ہم نے مرکزی جیل کا سفر شروع کیا تو راستے میں برفانی طوفان آ گیا۔ طوفان اتنا شدید تھا کہ چند فٹ دور تک کی چیز سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ ہم نے ایک کھیت دیکھ کر پولیس وین روکوائی اور اتر کر کھیت کے مالک کے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ اس دوران سب کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ ہم لوگوں سے غلطی یہ ہوئی کہ ہم نے روسو پر دھیان نہ دیا۔ ویسے بھی اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں جن کا ایک سرا ایک پولیس اہلکار کے ہاتھ میں بندھا ہوا تھا۔

پھر..... پھر کیا ہوا۔ ٹیڈ پوف کی آواز میں عجلت تھی جسے زارینہ بھی محسوس کر چکی تھی اور پھٹی پھٹی نظروں سے شوہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ہم لوگ اتر کر کھیت کے مالک کے گھر پر آ گئے اور روسو ایک محافظ کے ساتھ وین میں رہ گیا۔ بعد میں جب ہمیں احساس ہوا کہ ہم سے کیا غلطی ہو گئی ہے تو ہم پولیس وین کی طرف بھاگے مگر وہاں ہم نے جو منظر دیکھا وہ کافی ہولناک تھا۔

بولتے رہو، میں سن رہا ہوں۔

وہاں نہ تو پولیس وین تھی اور نہ روسو۔ البتہ ہمارا پولیس اہلکار کھیت میں مردہ حالت میں پڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی کا ایک سرا موجود تھا۔ یعنی روسو ہتھکڑی کو توڑ کر پولیس وین میں فرار ہو گیا تھا۔

تم لوگوں نے اس کا تعاقب نہیں کیا۔

وہاں تو ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اگر تھوڑی دیر اور ہم اس کھلی جگہ میں کھڑے رہتے تو ہمیشہ کے لیے پتھر کے ہو جاتے۔ مگر وہ خوفناک عفریت.....! اس پر اس شدید موسم کا بھی کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے جان کی پروا کیے بغیر دوڑ لگا دی۔

تم نے اپنے ہیڈ آفس اس واقعے کی اطلاع دی۔

ہاں، وہاں سے بعد میں یہ بتایا گیا کہ پولیس وین بڑی

سڑک پر کھڑی مل گئی ہے۔

تو گویا اس نے اتنا زتک کا واپسی کا آدھا سفر پولیس وین میں طے کیا ہے۔ ٹیڈ پوف نے کہا۔

ہاں اور چونکہ اس نے عدالت میں کھلم کھلا تمہیں دھمکی دی تھی اس لیے مجھے یقین ہے کہ وہ سیدھا تمہاری طرف آئے گا۔ میں نے تمہیں باخبر کر دیا۔ اب تم حفاظتی اقدامات کر سکتے ہو۔ کیپٹن کرچیف نے کہا۔ تم محتاط رہنا۔ ٹیڈ پوف.....! میں تم سے شرمندہ ہوں۔ اگر میں نے اس معاملے میں بے پروائی کا مظاہرہ نہ کیا ہوتا تو وہ وحشی اس انداز سے فرار نہ ہوتا۔ امید ہے تم مجھے معاف کر دو گے۔

کیپٹن کرچیف نے سلسلہ منقطع کر دیا مگر ساتھ ہی ٹیڈ پوف کے ذہن میں سیکڑوں انجانے وسوسے اور خدشات بیدار ہو گئے۔ اس کے دل نے گویا دھڑکنا بند کر دیا تھا۔ کسی سنگی مجسمے کی طرح وہ پھٹی پھٹی نظروں سے ٹرانسمیٹر کو دیکھے جا رہا تھا جیسے اس میں سے ابھی روسو نکلے گا اور اس کا سر چبا ڈالے گا۔

اس نے کھوئی کھوئی نظروں سے کھڑکی کے شیشے سے باہر کی طرف دیکھا۔ طوفان کی شدت میں اضافہ ہو چکا تھا۔ برف گرنے کی رفتار تیز ہو گئی تھی، ساتھ ہی ہوائیں بھی بھٹکتی ہوئی روحوں کی طرح چنگھاڑ رہی تھیں۔ باہر کا طوفان تو شدید تھا ہی، اس کے اندر کا طوفان اس سے بھی زیادہ شدید تھا۔

میں کہہ رہی تھا نا۔ ٹیڈ پوف نے زارینہ کی کمزور سی آواز سنی تو پلٹ کر دیکھا۔ وہ نہ جانے کب بستر سے اٹھ کر اس کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی۔

تم.....تم بستر سے کیوں اٹھ گئیں۔ چلو، جلدی سے لیٹ جاؤ، ہمیں صبح اسپتال جانا ہے۔ ڈاکٹر نے ٹائم دیدیا ہے۔

میں کہہ رہی تھی کہ وہ وحشی ضرور آئے گا۔

تم بے بنیاد خدشات کو اپنے ذہن میں جگہ مت دو۔

وہ ضرور آئے گا ٹیڈ.....وہ کمینہ خصلت ہے.....! زارینہ کی نقاہت بھری آواز سن کر ٹیڈ پوف کا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔

اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ رنگت پیلی ہو رہی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمایاں تھے۔ وہ برسوں نظر آ رہی تھی۔ اس کی نظروں میں غیر یقینی اور آنے وقت کا خوف تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ جی بھر کر دیکھنا چاہتی ہے۔ نہ جانے بعد میں وہ اسے دیکھ سکے

اچانک زارینہ زور سے لہرائی۔ اس نے اپنے ہاتھ رکھنے کی کوشش کی اور پھر گرنے لگی مگر ٹیڈ پوف تیزی سے آگے بڑھ کر اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں لیا اور پھر سہارا دے کر بستر تک پہنچایا اور بستر پر اچھی طرح اڑھا دیا۔

چند لمحے زارینہ آنکھیں بند کیے لیٹی رہی، پھر آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہنے لگیں۔

زارینہ.....! کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ اس طرح تو تم حوصلے کو پست کر دو گی۔ ٹیڈ پوف نے اس کے آنسو ہوئے کہا۔

اس وقت.....اسی وقت.....ٹیڈ.....ہمیں اس وقت جانا ہوگا۔ اس نے بمشکل یہ الفاظ ادا کیے۔

اچھا، میں تمہیں ابھی باہر لے چلوں گا، فکر مت کرو۔

وہ..... میرے درد شروع ہو گئے ہیں، برداشت.....! زارینہ نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے کہا۔ وقت کم رہ گیا ہے۔ ہمیں.....فوراً ہی تیز اسپتال پہنچنا ہے۔ وقت کم ہے، جلدی کرو۔

ٹھیک ہے۔ میں ابھی سلیج نکالتا ہوں۔ تم مجھے منٹ دیدو، پھر ہم تیز ان روانہ ہو جائیں گے۔ ٹیڈ نے کہا اور اپنے کیبن کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تو ہواؤں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ ہوائیں اس کی کے گودے تک میں اتر رہی تھیں اور اس کے اندر رہی تھیں مگر اس وقت اس کی محبوب بیوی اور ہونے والے بچے کی زندگی کا سوال تھا۔ ان دو زندگی بچانے کے لیے اسے ہر خطرہ مول لینا تھا۔ ہر مقابلہ کرنا تھا۔

ٹیڈ پوف نے کیبن کے کمپاؤنڈ میں موجود سلیج کو سیدھا کیا، اس میں رسیاں فٹ کیں، ان کو کھینچ کر ان کی مضبوطی کا اندازہ کیا۔ پھر برف پر چلنے والے کیلوں والے مخصوص چرمی جوتے پہنے، اسی دوران احاطے میں لگے ہوئے صنوبر کے درخت زور زور سے ہلے تو ٹیڈ پوف چونک اٹھا۔ اس نے چوکنا نظروں سے اس طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں روسو کا چہرہ ابھر آیا تھا مگر وہ پتے غالباً "ہوا کی وجہ سے ہلے تھے۔ اس نے اپنے ہولسٹر میں ریوالور کو چیک کیا اور پھر مطمئن ہو گیا۔

سلیج لا کر اس نے کیبن کے دروازے پر کھڑی کر دی، پھر اندر سے کئی کمبل لا کر اس میں بچھا دیئے اور نرم بستر تیار کر دیا۔ اس کے بعد وہ اندر گیا۔ اس نے زارینہ کو دو تین کمبلوں میں اچھی طرح لپیٹا اور پھر بانہوں میں اٹھا کر باہر لے آیا اور سلیج میں لٹا دیا۔ زارینہ کے چہرے پر ابھی تک کرب اور اذیت کے آثار تھے۔

ابھی تو بچے کی ولادت میں کئی روز باقی تھے۔ ٹیڈ پوف نے سوچا۔ پھر یہ اچانک اسے درد کیوں شروع ہو گئے۔ وہ سوچتا رہا اور پھر اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ روسو کے فرار کی خبر سن کر زارینہ کو ہول اٹھ گئے اور اسے درد شروع ہو گئے۔

زارینہ کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے ٹیڈ پوف سے کوئی بات نہ کی۔ ٹیڈ پوف نے اسے گاڑی میں لٹانے کے بعد اپنے مخصوص جوتوں کے تسمے باندھے۔ پھر سلیج کی رسیوں کو اپنے کندھوں سے گزار کر بازوؤں کے نیچے کیا۔ اب اس کی پوزیشن اس گھوڑے کی سی تھی جسے گاڑی میں جوتا جاتا ہے مگر یہاں رینڈیئر کی جگہ ٹیڈ پوف اس سلیج میں خود جتا ہوا تھا۔ اس نے آس پاس کا جائزہ لیا اور پھر سلیج کو کھینچتا ہوا چل پڑا۔ حد نظر تک برف ہی برف تھی۔ طوفانی ہواؤں میں مزید شدت پیدا ہو چکی تھی۔ جو ٹیڈ کا سینہ چیر ڈالنا چاہتی تھیں مگر وہ ہر مشکل اور اذیت سے بے نیاز مسلسل سلیج کو کھینچنے میں مصروف تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اسے طوفان کی موجودگی کا علم ہی نہیں ہے۔ اسے یہ معلوم تھا کہ اس کا جانی دشمن روسو اس خطرناک موسم میں اس کی زندگی کا چراغ بجھانے کے لیے آ رہا ہے مگر اس وقت اسے صرف زارینہ کی اور اس کے ہونے والے بچے کی فکر تھی۔ باقی تمام خطرات وہ اپنے ذہن سے نکال کر پھینک چکا تھا۔

حالانکہ اس شدید موسم میں اس کا اپنا کیبن اس کے لیے سب سے محفوظ جگہ تھی۔ اس میں اس طرح کے موسم سے بچاؤ کے لیے ہر سہولت فراہم کی گئی تھی اور خطرات سے نمٹنے کا بھی پورا انتظام تھا لیکن وہ مجبور تھا۔ اس حفاظتی قلعے اور اس محفوظ پناہ گاہ کو اس نے مجبوری کے عالم میں چھوڑا تھا۔ اسے بہر صورت زارینہ کو ڈاکٹر کے پاس اس کے اسپتال میں پہنچانا تھا۔ یہ ایک نہیں دو زندگیوں کا سوال تھا اور اس کے لیے ٹیڈ پوف نے ہر مشکل کا مردانہ وار مقابلہ کا عہد کر رکھا تھا۔

سلیج آہستہ آہستہ گھسٹتی ہوئی برف پر آگے بڑھ رہی تھی۔ اسے کھینچنے میں ٹیڈ پوف کو خاصی قوت لگانی پڑ رہی تھی، شاید اسی محنت کے باعث اس سرد موسم میں بھی اس کے جسم سے پسینے کی دھاریں پھوٹ نکلی تھیں اور اسی سے اس کے جسم میں نئی بیداری آ گئی تھی۔ ہر طرف درخت تھے جنہوں نے برف کا لباس پہن لیا تھا اور ان درختوں کے درمیان میں سے اس کی سلیج آہستہ آہستہ پھسلتی ہوئی آگے کی طرف چلی جا رہی تھی۔

کچھ دور جانے کے بعد وہ رک گیا۔ اس کا سانس پھول چکا تھا۔ اس نے گہرے گہرے سانس لیے اور توانائی کو مجتمع کرنے لگا۔ پھر اس نے ایک نظر گھوم کر زارینہ کی طرف بھی دیکھا۔ وہ گرم کپڑوں اور کمبلوں میں آرام سے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے جسم کا کوئی بھی حصہ حرکت نہیں کر رہا تھا۔ اس کے اوپر برف روئی کے گالوں کی طرح گر رہی تھی جس سے اس کا چہرہ چھپ گیا تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر ٹیڈ پوف کو اس پر رحم بھی آیا اور پیار بھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی کو یہ اذیت اس کی وجہ سے برداشت کرنی پڑ رہی ہے۔

حالات ناگفتہ بہ تھے، راستے پر خطر تھے مگر پھر بھی سفر تو کرنا تھا۔ ٹیڈ پوف نے اپنے سر کو جھٹکا اور ایک بار پھر نئے عزم، ولولے اور ہمت کے ساتھ برف پر قدم بڑھانے لگا۔ ساتھ ہی سلیج بھی گھسٹنے لگی۔

رک جاؤ ٹیڈ پوف.....! یہ وہ آواز تھی جسے سن کر ٹیڈ پوف اچھل پڑا وہ اس وحشی درندے کی آواز کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ میں نے کہا تھا نا کہ میں تمہارے پاس ضرور آؤں گا۔ تم سمجھتے تھے کہ مجھے پولیس کے حوالے کر کے اور عدالت سے سزا دلوا کر تم اطمینان سے رہ سکو گے اور میری سزا کے بعد اپنے سینے پر ایک تمغے کا اضافہ کراؤ گے مگر میں نے تمہارے اس خواب کو پورا نہ ہونے دینے کا عزم کیا ہے۔ تم زندہ رہو گے تو تمغہ حاصل کرو گے نا.....! دیکھ لو میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ میں آ گیا ہوں اور اب۔

یہ کہتے کہتے یکا یک روسو خاموش ہو گیا۔ ٹیڈ پوف اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ روسو کہاں ہے۔ یکا یک ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ ٹیڈ کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ روشنیاں برف صاف کرنے والے بلڈوزر کی تھیں۔ روسو اسی کے اوپر بیٹھا تھا۔ نہ جانے وہ کب اس جگہ آ کر بیٹھ گیا تھا اور غالباً ٹیڈ پوف کی تاک میں تھا۔ پھر اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور برف صاف کرنے والی مشین سے برف اٹھا اٹھا کر اس کی طرف پھینکنے لگا۔ ٹیڈ پوف نے اپنے ہولسٹر سے ریوالور نکالنا چاہا مگر اس کی انگلیوں نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا۔

زارینہ، گھبرانا مت، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ٹیڈ پوف نے اپنی بیوی کے پاس آ کر کہا۔ زارینہ کا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔ مگر اندر سے ٹیڈ پوف بھی گھبرایا ہوا تھا۔

تم تھک گئے ہو گے، اگر میرے پاس جوتے ہوتے تو شاید میں بھی سلیج سے اتر کر تمہارے ساتھ چل سکتی۔

یکا یک برف صاف کرنے والی مشین آگے بڑھنے لگی۔ اس کی ہیڈ لائٹس بھی روشن ہو چکی تھیں۔ ٹیڈ پوف نے ادھر دیکھا۔ اسے لگ رہا تھا آہستہ آہستہ موت اس کے قریب پہنچ رہی ہے اور پھر ایک دم مشین رک گئی ساتھ ہی اس کی ہیڈ لائٹس بھی بجھ گئیں۔ ایک بار پھر طرف تاریکی چھا گئی۔

اچانک ایک خنجر لہراتا ہوا آیا اور ٹیڈ پوف کے چہرے سے چند انچ دور گر گیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر اندھیرے میں خنجر کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر نہ جانے کہاں روسو اس کے پاس پہنچ گیا اور اس نے خنجر اٹھا کر ٹیڈ پوف پر حملہ کر دیا۔ ٹیڈ پوف نے کمال پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی کلائی پکڑ لی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ طاقتور اور پھرتیلے تھے۔ ان میں زور آزمائی شروع ہوئی۔ یکا یک روسو نے اپنا گھٹنا پوری طاقت سے ٹیڈ پوف کے پیٹ پر مارا، وہ اچھلتا ہوا برف پر گرا، اس کے ساتھ ہی روسو ہوا میں اڑتا ہوا اس پر آن پڑا اور اسے بری طرح رگیدنے لگا۔ روسو کے بھاری بھرکم وجود کے نیچے دبے ہوئے ٹیڈ پوف کو اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا، اس کے ساتھ ہی روسو نے اس پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ ٹیڈ پوف کے ہونٹوں اور ناک سے خون بہنے لگا۔ یکا یک اس کے کانوں میں زارینہ کی چیخ سنائی دی اور اس کا جسم نئی توانائی سے بھر گیا۔ اس نے روسو کو پوری قوت سے اوپر اچھال دیا۔ روسو برف پر جا گرا مگر فوراً ہی پلٹا، اس نے خنجر سے ٹیڈ پوف پر خطرناک حملہ کیا۔ ٹیڈ پوف نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ روسو اس خنجر کو آہستہ آہستہ ٹیڈ پوف کے گلے کی طرف لا رہا تھا، ٹیڈ بالکل مایوس ہو چکا تھا مگر اچانک ہی اس نے روسو کی کلائی موڑ دی اور ایک زور دار جھٹکا دیا تو وہ خنجر دستے تک روسو کی آنکھ میں پیوست ہو گیا۔ اس کی آخری چیخ بڑی بھیانک تھی۔

تھوڑی دیر تک ٹیڈ پوف برف پر پڑا خون تھوکتا رہا۔ پھر اسے زارینہ کی آواز سنائی دی، اس کے ساتھ ہی برفانی ہوا میں ایک بچے کی رونے کی آواز سے گونج اٹھا۔

ٹیڈ.....! میرا درد ٹھیک ہو گیا، اب ہم تین ہو گئے ہیں۔ جلدی گھر واپس چلو، اس ننھی جان کو سردی سے بچانا ہے۔

☆☆☆

تلافی

رقیہ خانم

فلینڈر جب جیل سے رہا ہوا تو وہ چالیس سال کا ہو چکا تھا۔ اس کا مکان فروخت کیا جا چکا تھا اور قسطوں کی عدم ادائیگی کی بنا پر کمپنی اس کی کار واپس لے چکی تھی۔ اسٹیٹ بروکر کی حیثیت سے اس کا لائسنس منسوخ کیا جا چکا تھا۔ وہ چوں کہ سزا یافتہ تھا اس لیے اسے نیا لائسنس نہیں مل سکتا تھا۔ اس کی زندگی میں صرف ایک چیز بچی تھی۔ اس کی وفا شعار بیوی لارا!

یہ مسرت بھی کیا دل برباد

فلینڈر کے لیے وہ زندگی کا بدترین دن تھا۔

اسے قرضہ فراہم کرنے والی کمپنی نے قرضہ نہیں دیا۔ پھر اس نے اپنی جائداد کی خرید و فروخت کرنے والی کمپنی کے مالک سے ایڈوانس رقم طلب کی مگر اس سلسلے میں بھی اسے ناکامی ہوئی۔

فلینڈر بہت مایوس ہوا اس لیے کہ اس کی میز پر ایسے بہت سے بل جمع ہو گئے تھے جن کی ادائیگی کرنا ضروری تھی۔

اس نے مایوسی سے شراب کی بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا تو معلوم ہوا کہ وہ خالی ہے۔ اس نے اپنی بیوی لارا سے کہا۔ ”بدقسمتی میرا پیچھا کر رہی ہے اور یہ میری زندگی کا منحوس ترین دن ہے۔ یہ دیکھو کہ شراب بھی ختم ہو چکی ہے۔“

اس کی شادی کو تقریباً ایک سال ہوا تھا اور وہ مفلسی کے مزے چکھ رہا تھا۔ اس کی بیوی لارا خوب صورت تھی اور اس میں یہ وصف بھی تھا کہ وہ باحوصلہ تھی۔ اس نے تھوڑی سی رقم پس انداز کر رکھی تھی۔ جس سے کم از کم شراب کی بوتل تو خریدی ہی جا سکتی تھی۔ اس نے وہ رقم اسے تھما دی اور بولی۔ ”گلی کے کونے پر جیروم کی دکان ہے وہاں سے ایک بوتل وہسکی لے آؤ۔“ اس نے توقف سے دوبارہ کہا۔ ”لیکن ذرا جلدی آ جانا، میں اکیلی ہوتی ہوں تو بوریت ہونے لگتی ہے۔“

”میں دو منٹ میں آتا ہوں۔“ فلینڈر نے کہا اور وہاں سے نکل آیا۔

جب وہ جیروم کی دکان پر پہنچا تو وہ دکان بند کرنے ہی والا تھا۔ جیروم کی دکان علاقے میں سب سے بڑی تھی اور وہاں ہر قسم کی شراب ملتی تھی۔ چوں کہ وہ شراب رعایتی داموں پر فروخت کرتا تھا اس لیے جیروم کو خوب

آمدنی ہوتی تھی۔ اس کی دکان پر گاہکوں کا رش ہوتا تھا اس لیے اس نے تین ملازم بھی رکھے ہوئے تھے مگر وہ سب رات نو بجے چھٹی کر جاتے تھے۔

"فلینڈر تم کہاں چلے گئے تھے؟ ایسا لگ رہا ہے کہ تم کہیں چھٹیاں منانے کے لیے چلے گئے تھے یا تم نے شراب پینا ہی چھوڑ دی ہے۔"

"شراب نوشی میں نے نہیں چھوڑی ہے اور کہیں گھومنے کے لیے میں نہیں گیا ہوں اس لیے کہ میرے پاس بھاری رقم نہیں ہے۔ میرا کاروبار گھاٹے میں جا رہا ہے۔"

"میرا کاروبار تو مہینے کی ابتدا سے لے کر آخر تک بالکل ٹھیک چلتا ہے۔ اور اگر لوگ کوئی جشن مناتے ہیں تو پھر فروخت مزید بڑھ جاتی ہے۔"

"مجھے اچھے قسم کی وہسکی چاہیے۔"

"وہ دائیں جانب کا شیلف دیکھ لو۔" جیروم نے اشارہ کیا۔ "امپورٹڈ ہے۔ تم پیو گے تو مزہ آ جائے گا۔ اب دکان بند کرنے کی تیاری کر رہا ہوں اس لیے کہ رات کے دس بجنے والے ہیں۔"

جیروم دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اس کے شٹر گرانا شروع کرے کہ دو آدمی جیکٹ میں ملبوس دکان میں داخل ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے واڈکا کی چھوٹی بوتل طلب کی۔ فلینڈر شیلف سے وہسکی کی بوتل نکال رہا تھا اور جیروم اسے شاپر میں ڈالنے ہی والا تھا کہ ان دونوں جیکٹ والوں نے سرعت اندازی سے ریوالور نکال لیے۔

"دونوں کیش رجسٹروں کی ساری رقم نکال کر اس بیگ میں ڈال دو۔" اس نے اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے بیگ کی طرف اشارہ کیا اور ریوالور کی نال جیروم کے سینے کی طرف اٹھا دی۔ "میرے اعصاب کمزور ہیں اس لیے میں ہیجان میں مبتلا ہو کر ٹریگر دبا دیتا ہوں۔ اس لیے تم احتیاط کرنا۔"

وہ ڈاکو پستہ قامت اور فربہ تھا۔ اس کے سر کے بال سرخ تھے اور اس کی تھوڑی پر چوٹ کا ایک نشان بنا تھا جو سوالیہ نشان کی طرح تھا۔

"میرا ساتھی ٹھیک کہتا ہے۔ جب ہم نروس ہوتے ہیں تو لاشیں گرانے لگتے ہیں۔" دوسرے نے کہا۔ وہ قدرے لمبا تھا اور اس کا چہرہ لمبوترا تھا۔ اس کی عمر تقریباً بائیس سال تھی۔

جیروم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور وحشت بھری نگاہ سے جائزہ لینے لگا۔ اس نے محسوس کر لیا کہ اگر وہ ان کے احکام پر عمل نہیں کرے گا تو وہ اپنی دھمکی پر عمل کرتے ہوئے اسے گولی مار دیں گے لہٰذا اس نے کیش رجسٹر کو کھولا اور اس میں سے ساری رقم نکال کر اس تھیلے میں ڈال دی۔

"تم ہمیں احمق سمجھتے ہو۔" تھوڑی کے نشان والا غرایا۔ "اس دراز کو کھینچ کر باہر نکالو اور اس کے نیچے رکھی ہوئی رقم بھی نکال کر اس تھیلے میں ڈال دو۔"

جیروم نے ایسا ہی کیا۔ دراز کے نیچے بیس اور پچاس ڈالر والے نوٹ تھے۔ مگر فلینڈر دیکھ رہا تھا کہ جیروم کے چہرہ سے گھبراہٹ اور سراسیمگی نہیں جھلک رہی ہے۔ وہ پرسکون ہے۔

اسے یاد آیا کہ جیروم نے ایک بار اسے خفیہ الارم کے متعلق بتایا تھا کہ اس نے دکان میں الارم لگوا لیا ہے اور وہ جوں ہی الارم کا بٹن دبائے گا تو پولیس تین منٹ میں وہاں پہنچ جائے گی۔ ممکن ہے اس نے الارم کا بٹن دبا دیا ہو۔ اور اس کے سکون کی یہی وجہ ہو۔

"اور اگر پولیس وہاں تھوڑی دیر بعد آ کر ان ڈاکوؤں کو گرفتار کرنے کے لیے گولی چلائے گی تو پھر وہ خواہ مخواہ مارا جائے گا۔

پستہ قامت ڈاکو کی ہدایت پر جیروم اب دوسرے کیش رجسٹر کی نقدی اس کے بیگ میں ڈال رہا تھا۔ لمبوترے چہرے والے نے فلینڈر کو کور کیا ہوا تھا۔

"دوست! تمہاری جیب میں جو رقم ہے وہ بھی ہمارے حوالے کر دو۔"

فلینڈر نے اپنا پرس نکالا اور پندرہ ڈالر اس لمبوترے چہرے والے کے حوالے کر دیے۔ اچانک ایک فائر ہوا اور پستہ قامت والے کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ پھر وہ اپنا سینہ تھامے دہرا ہوتا دکھائی دیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے رقم کا تھیلا سنبھال رکھا تھا جب کہ اس کا دوسرا ہاتھ سینے پر رکھا تھا جہاں سے خون ٹپک رہا تھا۔

وہ اب آہستہ آہستہ سیدھا ہو رہا تھا غالباً گولی نے اسے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا تھا۔

جیروم دوسرے ڈاکو کا نشانہ لے رہا تھا کہ وہ دوڑ کر فلینڈر کی پشت پر پہنچ گیا۔ اب جیروم ایسی صورت میں فائر نہیں کر سکتا تھا۔

دفعتاً پستہ قامت سیدھا ہو گیا اور اس نے جیروم پر گولی چلا دی۔ گولی جیروم کی دائیں آنکھ سے تھوڑا اوپر اس کی پیشانی پر پڑی۔ وہ چیخ مار کر اوندھا گر گیا۔ پھر شراب خانے میں پر ہول خاموشی چھا گئی۔ چند لمحوں بعد لمبوترے چہرے والے نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اب یہاں سے بھاگ چلو۔ تمہارا زخم زیادہ گہرا نہیں ہے۔ تم چل سکتے ہو نا آرچر؟"

"آرچر کے حلق سے کراہیں نکل رہی تھیں اور وہ اپنے ساتھی کا سہارا لے کر دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور اور دوسرے میں رقم کا تھیلا تھا۔ لمبوترے چہرے والے کو معلوم تھا کہ فلینڈر چشم دید گواہ ہے۔ لہٰذا اس نے فلینڈر کو حکم دیا کہ وہ کاؤنٹر کے پیچھے جا کر فرش پر لیٹ جائے اور اس وقت تک نہ اٹھے جب تک کہ وہ دکان سے نہ نکل جائیں۔

فلینڈر نے اس پر عمل کیا۔ اسے جیروم کی خون میں لت پت لاش دکھائی دی۔ اسے اب طبی امداد پہنچانا ممکن نہیں رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کر دروازے کے قریب پہنچا تو اسے پولیس گاڑیوں کے سائرنوں کی آواز سنائی دی۔ دونوں ڈاکو گلی کے موڑ پر پہنچ چکے تھے۔ پستہ قامت اب بھی لڑکھڑا رہا تھا۔

مگر پولیس کاروں کا سائرن سن کر وہ گھبرا گئے اور دوڑ کر آگے والی گلی میں جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ فلینڈر کو معلوم تھا کہ اب پولیس سب سے پہلا سوال اس سے یہ کرے گی کہ ڈاکو کس طرف گئے ہیں۔ اس لیے وہ اس سوال کا جواب دینے کے لیے خود کو تیار کرنے لگا۔

وہ گلی کے اختتام تک گیا مگر وہاں پہنچ کر ٹھٹک گیا اس لیے کہ وہاں ایک ریوالور اور تھیلا پڑا تھا۔ یہ دونوں چیزیں یقیناً زخمی ڈاکو کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھیں۔ فلینڈر نے ان دونوں چیزوں کو اٹھایا اور تیزی سے ملحقہ گلی میں چلا گیا۔

اس وقت اسے خیال آیا کہ وہ ضرورت مند ہے۔ اگر وہ لوٹی ہوئی رقم لے کر فرار ہو جائے تو ممکن ہے سال چھ ماہ سکون سے کٹ جائیں رقم اس نے نہیں لوٹی تھی بلکہ وہ اسے پڑی ہوئی ملی تھی۔ جیروم بھی مر چکا تھا اور یہ رقم اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی تھی۔

ان خیالات کے تحت وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنی کار کی طرف بڑھنے لگا۔ دونوں ڈاکو اب دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ممکن ہے وہ کہیں چھپ گئے ہوں۔ اور پولیس جب چلی جائے گی تو وہ فرار ہو جائیں گے۔ پولیس کاروں کے سائرنوں کی آواز اب بند ہو گئی تھی۔ فلینڈر نے اندازہ لگایا کہ وہ شراب خانے کے سامنے پہنچ چکی ہوں گی۔ اچانک اسے اپنے پیچھے ایک آہٹ سنائی دی۔

فلینڈر تیزی سے مڑا۔ وہ ایک شخص تھا جس کے ہاتھ میں لمبی سی بوتل دبی تھی اور وہ اس پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ فلینڈر دہشت زدہ ہو گیا۔ اسی دہشت کے عالم میں اس نے دو فائر کر دیے۔ بدحواسی میں اسے

گولیاں نہیں لگ سکیں اس لیے کہ اس شخص نے بوتل سے اس کے سر پہ وار کر دیا تھا- فلینڈر بے ہوش ہو کر گر پڑا-

اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک اسپتال میں تھا- ایک نرس نے اسے بتایا کہ شراب خانے میں جو ڈکیتی کی واردات ہوئی ہے- اس سلسلے میں اس پر شبہ کیا جا رہا ہے- یہ سن کر وہ بدحواس ہو گیا-

جب وہ ہوش میں آ گیا تو اٹھ کر بیٹھ گیا- پولیس کے دوسرا غرساں تھوڑی دیر بعد پوچھ گچھ کرنے اس کے پاس پہنچ گئے- فلینڈر نے ساری کہانی سنائی تو انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ تحقیق کریں گے-

فلینڈر کو ان کی باتوں سے قدرے اطمینان ہوا- اس نے سوال کیا کہ اس کے سر پہ کس نے وار کیا تھا تو پولیس والوں نے اسے بتایا کہ مسٹر کرامر ایک پارٹی سے واپس آ رہے تھے- انہوں نے سوچا کہ وہ جیروم کے شراب خانے سے ایک بوتل خریدتے ہوئے چلیں- مگر وہاں تم مشتبہ انداز میں چلتے نظر آئے تو انہوں نے بوتل سے وار کر دیا- تاکہ پولیس کو اطلاع دے سکیں-

"مشتبہ!" فلینڈر نے چونک کر کہا- "مگر میں تو ڈاکوؤں کو تلاش کر رہا تھا-"

"ممکن ہے تمہارا بیان درست ہو مگر ہم تو حقائق کی تلاش کر رہے ہیں- صحیح بات بھی جلد ہی سامنے آ جائے گی-" وہ بولا- "وہ اسٹور میں گیا تو اس نے جیروم کی لاش دیکھی پھر اس نے ایک تھیلا سینے سے چمٹائے تمہیں گلی میں جھکے جھکے چلتے دیکھا تو وہسکی کی ایک بوتل نکال کر تمہارے سر پہ وار کر دیا- اس کا خیال ہے کہ اس نے کارنامہ انجام دیا ہے-"

"اسی لیے اسے ہیرو اور مجھے مجرم سمجھا جا رہا ہے-" فلینڈر نے تلخ لہجے میں کہا-

"مسٹر فلینڈر تمہیں جائے واردات پر لوٹی ہوئی رقم اور ایک ریوالور کے ساتھ گرفتار کیا گیا ہے- اب اگر تم پولیس اسٹیشن پہنچ کر ان مجرموں کو البم دیکھ کر شناخت کر لو تو ہم انہیں گرفتار کر لیں گے اور تمہیں چھوڑ دیں گے-"

فلینڈر نے کوئی جواب نہیں دیا- اگلے روز ڈاکٹر نے اس کا زخم دیکھ کر اسے اسپتال سے جانے کی اجازت دے دی- وہاں سے وہ پولیس اسٹیشن گیا- اور اس نے مجرموں کی تصویروں کا البم دیکھا- مگر جب وہ کسی تصویر کو شناخت نہ کر سکا تو اسے جیل میں بند کر دیا گیا اور یہ بتایا گیا کہ اب اس کے بارے میں عدالت فیصلہ کرے گی-

جب اس کی بیوی لارا اس سے ملاقات کرنے آئی تو اس نے افسردگی سے کہا- "مجھے معلوم ہے کہ تم بے گناہ ہو- تم نے قانون کی مدد کرنا چاہی مگر الٹا تمہیں ہی گرفتار کر لیا گیا- بہرحال سچائی ضرور سامنے آئے گی- اور تمہیں قومی ہیرو قرار دیا جائے گا-"

"میں قومی ہیرو نہیں بننا چاہتا- میں عدالت سے رہائی حاصل کرنا چاہتا ہوں-" فلینڈر نے ناک سکیڑ کر کہا-

"ہم پہلے ہی قلاش ہیں اور وکیل نہیں کر سکتے- اس لیے سرکاری وکیل کی خدمات حاصل کرنا پڑیں گی- میں ڈسٹرکٹ اٹارنی کے آفس بھی گئی تھی- وہاں ایک شخص نے بتایا کہ تمہارے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق ابھی تک کسی مجرم کی گرفتاری عمل میں نہیں آئی ہے- جتنی بھی شہادتیں ہیں وہ تمہارے خلاف جاتی ہیں-"

"مجھے معلوم ہے کہ میں آہنی سلاخوں کے پیچھے ہوں اور مجھے ایک ایسے جرم کی سزا ملنے والی ہے جو مجھ سے سرزد نہیں ہوا-"

لارا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے-

عدالت میں مقدمہ پیش ہوا تو اسے مجرم گردانا گیا-

سرکاری وکیل نے ثابت کر دیا کہ فلینڈر ان دنوں بے روزگار تھا اس لیے اس نے جیروم کی شراب کی دکان پر ڈاکا ڈالا ہے- وہ رقم لے کر فرار ہو رہا تھا کہ مسٹر کرامر نے اسے دیکھ لیا اور بوتل سر پر مار کر بے ہوش کر دیا- مسٹر کرامر کا بیان تھا کہ انہوں نے جائے واردات پر کسی اور کو نہیں دیکھا-

جیوری نے اسے عمر قید کی سزا سنا دی-

عدالت کی طرف سے متعین وکیل نے سپریم کورٹ میں اپیل کی مگر وہ مسترد کر دی گئی-

اس دوران لارا اس سے ملاقات کرنے آتی رہی- اس کا کہنا تھا کہ وہ بے گناہ ہے اس لیے قدرت اس کی تلافی ضرور کرے گی- اور اصل مجرم اپنے کیے کی سزا بھگتیں گے- اس نے کہا- "چوں کہ ماضی میں تمہارا کردار بے داغ رہا ہے اس لیے وکیل کا کہنا ہے کہ اگر جیل میں تمہارا رویہ بہتر رہا تو آٹھ سال بعد تمہیں پیرول پر رہا کر دیا جائے گا-"

"صرف آٹھ سال بعد-" فلینڈر نے حیرت سے کہا- "اتنا عرصہ تو پلک جھپکتے میں گزر جائے گا-"

☆☆☆

فلینڈر جب جیل سے رہا ہوا تو وہ چالیس سال کا ہو چکا تھا- اس کا مکان فروخت کیا جا چکا تھا اور قسطوں کی عدم ادائیگی کی بنا پر کمپنی اس کی کار واپس لے چکی تھی- اسٹیٹ بروکر کی حیثیت سے اس کا لائسنس منسوخ کیا جا چکا تھا- وہ چوں کہ سزا یافتہ تھا اس لیے اسے نیا لائسنس نہیں مل سکتا تھا- اس کی زندگی میں صرف ایک چیز بچی تھی- اس کی وفا شعار بیوی لارا!

اسٹیٹ ایجنسی کے مالک مسٹر ڈیمر نے اس کی بیوی لارا کو بطور سیکریٹری اپنے ہاں ملازم رکھ لیا تھا- پھر انہوں نے یہ مہربانی بھی کی کہ اسے عارضی طور پر اپنے ہاں ملازم رکھ لیا- ان کا کہنا تھا کہ وہ محض خانہ پری کے لیے رکھا گیا ہے- بہتر ہوگا کہ وہ اپنے لیے ملازمت تلاش کرتا رہے-

لارا ایک چھوٹے سے فلیٹ میں منتقل ہو گئی تھی- اس نے فلینڈر کی رہائی پر اسے سجایا تھا اور اچھے طریقے سے اس کی تزئین کی تھی- اس نے فلینڈر کی پسندیدہ شراب کا بندوبست بھی کر رکھا تھا- کھانے میں اس نے اچھی ڈشیں تیار کی تھیں-

کھانے سے پہلے اس نے فلینڈر کو شیمپین پیش کی-

"خوش حال مستقبل کے نام پر-" اس نے کہا- "تم اب اپنے ماضی کو بھول جاؤ- خود کو قدرت کے انصاف پر چھوڑ دو- قدرت ناانصافی نہیں کرتی- تمہارے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی تلافی ضرور ہوگی-"

"جزا و سزا کا فرسودہ نظریہ اب بھی تمہارے دماغ سے چمٹا ہوا ہے-" فلینڈر نے منہ بنا کر کہا-

اگلے روز فلینڈر حاضری لگانے کے لیے اسٹیٹ ایجنسی کے آفس پر پہنچ گیا- ایک گھنٹہ وہاں گزارنے کے بعد وہ نکل آیا- اصولاً اسے کوئی ملازمت تلاش کرنا چاہیے تھی لیکن اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا- ان آٹھ سالوں میں جب کہ وہ جیل میں تھا لارا نے کچھ رقم بچالی تھی- فلینڈر نے اس سے ایک سستی مگر اچھی کارکردگی دینے والی ایک کار خرید لی-

جیل میں اس کی ملاقات ایک جرمن نژاد شخص گوئرنگ سے ہوئی تھی- وہ اس کے کام کرنے کے انداز سے متاثر ہوا تھا- اس لیے انہوں نے طے کیا تھا کہ جب وہ رہائی حاصل کر لیں گے تو مل کر کام کریں گے-

گوئرنگ کو بھی کام کرنے سے نفرت تھی- اور اس کا اصول تھا کہ دولت حاصل کرنے کے لیے ریوالور کو متحرک رکھنا چاہیے-

جیل جانے سے پہلے فلینڈر کو ایسا کوئی شخص مل جاتا تو وہ یقیناً اس کو پٹائی کر بیٹھتا- مگر اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی کی وجہ سے وہ گوئرنگ کو ایک کامیاب شخص

سمجھتا تھا- انہوں نے جیل میں طے کرلیا تھا کہ وہ رہائی پانے کے بعد بھی دوستی نبھائیں گے-

اس روز شام کو انہوں نے ریس کورس پر ملاقات کی-

"میں تقریباً تمہیں بھول گیا تھا-" گوئرنگ نے کہا- "تمہارے پاس کوئی خاص منصوبہ ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ ہم یہاں سے چلیں اور کہیں بیٹھ کر گفتگو کریں-" فلینڈر نے کہا- "ریس ختم ہو چکی تھی- اور لوگ وہاں سے نکل رہے تھے-

وہ لوگ جو ریس جیت گئے تھے کیش ونڈو سے رقم لے رہے تھے اس اثنا میں ایک چھوٹا سا بکتر بند ٹرک ریس کورس کے گیٹ پر آ گیا- اس میں سے مسلح گارڈ اترے تاکہ ریس کلب کی دن بھر کی آمدنی اکٹھا کرسکیں-

"ہم کہیں قریب چھپ کر ان گارڈز کی واپسی کا انتظار کرسکتے ہیں-" فلینڈر نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا- "میرے پاس ماسک بھی ہے ہم اسے پہن کر....."

"شاید تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے-" گوئرنگ نے کہا- "یہاں اس وقت درجنوں محافظ ہیں- تم دو قدم بھی نہیں چل سکو گے اور کوئی گولی تمہارا خاتمہ کردے گی- یہ خودکشی ہے- اگر تمہیں ڈاکا وغیرہ مارنا ہے تو اس کے لیے منصوبہ بندی کرنا پڑے گی-"

"وہ کیا؟"

"اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اس ٹرک کا تعاقب کریں اور ان کے معمولات چیک کریں- پھر اس کے بعد کوئی عملی قدم اٹھائیں-"

فلینڈر نے اس سے اتفاق کیا-

وہ ریس کورس سے باہر آ کر اپنی کار میں بیٹھ گئے- بکتر بند گاڑی چلنے لگی تو وہ اس کا تعاقب کرنے لگے- وہ مختلف مقامات پر رک کر رقومات وصول کر رہی تھی اور رقم کے تھیلے گاڑی میں رکھے جا رہے تھے- آخر میں وہ سپر مارکیٹ پہنچ گئی- ڈرائیور نے گاڑی کو پارکنگ لاٹ پر روک دیا- وہاں سے سپر مارکیٹ کا پچھلا دروازہ صاف نظر آ رہا تھا جب کہ سامنے کا دروازہ بند تھا- یہ سمجھنے میں انہیں دیر نہ لگی کہ گارڈ رقم لینے کے لیے عقبی دروازہ استعمال کرتے ہوں گے-

"کیا خیال ہے اب ہم ریوالور دکھا کر رقم نہ لوٹ لیں؟" فلینڈر نے کہا-

"ایسے معاملات میں جوش و ولولے کے بجائے دماغ استعمال کرنا چاہیے اور صبر و تحمل کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے اگلے ہفتے تک ہمیں مسلسل جائزہ لینا پڑے گا اور ان کے معمولات کو باریک بینی سے دیکھنا پڑے گا- پھر ہم ایک چوری کی کار پہلے سے لا کر پارکنگ لاٹ میں کھڑی کر دیں گے- تاکہ گارڈ یہ سمجھیں کہ کار وہاں پہلے سے کھڑی ہے اور اس کی طرف سے فکرمند نہیں ہونا چاہیے-" گوئرنگ بولا-

فلینڈر کو اس کی تجویز معقول لگی- انہیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا تھا- جمعے کو انہوں نے ایک پرانی سیڈان چرالی- اس کا رنگ جگہ جگہ سے اڑا ہوا تھا- وہ کار انہوں نے پارکنگ لاٹ میں کھڑی کردی- اس وقت اسٹور بند ہو چکا تھا اور اس کا سامنے والا دروازہ بھی بند کردیا گیا تھا- انہوں نے دستانے پہن لیے اور ریوالور ہاتھوں میں لے کر تیار ہو گئے-

تھوڑی دیر بعد کسی ٹرک کے آنے کی آواز سنائی دی- گوئرنگ دبک کر پچھلی نشستوں کے درمیان چھپ گیا- ایک گارڈ ٹرک میں رہا جب کہ باقی دو رقم جمع کرنے کے لیے سپر اسٹور کے پچھلے دروازے سے اندر چلے گئے-

"اب میرا خیال ہے کہ ماسک چڑھا لینا چاہیے-" فلینڈر نے کہا- اس کی آواز سرگوشی نما تھی-

دونوں نے ماسک لگائے اور کار سے اتر کر ٹرک کے نزدیک چلے گئے- وہ ہر لمحہ بھاری گزر رہا تھا اور ان

کے دل زور سے دھڑک رہے تھے-

تھوڑی دیر بعد وہ گارڈ سپر مارکیٹ کے عقبی دروازے سے نکلتے دکھائی دیے- ان میں سے ایک کے ہاتھ میں تھیلا دبا ہوا تھا جب کہ دوسرے نے اپنا ہاتھ ہولسٹر پر رکھا ہوا تھا-

وہ تیزی سے ان گارڈز کے پیچھے پہنچ گئے- آہٹ ہونے پر وہ تیزی سے مڑے لیکن ان کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر ٹھٹک گئے- گوئرنگ نے آگے جا کر دونوں کے ریوالور ان کے ہولسٹروں سے نکال لیے-

یہ سب کچھ چند سیکنڈوں میں ہو گیا-

گوئرنگ ٹرک کے انجن کی طرف دیکھ رہا تھا- وہ تاریکی میں کھڑا تھا اس لیے تیسرا شخص یعنی ڈرائیور نظر نہیں آ رہا تھا- اس نے غالباً ان لوگوں کو دونوں گارڈز کو کور کرتے نہیں دیکھا تھا- وہ بدلتی ہوئی صورت حال سے ناواقف دکھائی دیتا تھا-

وہ لوگ بہر حال ان کے لیے ڈھال کا کام دے رہے تھے-

"اب ٹرک کی ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھولو اور ڈرائیور سے کہو کہ وہ نیچے اتر آئے-" گوئرنگ نے سرگوشی میں ایک گارڈ سے کہا- "ورنہ میں تمہاری گدی میں سوراخ کردوں گا-"

گارڈ کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اس کی ہدایت پر عمل کرے- انہوں نے ڈرائیور پر بھی قابو پالیا- پھر ایک گارڈ نے ٹرک کا عقبی دروازہ کھولا اور گوئرنگ کے حکم پر رقم کے تھیلے اٹھا اٹھا کر انہیں دینے لگا- فلینڈر نے جلدی جلدی سارے تھیلے کار میں رکھ لیے-

جب وہ آخری تھیلا رکھ رہا تھا تو ایک آہٹ ہوئی- وہ چونک کر مڑا تو اسے کاغذ جمع کرنے والا لڑکا نظر آیا- وہ اپنے سامنے ایک نقاب پوش کو دیکھ کر گھبرا گیا- فلینڈر نے اسے ریوالور کی زد پر لے لیا- "اے ادھر آؤ لڑکے ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے- تم اس وقت تک ہمارے سامنے رہو گے جب تک کہ ہم یہاں سے چلے نہیں جاتے-"

لیکن لڑکا بدحواسی میں اسٹور کے عقبی دروازے کی طرف دوڑنے لگا- فلینڈر اس پر گولی نہیں چلا سکتا تھا- وہ اسے بے بسی سے بھاگتے دیکھتا رہا- وہ جب نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے گوئرنگ کو صورت حال سے آگاہ کیا-

"اب تھوڑی دیر بعد یہاں پولیس آ جائے گی اس لیے یہاں سے بھاگ لینا بہتر ہے-" اس نے سرگوشی میں کہا- وہ بولا-

وہ جب ٹرک کی طرف مڑا تو اس نے ایک گارڈ کو ٹرک کے خفیہ خانے سے ریوالور نکالتے دیکھا- "اے خبردار..... یہ ریوالور فرش پر پھینک دو-"

گارڈ نے ریوالور فرش پر پھینک دیا- گوئرنگ نے ریوالور اٹھالیا اور ٹرک کا عقبی دروازہ بند کردیا- وہ لپک کر سیڈان کی طرف گئے- تو انہیں سپر اسٹور کے عقبی دروازے سے ایک شخص نکلتا دکھائی دیا- وہ دونوں کار میں بیٹھ گئے اور اسے اسٹارٹ کر کے وہاں سے چل دیے- ان کی رفتار خطرناک حد تک تیز تھی-

وہ جب دو میل آگے آ گئے تو انہوں نے کار روک لی- وہاں فلینڈر کی کار پہلے سے پارک تھی- انہوں نے پھرتی سے وہ تھیلے اس میں منتقل کرلیے- آدھے گھنٹے بعد وہ گوئرنگ کے فلیٹ پر بیٹھے رقم گن رہے تھے- وہ پانچ لاکھ اسی ہزار ڈالر تھے- انہوں نے اسے تقسیم کرلیا- فلینڈر نے اسے ہدایت کی کہ وہ اب اس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہ کرے- یہ اس کا پہلا اور آخری جرم تھا- "میں تو اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کی تلافی کرنا چاہتا تھا-" اس نے کہا- "بہر حال اس رقم سے میں اپنا مستقبل بنالوں گا-"

وہ گوئرنگ کے فلیٹ سے نکل آیا-

دوسرے روز اس ڈکیتی کے بارے میں اخبارات میں خبریں شائع ہوئیں کہ نقاب پوش اپنا کوئی نشان چھوڑے بغیر فرار ہو گئے۔

فلینڈر نے ایک فرضی نام سے وہ رقم ایک بینک میں جمع کردی۔ پھر چھ مہینے کسی واقعے کے بغیر گزر گئے۔ ایک روز پولیس لیفٹیننٹ کا فون آیا کہ وہ کسی کی شناخت کرانا چاہتا ہے۔ اس لیے اسے پولیس اسٹیشن آنا ہوگا۔

وہ پولیس اسٹیشن چلا گیا۔ ''تم کس کی شناخت کرنا چاہتے ہو؟'' اس نے لیفٹیننٹ گیری سے سوال کیا۔

''اس البم کو کھول کر غور سے دیکھو۔'' اس نے ایک البم اسے دیا۔ پھر اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا اور اس نے اخبار پڑھنا شروع کردیا۔ فلینڈر کا دل انجانے وسوسوں سے دھڑک رہا تھا۔ آخر وہ اس سے کس کی شناخت کرانا چاہتے تھے؟ کیا گوئرنگ کی؟ اس لیے کہ گوئرنگ بین الاقوامی قسم کا بدمعاش تھا۔ اس بات کا اندیشہ تھا کہ اس کی تصویر دیکھتے ہی وہ چونک جائے گا۔

وہ بہر حال مجبور تھا کہ البم کی ورق گردانی کرے۔ تھوڑی دیر بعد اس کی نگاہ ایک تصویر پر جم کر رہ گئی۔ اس کے جبڑے پر سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔

''یہ وہی ہے جس نے جیروم کو ہلاک کیا تھا اور اس جرم کی سزا مجھے بھگتنا پڑی۔'' اس نے ہیجان خیز لہجے میں کہا۔ لیفٹیننٹ اس کے قریب آ گیا اور اس تصویر کو دیکھنے لگا۔

''تمہیں یقین ہے؟''

''ہاں جیروم نے بھی اس پر گولی چلائی تھی۔ اس کی دائیں پسلی پر اس کا نشان ہوگا۔'' فلینڈر بولا۔ ''اس کے بال سرخ ہیں۔ مگر یہ کہاں ہے؟''

''ڈکیتی کی ایک واردات میں پکڑا گیا ہے۔ اس نے دس مختلف وارداتوں کا اعتراف اور کیا ہے۔'' وہ بولا۔ ''جیروم کے شراب خانے پر انہوں نے جو واردات کی ہے وہ پہلی واردات ہے اس لیے پولیس کے پاس ان کا کوئی ریکارڈ اس وقت نہیں تھا۔ اور اگر اس نے اعتراف کرلیا ہے تو تم نے مجھے پولیس اسٹیشن کیوں بلالیا؟''

''تاکہ تم تصدیق کرسکو۔'' وہ بولا۔ ''تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا اس پر ہمیں افسوس ہے۔''

گھر پہنچ کر اس نے اپنی بیوی کو اس بارے میں بتایا تو وہ کہنے لگی۔ ''میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ جزا اور سزا کا نظریہ پرانا نہیں ہوا ہے۔ مجرم کو بہر حال سزا بھگتنا پڑتی ہے۔''

دوسرے روز اس کے وکیل نے فون کیا کہ وہ محکمہ پولیس پر پانچ لاکھ ڈالر ہرجانے کا مقدمہ کر رہا ہے۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہیں کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔'' وہ بولا۔

''مجھے کوئی اختلاف نہیں ہے۔'' وہ بولا۔

تھوڑی دیر بعد اخباری رپورٹر اس کے فلیٹ پر آ گئے۔ وہ اس کی لارا کی تصویریں بنانے لگے۔ ایک رپورٹر نے پوچھا۔ ''اگر تمہیں ہرجانے کی رقم مل جائے گی تو کیا تمہیں اطمینان ہوجائے گا کہ انصاف کا تقاضا پورا ہوگیا۔ اور عدل کے پلڑے برابر ہو گئے؟''

''فلینڈر نے سگریٹ سلگا لیا اور سوچنے لگا کہ سپر اسٹور کے عقب سے اس نے جو رقم لوٹی ہے۔ اب وہ اسے ہرجانے کی رقم کے ساتھ ملا کر خرچ کرسکے گا۔ اور کسی کو اس پر شبہ تک نہیں ہوگا۔

''تمہارا سوال ذرا مشکل ہے۔'' فلینڈر نے کہا۔ اور سگریٹ کے کش کھینچنے لگا۔ ''قانون نے ایک بڑی غلطی کی تھی۔ ہوسکتا ہے مجھ سے بھی کوئی غلطی ہوجائے۔ مگر اس کا فیصلہ قدرت کرے گی کہ قانون سے جو غلطی ہوئی ہے اس کی تلافی ہوئی یا نہیں۔'' اس نے کہا اور سگریٹ کا دھواں فضا میں اگل دیا۔

☆☆☆

بھوت کہانی

ذوالنورین

صفر۔ اس نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ احمق آدمی تم کیا سمجھتے ہو کہ میں یہ التجا کروں گی کہ تم کیتھی کو چھوڑ دو تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ تم نے اس سے شادی کر کے میرے سر سے بوجھ اتار دیا ہے۔ اس کے بھاری اخراجات میرے لیے ناقابل برداشت ہوئے جا رہے تھے۔

میں جو یہ سوچ رہا تھا کہ کیتھی کے ذریعے کلاڈیا کو بلیک میل کرسکوں گا اس کا سپاٹ جواب سن کر کھول کر رہ گیا۔ میں تو پہلے ہی یہ سوچ کر ہلکان ہوئی جا رہی تھی کہ اس سے شادی کون کرے گا۔ مگر تم نے میری مشکل آسان کردی۔ میرے اچھے داماد۔

وہ قہقہے لگانے لگی ہانٹڈ ری قسمت

بدروحوں کی کہانیاں لکھتے لکھتے اب میں خود کو بھوت سمجھنے لگا ہوں۔ میں تیسرے درجے کا ایک مسکین اور مفلس ٹائپ مصنف ہوں۔ لوگوں کے ڈرائنگ روموں میں بیٹھ کر ان کی زندگی کی کہانیاں سنتا ہوں پھر ان میں ترمیم و اضافہ کر کے انہیں پراسرار کہانیوں کی شکل دے دیتا ہوں۔ ان کہانیوں پر میرا نام نہیں آتا ہے لیکن میں بہر حال مشہور ہوں اور لوگوں سے میری اتنی واقفیت ہوچکی ہے کہ لوگ مجھ سے اچھا برتاؤ کرتے

،میری مدارات کرتے اور اپنی کہانیاں سناتے ہیں۔

میں تیسرے درجے کا مصنف سہی لیکن تھوڑی تھوڑی کر کے میرے پاس خاصی رقم اکٹھا ہوگئی اور بینک بیلنس ہوگیا۔ اس وقت میں نے سوچا کہ شادی کر لینا چاہیے۔ اس وقت میری عمر اکیاون سال تھی مگر میرے قوی مضبوط تھے۔ میری بینائی اور سماعت بالکل صحیح کام کر رہی تھی اس لیے میں نے سوچا کہ مجھے کلاڈیا سے شادی کر لینا چاہیے۔ کلاڈیا ایک اوپیرا میں کام کر چکی تھی اور جسمانی لحاظ سے ایک بھرپور عورت تھی۔

اس کے کئی دولت مند شوہر آنجہانی ہو چکے تھے اس لیے اس کا بینک بیلنس بہت بھاری تھا اور سماجی حلقوں میں اس کی کافی حیثیت تھی۔ اس کے وارثوں میں بیس سال کی ایک مردنما لڑکی کیتھی تھی..... مردنما اس لیے کہ کیتھی کی ہلکی سی مونچھیں تھیں۔

ایک رات جب کہ میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہا تھا میں نے شیمپن کا گلاس کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھا اور اس کا تندرست شانہ سہلا کر بولا۔ تم دنیا کی حسین ترین عورت ہو۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم مجھے دنیا کا خوش نصیب ترین مرد بنا دو۔

اس نے اپنی سحر آگیں آنکھوں سے میرا سر تا پا جائزہ لیا اور پاٹ دار آواز میں بولی۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو ،میں سمجھی نہیں۔

تم مجھ سے شادی کر لو۔

وہ تھوڑی دیر تک مجھے سکتے کی سی کیفیت میں دیکھتی رہی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ دل ہی دل میں گلنار ہو رہی ہوگی۔ سوچ رہی ہوگی کہ مجھ سے اچھا شوہر اس عمر میں اسے کہاں مل سکتا ہے۔ مگر اس نے ایک گہرا سانس لے کر خلاف توقع مجھ سے کہا۔ شادی کر لوں۔ تم سے شادی کر لوں۔ کیوں۔ کیا میں کوئی احمق ہوں۔ میرے سارے سابقہ شوہر مالدار تھے۔ میں تم جیسے مفلس سے شادی کیوں کر لوں۔

اس کا انداز تضحیک آمیز تھا۔

مگر میں مفلس نہیں ہوں۔ میں نے تمہاری سرگزشت رعایتی نرخ پر لکھی ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ۔

تم نے رعایت کیوں برتی ہے۔ محض اس لیے کہ تم تیسرے درجے کے مصنف ہو اور اپنی سطح سے گر کر ہو۔ اگر تمہیں کسی مالدار خاتون کی تلاش ہے تو اس کے لیے اور بھی گرنا پڑے گا۔ یعنی کوئی کم عقل اور جاہل عورت قبول کرنا پڑے گی۔

پھر وہ اٹھلاتی ہوئی برآمدے سے جانے لگی۔ جاتے ہوئے اس نے پلٹ کر کہا۔ اب یہاں سے چلے پھرتے نظر آؤ۔ میں تم جیسے کنگلوں کو ایک لمحہ بھی برداشت نہیں کر سکتی اور اس خوش فہمی میں نہ رہنا کہ تم میرا کچھ بگاڑ لو گے۔

اس کے انداز مخاطب پر میرا دماغ بھنا گیا۔ پہلے ہی مرحلے میں اس نے مجھے شرمناک شکست دی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی میں نے اپنا سامان سمیٹا اور جوتے پہن لیے۔

جب میں دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا تو کلاڈیا کی اکلوتی لڑکی کیتھی نے اچانک پوچھا۔ تم کہاں جا رہے ہو۔

میرا کام ختم ہوگیا ہے اس لیے میں کہیں اور جاؤں گا۔ کوئی اور کام کروں گا۔

مم..... مگر..... میں تو سمجھی تھی کہ تم ممی سے..... اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور آواز بھرائی ہوئی تھی۔

میں سمجھ گیا کہ اس کے دل میں میرے لیے نرم گوشہ پیدا ہو چکا ہے۔ میں اس کے نزدیک ایک نرم دل اور شفیق انسان ہوں اس لیے وہ مجھے پسند کرنے لگی ہے۔

اچانک میرے دماغ میں ایک منتقمانہ جذبہ ابھرا اور میں نے اسے حربے کے طور پر کیتھی پر استعمال کیا۔ میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ میں یہاں سے جا رہا ہوں

ہمیشہ کے لیے۔

اوہ مسٹر ایشلے میں تو تم سے جدا ہونے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ سسکیاں لے کر بولی۔

بعض اوقات زندگی میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ میں نے کہا۔ کہ ہم جسے چاہتے ہیں وہ ہمیں نہیں مل پاتا۔ ویسے تم چاہو تو بہت کچھ کر سکتی ہو۔

وہ کیا۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔

میرے ساتھ چلو اور ہمیشہ کے لیے میری ہو جاؤ۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کیتھی اس کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا سامان سمیٹا اور میرے ساتھ چلنے کو تیار ہوگئی۔ میں تو جوش انتقام میں اندھا ہو رہا تھا اس لیے میں نے آگے پیچھے اور کچھ نہ سوچا اور عدالت میں جا کر کیتھی سے شادی کر لی۔

جب ہم ہوٹل پہنچے تو میں نے کیتھی سے کہا۔ میرا خیال ہے کہ کلاڈیا کو فون کرنا چاہیے وہ تمہاری طرف سے پریشان ہوگی۔

میں اسے اطلاع نہیں دینا چاہتا تھا بلکہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ میں نے اس پر فوقیت پالی ہے۔ اسے زبردست جھٹکا دیا ہے۔

وہ میری طرف سے پریشان نہیں ہوگی۔ کیتھی نے کہا۔ بلکہ اسے میرے گھر سے فرار ہونے پر خوشی ہو رہی ہوگی۔ اس نے ایک حقیقت کا انکشاف کیا۔

بہرحال میرے اصرار کرنے پر اس نے کلاڈیا کو فون کر دیا۔ پھر کچھ دیر سننے کے بعد ریسیور میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے اسے کیتھی سے شادی کرنے کی خبر سنائی۔ یہ تو بہت دلچسپ بات ہے۔ اس نے چہکتے لہجے میں کہا۔

ہم لوگ تم سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں ممی۔ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

مجھے معلوم ہے کہ تم مجھ سے گفتگو کرنے کے لیے بے قرار ہو گے۔ تم کسی وقت بھی آ سکتے ہو۔ تمہیں خوش آمدید کہوں گی۔

میں نے کیتھی سے پوچھ کر اس سے کہا کہ ہم ایک گھنٹے بعد اس کے پاس پہنچ رہے ہیں۔ ہوٹل سے نکلنے سے پہلے میں نے کیتھی سے کہا۔ مجھے اپنی ایک کتاب شائع کرانے کے لیے ایک پبلشر سے ملاقات کرنا ہے اس لیے تم ایک گھنٹے کے وقفے سے آنا۔

میں نے منصوبہ بنایا تھا کہ اس اثناء میں، میں اپنی ساس کلاڈیا سے سودے بازی کر لوں گا۔ اگر وہ درخواست کرے گی کہ کیتھی کو چھوڑ دو تو میں بھاری رقم لے کر اسے چھوڑ دوں گا۔

میں جب اس کے مکان پر پہنچا تو وہ میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔ اپنے خاندان کی عزت بچانے کے لیے تم کیا قیمت ادا کر سکتی ہو۔

صفر۔ اس نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ احمق آدمی تم کیا سمجھتے ہو کہ میں یہ التجا کروں گی کہ تم کیتھی کو چھوڑ دو تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ تم نے اس سے شادی کر کے میرے سر سے بوجھ اتار دیا ہے۔ اس کے بھاری اخراجات میرے لیے ناقابل برداشت ہوئے جا رہے تھے۔

میں جو یہ سوچ رہا تھا کہ کیتھی کے ذریعے کلاڈیا کو بلیک میل کر سکوں گا اس کا سپاٹ جواب سن کر کھول کر رہ گیا۔ میں تو پہلے ہی یہ سوچ کر ہلکان ہوئی جا رہی تھی کہ اس سے شادی کون کرے گا۔ مگر تم نے میری مشکل آسان کر دی۔ میرے اچھے داماد۔

وہ قہقہے لگانے لگی۔

اس کے قہقہے لگانے پر میرا پارہ ایک دم سے چڑھ گیا۔ میں نے قریب پڑا ہوا پیانو اٹھایا اور اس کے سر پہ دے مارا۔ اس کے قہقہے دم توڑ گئے اور وہ ساکت ہوگئی۔ صرف اس کی پلکیں جھپک رہی تھیں اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ میں نے دوسری بار وار کیا تو اس کے حلق سے ایک کربناک چیخ نکلی اور اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ سینے کا تموج ختم ہوگیا۔

اسے موت کے منہ میں پہنچا کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ کیتھی کے توسط سے میں ایک بڑی دولت کا مالک بن جاؤں گا۔ مگر سب سے پہلے اس لاش کو چھپانے کا مسئلہ تھا۔ اس کے لیے ایک بہترین منصوبہ بندی کرنا تھی۔ میں نے غور وخوض کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ اس معاملے میں کیتھی کی گردن پھنسا دینا چاہیے۔

سب سے پہلے میں نے رومال نکالا، پھر پیانو سے خون کے دھبے اور ہر جگہ سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کیے۔ اس کے بعد پیانو کو راستے میں یوں آڑا کھڑا کر دیا کہ جو بھی اندر آئے اسے پیانو اٹھا کر ایک طرف رکھنا پڑے۔ اس کے بعد میں عقبی دروازے سے نکل آیا۔ پھر کیتھی کا انتظار کرنے لگا۔

آدھے گھنٹے بعد کیتھی کی کار آتی دکھائی دی۔ وہ کار سے اتر کر اندر گئی۔ میں نے پیانو اٹھانے اور رکھنے کی آواز سنی۔ میں چاہتا تھا کہ کمرے میں اس وقت داخل ہوں جب چیخ پکار کی آواز آنے لگے۔

اس کے لیے مجھے دس منٹ اور انتظار کرنا پڑا۔ پھر جب میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ ہچکیاں لے رہی اور پولیس کو فون کر رہی تھی۔ پیانو کو دروازے سے ہٹا کر ایک طرف رکھ دیا گیا تھا۔ لازماً "اس پر کیتھی کی انگلیوں کے نشانات آ چکے ہوں گے۔

☆

جب عدالت میں اس کا مقدمہ پیش کیا گیا تو میں اس کے سب سے نزدیک کھڑا تھا اور اس کی دل جوئی کر رہا تھا۔ میں نے اس کے لیے ایک اچھے وکیل کا بندوبست کیا تھا۔ تاہم کیتھی اس بات سے انکار نہ کر سکی کہ اس کی ماں سے اس کے تعلقات خراب تھے۔

یہ حقیقت تھی کہ وہ اپنی ماں کی لاش کے نزدیک تنہا ملی تھی۔ اس کے علاوہ پیانو پر اس کی انگلیوں کے نشانات ملے تھے جس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ اپنی ماں کی قاتل ہے۔ لہٰذا جیوری نے اس کے خلاف اپنا فیصلہ سنا دیا۔

مجھے یہ سن کر افسوس ہوا اور خوشی بھی۔ اس لیے کہ کلاڈیا کی دولت کا مالک بننے والا تھا۔ وہ ختم ہو چکی اور اس کی بیٹی اس کی قاتل ٹھہری تھی۔ یہ صحیح ہے کہ بذات خود مجرم نہیں ہو اور صرف ایسی کہانیاں لکھتا جو مجرم ہوتی ہیں اور جن میں بھوتوں کا ذکر ہوتا ہے۔ اس وقت میں نے ایک زبردست منصوبہ تیار کیا تو بلاشرکت غیرے ایک بڑی دولت کا مالک بن گیا تو جب کیتھی کو جیل بھیجا گیا تو وکیل نے مجھے آفس میں طلب کیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے خوش خبری سنائے گا۔ میرے پاؤں صحیح طور پر زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ میں اس کے آفس میں پہنچا تو اس نے کہا۔ مسٹر ایشلے آپ کے ساتھ جو کچھ پیش آیا ہے مجھے اس پر افسوس ہے۔ آپ کی ساس مر چکی ہے اور اس کی بیٹی یعنی آپ کی بیوی حوالات میں ہے۔

شکریہ۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

تم سمجھے نہیں۔ اس نے سادگی سے کہا۔ میں تمہیں کوئی خوش خبری نہیں سنا رہا ہوں۔ بلکہ یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ تمہیں اس کی جائداد سے ایک سینٹ بھی نہیں ملے گا۔

کیوں.....!

اس لیے کہ کلاڈیا کی جائداد کی حق دار کیتھی ہے اور کیتھی جیل میں ہے۔

مگر جب۔

مگر جب وہ جیل سے نکلے گی تو تمہیں دولت حاصل ہو جائے گی..... یہی کہنا چاہیے ہونا۔ لیکن وہ جیل سے کیسے باہر آئے گی اسے تو عمر قید کی سزا ہوئی ہے۔

یہ سن کر میرا دماغ خراب ہو گیا۔ آج کل میں پاگل خانے میں ہوں۔

☆☆☆

شاہان ٹیوڈر کے تاریخی عہد پر لکھے گئے خوں رنگ اوراق

گلابوں کی جنگ

اس عہد کی کہانی جب انگلستان غیر ترقی یافتہ تھا ترقی اور طاقت سے بھرپور عہد ٹیوڈر پر لکھی گئی تاریخی کہانی

اشتیاق فاطمہ عظمیٰ

قدیم انگلستان کے واقعات پر مبنی سلسلہ وار تاریخی کہانی

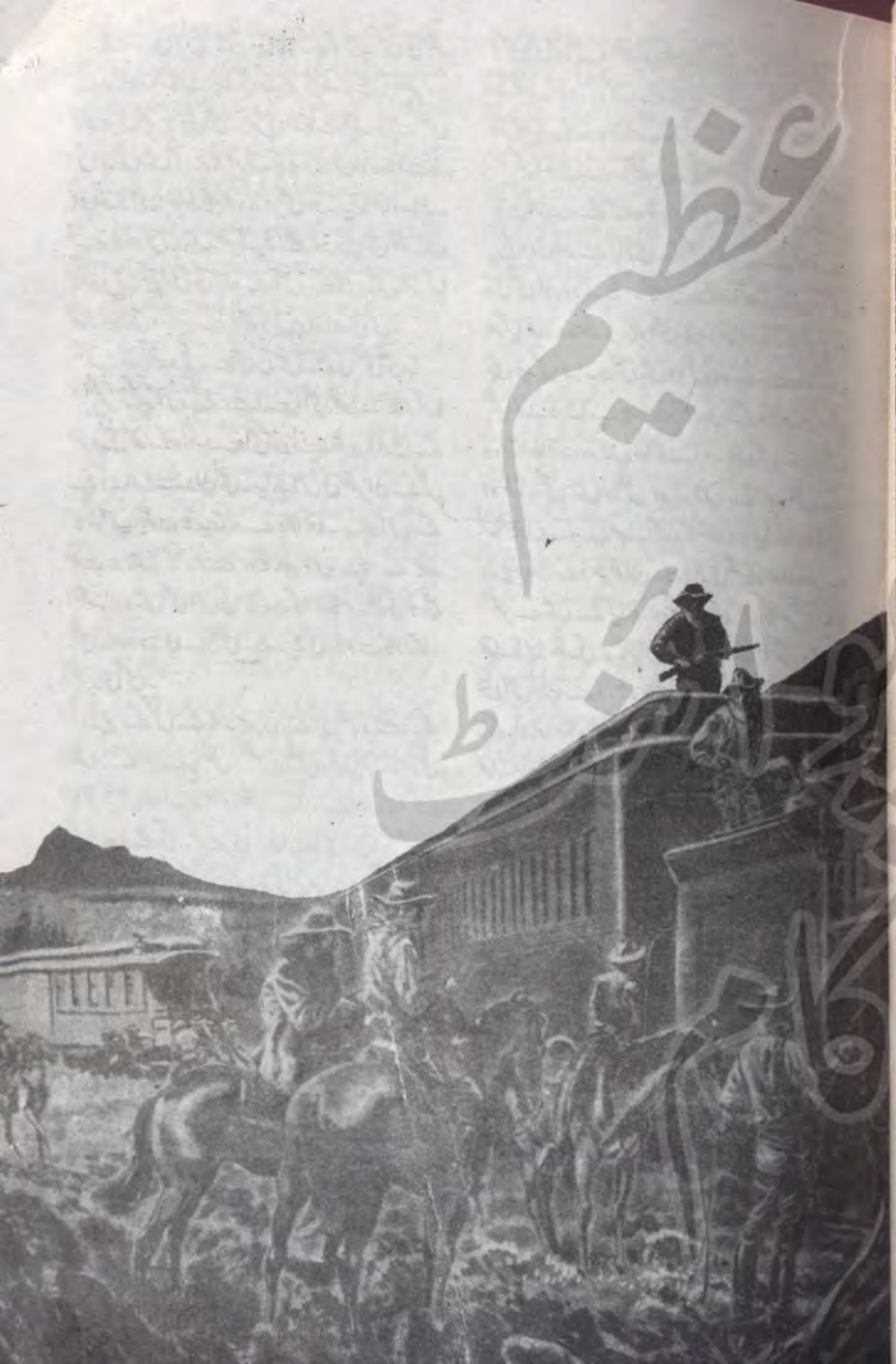

گلابوں کی جنگ

اشتیاق فاطمہ، ملتان

وہ اسی رات شدید بخار میں مبتلا ہوگیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ شدید بیمار ہوگیا تھا۔ ”بوتھ ویل! ایک رات اس نے بیٹے کو مخاطب کر کے کہا تھا۔ میں دنیا سے جا رہا ہوں، اب تم آرام سے شیلے سے شادی کر لینا۔“

اور اسی رات اس کا انتقال ہوگیا تھا۔

”بوتھ ویل! میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔“ شیلے نے روتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا۔ ”میں تمہارے والد کا دل نہیں توڑ سکتی..... اب بہتر ہوگا کہ تم اپنے باپ کی منتخب کردہ لڑکی سے شادی کر لو..... تمہارے اس طرح کرنے سے ان کی روح کو خوشی ملے گی۔“

بوتھ ویل خاموش ہوگیا تھا۔ مگر شیلے کی جدائی زیادہ دنوں تک وہ سہہ نہیں سکا تھا..... اور خود بھی شدید بیمار پڑ گیا تھا آخر شیلے کو اس کی ضد کے سامنے سر جھکانا پڑا تھا..... اور تین سال کے جان لیوا انتظار کروانے کے بعد آخر اس نے بوتھ ویل سے شادی کے لیے حامی بھر لی تھی۔

اور دو سال قبل وہ اس کی زندگی کا حصہ بن کر اس کے اس چھوٹے سے ولا میں آ گئی تھی اس نے اپنی سلیقہ مندی اور محبت سے اس چھوٹے سے بنگلے کو جنت بنا دیا تھا اور بوتھ ویل اپنی اس چھوٹی سی جنت میں بے حد خوش تھا۔

مگر اس کی اس حسین ورعنا جنت کو شاید کسی کی نظر لگنے کو تھی۔ اسکاٹ لینڈ کی ملکہ میری اسکاٹ کی نظر کرم بوتھ ویل پر پڑ چکی تھی۔ میری اسکاٹ ایک ایسے شخص کی تلاش میں تھی جو نا صرف خوبرو جوان اور طاقت ور ہو بلکہ ذہین معاملہ فہم اور مدبر بھی ہو۔ یہ تمام اوصاف اسے بوتھ ویل میں نظر آئے تھے اور پہلی ہی نظر میں بوتھ ویل نظروں کی راہ سے اس کے دل میں اتر گیا تھا۔ وہ دل و جان سے بوتھ ویل پر فدا ہو گئی تھی۔

اب وہ بوتھ ویل سے تنہائی میں ملنے کی متمنی تھی۔

مگر شاید اس کے لیے اسے ابھی تھوڑا انتظار کرنا ضروری تھا۔ وہ امید سے تھی وہ اپنے شوہر ڈارنلی کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ یہ بچہ اس کی حکمرانی کے محل کا خاص ستون ثابت ہونے والا تھا۔ یہ بچہ اس کے تخت و تاج کا وارث ہوتا اور اس بچے کے بعد انگلستان میں بھی اس کی حیثیت کو استحکام ملنے کی توقع تھی۔ سو وہ بڑی بے چینی سے بچے کی ولادت کا انتظار کر رہی تھی۔

رزیو کے قتل کے بعد میری نے کسی غم و غصے کے اظہار کے بجائے بالکل برعکس ردعمل دکھایا تھا۔ ڈارنلی کا تو خیال تھا اپنے منظور نظر کے قتل کے بعد وہ آگ بگولا ہو اٹھے گی۔ مگر میری نے ایسے کسی ری ایکشن کا مظاہرہ نہ کیا تھا بلکہ الٹا وہ ڈارنلی پر مہربان ہو گئی تھی۔ کسی شریر اور نٹ کھٹ بچے کی طرح اس نے ڈارنلی کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ڈارنلی ایسے سہم گیا تھا کہ جیسے اس نے کوئی بڑی خطا کر دی ہے اور اب اسے کوئی بڑی سزا ملنے والی ہو۔

دیکھا جاتا تو اس نے واقعی بڑی خطا کی تھی اپنے غنڈہ صفت دوستوں کی ٹولی کے ساتھ محل پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس حملے میں کئی خدام بھی زخمی ہوئے تھے۔ مگر بے چارہ رزیو تو بے موت مارا گیا تھا۔ وہ ملکہ کے معاملے میں بے حد محتاط تھا اور اب ملکہ کی طرف سے کسی بھی ردعمل کا اظہار نہ ہونا اس بات کا ثبوت تھا کہ ملکہ ٹھیک ہی کہتی تھی اسے رزیو سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ ملکہ کا ایک کارندہ تھا اور کچھ نہیں۔

مگر ڈارنلی کے ساتھیوں نے اس کے کچھ اس طرح کان بھرے تھے کہ وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا تھا۔ ملکہ کی کج ادائی اور بے نیازی نے بھی اس کے شبے کو تقویت دی تھی اور وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ محل میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ ملکہ کی پھوپھی کا بیٹا تھا اور ملکہ کا شوہر تھا یہی وجہ تھی کہ اسے محل میں داخل ہونے سے روکا نہیں گیا تھا۔ ورنہ اپنے چند سو ساتھیوں کے ساتھ بہر حال وہ اتنا طاقت ور نہیں تھا کہ بہ زور بازو محل میں داخل ہو سکتا۔ محل میں داخل ہو کر اس نے اور اس کے ساتھیوں نے بے مہابہ تشدد کا مظاہرہ کیا تھا اور ڈیوڈ رزیو کو ملکہ کے دسترخوان سے ڈارنلی گھسیٹتا ہوا دوسرے کمرے میں لے گیا تھا اور تلوار سے اس کا سر قلم کر دیا تھا۔ ڈیوڈ ملکہ کی مہربانیاں دیکھ کر سہم جاتا تھا وہ ہمیشہ ہی اس دن سے ڈرتا رہا تھا مگر اس کی لاکھ احتیاطوں کے باوجود وہ بدنصیب دن اس کی زندگی میں آ ہی گیا تھا۔ اور ڈارنلی کی احمقانہ رقابت کی دھار رزیو کا گلا کاٹ گئی تھی۔

اس حادثے کے بعد ملکہ میری نے نہایت دانائی اور عاقبت اندیشی سے حالات کا جائزہ لیا تھا۔ وہ قابل اور دانا ڈیوڈ رزیو جو اس کے لیے اور مملکت کے امور کے لیے بے حد اہم تھا مارا جا چکا تھا اور اس قتل میں ڈارنلی سے زیادہ ان لوگوں کا قصور تھا جو دوستوں کی صورت ڈارنلی کے گرد جمع تھے اور اپنی جھوٹی سچی باتوں سے ڈارنلی کو غصہ دلاتے اور اکساتے رہتے تھے۔ اس لیے اس نے فیصلہ کیا تھا کہ ڈارنلی سے پہلے ان لوگوں کو سزا ملنی چاہیے جو ڈارنلی کی پشت پر تھے اور ڈارنلی کی طاقت تھے۔

سو میری اسکاٹ نے ڈارنلی پر نگاہ التفات ڈال کر

اسے اپنا رسیا بنا لیا تھا۔ اس کی ایک ذرا سی چمکار پہ ڈارنلی کسی پالتو جانور کی طرح اس کے آگے پیچھے دم ہلانے لگا تھا۔ ملکہ نے نہایت دانش مندی سے ڈارنلی کو اپنی خواب گاہ تک محدود کر کے اس کے نام نہاد ساتھیوں کے خلاف آپریشن شروع کروا دیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے سارے ہی ساتھی گرفتار ہو گئے تھے۔ ملکہ نے ان سب کو عبرت ناک طریقے سے موت کے گھاٹ اتروا دیا تھا۔

ان کا جرم بھی تو کچھ کم نہیں تھا۔

انہوں نے ملکہ کے کردار پر نہ صرف شبہ کرنے کی جسارت کی تھی بلکہ ملکہ کے شوہر کو اس کے خلاف اُکسانے کی حماقت بھی کی تھی۔ ڈارنلی کو ان دنوں دنیا کی خبر نہ تھی۔ وہ صبح سے شام تک ملکہ کی دلنشیں شخصیت کے سحر میں ڈوبا اس کے حسن کی رعنائیاں سمیٹتا رہتا تھا۔ اور یہ راز و نیاز جلد ہی رنگ لے آیا تھا۔ جلد ہی سب کے سامنے یہ خبر آ گئی تھی کہ ملکہ میری امید سے ہے۔

اس خبر سے ڈارنلی ہی نہیں اس کے ماں باپ بھی بہت خوش ہوئے تھے۔ ڈارنلی کے باپ لارڈ کاکنس کو تو ملکہ میری سے کبھی بھی کوئی شکایت نہ رہی تھی کیونکہ وہ اپنے بیٹے کی ذہنی سطح سے واقف تھا۔ البتہ اس کی ماں مارگریٹ کو ملکہ سے ایک روایتی ساس کی طرح کافی شکایتیں تھیں۔ مگر ملکہ نے جس طرح ڈارنلی کے رزیو کے قتل کے جرم کو نظر انداز کر کے گلے سے لگا لیا تھا اور اب وہ اس کے بچے کی ماں بننے جا رہی تھی۔ اس کے ان دانش مندانہ اقدامات کی وجہ سے اب مارگریٹ بھی اپنی سوتیلی بھتیجی اور اکلوتی بہو سے بہت خوش تھی۔

"کاکنس" اس نے پیار بھری نظروں سے اپنے شوہر کاکنس کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "میں چاہتی ہوں' ہمارا پوتا ہمارے آبائی ولا میں پیدا ہو۔ اسی خاص کمرے میں جس میں تمہارے والد کی ولادت ہوئی تھی۔ پھر تم بھی اسی کمرے میں پیدا ہوئے تھے اور ہمارے بیٹے ڈارنلی نے بھی اسی کمرے کی بھاگوان فضا میں آنکھیں کھولی تھیں میں چاہتی ہوں' ڈارنلی کا پہلا بیٹا بھی اسی کمرے میں تولد ہو۔"

"اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" لارڈ نے بے نیازی سے کندھے اُچکاتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ ہمارے ولا میں پیدا ہو یا اپنی ماں کے محل میں..... اہم بات یہ ہے کہ وہ صحیح سالم اور صحت مندانہ طریقے سے اپنے وقت پر دنیا میں آئے۔"

"ہوں" ڈارنلی کی ماں نے سوچنے والے انداز میں سر ہلایا تھا۔

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

ملکہ میری کے بدلے ہوئے انداز نے نہ صرف ڈارنلی کو بلکہ اس کے ماں باپ کو بھی بے حد مطمئن اور مسرور کر دیا تھا۔

بچے کی خبر کے ساتھ ہی میری کے رویے میں تبدیلی کا عمل شروع ہو گیا تھا رفتہ رفتہ پھر سے اس میں وہی پہلے والی بے نیازی اور کج ادائیاں سر اٹھانے لگی تھیں۔ شروع شروع میں تو ڈارنلی نے یہ بات محسوس ہی نہیں کی تھی مگر جب محسوس ہونے لگی تو اسے پھر سے شکایت ہونے لگی۔

"ریٹا تم دیکھ رہی ہو۔" وہ اکثر ریٹا سے شکوہ کرتا کیونکہ وہ جانتا تھا محل میں ریٹا ہی تھی جو اس کے سب سے زیادہ قریب تھی۔

"ریٹا! میں محسوس کر رہا ہوں کہ' ملکہ میری اب پھر سے مجھ سے دور ہو رہی ہے..... وہی پہلے سی لاپروائیاں..... وہی بے نیازی وہی لاتعلقی....."

"نہیں جناب ایسا نہیں ہے۔" یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ بالکل درست کہہ رہا ہے اور وہ جیسا کہہ رہا ہے بالکل ویسا ہی معاملہ ہے۔ اس کے باوجود وہ پورے یقین سے کہتی۔ "آپ کو ایسا محسوس ہو رہا ہے ورنہ ایسا

ہے نہیں۔ دراصل جب عورت ماں بننے کے عمل سے گزر رہی ہوتی ہے۔ تو وہ کتنی ہی الجھنوں اور پریشانیوں کا شکار ہوجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آپ پر توجہ نہیں دے پاتیں۔"

شروع شروع میں ڈارنلی ریٹا کی طفل تسلیوں پر یقین کرتا رہا تھا مگر جب ایک رات ملکہ نے اسے اپنے بیڈروم سے بے دخل کردیا تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تھا۔

یہ سب کیا ہے ریٹا؟ وہ چیختے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ "کیا میں دوبارہ سے اپنے والدین کے پاس چلا جاؤں۔"

"خدانخواستہ آپ وہاں کیوں جانے لگے۔" ریٹا نے نرم لہجے میں پوچھا۔ "ملکہ عالیہ ایسی حالت سے ہیں' ایسے میں عورتیں چڑچڑی ہوہی جاتی ہیں۔ میں ابھی آپ کے لیے ایک اور آرام دہ خواب گاہ کا بندوبست کروادیتی ہوں۔"

اور یوں ڈارنلی ملکہ کی شاہانہ خواب گاہ سے محل کے ایک انتہائی مشرقی گوشے میں واقع عام سی خواب گاہ میں منتقل کردیا گیا۔ کبھی اس کا دل چاہتا وہ واپس اپنے والدین کے گھر چلا جائے۔ مگر بچے کے اشتیاق میں وہ اسی خواب گاہ میں پڑا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید بچے کی پیدائش کے بعد ملکہ کا موڈ دوبارہ سے ٹھیک ہوجائے۔

انہی دنوں ڈارنلی کو اس کے والد لارڈ کاکنس کی بیماری کی اطلاع ملی تھی اور وہ فوری طور پر اپنے گھر جا پہنچا تھا۔ اس کی ماں مارگریٹ پریشان سی نشست گاہ میں بیٹھی تھی جبکہ خواب گاہ میں طبیب لارڈ کا معائنہ کرنے میں مصروف تھا۔

ڈارنلی..... میرے بیٹے تم آگئے؟ اس کی ماں اسے دیکھ کر بے تابانہ اس کی جانب بڑھی تھی اور اس کے سینے سے لگ کر بے ساختہ رو پڑی تھی۔

"مام! سب خیر تو ہے؟" وہ ماں کے اس طرح رونے پر ایک دم سے پریشان ہوا اٹھا تھا۔ "ڈیڈ کیسے ہیں؟ وہ ٹھیک تو ہیں؟"

"ہاں' ابھی تو ٹھیک ہیں۔" مارگریٹ نے آنسو پونچھتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔ "مگر شاید وہ زیادہ عرصے تک ٹھیک نہ رہ سکیں انہیں پھیپھڑوں کی بیماری ہوگئی ہے۔"

تپ دق؟ ڈارنلی نے وحشت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں' ماں نے سسکی سی لی۔" اور بیماری بھی آخری اسٹیج پر پہنچ چکی ہے۔ ڈاکٹروں اور طبیبوں نے جواب دے دیا ہے۔"

"کیا؟" ڈارنلی متوحش ہوکر سر کاکنس کے کمرے کی طرف دوڑا' طبیب معائنے کے بعد کمرے سے باہر آرہا تھا۔

سب ٹھیک تو ہے نا؟ اس نے طبیب کو روک کر وحشت بھرے لہجے میں سوال کیا تھا۔ "ڈیڈ ٹھیک ہوجائیں گے نا۔"

"کچھ کہہ نہیں سکتے۔" طبیب نے سرسری سے لہجے میں جواب دیا۔ "موت اور حیات سب اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔"

ڈارنلی طبیب کو چھوڑ کر پلٹا اور تیزی سے کاکنس کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ "ڈیڈ" اس کی آواز پر زرد رو کاکنس نے نقاہت بھرے انداز میں آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

ڈارنلی آج کئی مہینوں بعد اپنے والد کو دیکھ رہا تھا۔ اب چند مہینوں میں اس کی صحت بہت ہی خراب ہوچکی تھی۔ وہ ہڈیوں کی مالا بن گیا تھا۔ چہرہ پچک گیا تھا اور آنکھیں گڑھے میں اتر گئی تھیں۔

ڈیڈ! یہ آپ کو کیا ہوا؟ اس کی روہانسی آواز پر کاکنس نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تم مجھ سے اتنی

محبت کرتے ہو گے؟ وہ مسکرایا۔ درد بھری پھیکی مسکراہٹ۔

"مجھے بھی کہاں پتہ تھا۔" وہ خود گویائی کے سے انداز میں بولا۔

"مگر یہ سچ ہے ڈیڈ میں آپ سے بے حد محبت کرتا ہوں میں آپ کو ہرگز بھی مرنے نہیں دوں گا۔ میں آپ کا بہترین سے بہترین معالج سے علاج کرواؤں گا اور آپ دیکھیے گا آپ جلد ہی بالکل ٹھیک ہوجائیں گے اور بہت برسوں تک زندہ رہیں گے۔"

"بہت برسوں..... تک بے شک نہیں..... مگر اپنے پوتے کے دنیا میں آنے تک میں ضرور زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

اس کی دھیمی آواز سے حسرت چھلک رہی تھی۔

"آپ ضرور زندہ رہیں گے۔" ڈارنلی نے تیزی سے کہا۔ "آپ اپنے پوتے کو نا صرف دیکھ سکیں گے بلکہ اس کی پرورش بھی آپ ہی کریں گے۔ آپ اسے بڑا ہوتا ہوا دیکھیں گے اور جب وہ اسکاٹ لینڈ کے تخت پر بیٹھے گا اس وقت بھی آپ موجود ہوں گے۔"

"کاش..... کاش" کاکنس کی نقاہت بھری آواز حلق میں گھٹتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

"میں..... معالج کو بلاتا ہوں۔" ڈارنلی تیزی سے پلٹ کر دروازے کی طرف لپکا تھا۔"

"نہیں" کاکنس نے بہ مشکل ہاتھ اٹھا کر اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔

"اب اس کی ضرورت نہیں ہے..... تم اپنی ماں کو بلالو..... اور تم بھی میرے قریب ہی رہو..... کیونکہ..... کیونکہ اب..... زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"مام" ڈارنلی نے وہیں سے وحشت زدہ آواز میں ماں کو پکارا تھا اور مارگریٹ تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

سب..... سب ٹھیک تو ہے نا؟ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

ڈارنلی نے کچھ نہیں کہا بس غم زدہ نظروں سے قریب المرگ باپ کی طرف دیکھنے لگا مارگریٹ بھی شوہر کی پٹی کے قریب آکر کھڑی ہوگئی تھی۔

لارڈ کاکنس آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا' لگتا تھا جیسے سانس سینے میں سما نہیں رہی اس کے چہرے پر تکلیف اور اذیت کے آثار بے حد نمایاں تھے۔

"کاکنس....." مارگریٹ نے جھک کر اس کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ کاکنس ابھی ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔"

کاکنس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اپنی تکلیف میں شاید وہ بیوی کی آواز سن ہی نہیں سکا تھا۔ اس کی سانس کے بڑھتے ہوئے زیر و بم کو دیکھ کر' وہ بہت زیادہ گھبرا گئی تھی۔

کئی لمحوں تک گہری گہری سانس لینے کی کوشش کے بعد کاکنس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہوگئی تھی اور چہرے کی رنگت کچھ اور سپید پڑ گئی تھی۔

"ڈارنلی؟ طبیب کو بلاؤ..... جلدی....." مارگریٹ کو کاکنس کی حالت کا اندازہ ہوگیا تھا اسی لیے اس نے تیزی سے کہا تھا۔ "للکہ جلدی کرو..... کہیں دیر نہ ہوجائے..... تمہارے ڈیڈ کی حالت ٹھیک نہیں۔"

ڈارنلی باہر کی طرف لپکا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ طبیب کو لئے اندر داخل ہوا تھا۔

مگر اتنی دیر میں سب کچھ ختم ہوگیا تھا۔ لارڈ کاکنس اس دار فانی سے رخصت ہوچکا تھا۔ مارگریٹ چہرہ چھپائے رو رہی تھی۔ ڈارنلی نے کرب بھری نظروں سے پہلے ماں کو پھر باپ کو دیکھا اور قریب دھری کرسی پر دھپ سے بیٹھ گیا۔

اس کا خیال تھا کہ ملکہ میری کاکنس کے انتقال کی خبر

سنتے ہی دوڑی چلی آئے گی۔ لارڈ کانس نہ صرف اس کا سسر تھا بلکہ سوتیلی پھوپھی کا شوہر بھی تھا۔

مگر اس وقت اسے بہت مایوسی ہوئی تھی جب اسے پتہ چلا تھا کہ ملکہ نے ناسازی طبع کے باعث کانس کی آخری رسوم میں شرکت سے معذرت کر لی تھی۔

''میں جانتی تھی وہ نہیں آئے گی۔'' لیڈی مارگریٹ نے غم اور غصے کے ملے جلے لہجے سے کہا۔ ''وہ اس رشتے سے کبھی خوش نہیں تھی نہ ہی اس رشتے کو نباہنا چاہتی ہے۔''

ڈارنلی خاموش ہی رہا تھا۔ اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

لارڈ کانس کی آخری رسوم ادا کر کے اسے سپرد خاک کر دیا گیا تھا مارگریٹ کا خیال تھا کہ اس کارروائی سے فراغت پا کر ڈارنلی محل واپس لوٹ جائے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ کانس کی موت کو کئی روز گزر جانے کے باوجود ڈارنلی ابھی ولا میں ہی موجود تھا۔

کیا تم محل نہیں جا رہے؟ آخر کئی روز بعد مارگریٹ نے ڈارنلی سے پوچھا تھا۔

''آپ کو اکیلا چھوڑ کر جانے کو میرا دل آمادہ نہیں۔'' ڈارنلی نے درد بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''ابھی کچھ عرصہ میں آپ کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں..... ڈیڈ کے انتقال کو ابھی وقت ہی کتنا گزرا ہے۔''

''تمہارا جذبہ قابل قدر ہے۔'' مارگریٹ نے دھیمی مگر تشکر بھری آواز میں کہا۔ ''میں نہیں جانتی تھی کہ ہمارا بیٹا اپنے باپ اور ماں سے اتنی انسیت رکھتا ہے۔ جبکہ ہم نے تمہاری شادی کے سلسلے میں کوئی دانش مندی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ کاش ہم دولت اور حکومت کی لالچ میں پڑ کر میری جیسی لڑکی سے تمہاری شادی نہ کرواتے۔

''مام! اس ذکر کو جانے دیں۔'' ڈارنلی کرب بھرے لہجے میں بولا۔ ''اب بہت وقت گزر چکا ہے اب پچھتانے سے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا سوائے تکلیف اور اذیت کے.....''

''ہاں'' تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' مارگریٹ نے سسکی سی لی۔'' مگر اب اس طرح بیچ راستے میں تم اس کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے جبکہ وہ تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہے۔''

''مام اسے میری پرواہ ہی کب ہے۔ میں اس کے ساتھ رہوں یا اس کا ساتھ چھوڑ جاؤں اسے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''مگر میرے بیٹے..... تمہیں اب دانش مندی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ مارگریٹ نے ڈارنلی کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لیتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ ''تمہیں نباہنے کی پوری کوشش کرنی ہے..... اپنی خاطر اور اپنے آنے والے اس بچے کی خاطر جو کل..... اسکاٹ لینڈ کا بادشاہ بنے گا۔''

''جی! آپ بجا فرما رہی ہیں۔'' ڈارنلی نے پرسوچ انداز میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

تو بس' تیاری کرو اور فوری طور پر محل کے لیے روانہ ہو جاؤ..... اس گھر سے زیادہ اس محل میں تمہاری ضرورت ہے کیونکہ وہاں تمہاری بیوی تمہارے بچے کو جنم دینے والی ہے۔'' ہر وقت بیوی کے خلاف بھڑکانے والی اس کی ماں آج اسے بیوی کے پاس واپس جانے کی ترغیب دے رہی تھی مگر مام آپ کو یوں..... تنہا چھوڑ کر.....'' ڈارنلی نے ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں اپنے یہاں سے نہ جانے کا جواز پیش کرنا چاہا تھا مگر مارگریٹ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے' اسے سمجھانے والے لہجے میں کہا۔

''ڈارنلی! تم میری فکر مت کرو۔ بیٹوں کو ماؤں کی فکر کرنی چاہیے مگر بس اتنی جتنا انہیں ان کے ساتھ رہنا ہے۔ ان کے مقابلے میں انہیں اپنی بیویوں کی فکر

زیادہ کرنی چاہیے کیونکہ اپنی بیویوں کے ساتھ انہیں مرتے دم تک رہنا ہے سمجھے۔'' وہ مسکرائی۔

''جی'' اس کی مسکراہٹ نے ماحول کے تناؤ میں ایک دم سے کمی پیدا کر دی تھی۔ ڈارنلی کو اپنے دل میں ایک عجب سی سرخوشی سی محسوس ہوئی تھی۔ میری اسکاٹ اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی اور وہ بچہ اسکاٹ لینڈ کے تخت و تاج کا وارث تھا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں مجھے محل میں چلے جانا چاہیے۔''

اس نے سر جھکا کر دھیمے لہجے میں کہا۔ ''آپ اپنی طبیعت کے بارے میں مجھے مطلع کرتی رہیے گا۔''

اور اسی شام ڈارنلی دوبارہ سے محل میں لوٹ آیا تھا اس کا ٹھکانہ ملکہ کی خواب گاہ سے خاصے فاصلے پر ایک عام سی خواب گاہ میں تھا۔ وہ فوری طور پر ملکہ سے مل کر اس کی طبیعت کے بارے میں استفسار کرنا چاہ رہا تھا مگر اسے بتا دیا گیا تھا ملکہ ''مشرقی سرحدوں کے شمشیر زن مسٹر بوتھ ویل کے ساتھ مذاکرات میں مصروف ہیں۔''

''بوتھ ویل.....؟'' ڈارنلی کے کان کھڑے ہوئے تھے۔

''یہ کون ہے؟'' پہلے کبھی یہ نام نہیں سنا۔'' اس نے حیرت سے ریٹا کی طرف دیکھا۔''

''جی! یہ مشرقی سرحدی صوبے میں رہتے ہیں۔ اپنی بیگم کے ساتھ'' ریٹا نے بیگم'' پر خاص طور پر زور دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وقت سے پہلے ڈارنلی کسی شبے میں مبتلا ہو جائے۔

بیگم کے تذکرے نے ڈارنلی کو قدرے مطمئن کر دیا تھا اور وہ خاموشی سے اپنی خواب گاہ میں لوٹ گیا تھا۔

ٹھیک تین دن بعد ملکہ میری نے ایک خوبصورت اور صحت مند بیٹے کو جنم دیا تھا۔ محل میں ہی نہیں پورے شہر میں پورے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

ڈارنلی بھی خوشی سے نہال ہوا اٹھا تھا اور بھاگتا ہوا' ملکہ کے پاس پہنچا تھا۔

مگر اسے ملکہ کے کمرے کے دروازے پر ہی روک دیا گیا تھا۔

''قابل احترام ڈارنلی'' دروازے پر تعینات ہتھیار بند دربانوں نے سر جھکا کر ادب سے گزارش کی تھی۔ ''ملکہ عالیہ اس وقت تکلیف سے ہیں اس لئے کسی کو بھی اندر داخل ہونے سے منع فرمایا ہے۔''

''مگر میں' کسی نہیں ہوں۔ اس بچے کا باپ ہوں۔'' ڈارنلی نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ''مجھے اندر جانا ہے۔''

''کیسا شور ہے یہ۔'' ریٹا باہر نکلی تھی اور ڈارنلی پر نگاہ پڑتے ہی اس کی شفاف پیشانی پر بے نام لکیریں ابھر آئی تھیں۔

''ریٹا! یہ سب کیا ہے..... میں اپنے بیٹے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''آپ کو صبر کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔'' ریٹا نے قدرے خشک لہجے میں کہا۔ ''بپتسمہ کی رسم والے دن سے پہلے آپ بچے کو نہیں دیکھ سکیں گے۔''

ڈارنلی اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ خود کو بے حد تنہا اور بے بس محسوس کر رہا تھا۔ ملکہ میری نے ڈیوڈ رزیو کے قتل والے واقعے کے بعد اس کے سارے دوستوں اور بہی خواہوں کو ایک ایک کر کے قتل کروا دیا تھا۔ اس کے جاننے والوں اور اس کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھنے والوں تک کو چن چن کر صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا تھا۔ اب اس کا کوئی دوست نہ تھا نہ اس میں ہمت تھی کہ نئے سرے سے اپنے لیے وفادار تلاش کرے اور نہ ہی کسی دوسرے میں یہ حوصلہ تھا کہ اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا کر زندگی سے ہی ہاتھ دھو لے۔ ایک ماں باپ تھے سو باپ کے انتقال کے بعد اس کے اکیلے پن میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ یہاں محل میں اسے اس الگ تھلگ گوشے میں

اچھوت بنا کر ڈال دیا گیا تھا لیو نام صرف ایک خادم اسے خدمت کے لیے دیا گیا تھا۔

لیو فطرتاً کم گو اور خاموش طبع واقع ہوا تھا۔ اس لیے اس کے ہونے سے ڈارنلی کی تنہائی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا تھا۔ وہ کبھی اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا بھی تو وہ ہوں ہاں کے سوا کچھ نہ بولتا تھا۔

''تمہیں مجھ سے بات کرنے سے منع کیا گیا ہے کیا؟ کبھی وہ زچ ہو کر پوچھتا تو لیو حیرت سے نفی میں سر ہلا کر جواب دیتا۔

''نہیں جناب عالی! بھلا مجھے کوئی منع کیوں کرے گا؟''

پھر تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے؟ ڈارنلی بے بسی بھرے غصے سے سوال کرتا۔

''آپ بات کیجیے میں سن رہا ہوں۔'' وہ سر جھکا کر جواب دیتا۔ ''مگر افسوس مجھے زیادہ بات کرنی نہیں آتی۔''

''لیو'' ملکہ کے دروازے سے ناکام و نامراد لوٹنے کے بعد اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے لیو سے کرب بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ''تم یقین کر سکتے ہو کہ کسی باپ کو اپنے پہلوٹھی کے بیٹے کو دیکھنے کی بھی اجازت نہ دی گئی ہو۔''

لیو نے نفی میں سر ہلایا مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے؟ ڈارنلی نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔'' جب سے ملکہ امید سے ہوئی تھی' رفتہ رفتہ اس کے لطف و کرم میں کمی آتی چلی گئی تھی' حتیٰ کہ مجھے بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا اور اب بیٹے کی پیدائش کے بعد تو لگتا ہے اسے میری ضرورت ہی نہیں رہی۔''

''تو پھر آپ اپنی والدہ کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے۔''

کبھی کبھار تو لیو یوں بے ساختہ مشورہ دیتا تھا۔ ڈارنلی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ کئی لمحوں تک وہ پُرسوچ انداز میں سر ہلاتا رہا پھر مضبوط اور فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

''تمہارا مشورہ بے حد سعد ہے۔ یہاں میں اکیلا پڑا ہوں۔ اگر اپنے گھر چلا جاؤں تو..... کم از کم..... اپنی ماں کی تنہائی تو بانٹ سکوں گا۔''

''جی! وہی تو.....'' لیو نے مسرور سے لہجے میں مزید کہا۔

''بس یہ طے ہو گیا۔'' ڈارنلی نے کہا۔ ''میں کل صبح ہی اپنی مام کے پاس چلا جاؤں گا..... اور انہی کے ساتھ رہوں گا۔''

مگر شاید ڈارنلی کی قسمت میں اکیلے رہنا ہی لکھا تھا۔ کیونکہ اگلی صبح اس کی ماں کے اچانک انتقال کی خبر آ گئی تھی۔ شام کو اچھی بھلی وہ اپنے بیڈ روم میں گئی تھی مگر صبح خادمہ نے اسے اپنے بستر پر مردہ حالت میں پایا۔

ڈارنلی نے لیو کے ذریعے ملکہ میری کو اطلاع بھجوائی تھی۔ کچھ بھی تھا مارگریٹ شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ جیمس کی سوتیلی بہن تھی سو' دنیا دکھانے کو میری کو اس کی آخری رسوم میں شریک ہونا پڑا تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد ڈارنلی نے محل چھوڑ کر جانے کا خیال ہی دل سے نکال دیا تھا۔

بچے کی پیدائش کے چھٹے دن بپتسمہ کی رسم ادا کی گئی۔ شاہی پادری نے اس کا نام ''جیمس'' تجویز کیا۔ جسے ملکہ میری نے پسند کیا تھا۔ اسی دن پہلی بار ڈارنلی نے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ وہ ایک خوبصورت گول مٹول پیارا سا بچہ تھا۔

جیمس کی ماں بننے کے بعد ملکہ میری اسکاٹ کا انگلستان کے تخت پر کچھ اور حق بڑھ گیا تھا۔ ملکہ انگلستان الزبتھ کے والد ہنری ہشتم کے وراثت کے سلسلے میں جو وصیت کی تھی۔ اس کے مطابق ملکہ الزبتھ کے بعد اس کی بڑی پھوپھی میری گرے کی بیٹیوں کو تخت انگلستان کا وارث قرار دیا گیا تھا۔ مگر میری

گرے کی بڑی بیٹی جین گرے کے خسر نے ملکہ میری ٹیوڈر سے قبل ہی اسے تخت نشین کر دیا تھا۔ جسے بعد میں میری ٹیوڈر نے اس کے شوہر سمیت قتل کروا دیا تھا۔ اب بچی اس کی چھوٹی بہن کیتھرائن گرے۔

کیتھرائن نے 1553ء میں لارڈ ہربرٹ سے عقد کیا تھا۔ مگر جلد ہی یہ شادی ختم ہو گئی تھی۔ آٹھ سال بعد اس نے لارڈ سمرسٹ کے بیٹے ہارٹ فرڈ سے خفیہ شادی کر لی تھی۔ ایک بیٹا بھی تولد ہوا۔ مگر پاپائے کلیسا پارکر نے واقعات کی تحقیقات کر کے اس شادی کو ہی ناجائز قرار دے دیا تھا اور اس بنا پر کیتھرائن اور اس کے بیٹے کے حقوق تخت انگلستان سے ساقط ہو گئے تھے۔ اب اہل انگلستان اسکاٹ لینڈ کی ملکہ میری اسکاٹ اور اس کے بیٹے کے حقوق کو زیادہ اہم سمجھنے لگے تھے۔ ملکہ میری اسکاٹ ملکہ الزبتھ کی چھوٹی پھوپھی مارگریٹ کی پوتی تھی۔ اس حوالے سے تخت انگلستان پر اس کے دعوے کو زیادہ سچا سمجھا جانے لگا تھا۔

مگر میری اسکاٹ ان دنوں انگلستان کے تخت و تاج کے بجائے اپنے دل کے سنگھاسن پر بیٹھے بوتھ ویل کے بارے میں سوچنے میں مصروف تھی۔

گو کہ بوتھ ویل اپنی چہیتی بیوی الیگزینڈرا سے بے وفائی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ الیگزینڈرا کو دل کی گہرائیوں سے چاہتا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ملکہ میری اس پر یوں فریفتہ ہو جائے گی۔ دراصل ملکہ میری ایک ایسا ساتھی چاہتی تھی جس پر وہ بھروسہ کر سکے۔ جو حکومت کے گورکھ دھندے میں اس کا بہی خواہ اور مددگار ہو یہ تمام اوصاف اسے بوتھ ویل میں نظر آئے تھے اور وہ پہلی ہی نگاہ میں اس پر مر مٹی تھی۔

''مگر ملکہ عالیہ'' میری کی فریفتگی اور دیوانگی کے جواب میں اس نے کسی جوش و خروش کا مظاہرہ نہیں کیا تھا بلکہ اگر مگر اور شش و پنج کا شکار تھا۔

''اگر مگر کو بھول جاؤ۔'' ملکہ نے مضبوط لہجے میں جواب دیا تھا۔

''تقدیر کی دیوی تم پر مہربان ہو رہی ہے۔ اسکاٹ لینڈ کا تخت تمہاری راہ دیکھ رہا ہے۔ تم میرے شوہر بن کر اسکاٹ لینڈ کے بادشاہ اور حکمران بن جاؤ گے۔''

بوتھ ویل کی شارپ نیلگوں آنکھوں میں حریص چمک جاگ اٹھی تھی۔ اس نے تقدیر کی سازگاری سے پورا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''میری طرف دیکھو ویل!'' ملکہ نے اس کے چہرے پر پیاسی نظریں جماتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا مجھ میں کوئی کمی ہے..... میں حسین اور جوان نہیں؟

''نہیں یہ بات نہیں۔'' وہ ملکہ کے سراپے کو گہری نظروں سے ٹٹولتے ہوئے بولا۔ ''آپ بہت اچھی ہیں..... مگر..... آپ اگر شادی کی بات کر رہی ہیں ..... تو..... آپ کے شوہر کے ہوتے بھلا شادی کس طرح ہو سکتی ہے؟

تو کیا تم مجھ سے شادی کے لیے تیار ہو؟ ملکہ میری نے بے یقین لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں' بھلا آپ کو کون منع کر سکتا ہے۔'' اس نے جھک کر اس کا ہاتھ تھام کر ہاتھ کی پشت پر نہایت احترام سے بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

مگر ویل' تم بھی تو شادی شدہ ہو؟ ملکہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''اپنی بیوی کا کیا کرو گے؟''

بوتھ ویل اپنی بیوی سے بے تحاشہ محبت کرتا تھا مگر تخت و تاج کی ہوس نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ دھیمی آواز میں بولا۔ ''آپ ڈارنلی سے نجات کی راہ ڈھونڈیں..... میں اپنی بیوی سے جان چھڑانے کا راستہ تلاش کر ہی لوں گا۔''

''یہ ہوئی نا بات؟ ملکہ ادا سے مسکرائی۔

''آپ کی مسکراہٹ بے حد خوبصورت ہے۔'' بوتھ

ویل نے اس کے ہونٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے بوجھل لہجے میں کہا۔

''اگر تم..... آپ کے بجائے مجھے تم کہہ کر مخاطب کرو گے تو مجھے زیادہ اچھا لگے گا۔'' میری نے پیار بھرے لہجے میں کہا تھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھا لیا تھا اور یہ کہ اگر تم میری مسکراہٹ کے بجائے میرے لبوں کی تعریف کرو گے تو' مجھے بہت اچھا لگے گا۔

''اگر تم اجازت دو..... تو میں ان نرم اور گداز لبوں کو چھو کر دیکھ لوں۔'' بوتھ ویل نے اس کے چہرے کی طرف جھکتے ہوئے جذبات سے بوجھل آواز میں سرگوشی کی اور ملکہ بے ساختہ مسکرا اٹھی۔

یہاں ملکہ کی نشست گاہ میں یہ شغل میلہ چل رہا تھا۔ ادھر ڈارنلی اپنے کمرے میں اداس اور محروم بستر پر پڑا کروٹیں بدل رہا تھا۔ کئی دنوں سے اس کے پورے بدن میں درد تھا اور ہلکے بخار کی بھی شکایت تھی۔

''آپ طبیب کو کیوں نہیں دکھاتے؟ لیونے کئی بار مشورہ دیا تھا مگر ڈارنلی کا ہر بار یہی جواب تھا۔ اچھا ہے مر ہی جاؤں..... تو اس قید تنہائی سے جان چھوٹے۔''

''تم کیا سمجھتی ہو تم ڈارنلی سے طلاق لینے میں کامیاب ہو جاؤ گی؟

بوتھ ویل' نے سوال کیا تھا۔

''پھر تم ہی بتاؤ' اس ناہنجار سے کس طرح نجات حاصل کی جا سکتی ہے؟

''صرف ایک راستہ ہے'' بوتھ ویل نے میری کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تھا۔ ''اس کی موت؟''

تمہارا مطلب ہے کہ.....؟ ملکہ ہراساں سے لہجے میں بولی۔

''ہاں'' بوتھ ویل نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ ''تم ٹھیک سمجھیں ڈارنلی کو قتل ہی کروانا پڑے گا۔ جیتے جی وہ کبھی اس مقام سے نیچے اترنے کو تیار نہ ہوگا۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' ملکہ نے تائید بھرے انداز میں سر ہلایا۔ ''مگر سوال یہ ہے کہ اسے کون اور کس طرح قتل کرے گا۔''

''یہ وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔'' بوتھ ویل نے لاپرواہی سے شانے اُچکاتے ہوئے کہا اور مسکراتا ہوا ملکہ کے قریب چلا آیا۔

☆

ملکہ الزبتھ فرانسس ڈریک سے ملنے کے بعد واپس لوٹ آئی تھی۔ مگر اس سے ملاقات کے بعد سے مسلسل اسی کے بارے میں سوچے جا رہی تھی اس کی شاندار شخصیت کا سحر اپنی جگہ تھا مگر اس کا پیش بہا خزانہ ایسا جادو رکھتا تھا کہ ملکہ اس کی دیوانی سی ہو گئی تھی۔

''ہمیں انگلستان کو پورے یورپ میں ایک عزت اور بلند مقام پر پہنچانا ہے۔'' وہ اپنے خصوصی مشیران کی مجلس میں کہہ رہی تھی۔

''اور یورپ میں ہی کیوں' میں چاہتی ہوں انگلستان پوری دنیا میں محترم اور سرفراز ہو..... اور اس کے لیے ہمیں ایک پرشکوہ فوج ایک طاقت ور بحریہ اور خوشحال اور وفادار رعایا کی ضرورت ہے اور ان سب کے لیے دولت کی ضرورت ہے..... اور دولت کی یہ ضرورت ہاکسن ڈریک اور گلبرٹ جیسے قزاق ہی پوری کر سکتے ہیں۔''

''آپ کا اندازہ درست ہے۔'' ولیم سیسل نے تائید بھرے انداز میں کہا۔ ''مسٹر ڈریک نے اپنا آدھا خزانہ تو آپ کے ساتھ ہی روانہ کر دیا تھا۔''

''ہوں'' ملکہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اب ہمیں اس کے بقیہ آدھے خزانے کو ملک میں لانے کی تدبیر کرنی ہے..... تم فوری طور پر اسے لندن آنے کی دعوت بھجواؤ..... اور ایک معزز اور دولت مند لارڈ کی طرح اس کے شاندار استقبال کی تیاریاں شروع کر دو..... ہم اسے نہایت عزت و احترام سے محل میں لائیں گے اور میں اسے ''سر'' کے خطاب سے بھی نوازنا چاہتی ہوں۔''

''یہ تو بہت ہی خوب رہے گا۔'' بوڑھے وزیر الترے نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔ ''وہ ڈاکو جسے شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی جس کے شہر میں داخل ہوتے ہی گرفتار کر لینے اور قتل کر دینے کے احکام تھے۔ اب اسے عزت و احترام سے محل میں لایا جائے گا اور سر کے خطاب سے نوازا جائے گا۔''

''یہ سب اس کی دولت کی خاطر کیا جا رہا ہے۔'' ملکہ نے بوڑھے وزیر کے پوشیدہ طنز کو محسوس کرنے کے باوجود نظر انداز کرتے ہوئے اسی سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ہمیں اپنے ملک کو ترقی دینے کے لیے دولت کی ضرورت ہے..... اور یہ دولت ہمیں انہی قزاقوں سے حاصل ہو سکے گی۔''

ہاکسن اور ڈریک کو بلانے کے سارے انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ بہت ہی اہتمام اور احترام سے انہیں بلایا جا رہا تھا۔ ان دونوں کی رہائش کے لیے شاہی محل کے مہمان خانے کو از سر نو ڈیکوریٹ کیا جا رہا تھا۔ بندرگاہ سے محل تک آنے والے راستوں کو سجایا سنوارا جا رہا تھا۔ اگلے دن ملکہ نے ان دونوں بدنام زمانہ قزاقوں کے اعزاز میں ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا ہوا تھا جس میں شہر کے تمام بااثر اور محترم لوگ شامل ہونے والے تھے۔ اسی دن شام کو شاہی آڈیٹوریم میں ایک شاندار تقریب میں ملکہ ان ڈاکوؤں کو ''سر'' کے خطاب سے نوازنے والی تھی۔

ان لٹیروں سے حاصل ہونے والی دولت کا تخمینہ اور اخراجات کا بھی حساب کتاب کر لیا گیا تھا۔ شہر کی سڑکوں کی تعمیر و مرمت کا کام تو پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ دریاؤں پر پل اور بند باندھنے کا کام بھی پیش نظر تھا۔ اس کے علاوہ اسکولوں اور ہسپتالوں کی تعمیر پر بھی خصوصی توجہ دی جا رہی تھی۔ غریب بستیوں میں کم قیمت مگر انگریز قوم کے شایان شان گھروں کی تعمیر کا بھی منصوبہ تھا۔

الزبتھ نے اتوار کی شام کو ملک کے تمام شاعروں اور لکھاریوں کو انوائیٹ کیا ہوا تھا۔

محل کے نسبتاً چھوٹے ہال میں جس میں عموماً شاہی تقریبات ہوتی تھیں میں ملکہ نے ملک کے نامور شعراء اور مصنفین کو مدعو کیا تھا۔ ملک میں سر اٹھاتی خوشحالی کے باعث لوگوں میں اطمینان و امن و امان کے احساسات پنپ رہے تھے۔ ملکہ کی بھی یہی خواہش تھی کہ اس کی رعایا ایک مطمئن زندگی گزاریں اور زندگی سے لطف اندوز ہوں۔ لطف و تفریح کے احساسات کو تسکین دینے کے لیے ڈرامہ' کلبس اور شراب خانے جہاں خواتین بھی جا کر پینے پلانے سے لطف اندوز ہو سکتی تھیں وجود میں آ رہے تھے۔ رقص گاہوں کا وجود بھی لوگوں کے سامنے وسعت پا رہا تھا۔

لندن میں خوبصورت شام پھیلی ہوئی تھی۔

اور محل کے خوبصورت شاہی ہال میں شعراء و ادیب تشریف فرما تھے۔ آج ملکہ کے ساتھ' اس کے تین نئے ساتھی بھی تھے۔ روبرٹ سیسل' امیر اسکس اور والٹر ریلے..... والٹر ریلے پر وہ پہلے بھی نظر کرم ڈالتی رہی تھی۔ مگر اب وہ پوری طرح اس کے شگفتہ التفات میں پھنس چکا تھا۔

مہمانوں کی مدارت گرم قہوے اور نمکین خشک میوہ جات کے ساتھ کی گئی تھی۔ ملکہ نے نہایت عزت و احترام سے ان کا استقبال کیا تھا۔ لکھاری اور شاعر اس عزت افزائی پر حیران بھی تھے اور خوش بھی۔

ملکہ نے اپنی مختصر تقریر میں بتایا۔ ''کہ کوئی بھی معاشرہ تعلیم اور تفریح کے بغیر پنپ نہیں سکتا۔ انسان کو اس کا مقام اور احترام دینے کے لیے شاعر اور مصنف ایک اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ ایک استاد تعلیم دے کر انسان کو انسانیت کے اعلیٰ مقام تک پہنچاتا ہے جبکہ

شعر و ادب سے تعلق رکھنے والے لوگ انسان میں رعنائی اور نرمی پیدا کرتے ہیں۔ ایک اچھی اور باوقار زندگی کا ادراک دیتے ہیں۔

ملکہ نے بتایا کہ وہ چاہتی ہے کہ انگریز پوری دنیا میں وقار اور احترام کا استعارہ بن جائے۔ وہ انگریزوں کو پوری دنیا کے انسانوں سے بالاتر دیکھنا چاہتی ہے اور اس کے اس مقصد کے حصول کے لیے ادباء و شعراً کو اہم رول ادا کرنا پڑے گا۔ وہ اپنے مضامین اور شاعری کے ذریعے لوگوں میں وقار، تکبر اور احساس برتری کا احساس جگا سکتے ہیں اور انہیں بتا سکتے ہیں کہ انگریز پوری دنیا میں سب سے افضل و برتر ہیں۔

اس محفل میں تین مشہور ڈرامہ نگار کرسٹو فر مارلو (Christopher Marlo) بن جانسن (Bin Jhonson) اور ولیم شیکسپیئر (Willam Shakspeare) موجود تھے۔ ملکہ نے خاص طور پر ان ڈرامہ نگاروں کو انوائیٹ کیا تھا۔ ملکہ کو ڈرامے سے خصوصی رغبت تھی۔ اس کا خیال تھا تحریر سے شعر اور شعر سے ڈرامہ زیادہ اثر کرتا تھا۔

ولیم شیکسپیئر ایک کامیاب ڈرامہ نگار کے ساتھ بڑا شاعر بھی تھا۔ اس محفل میں شاعر ایڈمنڈ اسپنسر بھی موجود تھا۔ جس نے انگریزی زبان کی سب سے طویل مثنوی فیری کوئن (Fairy Queen) لکھی تھی۔ فرانسس بیکن ہکر اور سر فلپ سڈنی جیسے نثر نگار بھی اس ادبی تقریب میں موجود تھے۔

شعراء اور ادباء کے علاوہ اس کی توجہ والٹر ریلے، لارڈ اسکس اور روبرٹ سیسل پر بھی تھی۔

روبرٹ سیسل ایک معمولی شکل و صورت مگر غیر معمولی ذہانت اور کردار و اخلاق کا مالک تھا۔ اس کا باپ برے سیسل الزبتھ کے باپ ہنری ہشتم کے دور کا وزیر تھا۔ وہ ایک ذہین اور مدبر انسان تھا۔ اس نے اپنے بیٹے روبرٹ کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی تھی۔ روبرٹ کو بہت سے اوصاف باپ سے ورثے میں ملے تھے۔ ہر چند وہ باپ جیسا فطین اور درک نہ تھا پھر بھی عام امور سے واقفیت اور باپ سے رموز مملکت کی آگہی نے ملکہ کو اس کی طرف متوجہ کیا تھا اور ملکہ کو اس میں ایک کامیاب وزیر دکھائی دے رہا تھا۔

والٹر ریلے بہت عرصے سے ملکہ پر فریفتہ و شیدا تھا مگر وہ اب تک ملکہ کی نگاہ میں نہیں آسکا تھا۔ وہ ڈیون شر نامی قصبے میں پیدا ہوا تھا وہ ایک ہینڈسم نوجوان اور باتوں کا دھنی اور بے حد حاضر جواب تھا۔ اس کی خوبصورتی اور حاضر جوابی نے ملکہ کو متوجہ کیا تھا آگے چل کر اس نے بہت انعام و اکرام پایا۔ فوج رکاب کا سردار بھی بنایا گیا لیکن مجلس وزراء کا رکن یا سیاسی معاملات میں ملکہ کا یہ منظور نظر زیادہ دخل نہ پا سکا، وہ ایک کام کرنے والا آدمی تھا لیکن برابر والوں یا بالا دستوں سے نباہنے کے ہنر سے ناواقف تھا اسے زندگی میں بہت کچھ تجربے حاصل ہوئے، فرانس غرب الہند اور آئرلینڈ کے معرکوں میں شریک رہا وہ ایک خاص ذہانت رکھتا تھا۔ اس کے دل میں ملکہ کے لیے بڑی سچی لگن تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بعد کے زمانے میں اسے بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ والٹر ریلے نے امریکہ میں ایک نو آبادی قائم کی اور اس کا نام کنواری ملکہ پر "ورجینیا" (Virginia) رکھا۔

اس ادبی محفل میں پہلی بار ملکہ نے غور سے والٹر ریلے کی طرف دیکھا تھا اس کی خوب روئی اور حاضر جوابی حاضرین محفل میں اسے منفرد و ممتاز کر رہی تھی۔ ملکہ کی توجہ نے والٹر کے دل میں عجب سی سرشاری جگا دی تھی۔

لارڈ اسکیس جس کا اصل نام روبرٹ ڈیویرو تھا۔ والٹر ریلے سے وہ عمر میں کئی سال چھوٹا تھا۔ مگر حسن و رعنائی اور دانش و عقل مندی میں والٹر ریلے سے کہیں آگے تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس پہلی ہی ملاقات میں والٹر کو اسکیس اپنا رقیب روسیاہ محسوس ہوا تھا۔

ریلے کے مقابلے میں آگے چل کر اسکیس نے اپنے حاضرین میں بہت کچھ شہرت حاصل کی جس کا وہ حق دار نہ تھا۔ اس کے اندر دکھاوے کی بیماری تھی اس کی شہرت طلبی پر ایک مرتبہ روبرٹ سیسل کے باپ برے سیسل نے اپنے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"نہ تو ایسے شہرت طلب بنو جیسے اسکیس اور نہ شہرت سے ایسے غافل رہو جیسے ریلے۔"

بظاہر اسکیس کی شخصیت بہت پرکشش تھی، اور ملکہ اس کی کشش کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

اس ادبی تقریب کے اختتام پر، اس کا مشیر خاص ولیم سیسل اس سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔

کیا بات ہے ولیم؟ اس نے سوالیہ نظروں سے ولیم کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"پرنس آنٹرو کے بارے میں بات کرنے کا متمنی ہوں۔" ولیم نے نرم مگر سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔

"میں نے آنٹرو کو اپنا منگیتر تسلیم کر لیا ہے اور اس رشتے کی وجہ سے دربار فرانس کے ساتھ انگلستان کے تعلقات دوستانہ ہو گئے ہیں، ایک عہد نامہ مرتب ہو چکا ہے۔ جس کی رو سے اہل معاہدہ میں سے کسی پر کسی وجہ سے بھی کوئی حملہ آور ہو تو دوسرا چھ ہزار سپاہیوں سے مدد کرے گا۔"

"جی، یہ تمام باتیں اپنی جگہ ہیں۔" ولیم نے اسی دھیمے مؤدب مگر سپاٹ لہجے میں کہا۔ "مگر اب فرانسیسی چاہتے ہیں کہ اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کر لیا جائے۔"

"ٹھیک ہے ابھی ہم اندرونی اصلاحات میں مصروف ہیں۔" ملکہ نے چند لمحوں تک سوچتے رہنے کے بعد جواب دیا۔ "فرانس ڈریک، آکر واپس چلا جائے تو اس موضوع پر غور کریں گے۔"

"بہت شکریہ۔" ولیم سیسل نے دوہرا ہوتے ہوئے شکریہ ادا کیا اور ملکہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ دوپہر بہت روشن اور خوبصورت تھی۔

لندن کے نیلے آسمان پر سورج کا سنہری گولہ پوری آب و تاب سے دمک رہا تھا اور پورے لندن میں تسکین آمیز تمازت پھیلی ہوئی تھی۔ دمکتی چمکتی دھوپ نے پورے شہر کو اپنی نرم و گرم آغوش میں سمیٹا ہوا تھا۔ ملکہ اپنی خواب گاہ کے دریچے سے لگی نیلگوں آکاش پر چمکتے آفتاب کو تک رہی تھی۔

لندن میں بہت ہی کم ایسی گرم اور خوشگوار دوپہریں وارد ہوتی ہیں وہ روشنی بکھیرتے تمتماتے سورج کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ ایسے روشن اور آگ بگولہ سورج کو چھونے کی آرزو ہر دل میں ہوتی ہے، مگر اسے چھونے میں انگلیاں سوختہ ہو سکتی ہیں اور اکثر تو پورا وجود ہی بھسم ہو جاتا ہے۔ اس کا اپنا وجود بھی ایسے ہی آگ بگولہ سورج کی مانند تھا۔ حسن صورت، حسن سیرت جاہ و مقام سب ہی کچھ تھا۔ لوگ اسے دیکھتے اس پر دل و جان سے فدا ہوتے، مگر وہ اسے صرف دیکھ سکتے تھے۔ چھو نہیں سکتے تھے۔ چھونے میں ان کا نہیں خود الزبتھ کا وجود چٹخنے لگتا تھا۔ عجب شیشے سے بنی تھی وہ ہر شخص اس کے وجود میں جھانک سکتا تھا، مگر اس کے وجود میں چاہت کا اصل احساس نہیں جگا سکتا تھا۔ بظاہر وہ ہر عاشق کے لیے تھی جو بھی اس کی طرف حیرت بھری محبت سے دیکھتا وہ اپنی محبت کی راہ گزر اس کے لیے وا کر دیتی تھی۔ مگر کوئی بھی اس کے وجود کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ڈاکٹرز کا یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ اس کے مقدر میں کسی مرد کا حقیقی قرب نہیں لکھا اگر ایسا کرنے کی کوشش کی تو وہ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو سکتی ہے۔ ایک بار نہیں دو بار وہ خود سے یہ تجربہ کر کے دیکھ چکی تھی اور اب اس نے تقدیر کے اس فیصلے کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ کبھی بھی کسی سے بھی شادی نہیں کر سکتی۔ وہ ہر کسی کو اسی جھانسے میں رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔

فرانس کے شہزادے آنٹرو کے ساتھ اس نے یہی سوانگ رچایا تھا اور اس سے اپنی شادی کے لیے رضا مندی دے کر اس نے فرانس اور انگلستان کے درمیان پنپتے، غصے اور نفرت کی خلیج کو پاٹ دیا تھا۔ اب فرانس کی طرف سے شادی کا اصرار ہو رہا تھا۔

اور آج ملکہ نے فرانسیسی وفد کو شادی کے معاملات طے کرنے کے لئے بلایا تھا۔ اس نے آنٹرو سے شادی سے آنا کانی کرنے کے لیے کئی جواز سوچ رکھے تھے۔ سب سے بڑا جواز یہ تھا کہ آنٹرو سانس کا مریض تھا اور اس کا ایک پھیپھڑہ بیماری کے باعث ختم ہو چکا تھا۔

"میں نے تو خود اس رشتے کے لیے رضا مندی ظاہر کی تھی۔"

ملکہ نے فرانس سے آنے والے وفد کے عمر رسیدہ سربراہ مسٹر روکر سے دھیمی آواز میں کہا۔ "مگر آپ خود بتائیے ایک بیمار اور قریب المرگ شخص سے شادی کیا قرین قیاس ہوگا۔"

وفد کے سب ہی افراد خاموش ہو گئے تھے۔ ملکہ کی بات حقیقت پر مبنی تھی۔ آنٹرو کے بارے میں ڈاکٹرز کا یہی خیال تھا کہ وہ چند مہینوں یا زیادہ سے زیادہ سال بھر میں ملک عدم کو سدھار جائے گا۔ اب کسی ملک کی ملکہ کو کوئی کسی مرتے ہوئے شخص سے شادی کیلئے مجبور نہیں کر سکتا تھا۔

ملکہ نے آنٹرو کے بارے میں یہ ساری معلومات، فرانس کے شادی کے لیے اصرار کے بعد سے حاصل کی تھیں، اور ان معلومات کے حصول کے لیے اس نے ایک شام لارڈ اسکس کو طلب کیا تھا۔

اس وقت وہ ایک آرام دہ صوفے پر کچھ اس زاویے سے بیٹھی تھی کہ اس کے سڈول بدن کا دل کش انداز سامنے والے کے دل پر ایک دم سے اثر انداز ہوتا تھا۔ لارڈ اسکس کمرے میں داخل ہوا تو ملکہ کو اپنے سامنے اس قدر سیکسی انداز میں بیٹھے دیکھ کر اس کا دل یکا یکی دھڑک اٹھا تھا۔

"آپ نے مجھے طلب کیا؟ وہ خود کو سنبھالتا ہوا جلدی سے بولا۔

"کیا تمہیں طلب کر کے میں نے کوئی حماقت کی؟ ملکہ نے ادا سے پوچھا۔

"جی، بالکل نہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "حکم کیجئے، یہ خادم آپ کے لیے کیا کر سکتا ہے؟"

"اسکس۔" ملکہ نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ "یہاں آؤ..... یہاں بیٹھو..... میرے پاس مجھے تم سے کچھ اہم امور پر بات کرنی ہے۔"

"ملکہ عالیہ۔" اسکس گھبرا گیا تھا۔ وہ ملکہ کے قریب بیٹھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ "بھلا میں آپ کے پاس بیٹھنے کی جسارت کس طرح کر سکتا ہوں۔"

"یہ میرا حکم ہے۔" ملکہ نے ذرا سختی سے کہا تو وہ سمٹ کر قریب بیٹھ گیا تھا۔

"اسکس! میں نے محسوس کیا ہے کہ تم ایک قابل اعتبار انسان ہو۔" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ملکہ نے بات کا آغاز کیا تھا۔ "میرا دل کہتا ہے کہ تم پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔"

ملکہ کے منہ سے اپنی تعریف سن کر اسکس کا دل بے مہابا دھڑکنے لگا تھا۔

کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟ اسے خاموش دیکھ کر ملکہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا تھا۔

"نن..... نہیں ملکہ عالیہ۔" وہ ہکلایا۔ "یہ تو میرے لیے بہت عزت کی بات ہے کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔ میں اپنی جان دے کر بھی آپ کے بھروسے کو ٹوٹنے نہیں دوں گا۔"

"اوہ پیارے اسکس" ملکہ نے بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اسکس کے نوجوان جسم میں ایک سنسناہٹ سی جاگ اٹھی تھی۔ گو کہ ملکہ عمر میں

اس سے کافی سال بڑی تھی مگر بیج دھج سے وہ کسی نوعمر اور حسین لڑکی سے کم نہ تھی۔ اسکس کے رگ و پے میں ایک عجیب سا احساس سرائت کرتا محسوس ہو رہا تھا۔

"اسکس" اس نے دوبارہ جذبات بھرے انداز میں سرگوشی کی۔ "میں تم جیسے کسی شاندار ذہین اور قابل اعتبار انسان کی شریک زندگی بننا چاہتی تھی۔ مگر حالات نے مجھے فرانس کے مینڈک نما شہزادے آنٹرو سے وابستہ کر دیا۔ اس وقت کے حالات کا تقاضہ یہی تھا۔ اگر یہ رشتہ نہ قبول کیا جاتا تو..... ملکہ کے لیے بہت سی مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔ اسی لیے میں نے آنٹرو سے منگنی کر لی تھی۔ مگر اب فرانس کا شادی کے لیے اصرار بڑھتا جا رہا ہے۔

"اوہ" اسکس نے تشویش بھرے انداز میں ہونٹ سکوڑے۔

"اور میں کسی بھی قیمت پر آنٹرو سے شادی نہیں کرنا چاہتی اب تم ہی کہو میں کیا کروں۔ تمہاری ذہانت کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے تم سے ہی یہ مشورہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ تمہارے سوا اور کوئی بھی ایسا انسان نہیں ہے جس سے میں اپنا یہ دکھ بیان کر سکوں۔"

"یہ اس ناچیز کے لیے انتہائی خوشی اور اعزاز کی بات ہے۔"

لارڈ اسکس نے مسرت سے لرزتی آواز میں جواب دیا۔ "ملکہ عالیہ نے مجھے اس بھروسے کے قابل سمجھا اس کے لیے میں تہہ دل سے آپ کا شکر گزار ہوں۔"

"اسکس" ملکہ نے نہایت اپنے پن سے اس کا نام لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے بتاؤ میں کس طرح پرنس آنٹرو کے اس رشتے سے دامن چھڑا سکتی ہوں کیونکہ میں اس سے کسی بھی قیمت پر شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

"آپ صاحب تخت و تاج ہیں انگلستان کی رعایا آپ سے محبت کرتی ہے آپ ایک کامیاب حکمران ہیں۔ آپ بہ یک زبان جنبش انکار کر سکتی ہیں۔"

"یہی تو مشکل ہے۔" ملکہ نے افسردگی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں نے اپنی رعایا کے بھلے کے لیے ہی یہ معاہدہ کیا تھا اور ان کے فائدے کی وجہ سے ہی میں بلا جواز یہ رشتہ ختم نہیں کر سکتی۔"

"اوہ تو آپ کا مطلب ہے کہ.....؟ اسکس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ہاں" ملکہ جلدی سے بولی۔ "میں تمہیں یہ کام سونپنا چاہتی ہوں کہ تم خود فرانس جاؤ اور شہزادے آنٹرو کے اردگرد رہ کر کوئی ایسا جواز تلاش کرو جسے وجہ بنا کر میں اس سے یہ رشتہ توڑ سکوں۔"

"جی ملکہ عالیہ۔" اسکس نے سر تسلیم خم کیا مگر اس کے انداز میں جوش و خروش کی کمی محسوس کرتے ہوئے ملکہ نے دوبارہ سوال کیا۔ "لارڈ اسکس! تمہارے خیال میں یہ کوئی مشکل تو نہیں ہے۔"

"نن..... نہیں ملکہ عالیہ۔" وہ جلدی سے سٹ پٹاتے ہوئے بولا تھا۔ "آپ بے فکر ہو جائیں میں چند دنوں میں ہی آپ کی خدمت میں نتیجہ پیش کر دوں گا۔"

اور واقعی اگلے چار دنوں بعد ہی لارڈ اسکس نے ملکہ کو بتا دیا تھا کہ شہزادہ آنٹرو سانس کی بیماری میں مبتلا ہے اور اس کا ایک پھیپھڑا بالکل ختم ہو چکا ہے اور ڈاکٹرز کا خیال ہے کہ وہ چند مہینوں سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکے گا۔

اور اس وقت اس نے بڑے اعتماد اور دکھ سے بھرے انداز میں اس سچائی کو فرانس سے آنے والے وفد کے سامنے رکھا تھا۔

"اگر آپ لوگ یہی چاہتے ہیں کہ تپ دق کے مریض شہزادے سے شادی کر کے بیوگی کی آگ میں جل مروں تو مجھے آپ کی بات ماننے میں کوئی عار نہیں ہوگا۔"

"نہیں ملکہ عالیہ۔" وفد کے سربراہ بوڑھے وزیر مسٹر

روکر نے جلدی سے کہا۔ ''ہم خود بھی ہرگز بھی یہ نہیں چاہیں گے۔''

پھر آپ خود ہی بتائیے کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔''

''اس کے لیے ہمیں تھوڑے وقت کی ضرورت پڑے گی۔'' مسٹر روکر نے سوچتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہمیں شاہ فرانس سے بھی رابطہ کرنا پڑے گا..... مگر مجھے یقین ہے کہ اتوار تک ہم کسی فیصلے پر پہنچ جائیں گے۔

فیصلہ ایک ہفتے بعد تک ٹال دیا گیا تھا۔ اس دوران فرانسیس ڈریک کی آمد متوقع تھی۔

مقررہ تاریخ کو ڈریک اور ہاکسن بہ اہتمام تمام ساحل پر اترے انہیں بے حد شان و احترام سے لندن لایا گیا۔ محل کے دروازے پر تمام اراکین پارلیمنٹ نے ان کا استقبال کیا پھر بصد احترام انہیں خصوصی شاہی مہمان خانے میں پہنچا دیا گیا۔

ہاکسن اور خاص طور پر ڈریک نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کبھی وہ اس شان اور عزت و احترام سے لندن شہر میں داخل ہوگا۔ اس کے ساتھ اس کے ساتھی اور ہم راز و غم گسار ریڈ اور کلف بھی آئے تھے۔ یہ جاہ اور وقار دیکھ کر ان دونوں کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔

''سر جی'' ریڈ نے حیران لہجے میں ڈریک کو مخاطب کیا۔ ''مجھے تو یہ سب خواب سا لگ رہا ہے..... آپ کو یاد ہے کنگ ایڈورڈ کے زمانے میں یہ مہم شروع کی گئی تھی کہ کسی بھی قزاق کو انگلستان کے کسی بھی ساحل کے قریب دیکھا جائے تو جال ڈال کر مگر مچھ کی طرح' موت کی نیند سلا دیا جائے۔''

''ہاں'' ڈریک کے بجائے کلف نے جواب دیا۔ ''اور اس فرمان کے بعد سے ہم لوگ دریائے ٹیمز سے کتنے خوفزدہ ہو گئے تھے..... اور ہم نے سمجھ لیا تھا اب ہم کبھی بھی انگلستان کے ساحلوں پر لنگر انداز نہیں ہو سکیں گے۔''

''مگر آج تم لوگ دیکھ رہے ہو۔'' ڈریک نے کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہیں جماتے ہوئے پر لہجے میں کہا۔ ''کہ نا صرف ہم ساحل پر آئے بلکہ میں بھی داخل ہوئے ہیں..... اور وہ بھی کس شان و احترام سے۔''

اس کے لہجے میں آپ سے آپ ایک تکبر اتر تھا۔

''مجھے تو یوں لگ رہا ہے کہ ہم ڈاکو نہیں کسی ملک کے بادشاہ ہوں جیسے'' ریڈ نے معصومیت سے کہا کلف اس کے کاندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔

''ارے واہ خوامخواہ میں ہی پانچواں سوار بنا جا ہے' بے وقوف ہم تو شاہ کے مصاحب ہیں۔ اصل بادشاہ تو ہمارا یہ یار..... فرانسس ڈریک ہے۔''

کیا مطلب؟ مطلب سمجھ کر بھی ریڈ نے سوال کیا۔

مطلب یہ ہے کہ ملکہ الزبتھ ہمارے شہزادے فریفتہ ہو گئی ہے دل و جان سے مرمٹی ہے۔ اسی اس نے ہمارے یار کو بلایا ہے۔ تو دیکھ لینا جلد یا بدیر ہمارے ڈریک سے شادی کر لے گی۔''

''ارے پاگل ہوئے ہو کیا تم لوگ۔'' ڈریک نے گھبرا کر کلف کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''کسی نے سن لیا تو سر قلم کروا دیا جائے گا..... جہاں تک فریفتگی اور دیوانگی کا تعلق ہے تو وہ تو اس طرف سے بھی ہے۔ مگر احتیاط کا دامن تھامنا بے ضروری ہے کیونکہ وہ کوئی عام عورت نہیں انگلستان کی ملکہ ہے سمجھے.....''

''سمجھ گئے۔'' کلف کے ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ مچلی۔ ''مطلب تم یہ کہہ رہے ہو' کہ بھابی کے بارے میں یوں زور زور سے بات نہ کی جائے۔''

''تو ٹھہرا بھی بھابی کے بچے۔'' ڈریک کلف کے پیچھے لپکا اور وہ ہنستا ہوا بھاگ گیا۔

ڈریک آ کر دوبارہ سے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

خود اسے بھی اس قدر شان و احترام سے استقبال کی توقع نہیں تھی۔ گو کہ اب تک ملکہ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی مگر اس کا دل ایک نئے انداز سے دھڑک رہا تھا۔ ملکہ سے ملنے سے پہلے سے ہی ڈریک اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو چکا تھا ملاقات کے بعد اس دیوانگی میں اور اضافہ ہوا تھا اور اب یہاں آنے کے بعد تو اس کے دل کا عجب ہی عالم تھا۔

اب تو اس کے دل کو بھی یقین آتا جا رہا تھا کہ' ملکہ واقعی اسے پسند کرتی ہے اور اس سے محبت کرتی ہے اور اسے اپنے قابل بنانے کے لیے اس عزت و احترام سے نواز رہی ہے۔

کچھ دیر بعد محل کے شاندار آڈیٹوریم میں' ڈریک کو سر کا خطاب دینے کی تقریب کا آغاز ہونے والا تھا۔ اسی لیے ہاکسن نے مشورہ دیا تھا کہ تم لوگ چونچالی کرنے کے بجائے کچھ دیر آرام کر لو پھر نہا دھو کر تیار ہو جانا۔ یہ تقریب ہم سب کی زندگی کی ایک یادگار ترین تقریب ہے اس میں ہم سب کو بہت اہتمام سے تیار ہو کر جانا چاہیے خود ڈریک کی بھی یہی خواہش تھی۔

کتنے ہی دنوں بعد آج اس کا ملکہ سے آمنا سامنا ہونے والا تھا۔ اس نے ملکہ سے ملنے سے پہلے اور اس کے ساتھ ملاقات کے بعد کتنے ہی خواب دیکھے تھے اور جب ملکہ اس سے ملنے گہرے پانیوں میں' اس کے شپ پر آئی تھی..... اور جس انداز سے اس نے ڈریک کے جذبات کی پذیرائی کی تھی۔ ان سب باتوں نے ڈریک کے خوابوں میں نئے انداز سے رنگ بھرا تھا۔ اس کی امنگیں اور امیدیں جوان ہو گئی تھیں..... وہ ملکہ کی چاہت پانے کے لیے بہت پر یقین تھا۔

ریڈ! کیا واقعی ملکہ مجھ سے محبت کرتی ہے؟ یہ سوال ہزاروں بار وہ کبھی ریڈ سے اور کبھی کلف سے پوچھ چکا تھا اور اس کے دونوں ہی دوستوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ ملکہ دل و جان سے اس پر فدا ہے اور کیوں فدا نہ ہوتی؟ وہ ایک جواں سال خوبرو' وجیہہ' ذہین قابل انسان تھا اور اس کے پاس اتنا بڑا خزانہ تھا کہ شاید اتنا بڑا خزانہ تو خود ملکہ کے پاس بھی نہ ہوگا۔ ان سب باتوں نے اسے بہت حوصلہ دیا تھا۔ اس کا دل بڑھایا تھا۔ امید بندھائی تھی۔ اس کے باوجود اسے اب تک پوری طرح یقین نہ آ سکا تھا کہ ملکہ اس سے محبت کرتی ہے یا اس پر دل و جان سے مہربان ہے؟

آج اسے بہت اہتمام سے تیار ہو کر اس ہال میں جانا تھا جہاں پارلیمنٹ کے تمام ممبران وزراء و مشیران کے علاوہ عمائدین شہر بھی مدعو تھے۔ آج ملکہ سب کے سامنے اس کی شان میں قصیدہ پڑھنے والی تھی اور اسے سر کے معزز اور محترم خطاب سے نوازنے والی تھی۔

ایک بدنام زمانہ لٹیرا..... ایک بحری ڈاکو..... اور اب ایک معزز قابل احترام انسان کے عہدے پر فائز ہونے جا رہا تھا..... سچ ہے ''جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔'' ملکہ کی ایک نظر عنایت نے اسے ڈاکو سے۔ ''سر ڈریک'' بنا دیا تھا۔

یہ الگ بات ملکہ کی یہ عنایت خالی از علت نہیں تھی۔ ملکہ اس ذرا سی مہربانی کے بدلے اس کے عمر بھر کا جمع شدہ خزانہ ہتھیانے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھی۔

ملکہ کے ارادے کچھ ایسے غلط نہ بھی تھے۔ وہ یہ سب کچھ اپنے ملک اور اہل ملک کے لیے کر رہی تھی۔

تقریب کا آغاز ہو چکا تھا۔

وسیع ہال معزز مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سجے سجائے ہال میں جا بجا تازہ پھولوں کے گلدستے رکھے تھے جن کی مسحور کن مہک لوگوں کے مشام جان کو تازگی بخش رہی تھی۔ ہر طرف ریشمی ڈوریوں سے کسے ہوئے تھے۔ ہر طرف رنگ و نور کا دریا سا بہہ رہا تھا۔ خوشبوئیں ہواؤں کے ساتھ اڑتی پھر رہی تھیں اراکین حکومت اور عمائدین شہر بہترین پوشاکیں

زیب تن کیے ہال میں موجود تھے۔

ہال کے آخری سرے پر کئی فٹ اونچے چبوترے پر قالین اور غالیچے بچھے تھے۔ چبوترے کے بیچوں بیچ ملکہ کا تخت سجا تھا۔ تخت کے دونوں جانب مخملی پوشش والی آرام دہ اور دیدہ زیب کرسیاں دھری تھیں۔ یہ کرسیاں معزز مہمانوں کے لیے رکھی گئی تھیں۔ ہال کے تمام دروازوں پر خنجر بردار دربان مستعد اور چوکنا کھڑے تھے۔ تمام اراکین کے ہال میں پہنچ جانے کے بعد، ڈریک ہاکسن اور ان کے ساتھیوں کو اطلاع دی گئی تھی۔

وہ چاروں کب سے تیار ہو کر بلاوے کے منتظر بیٹھے تھے۔ آج ڈریک کی سج دھج بالکل الگ تھی۔ وہ قذاقوں والی بنڈی اور سر پر پگڑی نما چھوٹے سے کپڑے کے بجائے آج مہذب دنیا کے معزز مہمانوں والی پوشاک زیب تن کیے ہوئے تھا یہ پوشاک ملکہ کی طرف سے اسے تحفے میں پیش کی گئی تھی۔ اس شاہانہ خلعت کے پہننے سے اس کی شخصیت میں چار چاند لگ گئے تھے اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین و جمیل اور شاندار لگنے لگا تھا۔

جب وہ چاروں ہال میں پہنچے تو ہال میں موجود سب ہی لوگوں نے اسے ستائش بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ خاص طور پر اسکس، والٹر ریلے اور روبرٹ سیسل نے اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔

یوں تو ملکہ کے عشاق میں ولیم سیسل سمیت کئی اور لوگ بھی شامل تھے۔ مگر والٹر ریلے سب سے زیادہ حاسد فطرت کا مالک تھا۔ وہ ہر اس شخص سے حسد کرنے لگتا تھا جسے ملکہ نظر بھر کر بھی دیکھ لیتی تھی۔

آج ڈریک کی آمد پر یہ اہتمام و انتظام دیکھ کر پہلے ہی اس کا ماتھا ٹھنکا تھا..... اور اب ڈریک کو اپنے سامنے دیکھ کر اسے اپنا دل بیٹھتا محسوس ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ بحری لٹیرا کوئی موٹی توند اور سفید گھنی داڑھی والا ادھیڑ عمر بوڑھا بدشکل اور بدمزاج انسان ہوگا مگر ڈریک تو اس کی سوچ کے برعکس تھا۔ ایک نوعمر نوجوان ہینڈسم لڑکا..... اسے اپنے دل میں ڈریک کے خلاف حسد و نفرت کی آگ سلگتی محسوس ہوئی تھی۔

ذرا دیر بعد ہی ملکہ کی آمد کی شنوائی سنائی دی تھی۔

''باادب، باملاحظہ، نگاہ نیچی سر خمیدہ..... ملکہ انگلستان تشریف لا رہی ہیں۔''

ہال کے آخری سرے پر واقع چبوترے کے انتہائی کونے پر، واقع دروازے سے پہلے دو خنجر بردار سپاہی برآمد ہوئے تھے۔ اس کے پیچھے، تکبر بھرے انداز میں سر اونچا کیے سر پر ہیروں کا تاج دھرے، ہریری ملبوس میں سجی سجائی، ملکہ الزبتھ داخل ہوئی تھی۔ اس سے دو قدم پر اس کی خادمہ خاص ریٹا اور خادمہ سن رسیدہ، مسز کیٹی بھی تھیں۔

سامنے ہال میں تمام لوگ سر جھکائے مؤدب و مستعد کھڑے تھے ملکہ نے جب اپنی نشست سنبھال لی تو، تمام لوگوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا تھا۔ اور معزز مہمانانِ گرامی کو چبوترے پر لا کر ان کے لیے مخصوص نشستیں پیش کی گئی تھیں۔

چبوترے کی سیڑھیاں چڑھتے ڈریک کو ملکہ نے گہری نظروں سے دیکھا تھا۔ آج وہ ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت لگ رہا تھا۔ کسی ملک کا شہزادہ یا حکمران لگ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بالکل اچانک اسے پرنس آنٹرو کا خیال آ گیا تھا۔ چھوٹے قد اور چینی آنکھوں والا وہ شخص کس قدر کراہیت آمیز تھا۔ مگر اس کی مجبوری تھی کہ اب تک وہ اسے اپنا منگیتر گردانتی آئی تھی۔ مگر جب اس طرف سے شادی کا اصرار بڑھا تو اس نے نہایت سمجھ داری سے اپنا استدلال پیش کر دیا تھا۔ فرانس کے وفد کے سربراہ بوڑھے روکر نے کہا تھا وہ جلد ہی کوئی مناسب فیصلہ کر کے ملکہ کی خدمت میں پیش کر دے گا۔ ملکہ کو اس کے فیصلے کا نہ انتظار تھا

اور نہ ہی اس کے لیے یہ بات کسی فکر کا باعث تھی۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔

ڈریک نے ملکہ کے مقابل آ کر سر جھکا کر اور گھٹنوں کو خم دے کر ملکہ کو تعظیم پیش کی تھی۔ ملکہ نے مسکراتی نظروں اور مسکراتے لبوں کے ساتھ اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا تھا۔ ڈریک نے دستور کے مطابق زمین پر گھٹنے ٹیک کر ملکہ کا ہاتھ تھام کر اس کی پشت پر مہر محبت و عقیدت ثبت کر دی تھی۔

پھر ہاکسن اور اس کے بعد ریڈ اور کلف اسٹیج پر آئے تھے سب نے اسی طرح سر جھکا کر اور گھٹنوں کو خم دے کر ملکہ کو تعظیم پیش کی تھی۔ مگر ملکہ نے ڈریک کے سوا کسی کو بھی اپنے ہاتھ کو تھامنے اور بوسہ دینے کی خوش نصیبی نہ عطا کی تھی۔

خدام کی رہنمائی میں وہ چاروں اپنے لیے مخصوص نشستوں پر بیٹھ گئے تھے۔ ملکہ کی انتہائی نزدیکی نشست پر ڈریک بیٹھا ہوا تھا۔

پھر ملکہ نے مہمانوں کا اور خاص طور پر ڈریک اور اس کے ساتھیوں کا شکریہ ادا کیا تھا اور ایک خوبصورت ہیروں سے مزین بروچ کے ساتھ ڈریک کو ''سر'' کے خطاب سے نوازا تھا۔

''مسٹر ڈریک اپنی صلاحیتوں اور لیاقتوں کی وجہ سے اس قابل ہیں کہ ان کے نام کے ساتھ ''سر'' کا لقب لگایا جائے اور عزت و احترام سے ان کا نام لیا جائے۔

اب فرانسس ڈریک، ایک معزز انگلستانی، ایک قابل احترام انگریز ''سر فرانسس ڈریک'' بن چکا تھا خود ڈریک کو اپنے نام کے ساتھ یہ خطاب بے حد بھلا محسوس ہو رہا تھا..... اور اس کے دل میں مسرت و انبساط کے لڈو پھوٹ رہے تھے۔ اس کے بعد معزز اراکین پارلیمنٹ، وزراء اور درباریوں نے ڈریک کو مبارک باد پیش کی تھی اور حسب توفیق اس کی خدمت میں تحفے تحائف پیش کیے گئے تھے۔

اس تقریب کے اختتام پذیر ہونے کے بعد ملکہ اپنی خادماؤں اور پاسبانوں کے ساتھ واپس لوٹ گئی تھی۔

ڈریک کی اس سے نہ کوئی بات ہوئی تھی، نہ ہی نظروں کا تصادم ہوا تھا۔ بس اس کا ہاتھ تھام کر بوسہ دینے کی سعادت ہی اسے نصیب ہوئی تھی۔ اس کے باوجود اسے اپنے پورے وجود میں ایک عجب سی سرشاری محسوس ہو رہی تھی۔ اسے اپنے روم روم سے خوشی پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔ والٹر ریلے اسے گہری اور حاسد نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے لارڈ اسکیس، روبرٹ، ولیم وغیرہ ہی رقیب کیا کم تھے کہ اب یہ ایک اور نیا رقیب میدان میں اتر آیا تھا۔

ملکہ اپنے مخصوص چیمبر میں جا چکی تھی۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مسٹر ڈریک اس قدر ہینڈسم بھی ہو سکتے ہیں۔''

مسز کیٹی نے چیمبر میں جاتے ہی اپنی عادت کے مطابق تبصرہ کیا تھا۔ ''وہ واقعی ایک بے حد حسین و جمیل نوجوان ہیں۔''

''ہاں کیوں نہیں۔'' ریٹا نے ان کی بات کی تائید کرتے ہوئے تحسین بھرے لہجے میں کہا۔ ''آج دربار میں سب ہی لوگ اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔''

ملکہ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا..... وہ خاموشی سے مسکراتی نظروں اور مسکراتے لبوں سے کچھ سوچے جا رہی تھی۔

''آپ کیا سوچ رہی ہیں؟ ریٹا نے چند لمحوں بعد دھیمی آواز میں ملکہ سے سوال کیا تھا۔'' کیا آپ بھی سر ڈریک کے بارے میں سوچ رہی ہیں۔؟

''ہاں'' ملکہ نے بنا کسی پس و پیش کے سچائی کا اعتراف کیا۔ ''میں سوچ رہی ہوں ہاکسن اور ڈریک

جیسے لوگ جن کی پوری زندگی سمندر میں گزری ہے۔ یہ لوگ انگلستان کی بحریہ کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دے سکتے ہیں۔"

آپ کا خیال ہے کہ ڈریک اور ہاکسن جیسے لٹیرے اپنی لوٹ مار ترک کر کے انگلستان کے جہازوں کے بیڑے کو سنبھالنے لگیں گے؟ ریٹا نے حیران سے لہجے میں سوال کیا۔

"لوٹ مار سے انہیں کون روک رہا ہے۔" ملکہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ "انگلستان کے ساحلوں سے آگے یورا سمندر ان کے لیے کھلا ہے..... اپنے لوگوں اور اپنے ملک کی سرحدوں کو چھوڑ کر وہ جسے چاہیں لوٹیں..... اور اجاڑیں، ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ مگر میں چاہتی ہوں کہ ڈریک جیسے مایہ ناز ملاحوں سے ملکی بحریہ کے لیے کام لیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسے چند لوگ ہمارے بیڑے کو سنبھالنے میں معاون ہو گئے تو ہم تمام ملکوں کے بیڑے غرق کر دینے کے قابل ہو جائیں گے۔

سورج کے غروب ہوتے، ضیافت کا اہتمام شروع ہو گیا تھا۔ آج رات ملکہ نے سر ڈریک کے اعزاز میں ایک پرتکلف ڈنر کا اہتمام کیا تھا۔

کافوری موم بتیوں کے مدہم سے اُجالے میں ساگوان کی خوبصورت میزوں پر چاندی اور بلور کے برتنوں میں ڈنر سرو کیا گیا تھا۔ ہر طرف مسحور کن خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ہواؤں کے نرم جھونکوں میں ایک عجب سی مستی و سرخوشی بسی ہوئی تھی۔ ڈنر پر بس چند چنیدہ لوگوں کو ہی انوائیٹ کیا گیا تھا۔

اس ڈنر کے لیے ملکہ خصوصی اہتمام سے تیار ہوئی تھی سرخ اور کتھئی کنٹراسٹ کے ساتھ اس کا مخملی لباس بے حد خوبصورت لگ رہا تھا۔ یاقوت کے آویزے اور گلے میں براؤن موتیوں کی مالا پہنے وہ آج ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے سنہری چاندنی کے سے دمکتے بالوں پر دھرا چھوٹا سا طلائی تاج، اس کے بالوں کے ہم رنگ ہی لگ رہا تھا۔ خوشبوؤں میں بسی اداؤں سے بھری، دلکش انداز میں باوقار طریقے سے قدم دھرتی جب وہ ڈنر ہال میں داخل ہوئی تھی، تو ہر شخص اس کی سج دھج دیکھ کر اپنی جگہ پر ساکت رہ گیا تھا۔

"اف! آج ملکہ کس غضب کی حسین لگ رہی ہے۔" ہاکسن نے ڈریک کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ ریڈ اور کلف بھی آنکھیں پھاڑے منہ کھولے ملکہ کو تک رہے تھے۔ آج وہ آسمان سے اتری ہوئی کوئی حسین اپسرا لگ رہی تھی۔

ڈریک کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ اپنی جگہ ساکت سا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس قدر حسین اور باوقار ملکہ اس کے عشق میں مبتلا تھی۔ یہ احساس ہی اس قدر خوش کن تھا، کہ وہ اپنا سب کچھ لٹا کر بھی احساس زیاں میں مبتلا نہ ہوتا۔ حقیقت میں ایسا ہی تھا۔ جب ملکہ اس سے ملنے اس کے شپ پر گئی تھی تو اس نے اپنا آدھا خزانہ ملکہ کے ساتھ روانہ کر دیا تھا..... اور اب جبکہ وہ یہاں آیا تھا تو تحفے کے طور پر اپنا آدھا خزانہ ملکہ کے لیے لے کر آیا تھا۔

اس بات کو انتہائی راز میں رکھا گیا تھا۔

کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی جائے، مبادا دیگر ممالک کے لوگ اس خزانے پر دعویٰ کر بیٹھیں کیونکہ یہ خزانہ ڈریک کی ذاتی ملکیت نہ تھا۔ اس نے دنیا جہاں کے جہازوں کو لوٹ کر یہ خزانہ جمع کیا تھا۔

"کیسے ہو ڈریک؟" کھانے کی میز پر ڈریک کی کرسی ملکہ کے بالکل ساتھ دائیں جانب رکھی گئی تھی تاکہ ملکہ اس سے بات چیت کر سکے اور یہ ایک طرح سے اعزاز تھا جو معزز مہمان کو بخشا گیا تھا۔

میں..... بالکل ٹھیک..... آپ..... آپ کیسی ہیں؟ ڈریک نے رکتے تھمتے قدرے ہکلاتے ہوئے

جواب دیا۔

"تمہارے سامنے ہوں۔" ملکہ کرب بھرے انداز میں مسکرائی۔ "جب سے تم سے مل کر آئی ہوں کچھ عجب ہی حالت ہے۔"

"اوہ" ڈریک کے چہرے پر کئی رنگ آ کر چلے گئے تو اس کا مطلب تھا کہ دونوں ہی طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔ ڈریک کو اپنا دل بے مہار دھڑکتا ہوا محسوس ہوا۔

باوردی خدمت گار ٹیبل پر پیالے اور قابیں رکھ رہے تھے مہمانوں کے سامنے دھرے پیالوں اور رکابیوں میں کھانا ڈال رہے تھے۔ 6 کورس پر مشتمل یہ ڈنر رات گئے تک چلتا رہا تھا۔ کھانے کے بعد ملکہ ڈریک کو لیے اپنی اسٹڈی میں آ بیٹھی تھی۔

یہ شاندار اسٹڈی اس کے دادا ہنری ہشتم نے بنوائی تھی ساگوان کی شاندار الماریوں میں اعلیٰ درجے کی کتب سجی تھیں الماریوں کے ہینڈل اور کنڈیاں خالص سونے کی تھیں۔ اسٹڈی کے دائیں جانب دیوار کے ساتھ ایک صوفہ سیٹ لگا تھا۔ درمیاں میں شیشے کی میز تھی جبکہ دونوں جانب چاندی کی گول تپائیاں دھری تھیں۔ جن میں بلور کے پیالوں میں تازہ گلاب سجے تھے اور پوری فضا میں گلابوں کی بھینی بھینی مہک رچی ہوئی تھی۔ اسٹڈی کے بیچوں بیچ ایک کشادہ میز دھری تھی۔ میز کے پچھلی جانب ایک آرام دہ کرسی تھی۔ جس پر ہنری بیٹھ کر لکھنے، پڑھنے کا کام کیا کرتا تھا۔

کنگ ایڈورڈ کے بعد ملکہ میری ٹیوڈر نے اس اسٹڈی سے فائدہ اٹھایا تھا۔ گو کہ اسے لکھنے پڑھنے سے ایسی خاص رغبت نہ تھی مگر اکثر شاہی ڈنرز کے بعد وہ اپنے خاص مہمانوں کے ساتھ اسی اسٹڈی میں قہوہ نوش فرماتی تھی..... اور شادی کے بعد شروع کے دنوں میں وہ کنگ فلپ کے ساتھ اسی اسٹڈی میں خوش گپیوں میں مصروف رہتی تھی۔

اب یہ شاہی اسٹڈی ملکہ الزبتھ کے زیر استعمال تھی۔ ملکہ ایک ذہین پڑھنے لکھنے والی اور باشعور عورت تھی۔ وہ اکثر اس اسٹڈی میں مصروف کار رہتی تھی۔ بہت ہی کم ایسا ہوا تھا کہ اس نے اس اسٹڈی میں کسی کے ساتھ محض قہوہ پیا ہو مگر آج خاص طور پر اس اسٹڈی کو اسی مقصد کے لیے استعمال کیا جانے والا تھا۔

الزبتھ، سر ڈریک کے ساتھ، اسٹڈی کے مغربی کونے میں لگے صوفے پر آ بیٹھی تھی..... فضا خوشگوار اور ہوا، دلفریب تھی گلابوں کی روح میں اترتی خوشبو ہر سمت بکھری ہوئی تھی۔ اسٹڈی کی نقشیں چھت کے بیچوں بیچ لٹکے فانوس میں موم بتیاں پگھل رہی تھیں اور ہر سمت خوابناک سا اُجالا بکھرا ہوا تھا۔

"ڈریک" ملکہ نے صوفے پر ناز بھرے انداز میں بیٹھنے کے بعد پیار بھری سرگوشی میں ڈریک کا نام پکارا تھا۔

"جی..... جی ملکہ عالیہ۔" ڈریک ایک دم سے اس کی جانب جھکتے ہوئے گویا ہوا تھا۔

"کیا تم نے بھی مجھے اتنا ہی مس کیا..... جتنا کہ میں نے۔"

ملکہ کی سرگوشی میں جذبوں کی چاشنی شامل تھی، احساس کے رنگ ہلکورے لے رہے تھے۔

"جج..... جی۔" ڈریک ہکلایا۔ "شاید آپ سے بھی زیادہ..... آپ سے مل کر تو میری دنیا ہی بدل گئی ہے..... سب کچھ بدل گیا ہے..... سمجھ نہیں آتا کیا کروں..... کیا نہ کروں؟"

"میں چاہتی ہوں..... تم انگلستان کی بحریہ کی سربراہی کا عہدہ قبول کر لو۔" ملکہ نے قدرے حکمیہ انداز میں کہا۔ "تمہارے تجربے اور صلاحیتوں پر مجھے پورا یقین ہے کہ انگلینڈ کا بحری بیڑہ دنیا کے کسی بھی بیڑے کو غرقاب کر سکے گا۔"

(جاری ہے)

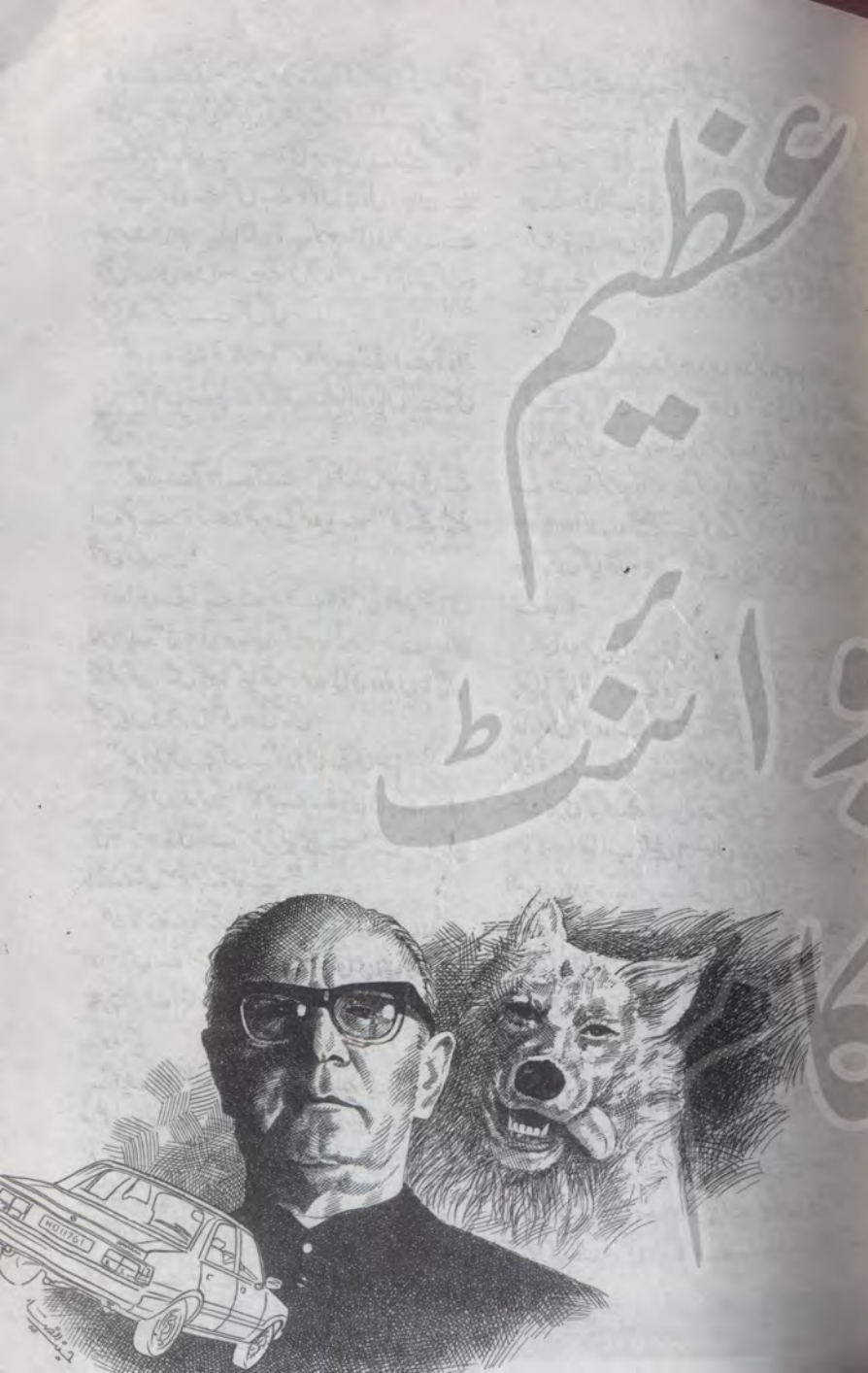

آگ بگولہ

راشد سعید

ایک بات کانوے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ قاتل بہت نڈر اور بے خوف ہے اسے اپنی گرفتاری کا اندیشہ نہیں ہے- وہ ہر صورت کانوے کو مردہ دیکھنا چاہتا ہے- اس پر فائر کرنے کے بعد وہ بھاگ کر کہیں نہیں گیا اور اس کی ٹوہ میں لگا رہا کہ وہ کہاں جاتا ہے- پھر موقع پاکر اس نے کانوے پر کار چڑھانے کی کوشش کی-

انتقام کے جنون میں مبتلا ایک عمر رسیدہ عورت کی ایک سنسنی خیز کہانی

مارک والڈن نے دھمکی دی تھی کہ وہ اسے جان سے مار ڈالے گا مگر جب اسے بجلی کی کرسی نصیب ہوگئی تو کانوے نے اطمینان کا سانس لیا- یہ بات بہر حال کانوے کے لیے نئی نہیں تھی- اپنی بیس سالہ پولیس کی ملازمت میں اسے بہت سے مجرم قتل کرنے کی دھمکیاں دے چکے تھے-

وہ اس وقت سینٹرل پولیس ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے کی کھڑکی میں کھڑا تھا- باہر یخ بستہ ہوائیں چل رہی تھیں مگر وہ کمرہ جہاں وہ کھڑا تھا' گرم ہو رہا تھا- کانوے کے دوسرے ساتھی خوش گپیوں میں مشغول تھے- اس نے پلٹ کر ناگواری سے کہا- ''کیا تم لوگ کچھ دیر کے لیے خاموش نہیں رہ سکتے؟''

اس کے ساتھیوں نے اس پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور پھر ہنسنے لگے-

وہ ایک بار پھر پلٹ کر انہیں ڈانٹنے والا تھا کہ اس نے ایک بوڑھی عورت کو پولیس ہیڈ وارٹر کی عمارت میں داخل ہوتے دیکھا- اس کی عمر تقریباً ستر سال تھی- وہ اسکواڈ روم سے ہوتی ہوئی اس کمرے میں داخل ہوگئی- اس کے چہرے سے پریشانی مترشح تھی- جاسوس کو گلے کی پیٹھ اس بڑھیا کی طرف تھی- نوجوان سراغ رساں روڈی بھی بڑھیا کی آمد سے بے خبر رہا-

بڑھیا کی وضع قطع سے یہ ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ بہت نفاست پسند ہو- اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا گتے کا ڈبا تھا- اس کے جسم پر فر کا لمبا کوٹ اور پرانا سا ہیٹ تھا- ''فرمایئے میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟'' کانوے نے آگے بڑھ کر پوچھا-

کو گلے اور روڈی چونک کر اسے دیکھنے لگے- ''میں سارجنٹ کانوے سے ملنا چاہتی ہوں-'' بڑھیا نے ان تینوں پر اچٹتی سی نگاہ ڈال کر کہا-

''مجھے کانوے کہتے ہیں-'' اس نے مودبانہ انداز میں کہا-

''کیا تم تھوڑی دیر کے لیے اپنی میز تک چل سکتے ہو؟'' بڑھیا نے اسے اپنی چمکیلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا- ''اس طرف آجایئے-'' کانوے نے کہا اور اپنی میز کی طرف اس کی رہنمائی کرنے لگا-

روڈی نے اپنے ہاتھ سے کافی کی پیالی رکھ دی اور اس بڑھیا کے ہاتھ سے گتے کا ڈبا لے لیا-

''شکریہ نوجوان- یہ کافی وزنی ہے، میں اس کے بوجھ سے تھک گئی تھی-'' اس نے ممنونیت سے کہا-

روڈی نے قریبی میز پر وہ ڈبا رکھ دیا- بڑھیا نے

کانوے سے کہا۔ ''میں سوسائٹی آف سسٹرز کی نمائندہ ہوں۔ یہ سوسائٹی لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے عرصے سے کام کر رہی ہے۔ سوسائٹی ہر سال ایک ایسے شخص کا انتخاب کرتی ہے جس نے لوگوں کی دل و جان سے خدمت کی ہو۔ یہ ڈبا میں آپ کو سوسائٹی کی طرف سے پیش کر رہی ہوں۔ اسے قبول فرمائیں۔'' اتنا کہہ کر وہ مڑی اور کمرے سے نکل گئی۔

''ارے سنیئے تو مادام!'' کانوے نے اسے آواز دی۔ مگر اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا اور وہاں سے چلی گئی۔

''تمہارے تو مزے آ گئے۔ کیونکہ اب سوسائٹی نے اب تم سے متاثر ہونا شروع کر دیا ہے۔'' کوگلے نے ہنس کر کہا۔

روڈی نے آگے بڑھ کر ڈبے کا ڈھکن اٹھایا تو اس میں ایک بھنی ہوئی مرغابی رکھی دکھائی دی۔ اسے مسالہ لگا کر تنور میں بھونا گیا تھا۔ مرغابی کی دونوں ٹانگیں چھڑیوں کی طرح اٹھی ہوئی تھیں۔

''میرا خیال ہے کہ.....'' روڈی نے کہنا چاہا۔

''بکواس بند کرو۔'' کانوے نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''سوسائٹی آف سسٹرز کیا چیز ہے۔ ہمیں اس کے بارے میں معلوم کرنا چاہیے۔''

ان کا چیف مائیکل فیراڈے اس کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے اشارے سے کانوے کو قریب بلایا اور میز کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ ''یہ ڈبے میں کیا چیز ہے؟''

''سوسائٹی آف سسٹرز کی جانب سے ایک بھنی ہوئی مرغابی کانوے کے لیے بھیجی گئی ہے کیوں کہ اس کی کارکردگی اس ماہ سب سے اچھی رہی ہے۔'' روڈی نے طنزیہ لہجے میں بتایا۔

''ٹھیک ہے، تم میرے ساتھ آؤ۔'' چیف نے کانوے کو اپنے کمرے میں آنے کا اشارہ کیا۔ کانوے اس کے پیچھے وہاں سے نکل گیا۔

جب وہ اپنے کمرے میں جا کر میز پر بیٹھ گیا تو ... نے کہا۔ ''کانوے دروازہ بند کر لو میں گزشتہ ... ہونے والی نقب زنی کی واردات کے بارے میں ... کرنا چاہتا ہوں جو ایڈف ڈرک میں ہوئی ہے۔ ... خیال ہے کہ روڈی نے ساری تفتیش کو بگاڑ کر ... ہے۔''

کانوے نے پلٹ کر دروازہ بند کرنا چاہا تو اس کی ... کوگلے پر پڑی۔ وہ بھنی ہوئی مرغابی کا ڈبا اٹھا ... للچائی نظروں سے مرغابی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کانوے ... نے منہ بنا کر دروازہ بند کر دیا۔ ٹھیک اسی لمحے ایک ... دھماکا ہوا اور وہ جھٹکے سے آگے گرا۔ اس کا سر میز ... جا کر ٹک گیا تھا۔ چیف مائیکل اپنی کرسی سمیت دیوار ... سے جا لگا۔

یقیناً وہ مرغابی نہیں ٹائم بم تھا جو مہارت سے اس میں ... چھپایا گیا تھا۔ کوگلے کو اسپتال میں پہنچا دیا گیا اور پھر ... سارا دن اس واقعے کی تحقیق و تفتیش ہوتی رہی۔ سہ پہر ... کو اسی بارے میں ایک ہنگامی میٹنگ بھی ہوئی۔ شام ... تک خبر ملی کہ کوگلے کی حالت بہتر ہے۔ وہ کمرہ جہاں ... دھماکا ہوا تھا اب قابل استعمال نہیں رہا تھا اس لیے ... افسروں کو دوسرے کمرے میں منتقل کیا گیا۔

''یہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اس دیوانی بڑھیا کا ... مقصد کیا تھا؟'' روڈی نے اپنے لمبے بالوں پر ہاتھ ... پھیرتے ہوئے کہا۔

''میں نے سیکڑوں جگہ فون کر کے دیکھ لیا ہے، مگر اس ... سوسائٹی آف سسٹرز کا سراغ نہیں لگا۔'' چیف آفیسر ... مائیکل نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ وہ کوئی مجرم عورت تھی، ورنہ کوئی ... دوسری عورت اتنی دیدہ دلیری سے پولیس ہیڈ کوارٹر ... میں داخل نہیں ہو سکتی۔'' کانوے نے سپاٹ لہجے میں ... کہا۔

''مارک والڈن کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ کیا اسے اس خانے میں فٹ نہیں کیا جا سکتا؟'' مائیکل نے سوچ کر کہا۔

''والڈن تو آج صبح ہی مر چکا ہے۔ اس کا اس واقعہ سے کیسے تعلق ہو سکتا ہے؟''

''وہ تمہیں مارنے کی دھمکی دے چکا تھا۔ کیا وہ اپنے کسی ساتھی سے یہ کام نہیں کرا سکتا؟'' چیف نے نکتہ پیش کیا۔

''ایسی کوشش وہ ایک ہفتے یا ایک مہینے پہلے کر سکتا تھا، مگر مرنے کے بعد وہ ایسی کوشش کیوں کرنے لگا۔ میری موت کی خوش خبری وہ قبر میں کیسے سنے گا؟'' کانوے نے اس نکتے کو مسترد کر کے کہا۔

''مگر والڈن کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اسے کس روز بجلی کی کرسی پر بٹھایا جائے گا۔ اس نے اپنے کسی ساتھی کو یہ حکم دیا۔ اس نے اپنے ذہن کے مطابق یہ منصوبہ بنایا کہ تمہیں ٹھیک اس روز بم بلاسٹ سے ہلاک کیا جائے جب کہ والڈن کو موت کی سزا دی جا رہی ہو۔'' مائیکل نے دلیل دی۔

''لیکن سارے شہر میں ایسا کون سا شخص ہے جو مجھے ہلاک کرنے پر تیار ہو جائے گا؟''

''بیکر!'' مائیکل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''بیکر ایک ایسا شخص ہے جو والڈن کے ہر حکم پر عمل کر سکتا ہے۔ بم دھماکے کا اسٹائل اس کی وارداتوں سے ملتا جلتا ہے۔''

بیکر شہر کا سب سے بڑا بدمعاش تھا اور والڈن اس کے ساتھیوں میں رہ چکا تھا۔ مگر والڈن نے بجلی کی کرسی پر بیٹھنے سے پہلے چار اور ساتھیوں کے ناموں کا انکشاف کر دیا تھا۔ گویا والڈن ان کے نزدیک غدار ہو گیا تھا۔

''بیکر ایسا نہیں کر سکتا۔'' کانوے نے ایک بار پھر اس کا آئیڈیا مسترد کیا۔ ''اس کی نظر میں والڈن ہمدردی کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ والڈن خوش قسمت تھا کہ اس کے ساتھیوں نے اسے جیل میں ہلاک نہیں کیا۔ اپنے شریک ساتھیوں کے نام بتانے کے باوجود اگر اسے غدار کی حیثیت سے ہلاک نہیں کیا گیا تو مجھے اس پر حیرت ہے۔''

''لیفٹیننٹ!'' اچانک دروازے کی طرف سے آواز آئی۔ وہ بم اسکواڈ کا ماہر افسر تھا۔ اس نے دو سال میں بہت ترقی کر لی تھی۔ ''لیفٹیننٹ اس بم کے بارے میں ہمیں بہت کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ یہ بم بارودی سرنگ سے مشابہ ہے۔ جسے مرغابی کا پیٹ چاک کر کے رکھ دیا گیا تھا۔ ایسے بم دوسری جنگ عظیم میں نازیوں نے بھی استعمال کیے تھے۔ بم کے ٹکڑوں کا معائنہ کرنے کے بعد پتا چلا ہے کہ ان میں زنگ لگا ہوا تھا۔ اس سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ وہ بم خاصا پرانا تھا۔''

''ہوں۔ اب مجھے مجرموں کی فائلیں چیک کرنا پڑیں گی۔'' کانوے نے گہرا سانس لے کر کہا۔

''والڈن کی فائل بھی دیکھنا ضروری ہے۔'' مائیکل نے کہا۔

روڈی اور وہ مل کر شام چھ بجے تک فائلوں میں سر کھپاتے رہے لیکن کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ کانوے اکتاہٹ کا شکار ہو گیا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم میرے ساتھ بیئر پیو۔'' روڈی بولا۔

''آج دل نہیں چاہ رہا ہے پھر کسی روز سہی۔'' کانوے نے معذرت کی۔

وہ ہیڈ کوارٹر کی عمارت سے نکل آیا اور سڑک پار کھڑی اپنی سیڈان میں بیٹھ گیا جو گیارہ سال پرانی تھی۔ کار اس وقت ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ تین میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے کار مرکزی سڑک سے ذیلی سڑک کی طرف موڑ لی۔ اور رفتار دھیمی کر لی۔ ہیڈ لائٹس میں اسے ایک کمپکٹ کار کھڑی نظر آئی۔ وہ اس وقت خالی تھی۔ شاید اس کے کسی پڑوسی نے وہ نئی

کار خریدی تھی۔

اس کا مکان روشن تھا۔ غالباً اس کی بیوی کھانے پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ گیٹ سے گیراج کی طرف گاڑی لے گیا۔ کار سے اتر کر وہ باہر آیا اور اس نے گیراج کا دروازہ بند کر دیا' اچانک گلی میں کھڑی کمپکیٹ کار کا انجن جاگا اور اس کے ساتھ ہی کانوے کا دماغ جاگ گیا۔ اسے خطرے کا احساس ہو گیا۔ جوں ہی وہ کار تیز رفتاری سے اس کے مکان کے گیٹ کے سامنے سے گزری۔ ایک فائر ہوا۔ کانوے نے خود کو زمین پر گرا دیا۔ ایک گولی سنسناتی ہوئی اس کے کان پر سے گزری اور پچھلی دیوار میں پیوست ہو گئی۔

وہ کسی سلینڈر کی طرح لڑھکنے لگا۔ پھر اس نے اپنا سروس ریوالور نکال لیا۔ اور گیٹ پر پہنچ گیا۔ گلی کی دوسری طرف سے ایک اسٹیشن ویگن آ رہی تھی۔ اس کی ہیڈ لائیٹس میں اسے کمپکیٹ کار دوسرے موڑ پر پہنچتی نظر آئی۔ اس کا ڈرائیور اسے مرکزی سڑک کی طرف لے جا رہا تھا۔

کانوے گلی میں آ گیا۔ دوسری طرف سے آنے والی اسٹیشن ویگن کے ڈرائیور نے بریک لگا کر ویگن روک لی۔ ''کیا بات ہے؟'' اس نے ڈرائیور سے سوال کیا۔

''وہ کمپکیٹ کار جو ابھی ابھی مرکزی سڑک پر گئی ہے اس کے ڈرائیور کو تم نے دیکھا تھا؟''

''اسے کوئی عورت ڈرائیو کر رہی تھی۔''

''کیا کار کی پچھلی نشست پر بھی کوئی تھا؟''

''میں اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' وہ بولا۔

گولی چلنے کی آواز سے پڑوسی جاگ گئے تھے اور مکانوں کی کھڑکیاں روشن ہو گئی تھیں۔ کچھ لوگ دروازہ کھول کر باہر آ گئے تھے۔ کانوے نے ڈرائیور کو جانے کا اشارہ کیا۔ پھر وہ اپنے مکان میں داخل ہوا تو اپنی بیوی آئرس اسے دروازے پر کھڑی دکھائی دی۔

''فکر کی کوئی بات نہیں ہے آئرس۔'' وہ بولا۔ ''سب ٹھیک ہے۔ مگر مجھے ابھی ہیڈ کوارٹر واپس جانا پڑے گا۔''

وہ وہاں سے اٹھائیسویں شاہراہ پر گیا۔ وہاں گرین تھم نامی پھولوں کی دکان میں داخل ہو گیا۔ دکان کے باہر کا شوکیس روشن تھا اور باقی جگہوں پر تاریکی تھی۔ اس نے دروازے پر دستک دی تو تھوڑی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ ایک متناسب قامت کے شخص نے دروازہ کھولا۔ اس کی عمر تقریباً تیس سال تھی۔ اس نے کانوے کو پہچان لیا۔ کانوے اسے دھکا دے کر اندر چلا گیا۔ ''ریگل مجھے بیکر سے ملنا ہے۔'' اس نے کہا۔ ریگل نے بھویں اچکائیں اور زبان سے کچھ نہیں کہا۔ ''میں اس کام کے لیے بیس منٹ دے رہا ہوں۔ اس سے کہو کہ اس عرصے میں آ کر مجھ سے ملاقات کر لے۔''

''بیکر اس وقت تم سے نہیں مل سکے گا۔''

''میں کچھ نہیں جانتا۔ اس کو تلاش کر کے کہو کہ وہ بیس منٹ میں ملاقات کرے ورنہ میں تمہیں جیل میں سڑا دوں گا۔''

وہ جا کر گلی میں کھڑا ہو گیا۔ اٹھارہ منٹ بعد ایک شورلیٹ کارزن زناتی ہوئی گلی میں داخل ہوئی اور اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر شوفر نے اتر کر پچھلی نشست کا دروازہ کھولا اور کانوے کی طرف دیکھ کر اسے کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کانوے کار میں چلا گیا تو اس نے ایک خوش پوش نوجوان کو عقبی نشست پر بیٹھے دیکھا۔

''کیا ہو گیا ہے سارجنٹ؟ ریگل نے مجھے پانچ منٹ پہلے فون کر لیا ورنہ میں نکلنے ہی والا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''دراصل میں آج ایک تقریب میں مدعو ہوں۔''

''تمہیں ایک اہم بات پوچھنے کے لیے بلوایا گیا ہے۔''

''اوہ ہاں! ہیڈ کوارٹر میں بم کا دھماکا بھی تو ہوا تھا۔ ایسی کیا بات ہو گئی تھی۔''

''اسی لیے تم بھاگے چلے آئے۔ تمہارے آنے کی وجہ والڈن ہے؟''

''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ دھماکا آنجہانی والڈن نے کرایا ہے؟''

''صبح ہیڈ کوارٹر میں دھماکا ہوا تھا تو میں نے سوچا کہ وہ بڑھیا پاگل ہو گئی ہے لیکن پون گھنٹہ پہلے میرے مکان کے باہر مجھ پر گولی چلائی گئی۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دونوں ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں اور یہ کسی دیوانے کا کام نہیں ہے۔''

''معاملہ تو واقعی سنگین ہے۔'' بیکر نے تشویش سے کہا۔ ''ایک دن میں دو بار قاتلانہ حملہ، مگر والڈن تو ختم ہو چکا ہے اس نے تمہارے قتل کی منصوبہ بندی قبر میں کیسے کر دی؟''

''کیا اس کے دوست احباب اس دنیا میں نہیں ہیں؟''

''تھے؟'' اس نے کہا۔ ''والڈن نے ہم سے غداری کی اس لیے ہم نے اسے اپنے حلقۂ احباب سے خارج کر دیا تھا۔'' بیکر بولا۔

''یہ بات میرے علم میں نہیں تھی۔''

''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو سارجنٹ؟ اگر تم کہو تو میں اس علاقے میں اپنے چند آدمی پھیلا دوں؟''

''تم اس معاملے سے الگ رہو۔ میں نے یہ کہنے کے لیے تمہیں بلایا تھا۔''

''تم نے مجھے غلط سمجھا ہے سارجنٹ۔'' اس نے کہا۔ ''میں ایک غدار کے لیے تمہاری جان کیوں لینے لگا۔''

کانوے کار سے باہر آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد شیورلیٹ اسٹارٹ ہوئی اور وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ کانوے سوچنے لگا کہ بیکر اسے قتل نہیں کر سکتا۔ اسے فہرست سے خارج کر دینا چاہیے۔ جس نے بھی اس پر حملہ کیا ہے اسے معلوم تھا کہ وہ صبح کے حملے میں بچ گیا ہے۔ تو پھر وہ بوڑھی عورت کون تھی اور اسے کیوں قتل کرنا چاہتی تھی؟

اس کا دماغ الجھنے لگا تو اس نے بڑی بی پر لعنت بھیج دی۔ اس قسم کی باتیں تو جاسوسی ناولوں میں ہوتی ہیں۔ ان کا حقیقت سے کیا تعلق؟ وہ سڑک پار کھڑی اپنی کار کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ سڑک کے وسط میں پہنچا تو اسے دائیں جانب سے کسی کار کی تیز ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔ وہ بالکل سیدھی آ رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اسے کچل دینا چاہتی ہو۔ اس نے الٹی چھلانگ لگا دی۔ وہ سڑک کے کنارے گرا۔ وہ کار اس کے قریب سے گزرتی چلی گئی۔ اس کی ٹانگیں بونٹ سے ٹکرائی تھیں۔ دور جاتی اس کار کو کانوے نے دیکھ لیا تھا۔

وہ وہی کمپکیٹ کار تھی جس سے ایک گھنٹہ پہلے اس پر فائر کیا گیا تھا۔

ایک بات کانوے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ قاتل بہت نڈر اور بے خوف ہے۔ اسے اپنی گرفتاری کا اندیشہ نہیں ہے۔ وہ ہر صورت کانوے کو مردہ دیکھنا چاہتا ہے۔ اس پر فائر کرنے کے بعد وہ بھاگ کر کہیں نہیں گیا اور اس کی ٹوہ میں لگا رہا کہ وہ کہاں جاتا ہے۔ پھر موقع پا کر اس نے کانوے پر کار چڑھانے کی کوشش کی۔

وہ ہیڈ کوارٹر کی طرف چلا گیا۔ رات ڈیوٹی پر موجود دوستوں نے اس سے دھماکے کے بارے میں سوالات کرنا شروع کر دیے، مگر اس نے سرسری جوابات دیے اور ریکارڈ روم میں چلا گیا۔ والڈن کی فائل اسے مل گئی۔ اس نے فائل کی ورق گردانی پھر شروع کر دی۔ اس احساس کے ساتھ کہ وہ کوئی بات

نظر انداز کر رہا ہے- جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ والڈن شادی شدہ تھا اور مسز نیتا والڈن کا پتا فائل میں درج تھا-

کانوے فائل لیے ہوئے ٹریفک کے شعبے میں چلا گیا-

وہاں معلوم ہوا کہ مسز والڈن ایک کمپکیٹ کار کی مالک ہیں- تھوڑی دیر بعد وہ اپنی کار میں بیٹھ کر اس پتے پر چل دیا- اس نے اپنی کار دور کھڑی کی تھی- وہ دو منزلہ مکان تھا جس کے نچلے حصے میں روشنی ہو رہی تھی- جب وہ اپنی کار سے اترا تو سردی مزاج پوچھ رہی تھی- اس نے دروازے پر جا کر اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا- تھوڑی دیر بعد ایک خوب رو عورت نے دروازہ کھولا اور اس کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا- کانوے نے اندازہ لگایا کہ اس کی عمر تقریباً تیس سال ہے- اس کے جسم پر سرخ رنگ کی پتلون اور سرخ قمیص تھی-

''میرا تعلق پولیس سے ہے مسز والڈن-'' وہ بولا-

''اوہ ہاں- تو تم میرے شوہر کے قاتل ہو-'' اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا-

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے پاس ایک کمپکیٹ کار ہے- میں وہ کار ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں-''

''یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میں چیخ چلا کر پڑوسیوں کو بلا لوں گی-'' اس نے دھمکی دی-

کانوے پیچھے ہٹ گیا- عورت نے دروازہ بند کر دیا اور اس کے جاتے قدموں کی آواز سنائی دی- اسے معلوم تھا کہ اس کی پوزیشن کمزور ہے- وہ اس مکان میں زبردستی داخل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی مسز والڈن کو پولیس ہیڈ کوارٹر لے جا سکتا ہے-

اگر مسز والڈن نے بڑھیا کا میک اپ کر کے اس پر قاتلانہ حملے کیے ہیں تو اپنے فربہ جسم کو کیسے گھٹا لیا- اس لیے کہ جو بوڑھی عورت ہیڈ کوارٹر میں بھنی ہوئی مرغابی لائی تھی وہ خاصی نحیف و نزار تھی-

کانوے نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی کار کی طرف بڑھنے لگا- اس وقت وہ ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار تھا- اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دو آنکھیں اس کی نگرانی کر رہی ہوں- اور جیسے چند لمحوں بعد ایک گولی اس کی طرف آنے والی ہو اور اس کا خاتمہ ہونے والا ہو! جب وہ سڑک پار کر کے اپنی کار میں بیٹھ گیا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا-

دوسرا دن کانوے کے لیے پریشان کن ثابت ہوا اس لیے کہ وہ مسز والڈن کو ہیڈ کوارٹر بلا کر اس سے سوالات نہیں کر سکتا تھا- دوسرے یہ کہ وہ بوڑھی عورت بھی نہیں مل رہی تھی- جس نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا تھا-

اس کی کار ٹریفک میں رینگ رہی تھی- اچانک اس کی نگاہ ایک سپر مارکیٹ کے اشتہار پر پڑی تو اسے خیال آیا کہ مسز والڈن کے مکان کے قریب ترین جنرل اسٹور پر جا کر وہ دکان داروں سے سوالات کر سکتا ہے اور کوئی کلید پا سکتا ہے اس لیے کہ مسز والڈن بہرحال وہاں سے گھر کے لیے سودا سلف خریدتی ہو گی-

کانوے نے تفتیش کے لیے گوشت کا کاؤنٹر منتخب کیا- ''کیا مسز والڈن آپ کے ہاں سے گوشت خریدتی ہیں؟'' اس نے کاؤنٹر والے سے پوچھا-

''ہاں-''

''اس ہفتے پہلے انہوں نے یہاں سے ایک مرغابی خریدی تھی؟''

''نہیں-'' وہ بولا- ''مگر ٹھہریے- مجھے یاد آ رہا ہے کہ ان کی ماں نے ایک مرغابی ضرور خریدی تھی- ان کا نام مسز ڈون ہے-''

''انیتا کی ماں؟''

''جی ہاں- سامنے والے مکان میں وہ اور اس کی ماں رہتی ہیں-''

کانوے ایک بار پھر پرجوش ہو گیا- وہ مارک والڈن

کے مکان کی طرف گیا اور اطلاعی گھنٹی بجانے لگا، مگر کسی نے دروازہ نہیں کھولا- اس نے پڑوسیوں سے پوچھ گچھ کی تو ایک بڑھیا نے اسے انیتا کے متعلق تفصیل سے بتا دیا- اس نے کہا کہ وہ صبح ساڑھے آٹھ بجے وہاں سے چلی گئی ہے-

''مگر وہ تو اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہے- میں نے گھنٹی بجائی تو کسی نے جواب ہی نہیں دیا-''

''اس کی ماں آدھے گھنٹے بعد چلی گئی تھی-''

اب کوئی ایسی بات نہیں رہ جاتی تھی جو پوچھی جاتی اس لیے کانوے پلٹ کر ہیڈ کوارٹر کی طرف چل پڑا- اس نے کوگلے اور روڈی کو ہدایت دی کہ وہ اس بڑھیا کو گرفتار کر کے لے آئیں- اس لیے کہ یہ سارا فساد اس کا ہے- وہ بڑھیا کو گرفتار کرنے کا لائحہ عمل بنا رہے تھے کہ اچانک کمرے میں ان کا ایک ساتھی رابرٹ داخل ہوا- اس کے اعصاب تنے ہوئے تھے اور ہاتھ کپکپا رہے تھے-

''میرے پیچھے دیکھو چیف-'' اس نے مائیکل کو مخاطب کر کے کہا-

دوسرے ہی لمحے ایک بڑھیا کمرے میں داخل ہو گئی- اس نے کمرے میں موجود پولیس افسران کا جائزہ لیا- اور جب اس نے کانوے کو دیکھ لیا تو وہ قدرے مطمئن ہو گئی- یہ وہی بڑھیا تھی جو اس سے پہلے مرغابی میں ٹائم بم لگا کر لائی تھی اور جس سے کوگلے زخمی ہو گیا تھا- وہ اس وقت بھی فر کا بوسیدہ کوٹ پہنے ہوئے تھی- اس کے سر پر وہی ہیٹ تھا- دائیں ہاتھ میں ایک پھولا ہوا پرس- بائیں ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹیوب تھی جس میں کوئی سیاہ مادہ بھرا تھا-

''لیفٹیننٹ یہ کہہ رہی ہے کہ اس ٹیوب میں آتش گیر مادہ بھرا ہوا ہے- اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں اس کے ساتھ اوپر نہ گیا یہ تو نیچے موجود سارے افراد کے پرخچے اڑا دے گی-''

''اوکے- ہم اسے سنبھالیں گے-'' مائیکل نے اسے تسلی دی-

مگر جیسے ہی وہ آگے بڑھا- بڑھیا چوکنا ہو گئی-

''مجھے اس سے بات کرنے دو مائیکل-'' کانوے نے کہا-

''آپ کے ہاتھ میں ایک خطرناک چیز ہے مسز ڈون- احتیاط کیجیے-''

''میں جانتی ہوں- یہ نائٹروگلیسرین ہے- اگر میں یہ ٹیوب فرش پر گرا دوں گی تو ایک زبردست دھماکا ہو گا اور تم سب لوگوں کے پرخچے اڑ جائیں گے-''

''آپ یہ ٹیوب مجھے دے دیں-'' کانوے نے ہاتھ پھیلا کر کہا-

''ہرگز نہیں- میں تو تمہیں قتل کرنے آئی تھی- افسوس کہ تمہارے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہلاک ہوں گے لیکن کیا کروں مجبوری ہے-''

''مگر اس طرح سے آپ بھی زندہ نہیں بچیں گی-''

''مجھے اپنے مرنے کی پروا نہیں ہے- میں اس کے لیے تیار ہو کر آئی ہوں-'' بڑھیا نے بے پروائی سے کہا-

''لیکن میں یہ جاننے سے قاصر ہوں کہ آپ مجھ سے ناراض کیوں ہیں؟'' کانوے نے کہا- وہ اسے باتوں میں لگا کر وہ ٹیوب جھپٹ لینا چاہتا تھا- تاہم اسے یہ اندیشہ بھی تھا کہ جدوجہد میں وہ ٹیوب پھٹ جائے گی-

''تم سے نفرت کی وجہ یہ ہے کہ تم نے میرے داماد مارک والڈن کو قتل کیا ہے- اس نے میرا اور میری بیٹی کا بہت خیال رکھا تھا- وہ بہت عظیم تھا- اس لیے میں تمہیں قتل کیے بغیر نہیں رہوں گی-''

''میں نے والڈن کو قتل نہیں کیا ہے-'' کانوے نے کہا- ''اسے ریاستی قانون کے تحت سزا ہوئی ہے-''

''لیکن قانون کے حوالے تو تم نے اسے کیا تھا-'' وہ زہر پاش لہجے میں بولی-

"وہ میرا فرض تھا' میں اس پر نادم نہیں ہوں۔"

"اور یہ میرا فرض ہے کہ میں والڈن کی آخری خواہش کے مطابق تمہیں قتل کردوں۔" اس نے درشتی سے کہا۔ "میں نے مرغابی میں بم فٹ کرکے یہاں رکھا مگر تم بچ گئے۔ تم پر گولی چلائی لیکن پھر بھی تم ختم نہیں ہوئے۔ اس کے بعد میں نے تمہیں کار سے کچل دینا چاہا تم پھر بھی زندہ رہے۔ لیکن اب میں یہ ٹیوب لے کر آئی ہوں جو اس پورے کمرے کے ٹکڑے اڑا دے گی۔"

"مسز ڈون۔" کانوے نے کہا۔ وہ اس کی توجہ دوسری طرف مبذول کرانا چاہتا تھا تاکہ ٹیوب اس کے ہاتھ سے جھپٹ لے۔ مگر وہ اس کی توقع کے برعکس ہوشیار تھی۔ اس نے ٹیوب کو انگوٹھے اور انگلی کے درمیان جھول جانے دیا۔ یہ دیکھ کر روڈی کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں جھلملانے لگیں۔ کوگلے کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور مائیکل جلدی جلدی پلکیں جھپکانے لگا۔

"یہ سارے لیفٹیننٹ اور سارجنٹ کہاں چلے گئے؟" اچانک راہ داری کی طرف سے آواز آئی۔ وہ سب چونک کر اس طرف دیکھنے لگے۔ پھر کوئی زور زور سے ہنسنے لگا۔ کانوے اپنی جگہ پر ساکت و جامد کھڑا تھا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اس آواز کو سن کر مسز ڈون نے وہ ٹیوب اپنے ہاتھ سے کیوں نہیں گرادی؟

پھر بیکر دونوں ہاتھ پھیلائے اور اپنے ہونٹوں پر ایک دل کش مسکراہٹ سجائے اندر آ گیا۔ اسے قطعی نہیں معلوم تھا کہ اس نے ایک سنگین صورت حال میں مداخلت کردی ہے۔

"یہ لوگ یہاں چھپے کھڑے ہیں۔" بیکر نے مڑ کر کہا۔ "اچھا اب سامان لاکر یہاں رکھ دو۔" اس کے ساتھی راہ داری میں کھڑے تھے۔

پھر کمرے میں پانچ نوجوان داخل ہوئے جنہیں ہیڈ کوارٹر کا ہر فرد جانتا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں گتے کے کھلے ڈبے تھے جن میں بھنی ہوئی مرغابیاں رکھی تھیں۔

"یہاں دیوار کے قریب رکھ دو۔" اس نے لڑکوں کو ہدایت دی۔ پھر اس نے کانوے کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ان ڈبوں میں بہترین بھنی ہوئی مرغابیاں ہیں۔"

ان نوجوانوں نے ڈبے لاکر دیوار کے قریب سجا دیے اور ایک طرف کھڑے ہوگئے۔ "میں کل رات پولیس والوں کو مرغابیاں فراہم کرنا چاہتا تھا اس لیے کہ تم لوگوں کی آمدنی بہت محدود ہوتی ہے۔ موسم بہت اچھا ہے۔ اس لیے ہر شخص کو اس سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔" بیکر نے مسکرا کر کہا۔ "اور ہاں تم لوگ یہ کیا کر رہے ہو؟ اس طرح سے ساکت کھڑے کیا دیکھ رہے ہو؟"

اس نے کمرے پر طائرانہ نگاہ ڈالی پھر دو قدم آگے جاکر مسز ڈون کے قریب پہنچ گیا۔ "مادام۔ میں آپ کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ آپ مارک والڈن کی ساس ہیں۔ وہ میرے ساتھ کام کرتا رہا ہے۔ کیا آپ مجھے یعنی بیکر کو نہیں جانتیں؟"

کانوے کو اب مسز ڈون کی طرف دیکھتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس لیے کہ وہ کسی بھی لمحے ٹیوب فرش پر گرا سکتی تھی۔

"میں آپ سے اچھی طرح واقف ہوں مسٹر بیکر۔ آپ معزز شخص ہیں۔ آپ کے والڈن سے اچھے تعلقات تھے اور آپ اس کی مدد کرتے تھے۔"

مسز ڈون کو باتوں میں لگا کر وہ ان کے قریب پہنچ گیا پھر اس نے کانوے پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر کہا۔ "ارے سارجنٹ! یہ تمہیں کیا ہوا ہے؟ اس طرح سے اکڑے کیوں کھڑے ہو؟ کیا تمہاری کمر میں درد ہے؟"

"اس ٹیوب میں ایک ایسا مادہ بھرا ہوا ہے بیکر کہ اگر یہ....." کانوے اسے بتانا چاہتا تھا لیکن پھر خاموش ہوگیا۔ وہ سوچنے لگا کہ بیکر جیسا شاطر شخص نیچے سے

اوپر کیسے آ گیا؟ کیا اسے کسی نے نہیں بتایا کہ ہم لوگ کیسی ہولناک صورت حال سے دوچار ہیں؟ اسے اوپر آنے کی اجازت کس نے دی؟

کانوے نے اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ دیوار کے قریب ڈبے رکھنے کے بعد اس طرح سے ایک لائن میں کھڑے ہوگئے جیسے ان کی حفاظت پر مامور ہوں۔ بیکر نے کھنکار کر اپنا حلق صاف کیا اور پھر بولا۔ "مسز ڈون یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟"

مسز ڈون نے اس کی طرف سپاٹ نگاہوں سے دیکھا جیسے وہ اسے کوئی جواب نہ دینا چاہتی ہوں۔

"یہ لوگ یقیناً پولیس والے ہیں لیکن حقیقت میں برے نہیں ہیں۔"

"سارجنٹ کانوے نے والڈن کو قتل کیا ہے۔"

"ہاں۔ سارجنٹ نے اسے گرفتار کیا تھا لیکن کیا آپ اسے قتل کرنا چاہتی ہیں؟"

"میں اسے ہلاک کرنے کے ارادے سے یہاں آئی ہوں، لیکن یہ نہیں چاہتی کہ آپ یا آپ کا کوئی ساتھی میرے ہاتھوں ہلاک ہو اس لیے کہ آپ کا رویہ والڈن کے ساتھ آخر تک بہت اچھا تھا۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ آپ اپنے ساتھیوں کو لے کر یہاں سے نکل جائیں۔ کیوں کہ تھوڑی ہی دیر بعد میں اس ٹیوب کو فرش پر پھینک دوں گی۔ جس سے ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوگا اور اس کمرے کے سارے افراد، مجھ سمیت ہلاک ہوجائیں گے۔"

"شکریہ نیک دل خاتون۔ اچھا ہم جا رہے ہیں۔" بیکر احسان مندی سے بولا۔ پھر اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر اشارہ کیا اور واپسی کے لیے مڑا، مگر دوسرے ہی لمحے اس نے مسز ڈون کی طرف گھوم کر اس ٹیوب پر ہاتھ ڈال دیا اور اسے ان کے ہاتھ سے چھین لیا۔

کانوے اور اس کے ساتھی جیسے سانس لینا بھول گئے۔ وہ ایک ناقابل یقین منظر تھا۔ ایک لمحے پہلے وہ سب موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے، لیکن اب انہوں نے موت سے دامن بچالیا تھا۔

مسز ڈون چند لمحوں تک ساکت اور ہکا بکا کھڑی رہ گئی پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بیکر نے وہ ٹیوب اپنے ایک ساتھی کو تھما دی۔ وہ اسے احتیاط سے باہر لے گیا۔ پھر مسز ڈون کو بھی وہ باہر لے گئے۔ کمرے میں موجود پولیس افسران، بیکر کو احسان مندی سے دیکھنے لگے۔ اس نے کانوے کو آنکھ مار کر شرارتی لہجے میں کہا۔ "مجھے پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ اوپر کیا منظر چل رہا ہے۔ وہ مجھے اوپر آنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ نہ صرف یہ کہ سارے پولیس والے ہلاک ہوجائیں گے بلکہ میں بھی موت سے ہم کنار ہوجاؤں گا۔ میں نے ان سے بحث مباحثہ کیا اور ان کو آمادہ کرلیا کہ وہ مجھے اوپر جانے دیں۔ تم لوگوں کی موت تو یقینی تھی نا؟ اب تم لوگوں کو بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ زندگی تو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب آپ متحرک ہوتے ہیں۔ تم لوگ موت کے دہانے پر کھڑے تھے۔ اب میرا کیا فرض تھا؟ تم لوگوں کو اس طرف دھکا دے دوں یا بچانے کی کوشش کروں۔ میں نے کوشش کر ڈالی اور قدرت نے میرا ساتھ دیا۔ مجھے کامیابی سے ہم کنار کردیا۔ مرغابیوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ یہ میری طرف سے ایک ادنیٰ سا تحفہ ہے۔"

"بیکر کی حیثیت سے تو یہ تحفہ میرے لیے قابل قبول نہیں ہے، مگر تم نے چند لمحوں پہلے جس جرات اور بے خوفی کا مظاہرہ کیا ہے اس کے لیے ہم سب تمہارے ممنون و مشکور ہیں۔ اچھا میں اپنے حصے کی مرغابی چکھ کر دیکھتا ہوں۔" کانوے بولا۔

☆☆☆

انگش بنگش

شکیل صدیقی

اس نے وہ ٹشو پیپر ہٹائے تو نیچے سے پاؤڈر نکلا۔ وہ حیران تھا کہ شارٹی نے اتنا سارا پاؤڈر ردی کی ٹوکری میں کیوں پھینک دیا۔
اس نے انگلی سے پاؤڈر کی تھوڑی سی مقدار اٹھا کر سونگھی پھر اسے چکھا لیکن۔

اس کی حاضر دماغی سے اسے بچالیا

وہ سرکس کے پانچ جوکر تھے۔ ان میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ تماشائیوں کا اچھی طرح سے دل بہلاتے تھے اور لوگ ان سے محظوظ ہوتے تھے لیکن ایک خصوصیت ان میں بہر حال تھی کہ وہ ہم شکل تھے۔

اگر ان کی شکلوں میں کوئی فرق رہ جاتا ہوگا تو بیک اپ کرنے کے بعد وہ بھی دور ہو جاتا تھا۔

تماشائیوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ ان میں کیا فرق ہے۔ ان پانچ جوکروں کے جسمانی فرق سے صرف ایک ہی شخص واقف تھا۔ اور وہ اس کی وجہ سے دشواری سے دوچار ہو گیا۔

اتوار کی رات کو ان جوکروں کا بڑا پروگرام تھا۔ اس لئے سرکس کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ دفعتاً تماشائیوں کے باکس کی طرف سے ایک گولی آئی اور ایک جوکر شارٹی

کی چھوٹی انگلی میں لگی پھر وہ حلق سے آواز نکالے بغیر گرا اور مر گیا۔ اس لئے کہ چھوٹی انگلی میں لگنے والا زخم زیادہ مہلک نہیں ہوتا لیکن بدقسمتی سے اس وقت وہ اپنی ناک کھجا رہا تھا اس لیے ریوالور سے چلائی جانے والی گولی اس کے بھیجے میں پیوست ہو گئی اور پھر اس کی موت کا باعث بن گئی۔

سرکس کے بینڈ سے اس وقت ایک پرشور دھن بج رہی تھی۔ چنانچہ گولی چلنے کی آواز کو کسی نے نہیں سنا اور نہ ہی کسی نے قاتل کو دیکھا اس لئے کہ لوگ محویت سے جوکروں کی مزاحیہ حرکتوں سے محظوظ ہو رہے تھے۔

شارٹی اچھل کر الٹا گرا اور فضا میں قلابازیاں کھاتا ہوا اسٹیج کی طرف آنے لگا۔ لوگوں نے زبردست تالیاں بجائیں۔ اس لئے کہ اس سے پہلے کوئی اتنے شان دار طریقے سے نہیں گرا تھا۔ البتہ جب اسٹیج کے پختہ فرش سے ٹکراتے ہی ہر طرف خون پھیل گیا اور شارٹی بے حس و حرکت ہو گیا تو ہر طرف سناٹا چھا گیا۔

موت کا سناٹا۔

شارٹی کو جس زاویے سے گولی لگی تھی۔ اس کا اندازہ فوراً ہی ہو گیا۔ اس لئے سرکس کا جاسوس میلکر بوکھلایا بوکھلایا دوڑ رہا تھا لیکن وہ کوئی عملی قدم اٹھانے سے معذور تھا۔ اس لئے کہ یہ معلوم ہوتے ہی کہ شارٹی کی موت واقع ہو گئی ہے۔ لوگوں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر سراسیمگی میں دروازے کی طرف بھاگنا شروع کر دیا تھا۔

اس بھگدڑ میں وہ کس کو روکتا یا کس کو مورد الزام ٹھہراتا۔

چیخم دھاڑ مچی رہی، لوگ دوڑ رہے، گر رہے، ایک دوسرے کو دھکیل رہے اور دروازے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں پنڈال خالی ہو گیا اور وہاں کربناک سکوت طاری ہو گیا۔

شارٹی کو ملک گیر شہرت حاصل تھی۔ لہٰذا اس کا قتل معمولی نہیں تھا۔ لوگ سرکس کے باہر جا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اور غل مچا رہے تھے۔ انہیں پولیس کا انتظار تھا تاکہ قاتل کو گرفتار کیا جا سکے۔

ایک فن کار کی حیثیت سے میلکر، شارٹی سے محبت کرتا تھا اور پنڈال میں بیٹھ کر اس کی اداکاری کو سراہتا تھا لیکن اس وجہ سے نفرت بھی کرتا تھا کہ اس نے ایک ہفتے پہلے اس کی بہن پومی کو طلاق دی تھی۔ اس واقعے سے میلکر کے دل میں شارٹی کی طرف سے گرہ بندھ گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد سرکس کے مالک جوائے کی صورت دکھائی دی۔ وہ بھاری تن و توش کا دراز قامت شخص تھا۔ اس کی دنیا بہت محدود تھی۔ اور وہ جانوروں، اسٹیج اداکاروں اور روپے کے لین دین کے علاوہ کسی موضوع پر گفتگو نہیں کرتا تھا۔

تم یہاں گارڈ مقرر ہو اور اداکاروں کی حفاظت کرنا تمہارا فرض ہے۔ لیکن تم نے انہیں خود ہی ہلاک کرنا شروع کر دیا۔ جوائے نے غرا کر کہا۔ تم ہی شارٹی کے قاتل ہو۔

قاتل نے ریوالور کو اس کی کرسی کے نیچے پھینک دیا تھا۔ جو فوراً ہی وہاں سے برآمد کر لیا گیا تھا۔ اس لئے جوائے کو اس پر شبہ ہونا لازم تھا۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ اس سے شدید نفرت کرتا تھا۔

جوائے میں نے رونالڈس کو اس طرف کے بوتھ میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ وہ شروع سے آخر تک وہاں رہا۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ قتل اسی نے کیا ہے۔ تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اس نے سارے بوتھ کا کرایہ ادا کیا اور وہاں تنہا بیٹھا رہا۔

میں جانتا ہوں کہ شارٹی نے ایک معاملے میں اس کی بے عزتی کی تھی۔ اس لئے رونالڈس، اس سے شدید نفرت کرتا تھا۔ بلکہ اس نے شارٹی کو جان سے مارنے کی دھمکی بھی دی تھی۔ مگر میک اپ کے بعد

سارے جوکروں کی صورت ایک جیسی ہو جاتی تھی۔ اس لئے ان میں شارٹی کون تھا۔ یہ شناخت کرنا دشوار تھا اور صرف تم ہو جو یہ شناخت کر سکتے تھے۔

میلکر خاموش رہا۔ اس لئے کہ جوائے جو کچھ کہہ رہا تھا اس کا حقیقت سے گہرا تعلق تھا۔ مگر قاتل اس بارے میں بھی کچھ نہ کچھ جانتا تھا۔ اسی لئے اس نے نہ صرف یہ کہ شارٹی کو قتل کیا بلکہ ریوالور اسکی نشست کے نیچے پھینک دیا تا کہ اس کی گردن پھنس جائے۔

اب میرے ساتھ آؤ۔ جوائے نے اپنا بھاری ہاتھ اس کی گردن پہ رکھتے ہوئے کہا۔ پولیس تمہاری منتظر ہے۔

ٹھہرو جوائے۔ میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ میرے علاوہ رونالڈس بھی اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ پانچ جوکروں میں شارٹی کون ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے تو تم مجھے مورد الزام نہیں ٹھہراؤ گے نا۔

میلکر پومی سے تو میں بھی محبت کرتا تھا لیکن اس نے شارٹی سے شادی کر لی۔ قتل کا شبہ تو مجھ پر بھی کیا جا سکتا ہے۔

ہاں لیکن ظاہر ہے کہ قتل ہمیں سے کسی نے کیا ہے۔ میں بولا۔ مجھے ایک کوشش کرنے دو تا کہ۔

لیکن جوائے اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اور پولیس کے پاس چلنے پر اصرار کرنے لگا۔ میلکر نے جھکائی دی اور اس کے سینے پر ٹکر مارنے کے بعد دائیں جانب بھاگنے لگا۔

جوائے ایک چیخ مار کر گر گیا تھا۔ اور زمین پر پڑا بک رہا تھا۔ دراصل وہ سیدھا سا شخص تھا۔ اور کسی الجھن میں گرفتار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میلکر اپنے جرم کا اقرار کر لے اور پولیس اسے فوراً ہی پھانسی پر چڑھا دے تا کہ قصہ ختم ہو جائے۔

جوائے کے پاس ریوالور ہوتا تھا اس لئے وہ اسے بھی استعمال کر سکتا تھا۔ لہذا میلکر پھرتی سے ایک خیمے کی آڑ میں ہو گیا۔ پھر زمین پر رینگتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔

پھر وہ ان چھولداریوں کی طرف چلا گیا جہاں سرکس کے فنکار قیام کرتے تھے۔ وہ شارٹی کی چھولداری میں چلا گیا۔ اور پھر اس حصے میں داخل ہو گیا جو ڈریسنگ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ گڑبڑ وہیں کہیں سے ہوئی ہے۔

ڈریسنگ روم میں تاریکی تھی۔ البتہ میز پر ایک ننھا سا بلب روشن تھا۔ جو تاریکی دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس ہلکی روشنی میں جائزہ لینے پر پتا چلا کہ وہاں جتنی بھی چیزیں ہیں وہ میک اپ سے متعلق ہیں۔ کریموں اور پاؤڈروں کے ڈبے، استرا جس کی دھار چمک رہی تھی۔ اور نئے پرانے ملبوسات۔

میلکر نے میک اپ باکس کھولا اور شیشیاں اٹھا اٹھا کر ان کا جائزہ لینے لگا۔ ایک شیشی میں سیاہ لیس دار اور گاڑھا محلول بھرا ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ کیا ہو سکتا ہے۔

جب اس بارے میں کچھ اندازہ نہ ہو سکا تو اس نے شیشی بند کر دی اور دوسری شیشیوں کا جائزہ لینے کے بعد ردی کی ٹوکری کی طرف متوجہ ہوا۔ اس میں ٹشو پیپر کے ٹکڑے بھرے ہوئے تھے۔

اس نے وہ ٹشو پیپر ہٹائے تو نیچے سے پاؤڈر نکلا۔ وہ حیران تھا کہ شارٹی نے اتنا سارا پاؤڈر ردی کی ٹوکری میں کیوں پھینک دیا۔

اس نے انگلی سے پاؤڈر کی تھوڑی سی مقدار اٹھا کر سونگھی پھر اسے چکھا لیکن کوئی خاص بات سامنے نہ آ سکی۔ وہ عام سا ٹالکم پاؤڈر تھا۔ اگر شارٹی نیا ڈبہ خرید کر لایا تھا اور اسے کھولنے میں دشواری پیش آ رہی تھی اور ڈبہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا تو اسے فرش پر بکھرنا چاہیئے تھا نا کہ ردی کی ٹوکری میں۔

وہ جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی اس کا دماغ الجھ رہا تھا۔

پھر اس نے میز پر رکھے پاؤڈر کے ڈبے سے پاؤڈر نکالا اور اسے چھپکلی کی پشت پر ملنے لگا۔ پشت پر کھجلی ہونے لگی۔ اس نے ہاتھ دھویا اور وہاں سے نکل آیا۔ وہ چھولداری سے نکلا اور مورگن اسٹور کی طرف بڑھ گیا۔

دکان کا مالک اسے دیکھ کر مسکرایا۔ پھر اس نے سنجیدگی سے کہا۔ شارٹی کی موت پر مجھے بہت افسوس ہوا۔

اس اسٹور پر سرکس سے متعلق اور عام لوگوں کے لئے دل چسپ چیزیں فروخت ہوتی تھیں۔ جس میں ایک پاؤڈر بھی تھا۔

تمہارے اسٹور سے آج کل کھجلی کا پاؤڈر کیا زیادہ فروخت ہو رہا ہے۔

ہاں چیز دلچسپ ہے لیکن ساتھ ہی تکلیف دہ بھی۔ جب اس کا موجودہ اسٹاک ختم ہو جائے گا تو میں اسے مزید نہیں لاؤں گا۔

کیا شو شروع ہونے سے پہلے بھی کوئی اس پاؤڈر کو خرید کر لے گیا تھا۔ میلکر نے سوال کیا۔

ہاں.....! اس نے سر ہلایا۔ آج بھی فروخت ہوا تھا۔ تمہارا دوست رونالڈس دو تھیلیاں لے گیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ آج اسے اپنے ایک دوست سے کچھ مذاق کرنا ہے۔ کیوں کیا بات ہے۔

کوئی بات نہیں ہے تم یہیں ٹھہرنا۔ میں ابھی آتا ہوں۔ میلکر نے اس کے شانے کو تھپ تھپا کر کہا۔

وہ گیٹ کی طرف گیا تو اسے جوائے چند پولیس والوں کے ساتھ کھڑا دکھائی دیا۔ میلکر کو معلوم تھا کہ اس کے پاس وقت نہیں ہے۔ لہذا اس نے سارجنٹ کے سامنے جلدی جلدی بولنا شروع کر دیا۔

سارجنٹ ڈوریے نے سر کو اثباتی جنبش دی اور پھر اس کے ساتھ شارٹی کے خیمے کی طرف گیا۔ یہ پاؤڈر میلکر نے کہا۔

میں اس کے بارے میں بتا رہا تھا۔ جوائے اب تم چاہو تو اسے اپنے چہرے پر مل سکتے ہو۔

تم نے ایک کہانی گھڑ لی ہے اور اب کوئی کمزور سا بہانہ تلاش کر رہے ہو۔ جوائے نے مسکرایا۔

شارٹی کے بارے میں سب کو معلوم ہے کہ وہ آوارہ صفت شخص تھا اور عورتوں کا التفات حاصل کرنے کے لئے ان کے پیچھے پھرا کرتا تھا۔ پھر سارا دن پڑا سوتا رہتا۔ اس نے کہا اور پاؤڈر کا ڈبا اٹھا کر وہ جوائے کے بازو پر چھڑکنے لگا۔

ہاں تو اس سے کیا ہوا۔ تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو۔ جوائے نے کہا۔ سارجنٹ اسے کینہ توز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

اس حقیقت سے رونالڈس بھی واقف تھا۔ اسی لئے وہ شو شروع ہونے سے پہلے آ گیا تھا۔ پھر اس نے اسٹور سے کھجلی والا پاؤڈر خرید لیا اور شارٹی کے ڈریسنگ روم میں جا کر اس کا پاؤڈر کا ڈبا اٹھایا اور اسے ردی کی ٹوکری میں خالی کرنے کے بعد کھجلی والا پاؤڈر ڈال دیا۔ پھر وہ باکس میں جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے شو کے دوران شارٹی کو گولی ماری اور افراتفری سے فائدہ اٹھا کر ریوالور میری نشست کے نیچے ڈال دیا۔

لیکن اس نے پانچ جوکروں میں سے شارٹی کو کیسے نشانہ بنا لیا۔ جب کہ وہ سب ایک جیسے لگ رہے تھے۔ جوائے نے اپنا بازو کھجلاتے ہوئے سوال کیا۔

اسے شناخت کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس نے جیسے ہی اپنی ناک کھجائی۔ رونالڈس نے اسے گولی مار دی۔ اس لئے کہ شارٹی وہ کھجلی والا پاؤڈر اپنے چہرے پر مل چکا تھا میلکر نے سادگی سے کہا۔

سارجنٹ نے سر ہلا کر اس سے اتفاق کیا پھر اپنے نائب کو رونالڈس کی گرفتاری کے احکام صادر کرنے لگا۔

☆☆☆

سہل انگار

امان اللہ

اس نے سوچا کہ وہ لوسی کو اس وقت نشانہ بنائے گا جب وہ اپنے محبوب سے محوِ گفتگو ہوگی تاکہ اس کی ہسٹریائی چیخیں سن کر اس کا محبوب دیوانہ ہو جائے۔ اس نے رائفل کو کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھ دیا اور دوربین لگا کر لوسی کے اپارٹمنٹ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہی فون کر رہی تھی۔ اس نے رائفل اٹھائی اس کا دستہ اپنے شانے سے لگایا۔ شست پر نگاہ جمائی اور ٹریگر دبا دیا.....

کون کس کا منتظر ہے کون کس گھاتوں میں ہے

وہ ایک چھ منزلہ گودام تھا۔ جس کی آخری منزل پر بیٹھے شخص نے خالی ڈبے پر بیٹھتے ہوئے ناگواری سے منہ بنایا اس لیے کہ سرد ہوا کے جھونکے اندر آ رہے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ کھڑکیوں کے بیشتر شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ وہاں نمی تھی اور گلی سڑی اشیاء کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

اس گودام میں داخل ہونے کا راستہ تلاش کرنے میں ایک دن لگ گیا تھا۔ پھر جب وہ اوپر پہنچ گیا تو اس نے چھٹی منزل کی کھڑکی کے قریب چند ڈبے رکھ کر اپنے لیے نشست تیار کر لی تھی۔ اب یہ اس کا معمول ہو گیا تھا کہ وہ رات کو آٹھ بجے کے قریب خطرناک زینے طے کر کے وہاں تک آتا تھا اور کچھ دیر ستانے کے بعد اپنے کام کا آغاز کر دیتا۔

کام آسان نہیں تھا۔ اسے سڑک پار سامنے والے اپارٹمنٹ کی ایک کھڑکی پر نگاہ رکھنا ہوتی اور وہاں سے اس کا زاویہ بہت دشوار تھا۔ اس لیے کہ اسے کھڑکی کی چوکھٹ سے سر نکال کر گردن گھما کر دیکھنا پڑتا تھا۔ مگر اس نے یہ دشواری برداشت کر لی تھی اس لیے کہ وہاں سے سامنے والی کھڑکی کے ذریعے ایک خواب گاہ کا منظر اس کے سامنے آ جاتا تھا۔ وہاں ایک حسین اور خوش جمال لڑکی رہتی تھی۔ لیکن اسے لڑکی سے محبت نہیں نفرت تھی۔

وہ کئی دنوں سے اس کی نگرانی کر رہا تھا اور روز بہ روز لڑکی سے اس کی نفرت بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے الجھن ہوتی تھی جب وہ لڑکی کہتی تھی کہ اس کا شوہر سات سمندر پار گیا ہوا ہے اور کسی سے تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔

پہلی بار جب وہ اس سے ملا تھا تو لڑکی وقفے میں کافی پی رہی تھی۔ اس نے خوش اخلاقی سے اسے لنچ کی دعوت دے دی۔ مگر لڑکی نے اسے نہایت خوبصورتی سے ٹال دیا۔ اور یہ کہا کہ وہ ساتھی لڑکیوں کے ساتھ لنچ کرتی ہے۔

اس نے ہمت نہیں ہاری اور دوسرے روز چھٹی ہونے پر اسے گھر تک چھوڑنے کی پیشکش کی۔ لیکن اس نے عذر پیش کیا کہ اسے نزدیکی سینٹر پر جا کر شاپنگ کرنا ہے اور پھر سیلون پر جا کر اپنے بال سیٹ کرانا ہیں۔

اس سے اگلے روز اس نے دیکھا کہ لڑکی کے بال پہلے کی طرح سے ہیں اور ان کی تراش خراش میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی تھی اور اس سے پیچھے چھڑانا چاہتی تھی۔

"پھر اس نے ایک اور لڑکی سے اس کا پتا معلوم کیا اور وہاں پہنچ گیا۔ اس کی رہائش ایک اپارٹمنٹ کی پانچویں منزل پر تھی اور سڑک پار ایک گودام تھا۔ لڑکی کے شوہر کے نام کی تختی وہاں لگی تھی اس لیے اسے معلوم ہو گیا کہ وہ سیون سی میں رہتی ہے۔ تھوڑی سی تحقیق و جستجو کے بعد معلوم ہو گیا کہ سیون سی کی کھڑکی میں گودام کی چھٹی منزل سے تاکا جھانکا جا سکتا ہے۔

اس سے اگلے روز جب لڑکی ایک شاپنگ سینٹر سے باہر آ رہی تھی تو اس نے لڑکی سے بات کرنے کی کوشش کی مگر لڑکی نے اسے نظر انداز کر دیا تو وہ جھنجھلا گیا اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ چھپ کر لڑکی کی نگرانی کرے گا اور اسے رنگے ہاتھوں پکڑے گا کہ اس کے کسی سے خفیہ تعلقات تو نہیں ہیں۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنی خوبصورت اور حسین لڑکی راہبانہ زندگی کیسے بسر کر رہی ہے۔ پھر ایسی صورت میں جب کہ اس کا شوہر فوج میں بھرتی ہو کر سات سمندر پار چلا گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اور جب وہ اس کا جھوٹ پکڑے گا تو اسے بھیانک سزا دے گا۔

دو روز تک وہ گودام کا جائزہ لیتا رہا اور اپنی کار کو مختلف جگہوں پر کھڑا کرتا رہا تاکہ گشتی پولیس کی نگاہ سے بچا جا سکے۔ جب ان کی گاڑی کے اوقات اسے معلوم ہو گئے تو اس نے ایک فولادی سلاخ حاصل کی اور گودام کے عقبی دروازے کا لاک توڑ ڈالا۔ عقبی دروازہ ایک گندی گلی میں تھا اس لیے وہ کسی کی نگاہ میں آئے بغیر اپنا کام کر سکتا تھا۔

اگلے روز اس نے ایک دوربین خریدی اور گودام کی چھٹی منزل پر پہنچ کر نگرانی شروع کر دی۔ اس کھڑکی کو فوکس کرنے کے بعد وہ اس کے بیڈ روم کا نصف حصہ دیکھنے پر قادر ہو جاتا تھا۔ اس کی خواب گاہ میں ایک بستر، دو میزیں اور دو کرسیاں تھیں۔ اس نے اندازہ لگایا تھا کہ لڑکی اپنا کھانا غالباً کچن میں کھاتی ہے مگر وہ حصہ اس کی دوربین سے محفوظ تھا اور اس کی زد میں نہیں آتا تھا۔

رات کو کھانے کے بعد جب وہ اخبار یا کسی کتاب کا مطالعہ کرنے لگتی تو وہ اسے دیکھنے میں کامیاب ہو جاتا۔ وہ ریڈیو بھی سنتی جو اس کے بستر کے قریب ہی رکھا تھا۔ ہفتے میں ایک آدھ بار وہ کسی کو خط بھی لکھتی تھی۔ کبھی ڈاک سے آئے ہوئے خطوط پڑھتی بھی نظر آتی تھی۔

دس بجے وہ سونے کی تیاری شروع کر دیتی۔ اپنا نائٹ گون پہن لیتی اور چہرے سے میک اپ صاف کر دیتی۔ وہ جانتا تھا کہ میک اپ اترنے کے بعد لڑکیوں کا چہرہ دیکھنے کے قابل نہیں رہتا لیکن اس لڑکی کا حسن مزید نکھر جاتا تھا۔

بیڈ پر جانے سے پہلے وہ کسی سے فون پر رابطہ ضرور

قائم کرتی تھی- اس لڑکی کا نام لوسی تھا اور سونے سے پہلے ہی فون کرتی تھی- نہ اس سے پہلے اور نہ بعد میں- چوں کہ فون کرتے وقت لوسی کی پشت اس کی طرف ہوتی تھی اس لیے وہ اس کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ پاتا تھا- البتہ جب وہ فون کا ریسیور کریڈل کرتی تھی تو اسے ایک خاص ادا سے تھپتھپانے لگتی تھی- جب وہ کھڑکی کی طرف گھومتی تھی تو مسکرا رہی ہوتی-

وہ جانتا تھا کہ لوسی اپنے کسی بوائے فرینڈ کو فون کرتی ہے- وہ اتنے محتاط تھے کہ کوئی انہیں پکڑ نہیں سکتا تھا- مگر اس نے پکڑ لیا تھا- وہ اس کے نزدیک کیوں نہیں آرہی ہے اور اسے کیوں دھتکار رہی ہے- محض اس لیے کہ وہ پہلے سے کسی سے عشق لڑا رہی ہے-

اس نے سوچا کہ وہ لوسی سے آخری بار لنچ کے لیے درخواست کرے گا- اور جب وہ انکار کرے گی تو وہ اس کے عاشق سمیت اسے موت کے منہ میں دھکیل دے گا-

اگلے روز شام کو جب چھٹی ہوگئی تو اس نے لوسی کو اپنی کار میں گھر چھوڑنے کی پیشکش کی لیکن وہ ٹال گئی- اس کا کہنا تھا کہ وہ مضافات میں اپنی سہیلی برتھا کے ہاں جارہی ہے-

اسے معلوم تھا کہ لوسی جھوٹ بول رہی ہے-

رات وہ اپنے اپارٹمنٹ میں موجود تھی اور اپنے عاشق سے گفتگو کر رہی تھی- اس نے اپنی رائفل فرش سے اٹھالی اور اسے لوڈ کرنے لگا- پولیس کی ملازمت چھوڑنے کے بعد سے اب تک اسے رائفل چلانے کا موقع نہیں ملا تھا- لیکن وہ ایک اچھا نشانے باز تھا اور اسے انعامات ملا کرتے تھے-

اس نے سوچا کہ وہ لوسی کو اس وقت نشانہ بنائے گا جب وہ اپنے محبوب سے محو گفتگو ہوگی تاکہ اس کی ہسٹریائی چیخیں سن کر اس کا محبوب دیوانہ ہوجائے-

اس نے رائفل کو کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھ دیا اور دوربین لگا کر لوسی کے اپارٹمنٹ کی طرف دیکھا- وہ اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہی فون کر رہی تھی- اس نے رائفل اٹھائی اس کا دستہ اپنے شانے سے لگایا- شست پر نگاہ جمائی اور ٹریگر دبا دیا.....

☆☆☆

کیرولین فوڈ کمپنی نے سبزیوں کے ڈبوں پر خاص رعایت کا اعلان کیا تھا اس لیے لوگ ٹوٹے پڑ رہے تھے- اس لیے لوسی عام دنوں کے مقابلے میں آج کچھ زیادہ ہی تھکن محسوس کر رہی تھی- لوبیا کے ڈبے کے ساتھ ٹماٹر کی چٹنی کی چھوٹی شیشی مفت دی جارہی تھی اس لیے لوگ اسے زیادہ طلب کر رہے تھے-

لوسی جب گھر واپس آئی تو وہ تھکن سے چور ہوچکی تھی- شادی سے پہلے سے وہ کالاہان سپر مارکیٹ میں کام کرتی تھی اور رعایتی سیل والے دن اسے پریشانی اٹھانا پڑتی تھی- شادی کے ایک سال تک اس نے پر لطف زندگی گزاری مگر جب اس کے شوہر کو جبری بھرتی کرنے کے بعد ویت نام بھیج دیا گیا تو اس کی زندگی میں بے کیفی آگئی-

اس کا کام زیادہ محنت والا نہیں تھا مگر مسلسل کھڑے ہونے کی وجہ سے اس کی ٹانگیں درد کرنے لگتی تھیں- ساتھی لڑکیاں اور لڑکے اس کے ساتھ تعاون کرتے تھے- انہیں معلوم تھا کہ اس کے شوہر کو ویت نام بھیج دیا گیا ہے- وہ اس سے خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے- مارکیٹ کا منیجر ایک بوڑھا شخص تھا- وہ دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتا تھا مگر رش کے اوقات میں اپنے آفس سے نکل آتا تھا اور کارکنوں کی مدد کیا کرتا تھا- مثال کے طور پر کسی کے ہاتھ سے شربت کی بوتل گر جائے تو وہ شیشے کے ٹکڑے ڈسٹ بن میں ڈال کر خود صفائی کر دیتا تھا- بعض اوقات شاپر ختم ہوجاتے تو وہ شاپروں کی تھیلی اٹھا کر اسٹور سے خود لے آتا- کوئی سیلز گرل نوٹ گننے میں دشواری محسوس کر رہی ہوتی تو

وہ نوٹ گن دیتا-

مگر جب اس نے ابتدا میں لوسی کو اپنے ساتھ گھومنے پھرنے اور پھر لنچ پر چلنے کی دعوت دی تو لوسی کو عجیب سا معلوم ہوا- اس نے مختلف بہانے بنا کر انکار کر دیا- ایک بار اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ اس کا شوہر ویت نام گیا ہوا ہے اس لیے وہ اس کی عدم موجودگی میں کوئی نازیبا حرکت نہیں کر سکتی- پھر اس نے کئی بار اسے اپنی کار میں گھر چھوڑنے کی پیشکش کی لیکن اس نے خوش اسلوبی سے ٹال دیا-

وہ جس اپارٹمنٹ میں رہتی تھی وہ قصبے کے دوسرے سرے پر تھا- فلیٹ صاف ستھرا تھا اور اس کا کرایہ بھی معقول تھا- اس اپارٹمنٹ کا مالک اور اس کی بیوی اچھی طبیعت کے مالک تھے اور اس کے پاس آتے رہتے تھے- اس کے ساتھ کافی بھی پی لیتے تھے- اسے اپنے مشوروں سے نوازتے رہتے تھے- مثال کے طور پر انہوں نے کئی بار مشورہ دیا تھا کہ وہ سونے سے پہلے ساری کھڑکیوں کے پردے گرا دیا کرے- مگر لوسی سوچتی تھی کہ اس طرف تو ایک گودام ہے جس کی کھڑکیاں اور دروازے تاریک رہتے ہیں اگر کھڑکیوں پر شیڈ نہیں ہے تو کیا فرق پڑتا ہے؟ البتہ ڈرائنگ روم کی کھڑکیوں سے دوسرے اپارٹمنٹ کا سامنا ہوتا تھا اس لیے وہ پردے گرا دیتی تھی-

وہ چوں کہ تھکی ہوئی تھی اس لیے معمول سے پہلے سونا چاہتی تھی- بیڈ پر جاتے وقت وہ ریڈیو سن لیتی، اخبار یا میگزین پڑھ لیتی تھی- مگر اس وقت اس کی طبیعت کسی کام میں نہیں لگ رہی تھی-

وہ ہفتے میں ایک بار اپنے شوہر کو خط بھی لکھا کرتی تھی- مگر آخری خط دو روز پہلے لکھ چکی تھی اس لیے اب اسے صرف ڈنر کرنا تھا- اس نے کھانا کھالیا اور اس کے بعد برتن دھو کر دودھ گرم کرنے لگی- سونے سے پہلے وہ دودھ ضرور پیتی تھی-

دودھ گرم کر کے اس نے گلاس میں انڈیلا اسے خواب گاہ میں جا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور پھر باتھ روم میں جا کر اپنا چہرہ صاف کیا- اور ہلکی سی کریم مل کر بیڈ روم میں آگئی- صبح کام پر جاتے وقت جلدی ہوتی تھی اس لیے وہ رات ہی کو لباس کا انتخاب کر لیتی تھی-

دودھ کے گلاس سے اس نے ایک چسکی لی اور پھر فون کا ریسیور اٹھا لیا- یہ اس کے معمولات میں سے آخری آئٹم تھا اس کے بعد وہ اپنے شوہر کی تصویر کو پیار کر کے سو جاتی تھی- ٹیلی فون اس نے اس وقت سے کرنا شروع کیے تھے جب سے اس کا ریڈیو خراب ہوگیا تھا- ریڈیو پر وہ محکمہ موسمیات کی پیشن گوئیاں سن لیتی تھی اور اگلے روز اس کے مطابق اپنے معمولات میں تبدیلی کر لیتی- مثال کے طور پر ابر آلود ہونے کی پیش گوئی ہوتی تو وہ گرم لباس نکال لیتی- بارش ہونے کے متعلق کچھ کہا جاتا تو وہ اسٹور جاتے وقت چھتری لے لیتی-

محکمہ موسمیات کو فون کرنے پر ایک پیاری، دلکش نسوانی آواز سنائی دیتی تھی- وہ لڑکی اب اس سے مانوس ہوگئی تھی اور نجی گفتگو بھی کرنے لگی تھی- لوسی اس سے شکایت بھی کرتی کہ اس نے آج کے بارے میں جو پیشن گوئی کی تھی موسم اس کے برعکس نکلا- پھر جب وہ ریسیور کریڈل کرتی تو پہلے اس کا شکریہ ادا کرتی اور اس کے بعد فون تھپتھپانے لگتی-

اس رات اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا- اس کی پشت ویران گودام کی طرف تھی- اس نے فلیٹ کے مالک کے مشورے کو نظر انداز کرتے ہوئے کھڑکی کا پردہ نہیں گرایا تھا- اس روز کھڑکی کا شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا اور پھر اس نے اپنی پیٹھ میں دل کے مقام پر کوئی گرم چیز داخل ہوتی محسوس کی- ریسیور اس کے ہاتھ سے گر گیا اور وہ لہرا کر فرش پر گر گئی-

☆☆☆

دہرا مذاق

شکیل صدیقی

''مجھے چیلنج مت کرو-'' رونالڈ نے میز پر ہاتھ مار کر کہا- ''ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے- اگر میں اپنی بات سچ ثابت نہیں کر سکا تو اپنی ساری جائداد تمہارے نام کر دوں گا-''
''ٹھیک ہے- میں تم سے شرط لگانے کو تیار ہوں-'' فاربس نے غصہ دلانے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا-''اور اس سلسلے میں ایک ڈالر ہارنے کو تیار ہوں-'' ان کے درمیان ایک دلچسپ بحث کا آغاز ہو گیا- ہم سب محظوظ ہوتے رہے- رونالڈ زیادہ ہی برہم ہو گیا- اس نے اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر میز پر ڈال دی اور درشت لہجے میں بولا-''اگر میں اپنی بات ثابت نہ کر سکا تو یہ رقم ہارنے کو تیار ہوں-''

دو شاطروں کے شاطر ذہنوں کی دلچسپ روداد

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں فرنیچر تیار کرنے والی مشہور کمپنی فنارا میں ملازم تھا اور آرڈر بک کرنے کے لیے مختلف شہروں کے چکر کاٹتا پھرتا تھا- کمپنی نے مجھے اس مقصد کے لیے ایک کار دے رکھی تھی اور پٹرول کا الاؤنس بھی مقرر تھا- اس روز سہ پہر کو جب میں قصبہ نارتھ ویلی پہنچا تو بارش شروع ہو گئی جس نے تھوڑی سی دیر میں موسلا دھار کی صورت اختیار کر لی- فضا میں چاروں طرف دھند سی چھا گئی اور راستے کا تعین کرنا دشوار ہو گیا- میں نے سوچا میں کسی مناسب سی جگہ پناہ لے لوں تاکہ جب بارش تھم جائے تو دوبارہ سفر شروع کروں-

بالآخر مارکیٹ ایریا کے قریب مجھے ایک شراب خانے کا سائن بورڈ نظر آ گیا- میں نے اپنی کار پارکنگ ایریا میں کھڑی کی اور دروازہ لاک کر کے شراب خانے کی طرف بڑھ گیا- اس کا دروازہ کچھ اس انداز سے بنا تھا کہ باہر سے آنے والا شراب خانے میں بیٹھے افراد کو نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اندر بیٹھے ہوئے افراد باہر سے آنے والوں کو بہ خوبی دیکھ سکتے تھے- میں نے پارکنگ ایریا میں ایک سیاہ بائیسکل اور ڈبلیو بی ایم کار کھڑی دیکھی-

شراب خانے میں بیٹھے افراد لنچ سے فارغ ہو چکے تھے اور اب وقت گزاری کے لیے وہسکی پی رہے تھے- بارش مسلسل ہو رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آئندہ دو گھنٹے تک ایسی ہی جھڑی لگی رہے گی- میں جس میز پر بیٹھا تھا اس کے سامنے والی میز پر ایک پیلے چہرے اور دھنسی ہوئی آنکھوں والا نوجوان بیٹھا پی رہا تھا اور زیر لب بڑبڑاتا بھی جا رہا تھا- اس کی میز پر چار افراد اور بھی بیٹھے تھے- نوجوان کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس کا نام

فاربس ہے اور وہ مقامی یونیورسٹی کے ہاسٹل میں رہتا ہے- اس کا جام خالی ہو چکا تھا اس لیے اس نے ویٹر کو بلایا اور اپنا جام بھرنے کا آرڈر دیا-

اسی میز پر ایک اور بردبار اور حلیم الطبع شخص رونالڈ بھی بیٹھا تھا وہ بھی کبھی کبھار ان لوگوں کی گفتگو میں شریک ہو جاتا تھا- اس کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ افریقہ اور ہندوستان کے بیشتر مقامات کی سیر کر چکا ہے اور اسے زندگی کا وسیع تجربہ ہے-

گفتگو کے دوران معلوم نہیں کیسے وچ ڈاکٹروں کا موضوع آ گیا- رونالڈ کا کہنا تھا کہ وچ ڈاکٹر روحوں سے گفتگو کرتے ہیں اور جادو کے ذریعے سے لوگوں کا علاج کرتے ہیں- لیکن وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں پر بے یقینی تھی- صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کسی کو اس کی بات پر اعتبار نہیں آیا- یہ چیز رونالڈ نے بھی محسوس کر لی- اس کا چہرہ غصے سے متغیر ہو گیا- اس نے گونجیلے لہجے میں کہا-''میں نے وچ ڈاکٹروں سے یہ فن سیکھا ہوا ہے اور میں اس وقت بھی چاہوں تو روح کو بلا کر اس سے گفتگو کر سکتا ہوں-''

اس نے وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی- فاربس کی نگاہ میں اس کے لیے تمسخر اور توہین تھی- رونالڈ نے یہ بات محسوس کر لی- وہ ناراضی سے بولا- ''اگر کسی کو یہ شبہ ہے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں تو وہ اس کی آزمائش کر سکتا ہے؟ اس کا لہجہ چیلنج کرنے والا تھا-

''مجھے روحوں پر سو فیصد یقین نہیں ہے- مگر بہر حال یہ چیزیں کچھ نہ کچھ حقیقت رکھتی ہوں گی جب ہی تو لوگ اس کا تذکرہ کرتے ہیں، مگر تم کسی روح کو کیسے طلب کر سکتے ہو-''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں-'' رونالڈ نے ناگواری سے کہا-

''میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں- مگر مجھے بھوت پریت پر یقین نہیں ہے- ویسے میں نے ایک رات بھوت گھر میں گزاری ہے اور پہلا انعام حاصل کیا ہے-''

''مجھے چیلنج مت کرو-'' رونالڈ نے میز پر ہاتھ مار کر کہا- ''ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے- اگر میں اپنی بات سچ ثابت نہیں کر سکا تو اپنی ساری جائداد تمہارے نام کر دوں گا-''

''ٹھیک ہے- میں تم سے شرط لگانے کو تیار ہوں-'' فاربس نے غصہ دلانے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا-''اور اس سلسلے میں ایک ڈالر ہارنے کو تیار ہوں-''

ان کے درمیان ایک دلچسپ بحث کا آغاز ہو گیا- ہم سب محظوظ ہوتے رہے- رونالڈ زیادہ ہی برہم ہو گیا- اس نے اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر میز پر ڈال دی اور درشت لہجے میں بولا-''اگر میں اپنی بات ثابت نہ کر سکا تو یہ رقم ہارنے کو تیار ہوں-''

''ٹھیک ہے- میں بھی تم سے ایک ڈالر ہارنے کو تیار ہوں-'' فاربس نے استہزائیہ انداز سے کہا-

رونالڈ ایک بار پھر غصے میں آ گیا- اس کے چہرے کے عضلات میں کھنچاؤ پیدا ہو گیا- ہم لوگ ان کے درمیان ہونے والی بحث میں پوری طرح سے دلچسپی لے رہے تھے-''اگر تم نے مجھے اپنی شعبدہ بازی سے متاثر کر دیا تو یہ رقم تمہاری-'' نوجوان فاربس نے کہا اور اپنا پرس نکال کر پانچ پانچ ڈالر والے تین نوٹ نکال کر میز پر ڈال دیے-

''ان پندرہ ڈالروں کا میں کیا کروں گا؟'' رونالڈ نے کہا اور اس کے نتھنے پھولنے پچکنے لگے- اس کے انداز میں واضح حقارت تھی-

''میں اس رقم کو دوگنا کر دوں گا-'' کسی طرف سے ایک آواز آئی-'' مگر اس وقت جب کہ میں اپنی آنکھوں سے روح کو یہاں آتا دیکھ لوں گا-''

تھوڑی سی دیر میں سب لوگ اس معاملے میں دلچسپی لینے لگے- جب رونالڈ نے شکایت کی کہ فاربس کی رقم کم ہے تو لوگوں نے رضا کارانہ طور پر اپنے پرس کھول کر ایک ایک دو دو ڈالر میز پر پھینکنا شروع کر دیے- تھوڑی دیر میں میز پر خاصی رقم جمع ہو گئی-

اس رقم کو گننے کے بعد رونالڈ نے اپنی گڈی سے اتنی ہی رقم نکالی اور پھر ساری رقم شراب خانے کے مالک-

حوالے کردی کہ جو شخص جیت جائے رقم اس کے حوالے کردی جائے۔

تھوڑی دیر بعد یہ الجھن پیدا ہوگئی کہ رونالڈ ''روح کو کہاں طلب کرے گا؟ اس لیے کہ روح کو اٹھتے بیٹھتے ہر جگہ طلب نہیں کیا جاسکتا۔ شراب خانے کے مالک نے کہا کہ اس کا گودام زمین دوز ہے اور وہ اس کا ایک کمرہ خالی کرسکتا ہے۔ لوگوں نے اس کی یہ بات قبول کرلی۔

پندرہ منٹ میں ایک کمرہ خالی ہوگیا۔ وہاں ایک میز اور بہت سی کرسیاں لگادی گئیں۔ سب چیزوں کو اچھی طرح سے چیک کرلیا گیا کہ اس سے رونالڈ کوئی شعبدہ نہ دکھادے۔

فاربس نے تہ خانے کا دروازہ اندر سے بند کرلیا اور ایک کرسی پر گر کر اس لمحے کا انتظار کرنے لگا۔ جب کہ رونالڈ روح کو طلب کرے گا۔

رونالڈ نے ماحول پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور کہا۔ ''اگر کھڑکیوں اور دروازوں پر پردے ڈال دیے جائیں تو مناسب رہے گا۔ اس کی خواہش پر عمل کیا گیا اور پھر اس کی ہدایت پر تہ خانے کا بلب بھی بجھادیا گیا۔ اس کے بعد رونالڈ نے دروازے پر چاک سے چند آڑی ترچھی لکیریں کھینچیں اور پھر کچھ بڑبڑانے لگا۔ رفتہ رفتہ اس کی بڑبڑاہٹ بلند ہوتی چلی گئی۔ پھر وہ بلند آواز میں کسی ایسی زبان کے الفاظ ادا کرنے لگا جو ہمارے لیے نامانوس تھی۔ مگر ہم سب محسوس کررہے تھے کہ رونالڈ خوف زدہ ہے اور اب اس کی آواز میں کپکپاہٹ پیدا ہوگئی ہے۔

اس کے علاوہ ہم یہ بھی محسوس کررہے تھے کہ فاربس بے چینی اور بے اطمینانی سے اپنی جگہ پر پہلو بدل رہا ہے۔ نوجوانی میں حالاں کہ لوگ نڈر اور بے خوف ہوتے ہیں لیکن اس کی کمزور دلی سب پر عیاں ہوچکی تھی۔

پھر اچانک ہی رونالڈ خاموش ہوگیا اور تہ خانے میں سناٹا چھا گیا۔ صرف اس کے گہرے گہرے سانس لینے کی آوازیں آرہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پھٹی پھٹی غیر انسانی آواز میں کہا۔ ''آؤ.... آؤ خوش آمدید.... کیا حال ہیں؟''

''اچھا ہوں۔'' ایک نامانوس آواز نے جواب دیا۔ آواز ہمیں بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔ ''یہ تم نے مجھے بلانے سے پہلے دھویں کا خیال نہیں رکھا؟ میں دروازے کے ہول سے دھویں کی لکیر نکلتے دیکھ رہا ہوں۔''

ہم سب چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ وہاں کوئی بھی سگریٹ نہیں پی رہا تھا پھر نو وارد نے کی ہول سے دھواں نکلتے کیوں دیکھ لیا تھا؟ کہیں دور سے سسکیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ جو بتدریج بلند ہوتی چلی جارہی تھیں پھر ایک کرخت اور غیر انسانی آواز نے کہا۔ ''آوں.... اوہ.... دروازے میں ایک جھری بھی ہے کیا میں اس سے داخل ہوجاؤں؟''

میں نے اس آواز کو نہایت غور سے سنا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ آواز رونالڈ کی نہیں ہوسکتی۔ وہ آواز مسرت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ''ارے یہاں تو ٹھنڈک ہے بے پناہ ٹھنڈک!''

روح ابھی تک ہمیں دکھائی نہیں دی تھی۔ ہم اس کی آوازیں ہی سن رہے تھے۔ ہم میں سے ہر شخص جانتا تھا کہ یہ محض شعبدہ بازی بھی ہوسکتی ہے۔ عموماً شعبدہ باز حلق سے ایسی آوازیں نکال لیتے ہیں جو دور سے آتی محسوس ہوتی ہیں۔ وہ لہجے اور آوازیں بدلنے پر بھی قادر ہوتے ہیں۔ ہم اس تذبذب میں مبتلا تھے کہ اسے کیا سمجھیں کہ اچانک ہی فاربس نے ہیجانی آواز میں چیخنا شروع کردیا۔ ''اوہ خدایا میں اس کا چہرہ دیکھ رہا ہوں.... حیرت انگیز.... رونالڈ مائی ڈیئر یہ تم نے کیسے کیا؟''

اس کی بات سن کر ہم سب کو حیرت ہوئی اور ہم ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ مگر کسی کو کچھ نظر نہ آسکا۔ فاربس روح کو دیکھ رہا تھا مگر ہمیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''یہ.... یہ کون چیخ رہا ہے۔'' وہی پھٹی پھٹی سی آواز آئی۔ ''میں اس کے جسم کی گرمی محسوس کررہا ہوں۔ میں

اس کا ہاتھ بھی تھام سکتا ہوں۔''

''نہیں.... نہیں.... میرے نزدیک نہ آنا.... ورنہ میں یہ کرسی تم پر کھینچ ماروں گا۔'' فاربس نے مرتعش لہجے میں کہا۔ ہم سب تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے مگر کوشش کے باوجود کوئی ہیولا تک نظر نہیں آرہا تھا۔ ''وہ روح کہاں ہے؟'' ہم سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے یہ سوال کررہے تھے۔ ''کیا تمہیں کچھ نظر آرہا ہے؟''

''یہ تو مجھے پکڑنے کی کوشش کررہی ہے۔ اوہ.... اوہ اس سے کہو کہ مجھ سے دور رہے۔'' فاربس نے چیختے ہوئے کہا۔ پھر وہ ہیجانی طور پر دروازے کی طرف لپکا اور اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ جب اس سے دروازہ نہیں کھلا تو وہ اس پر مکے برسانے لگا۔ ''مجھے باہر جانے دو.... میں باہر جانا چاہتا ہوں۔'' وہ کانپتی آواز میں کہہ رہا تھا۔ پھر جیسے اس پر نقاہت طاری ہوگئی یا پھر اس کے اعصاب جواب دے گئے اور وہ دروازے کے قریب بے ہوش ہوکر گر پڑا۔

''احمق.... بے وقوف۔'' رونالڈ نے چیخ کر کہا پھر دروازہ کھول دیا اور کھڑکیوں کے پردے کھینچ دیے۔ کھڑکی سے آنے والی ہلکی روشنی میں میں نے فاربس کو فرش سے اٹھتے دیکھا۔ بہت سے لوگ دروازے سے نکل کر راہداری میں گئے اور پھر اوپر جاکر شراب خانے میں بیٹھ گئے۔

فاربس کے لیے وہسکی منگوائی گئی۔ شراب خانے کے مالک نے نوٹوں کا ایک بنڈل رونالڈ کی طرف بڑھادیا۔ رونالڈ نے محجوب نظروں سے ہماری طرف دیکھا اور کہا۔ ''حضرات اس رقم میں آپ لوگوں کا حصہ ہے۔ اور فاربس اس رقم کو تقسیم کرسکتا ہے۔ اس نے اس وقت بہترین اداکاری کی ہے۔ ہمیں وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوسکا.... مگر وہ ہے کہاں؟'' رونالڈ حیرت سے اس کی خالی کرسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب کہ اس کا گلاس بھرا ہوا میز پر موجود تھا۔ معلوم نہیں وہ کب چپکے سے وہاں سے چلا گیا تھا۔ پورچ میں جو اس کی نیلی سائیکل کھڑی تھی وہ بھی اب غائب تھی۔

''وہ کہاں چلا گیا؟'' رونالڈ نے پریشانی سے کہا۔ ''اسے اپنی رقم لیے بغیر نہیں جانا چاہیے تھا۔ میں اس رقم کو اپنے پاس رکھ کر کیا کروں گا۔ میں تو یوں ہی مذاق کررہا تھا ورنہ بارش رکنے کا انتظار کرتے کرتے ہم سب بور ہوجاتے۔''

سب لوگ اس طرح سے سوچ رہے تھے کہ فاربس کو واقعی یوں نہیں جانا چاہیے تھا۔ کم از کم وہ بتاتو دیتا۔

''میرا خیال ہے کہ وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔ مجھے چاہیے کہ جاکر اسے بلالاؤں۔'' رونالڈ نے کہا۔ پھر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر گیا اور اپنی کار میں بیٹھ کر سڑک کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ نگاہوں سے اوجھل ہوچکا تھا۔

بارش ابھی تھمی نہیں تھی لیکن ہلکی ہوچکی تھی۔ مگر ہم ابھی اپنی جگہوں سے نہیں اٹھ سکتے تھے اس لیے کہ باہر دھند تھی جو بتدریج چھٹ رہی تھی۔

اب ہم بے چینی سے رونالڈ اور فاربس کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ ہر شخص کی نگاہ دروازے پر جمی تھی۔ گزرنے والا ہر ایک لمحہ ہمیں بہت دشوار لگ رہا تھا۔ ہم بہ دستور ان کا انتظار کرتے رہے۔ ہلکی سی آہٹ اور گاڑی کی آواز پر ہم توقع کرنے لگتے کہ اب وہ دونوں واپس آنے والے ہوں گے۔ مگر مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا۔

''اٹھارہ منٹ!'' ایک شخص نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھ کر اعلان کیا۔ ''ان لوگوں کو گئے ہوئے اٹھارہ منٹ ہوچکے ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ اب ان لوگوں کا انتظار فضول ہے۔'' دوسرے نے مایوسی سے کہا۔ ''ان لوگوں نے مذاق میں آٹھ سو ڈالر ہماری جیبوں سے نکلوالیے ہیں۔''

''تیسرے نے ہنس کر کہا۔ ''ہم بیٹھے بٹھائے احمق بن گئے۔''

☆☆☆

شجرہ نسب

ذوالنورین

جب اسے ترقی دی گئی تھی تو اس سے پہلے چپراسی اسے ایک لفافہ دے گیا تھا جس میں اس کا شجرہ نسب تھا۔ ڈک اسے پڑھ کر بہت حیران ہوا۔ جس نے وہ رپورٹ مرتب کی تھی اس نے مبارکباد دینے کے بعد لکھا تھا۔ ''آپ کے آبا بجد ادبڑی خوبیوں کے مالک تھے۔'' اس شجرے میں اس کی چوتھی پشت کے حالات تھے۔

جرم آدم نے کیا اور نسلِ آدم کو سزا

ڈک کو یہ پہلے سے معلوم تھا کہ فاربس کیمیکل کمپنی میں
مت حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے، مگر
ں کے وہم وگمان میں نہیں تھا کہ ملازمت سے پہلے جو
نامہ اسے دیا جائے گا وہ اتنا احمقانہ ہوگا کہ اس کا دل
ہ کپڑے پھاڑ لینے کو چاہے گا۔
سے یہ بھی معلوم تھا کہ بڑی کمپنیاں اپنے ملازمین کی
ن پھٹک کے لیے ایسے سوالات کرتی ہیں جو بظاہر
نہ لگتے ہیں مگر ان کے پس پردہ اہم باتیں ہوتی ہیں۔

وہ سوالنامے سینکڑوں ماہر نفسیات ترتیب دیتے ہیں۔ اس سے کمپنی کو معلوم ہو جاتا ہے کہ امیدوار کس اہلیت کا حامل ہے اور اسے کیسا عہدہ دیا جا سکتا ہے۔

بہت سے سوالات ایسے تھے جو اس کے نزدیک غیر ضروری تھے اور ان کے جوابات سے کوئی خاص بات سامنے نہیں آ سکتی تھی۔ مثال کے طور پر سوالنامے کے دوسرے صفحے پر لکھا تھا۔ کیا آپ پیرا کی کے ماہر ہیں؟ کیا آپ کے خاندان میں گنجا پن عام ہے؟ کیا آپ کی

اہلیہ کے بالوں کا رنگ قدرتی ہے؟

ڈک کو معلوم تھا کہ فاربس کیمیکل کمپنی کا کاروبار سارے ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ اور ملٹی نیشن کمپنی ہے اس لیے اس میں ترقی کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ فارم پر کرتے وقت کئی بار اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے لیکن اس نے خود پر قابو پا لیا اس لیے کہ سامنے والے بوتھ میں کمپنی کے کئی عہدے دار اسے دیکھ رہے تھے۔ اگر اس کے چہرے پر منفی تاثرات ابھرتے تو وہ اس کے بارے میں غلط فیصلہ کر سکتے تھے۔ آگے کچھ ایسے سوالات تھے۔ کیا آپ کبھی گرفتار ہوئے ہیں؟ آپ کے ڈیڈی کیا کرتے تھے؟ کیا وہ کسی مجرمانہ فعل میں ملوث تھے؟ آپ کو اپنی دادی یا پردادی کے مجرمانہ فعل کے بارے میں معلوم ہے؟

ڈک کا خیال تھا کہ کمپنی والے اپنی حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔ اسے چاہیے کہ وہ سوالنامہ پھاڑ کر ہوا میں اڑا دے اور وہاں سے چلا جائے لیکن سامنے ہی مسٹر بیکر کا چہرہ دیکھ کر اس کا حوصلہ پست ہو گیا۔ وہ ایک خوش پوش اور تعلیم یافتہ شخص تھا۔ لوگ اس کے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے۔ اس لیے وہ ہر طرح سے اس کے معیار پر پورا اترنا چاہتا تھا۔

اس نے کسی نہ کسی طرح سے سوالنامہ پر کیا اور پھر مسٹر بیکر کے حوالے کر دیا۔ اس کا انٹرویو لیا گیا اور پھر وہ گھر آ گیا وہ خوش آئند خیالات میں مگن تھا۔

ایک ہفتے کے بعد کمپنی کی طرف سے اسے خط ملا کہ کمپنی کے صدر اس کا انٹرویو لیں گے۔ ڈک یہ سن کر حیران رہ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ معمولی قسم کا انٹرویو تو مسٹر بیکر بھی لے سکتے تھے اس کے لیے صدر کو زحمت دینے کی کیا ضرورت تھی؟

کمپنی کے صدر مسٹر برکلے کا آفس پچاس منزلہ عمارت کی سب سے اوپری منزل پر تھا۔ وہاں دبیز اور نرم قالین بچھے تھے جن پر چلنے کے دوران پاؤں دھنستے تھے۔

قد آدم شیشے کی کھڑکیاں تھیں جن سے سارے شہر کا منظر دکھائی دیتا تھا۔

برکلے ایک گھومنے والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ وہ ایک قوی ہیکل شخص تھا جس کے شانے بہت مضبوط تھے۔ اس کا جسم قدرے بھاری تھا۔ وہ بہترین تراش خراش کا قیمتی سوٹ پہنے تھا۔ اس کی عمر تقریباً ساٹھ سال تھی مگر آواز گونج دار تھی۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت ایسی تھی کہ رعب طاری ہوتا تھا لیکن ڈک اس سے مرعوب نہیں ہوا۔ برکلے نے تھوڑی دیر تک اسکا جائزہ لیا اور پھر سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''تم مجھے کام کے آدمی لگتے ہو۔''

''شکریہ جناب۔'' ڈک بولا۔

''تم نے سوالنامہ پر کرتے وقت نہایت عجیب محسوس کیا ہوگا، مگر ہم امیدواروں کا انتخاب کرتے نہایت احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ میرے نزدیک قابلیت کے ساتھ ساتھ خاندانی پس منظر کا درست ہونا بھی ضروری ہے۔ دادی اور پردادی والا سوال پڑھ کر تمہیں کچھ عجیب سا محسوس نہیں ہوا؟''

''جی۔ محسوس ہوا تھا۔''

''یہ سوالات میری طرف سے دیے گئے ہیں، تاکہ امیدواروں کا حسب نسب معلوم ہو جائے۔ میں نے یہ فرض کر رکھا ہے کہ حرام کی کمائی پر پلنے والے بچے نیک نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح سے ڈاکو کے گھر پر ڈاکو ہی جنم لیتے ہیں۔''

''جی ہاں جناب۔''

''براخون ظاہر ہو کر رہتا ہے۔''

''جی ہاں جناب۔''

''ابھی تو تمہیں ابتدائی ذمے داریاں سونپی جا رہی ہیں، لیکن بعد میں جب تم اعلیٰ عہدوں پر فائز کیے جاؤ گے تو ہم ماہرین سے تمہارا شجرہ نسب معلوم کریں گے اور اسکے مطابق تمہیں ترقی دیں گے۔''

ڈک ہاں ہوں کر رہا تھا مگر ساتھ ہی برکلے کے

نظریات پر لعنت بھیج رہا تھا- اسے معلوم تھا کہ کوئی شخص اتنا اعلیٰ ارفع نہیں ہوسکتا کہ اس سے کوئی غلطی نہ ہو-

برکلے نے جیسے اس کے خیالات پڑھ لیے- وہ بولا- مگر ہم چھوٹی موٹی غلطیوں کو نظر انداز کردیتے ہیں- لیکن یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کے خاندان والوں نے کسی بڑے جرم کا ارتکاب کیا تھا تو ہم اسے ملازمت سے نکال دیتے ہیں-"

"مجھے اپنے خاندان پر مکمل بھروسہ ہے جناب-" ڈک نے جواب دیا- اسے معلوم تھا کہ کمپنی کو جناب صدر مسٹر برکلے کے نظریات کے مطابق نہیں چلایا جاسکتا- ویسے بھی کمپنی میں جتنے ملازمین ہیں کیا ان کے خاندنی پس منظر سے واقفیت حاصل کرلی گئی ہے؟ اگر کرلی گئی ہے تو کہاں تک؟ اسے تو خود اپنے پردادا اور اس سے پہلے کے لوگوں کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ہیں-

برکلے نے جیسے اس کے خیالات پھر پڑھ لیے وہ بولا- "اس سلسلے میں ہم اپنے ماہرین کے شکر گزار ہیں- وہ ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور نہایت عجیب طریقوں سے کسی شخص کے بارے میں اور اسکے خاندان کے بارے میں معلومات اکٹھا کرتے ہیں- اس معاملے میں ہمیں کبھی ناکامی نہیں ہوئی-" اس نے قدرے توقف کے بعد دوبارہ کہا- "ہمارے بعض امیدواروں کے بارے میں ماہرین نے گیارہویں صدی تک کی معلومات فراہم کردی ہیں- وہ لوگ جن کا خاندان پاک صاف ہے وہ مزے سے ملازمت کررہے ہیں- خون خراب ہو یا اچھا ضرور رنگ لاتا ہے-"

"میں آپ کے نظریات سے متفق ہوں جناب-"

"تمہارے دادا نے نہایت شریفانہ زندگی گزاری تھی- تمہارے جیسے آدمی کو ہم جو عہدہ دینے والے ہیں اس کے لیے یہ کافی ہے- اب تم استقبالیہ پر جاکر باقی معلومات حاصل کرلو-"

مسٹر برکلے کے آخری جملے سے ڈک نے اندازہ لگالیا کہ اسے صدر نے کمپنی کے لیے منتخب کرلیا ہے-

اگلے روز سے اس نے اپنا کام سنبھال لیا اور تیزی لوگوں سے تعلقات پیدا کرنا شروع کردیے- وہ سے ترقی کرکے اونچے عہدے پر پہنچنا چاہتا تھا- اس کہ اگر وہ سست رفتاری سے قانون اور ضابطوں مطابق کام کرتا تو اس بات کا قوی امکان تھا کہ وہ مناسب عہدے پر تیس سال میں پہنچ پاتا- پھر اس کی عمر پچپن یا ساٹھ سال ہوجاتی- یہ اسے منظور نہیں وہ عین نوجوانی کی عمر میں ساری ترقیاں حاصل کرلینا تھا-

وہ جس شعبے میں تھا وہاں کمپنی کے استعمال میں والی مشینوں کا حساب رکھا جاتا تھا- پندرہ افراد اس سینئر تھے جنہیں پھلانگنے کے لیے ایک طویل عرصہ تھا- اس لیے وہ اپنے اسٹائل سے کام کرنا چاہتا تھا جانتا تھا کہ ان موٹی عقل والوں کی سمجھ میں اس کا کارنہیں آسکتا-

مسٹر کولیٹ چالیس سال کے ایک دیانت دار اور کارکن تھے جن کی ملازمت کو بارہ سال ہوچکے تھے ہونق ٹائپ تھے اور جلدی جلدی گفتگو کرنے کے تھے مگر اس کے باوجود انہیں یہ خوش فہمی تھی کہ وہ ایک کوئی بڑا عہدہ حاصل کرلیں گے- ڈک نے انہیں بنانے کا فیصلہ کیا- اس نے کولیٹ سے بے تکلفی کرلی-

جب ہنسی مذاق بڑھ گیا تو وہ اس کے ساتھ لنچ کے نزدیکی کیفے تک جانے لگا- اسکے بعد وہ اپنی بیوی ساتھ اس کے گھر آنے جانے لگا- پھر وہ اس سے کے کام کے بارے میں پوچھنے لگا- کولیٹ نے اس اعتماد کیا اور اسے اپنے شعبے کے اسرار و رموز سمجھانا شروع کردیے- اسے معلوم تھا کہ وہ ڈک سے سینئر ہے ڈک اس کے لیے کوئی پریشانی نہیں پیدا کرسکتا- وہ

"ڈک یہ میرے تجربات ہیں جو تمہارے لیے مشعل

ثابت ہوں گے-"

"ہاں- ضرور-" ڈک مسکرا کر جواب دیتا-

پھر اس نے کولیٹ کی فائلوں پر نگاہ رکھنا شروع کردی- آخر کار اس کے ہاتھ ایک کارآمد فائل آگئی- کولیٹ نے انکم ٹیکس کو بھیجنے کے لئے پینسل سے گاڑیوں کی قیمتوں کا تعین کیا تھا- یہ فائل مستقل رجسٹر میں چڑھانے کے لیے بھیجی جانی تھی- کولیٹ نے مہارت سے حساب کتاب تیار کیا تھا اور دستخط کردیے تھے- فائل کو لیون نے چیک کرکے اوکے کردیا تھا-

انکم ٹیکس کے اصول کے مطابق گاڑیوں کی قیمت ہر سال مقرر کی جاتی تھی- اور کمپنی اس کی شرح گھٹا دیتی تھی- اس لیے کہ وہ چیزیں استعمال کرلی جاتی تھیں- کم قیمت دکھانے پر انکم ٹیکس کم ادا کیا جاتا تھا-

ڈک نے ربر سے ان چیزوں کی قیمتیں مٹا کر پینسل سے ہی نئی قیمتیں لکھ دیں مگر اس طرح کہ انہیں پہلے سے بڑھا دیا- مثلاً ایک میز کی قیمت کولیٹ نے سات ہزار ڈالر رکھی تھی تو اس نے نو ہزار ڈالر کردیے-

اس کے بعد ڈک نے انتظار کیا- کولیٹ کے رجسٹر کا اندراج پکے رجسٹر میں کردیا گیا اور پھر اسے انکم ٹیکس آفس بھیج دیا گیا- ڈک اپنے شعبے کے انچارج مسٹر گروڈی کے کمرے میں چلا گیا اور اس نے مسکین سی صورت بنا کر اسے احوال سنادیا- وہ اچھل پڑا اور حیرت سے بولا-

"کولیٹ ایسی غلطی کیسے کرسکتا ہے؟"

"غلطی تو ہوچکی ہے جناب-" ڈک نے کہا- "بہتر تر ہوگا کہ ہم اسے دور کرلیں ورنہ پھر محکمہ انکم ٹیکس کو ہم پر اعتبار نہیں رہے گا-"

"ڈک تم نے یہ غلطی پکڑلی تمہارا شکریہ- حیرت اس بات پر بھی ہے کہ کمپنی کے ماہرین نے یہ غلطی کیوں نہیں پکڑی- یہ سب نکمے اور کام چور ہوگئے ہیں-" اس نے توقف سے کہا- "اور یہ اکاؤنٹ کس نے تیار کیا تھا؟"

"مسٹر کولیٹ نے-"

"وہ ایک ذمے دار شخص ہے اور بارہ سال سے دیانت داری سے اپنے فرائض انجام دے رہا ہے- معلوم نہیں اس سے یہ چوک کیسے ہوگئی-" وہ بولا-

ڈک ان کے کمرے سے نکل آیا- وہ معاملے کو طول نہیں دینا چاہتا تھا- اسے معلوم تھا کہ انکم ٹیکس والے خود ہی اس غلطی کو پکڑلیں گے- ایک ہفتے بعد انکم ٹیکس آفس سے دو آفیسر آگئے- پھر وہ شام تک حساب کتاب چیک کرتے رہے- گروڈی اس اثنا میں بے چینی سے اپنی سیٹ پر پہلو بدلتا رہا- پھر وہ متعلقہ افسران پر غصہ کرنے لگا- کولیٹ شرمندہ تھا کہ اس سے یہ غلطی کیسے ہوگئی-

ایک ہفتے بعد انچارج نے ڈک کو اپنے کمرے میں بلا کر کہا کہ کولیٹ بوڑھا ہوگیا ہے اور اس کے اعصاب کمزور پڑگئے ہیں بہتر ہوگا کہ وہ ٹیکس کی فائلیں خود سنبھال لے- یہ نئی ذمے داری وہ بہتر طور پر انجام دے سکے گا-

ڈک کو یقین ہوگیا کہ کولیٹ کی ترقی کے امکانات معدوم ہوگئے ہیں- اب اسے ایسے رنگین خواب نہیں دیکھنا چاہئیں-

ڈک نے چند مہینوں میں کولیٹ کا بیشتر کام سنبھال لیا- تو اسے ترقی دے دی گئی- وہ تندہی سے کام کررہا تھا اور اس کے ساتھ اس نے اپنے شعبے کے افراد کی جاسوسی بھی شروع کردی تھی- عملے کے افراد سے جو چھوٹی موٹی غلطیاں ہوجاتی تھیں انہیں وہ اپنے انچارج گروڈی کے علم میں لے آتا تھا- اس طرح سے وہ گروڈی کی آنکھ کا تارہ بنتا جارہا تھا اور رفتہ رفتہ اس کا اعتماد حاصل کررہا تھا-

جب اسے ترقی دی گئی تھی تو اس سے پہلے چپراسی اسے ایک لفافہ دے گیا تھا جس میں اس کا شجرہ نسب تھا- ڈک اسے پڑھ کر بہت حیران ہوا- جس نے وہ رپورٹ مرتب کی تھی اس نے مبارکباد دینے کے بعد لکھا تھا- "آپ کے آبا و اجداد بڑی خوبیوں کے مالک تھے-" اس شجرے میں اس کی چوتھی پشت کے حالات تھے-

اپنی کارکردگی کی بنا پر اس نے گروڈی کے باس اور

ویژن کے سربراہ مسٹر ہونز کی توجہ بھی حاصل کرلی ہے۔ ڈک ایک سال تک سر جھکائے کام کرتا رہا۔ پھر اس نے اعلیٰ عہدے تک پہنچنے کا فیصلہ کیا اور مسٹر گروڈی کے گرد ایک جال بن دیا۔

اس نے مشاہدہ کرکے یہ معلوم کرلیا کہ گروڈی کہاں جاکر لنچ کرتا ہے پھر اس نے ریستوراں کے مالک کو معقول سی رشوت دی اور اسے اپنے ساتھ ملالیا۔ ''یہ محض ایک مذاق ہے۔'' اس نے ریستوراں کے مالک سے کہا۔

''تم جو گولیاں اس کی چائے کی پیالی میں ڈالو گے وہ بے ضرر ہیں۔'' ان سے مسٹر گروڈی کو کوئی نقصان پہنچنے کا احتمال نہیں ہے۔''

ریستوراں کا مالک اس پر تیار ہوگیا۔

دوسرے روز گروڈی نے جاکر اس ریستوراں میں لنچ کیا پھر کافی پی اور آفس واپس آگیا۔ لیکن وہ کام نہیں کرسکا اس لیے کہ اسے نیند آنے لگی تھی۔ خواب آور گولی نے کام دکھایا اور وہ ایک گھنٹے تک اپنا سر میز سے ٹکائے سوتا رہا۔

اس دوران میں آفس کے تقریباً سارے لوگوں کو اس بات کا علم ہوگیا اور انہوں نے حیرت سے گروڈی کو دیکھا۔ اس لیے کہ وہ ایک اصول پسند شخص تھا اور اس سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ ایسی کوئی نادانی کرے گا۔

مگر سونے کا سلسلہ ایک روز بعد ختم نہیں ہوا۔ گروڈی روز ہی سونے لگا اور پھر وہ اس کا معمول بن گیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ ناشائستہ حرکت ہے۔ لوگوں نے اسے جگانا چاہا لیکن وہ اتنی گہری نیند سوتا تھا کہ اس کی آنکھ ہی نہیں کھلی۔ بات کھل گئی اور ہونز کے کانوں تک پہنچ گئی۔ اس نے شعبے میں آکر انہیں خود سوتا ہوا دیکھ لیا۔

دوسری طرف گروڈی اپنے اس عمل پر شرمندہ تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کام کے دوران کیسے سوجاتا ہے۔ وہ اس سے قطعی بے بہرہ تھا کہ اسے ایک منصوبے کے تحت سلایا جارہا ہے۔

دو ہفتے بعد مسٹر ہونز نے اسے اپنے آفس میں بلا کر سخت وسست کہا۔ اور جب اس نے پھر بھی سونا برقرار رکھا تو ہونز نے ڈک کو اپنے آفس میں بلا کر کہا۔ ''تم ذہین اور محنتی نوجوان ہو اور تم نے بہت جلد ترقی کی ہے۔ کمپنی کے صدر مسٹر برکلے کا خیال ہے کہ تمہیں شعبے کا سربراہ بنایا جاسکتا ہے۔''

اس گفتگو کے بعد ڈک کو اپنی میز پر ایک خفیہ رپورٹ موصول ہوئی۔ جس میں اس کا شجرہ نصب کے اطمینان کا اظہار کیا گیا تھا۔ یہ بتایا گیا تھا اس کی پا پشت کے لوگ اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ اس کے خاندان کے زیادہ تر افراد انگلینڈ میں رہا کرتے تھے۔ ان سے اپنی زندگی میں چند ایک غلطیاں بھی سرزد ہوئی تھیں لیکن وہ نظر انداز کیے جانے کے قابل تھی۔

کمپنی کے صدر نے گروڈی کا عہدہ گھٹا دیا جس پر ڈک نے اس سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ ڈک نے سال تک ذل جمعی سے کام لیا۔ وہ کمپنی کے اعلیٰ افسران میں شامل ہوچکا تھا۔ اور اب اسے مزید کرنے کے لیے بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا تھا۔ نہایت شاطرانہ انداز سے ہونز سمیت تین اعلیٰ اختیار والے افسران سے آگے جانا تھا۔ اس نے اس منصوبے بلیک میلنگ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کے لیے اس ایک سراغرساں کی خدمات حاصل کیں اور اسے ان افسران کی کمزوریاں معلوم کرنے کے لیے لگا دیا۔

اسے جلد ہی معلوم ہوگیا کہ ایک ایگزیکٹیو مسٹر رابسن کے تعلقات ایک سنہرے بالوں والی لڑکی سے ہیں۔ رابسن ایک کامیاب ازدواجی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کی سماجی حالت بہترین تھی، وہ شریف اور پاکباز سمجھا جاتا تھا۔ ڈک نے اس کے سامنے صورت حال رکھی تو وہ شرمندہ ہوگیا اور اس نے وعدہ کیا کہ اب وہ اپنی نہیں کی ترقی کے لیے کوشش کرے گا۔

دوسرے حریف رچرڈ کے بارے میں اس نے افواہیں پھیلانا شروع کردیں کہ وہ شرابی اور جواری ہے، کمپنی کے راز دوسروں کو فروخت کررہا ہے۔ اس کے بعد اس نے یہ بھی مشہور کردیا کہ وہ معزز گاہکوں سے کمیشن وصول کرتا ہے۔

یہ افواہیں صدر مسٹر برکلے کے کانوں تک بھی پہنچیں۔ چوں کہ رچرڈ نے ان افواہوں کی کبھی تردید نہیں کی تھی چنانچہ انہیں درست تسلیم کرلیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسٹر برکلے نے رچرڈ کا عہدہ گھٹا دیا۔

اس وقت ڈک کی عمر چھتیس سال تھی اور وہ فارلس کیمیکل کمپنی میں نائب صدر بننے کا امیدوار تھا۔ ڈک کو اب تک چار ترقیاں دی گئی تھیں اور ہر بار اس کے شجرہ نسب کو کھنگالا گیا تھا۔ مگر اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ملی تھی۔ یعنی اسکے اجداد سے کوئی ایسی لغزش سرزد نہیں ہوئی تھی کہ قابل گرفت ہوتی۔

ایک روز اچانک راہ داری میں ڈک کا سامنا کمپنی کے صدر مسٹر برکلے سے ہوگیا۔ انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر محبت آمیز لہجے میں پوچھا۔ ''سناؤ ڈک کیسے ہو؟''

ڈک کو اس کا جملہ سن کر بہت خوشی ہوئی اس لیے کہ برکلے اپنے سے کم لوگوں سے مخاطب ہونا پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ نائب صدر سے بات کرتا تھا یا پھر بورڈ آف ڈائریکٹرز سے مخاطب ہوتا تھا۔

وہ ڈک کو اپنے آفس میں لے گیا۔

''تمہارے اجداد کے بارے میں ہمارے ماہرین نے حال ہی میں ایک رپورٹ مرتب کی ہے جس میں یہ لکھا ہے کہ تمہارا خاندان انگلینڈ کے قصبے ولکنسن میں رہا کرتا تھا۔ دلچسپ بات یہ کہ ہمارا خاندان بھی کسی زمانے میں وہاں رہا کرتا تھا۔''

''پھر تو وہ ایک دوسرے سے واقف ہوں گے۔'' ڈک نے مسکرا کر کہا۔

''ہوں۔ اس طرح سے ہمارے مابین ایک خاص قسم کا تعلق پیدا ہوگیا ہے۔'' پھر وہ دیر تک اپنے اور ڈک کے اجداد پر فضول گفتگو کرتا رہا۔ ڈک نہایت سنجیدگی سے وہ گفتگو سنتا رہا کیوں کہ ایک روز اسے برکلے کی گھومنے والی کرسی پر بیٹھنا تھا۔ وہ اس کے بجائے اپنا نام آفس کے دروازے پر سنہری الفاظ میں لکھا دیکھنا چاہتا تھا۔ تاہم پہلے اسے نائب صدر کی کرسی سنبھالنا تھی جس پر ہیرسن بیٹھا تھا۔

ہیرسن کے ریٹائر ہونے کا ابھی کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کے آفس کا ریکارڈ صاف تھا۔ اس کی کارکردگی بہترین تھی۔ چناں چہ اسے بلیک میل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ڈک اس کے معاملے میں وہ حربے بھی استعمال نہیں کرسکتا تھا جو اس نے دوسرے عہدے داروں کے بارے میں استعمال کیے تھے۔

اس نے ایک خطرناک قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔

اسے ایک شخص کے بارے میں ایسی معلومات حاصل ہوگئیں کہ وہ ایسے خطرناک کام انجام دیتا ہے۔'' کام تسلی بخش ہونا چاہیے۔'' اس نے کہا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ وہ صرف زخمی ہوجائے۔ زخم تو بھر بھی سکتے ہیں۔''

''جناب آپ بے فکر رہیں۔ میں اسے دوسری دنیا میں پہنچا کر رہوں گا۔'' اس شخص نے کہا۔

☆☆☆

فارلس کیمیکل کمپنی کے ملازمین نے یہ بات انتہائی افسوس کے ساتھ سنی کہ کمپنی کے نائب صدر مسٹر ہیرسن کار کے ایک حادثے کا شکار ہوکر چل بسے۔ پولیس اپنی پوری کوشش کے باوجود اس کار کے ڈرائیور کا سراغ نہیں لگا سکی ہے۔

ایک مہینے کے بعد ڈک کو ایک خفیہ رپورٹ ملی کہ اس کے اجداد کا کردار گیارھویں صدی تک بہترین تھا۔ پھر اس کے ایک ہفتے بعد اس کو پیشکش کی گئی وہ نائب صدر کا عہدہ سنبھالے۔ ڈک نے گہرے دکھ کا اظہار کیا اور پھر

وہ عہدہ سنبھال لیا- اس نے ملازمین کے لیے بہت سی مراعات کا اعلان کیا-

جب وہ نائب صدر بن گیا تو صدر مسٹر برکلے نے اسے اپنے آفس میں طلب کیا- ڈک کا خیال تھا کہ وہ اس سے کسی معاملے میں مشورے کا طلب گار ہے- جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو برکلے کھڑکی کے قریب کھڑا تھا- اس نے کہا- ''ایئر کنڈیشنڈ کمرے سے میرا دل متلانے لگتا ہے- میں کھلی ہوا میں سانس لینا چاہتا ہوں-''

''ڈک خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا- تھوڑی دیر بعد برکلے بھی اپنی کرسی پر بیٹھ گیا- پھر اس نے اپنی میز کی دراز سے ایک لفافہ نکالا اور بولا- ''تمہارے بارے میں یہ رپورٹ آج ہی انگلینڈ سے آئی ہے- اب مجھے تمہارے بارے میں مزید کچھ نہیں جاننا ہے-''

''کیا کوئی خاص بات ہے جناب؟'' ڈک نے دھڑکتے دل سے کہا-

''بہت خاص بات ہے ڈک- اب سے آٹھ سو سال پہلے یعنی بارہ ستمبر گیارہ سو بیاسی میں تمہارے اجداد میں سے ایک شخص نے اپنے افسر اعلیٰ کو قتل کر دیا تھا- افسوس کہ تمہارا شجرہ نسب داغ دار ہو گیا ہے اور قتل جیسا سنگین جرم تمہیں ورثے میں ملا ہے-''

''مجھے یہ سن کر افسوس ہوا- لیکن میرے خاندان کے باقی افراد تو معزز اور پاکباز تھے؟''

''شاید تم نے اس کا نام نہیں پڑھا- وہ ہمارے خاندان کا ایک فرد تھا-'' برکلے نے سرد لہجے میں کہا-

یہ سن کر ڈک کو اپنے خاندان والوں پر غصہ آیا کہ انہوں نے خواہ مخواہ ایسے سنگین جرم کا ارتکاب کر ڈالا- تاہم اس نے اپنی کیفیت پر قابو پا کر مسکراتے ہوئے کہا- ''مگر جناب یہ تو آٹھ سو سال پہلے کا واقعہ ہے- مجھے افسوس ہے کہ مقتول کا تعلق آپ کے خاندان سے تھا-''

''بات ذاتی رنجش کی نہیں ہے- میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قواعد و ضوابط کی رو سے اب تم کمپنی کے نائب صدر کے عہدے پر نہیں رہ سکتے- تمہیں اس ذمے داری سے سبکدوش ہونا پڑے گا-'' وہ بولا- ''تمہیں چھوٹا سا عہدہ قبول کرنا پڑے گا-''

ڈک کا دماغ سر تا پا جھنجھنانے لگا- اس نے نائب صدر کے عہدے تک پہنچنے کے لیے بہت جتن کیے تھے- اسے کرب ناک مرحلوں سے گزرنا پڑا تھا اور اب صدر اس کی محنت پر پانی پھیرے دے رہا تھا- اس نے بہ مشکل کہا- ''کیا ماضی کی رپورٹ پر میری حالیہ کارکردگی کو نظر انداز کر دیں گے؟ کیا میری خدمات کا صلہ آپ اس انداز سے دیں گے؟''

برکلے پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور کھڑکی میں کھڑا ہو گیا- ''تمہاری باتیں بہت معقول ہیں لیکن نائب صدر کا عہدہ بہر حال تمہیں چھوڑنا پڑے گا-''

اچانک ڈک نے سوچا کہ برکلے کھڑکی کے قریب کھڑا ہے اور کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے ہوئے ہیں اگر وہ اسے دھکا دے تو پھر اس کے صدر بننے کے امکانات روشن ہو سکتے ہیں- کمپنی کے لوگ جانتے ہیں کہ برکلے کو کھڑکی کے قریب کھڑے ہونے کی عادت ہے- یہی سمجھا جائے گا کہ اسے چکر آ گیا-

وہ اس کی طرف بڑھا مگر میز کا کونا لگنے سے آہٹ پیدا ہو گئی- برکلے نے پھرتی کا مظاہرہ کیا اور پلٹ کر اس کے شانوں کو گرفت میں لے لیا- ڈک نے مزاحمت کی لیکن کچھ نہ ہوا-

''تم مجھے قتل کرنا چاہتے تھے-'' وہ سانپ کی طرح پھنکارا- ''میں نے پہلے ہی نظریہ قائم کر لیا تھا کہ قتل تمہیں ورثے میں ملا ہے- تم نے اپنے خون کی پہچان کرا دی- تمہارے خاندان کے اس فرد نے بستر پر جرم کا اعتراف کیا تھا میرا خیال ہے کہ اس کی سزا تمہیں بھگتنا چاہیے-'' اس نے اپنے طاقت ور ہاتھوں سے ڈک کو اٹھایا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا-

☆☆☆

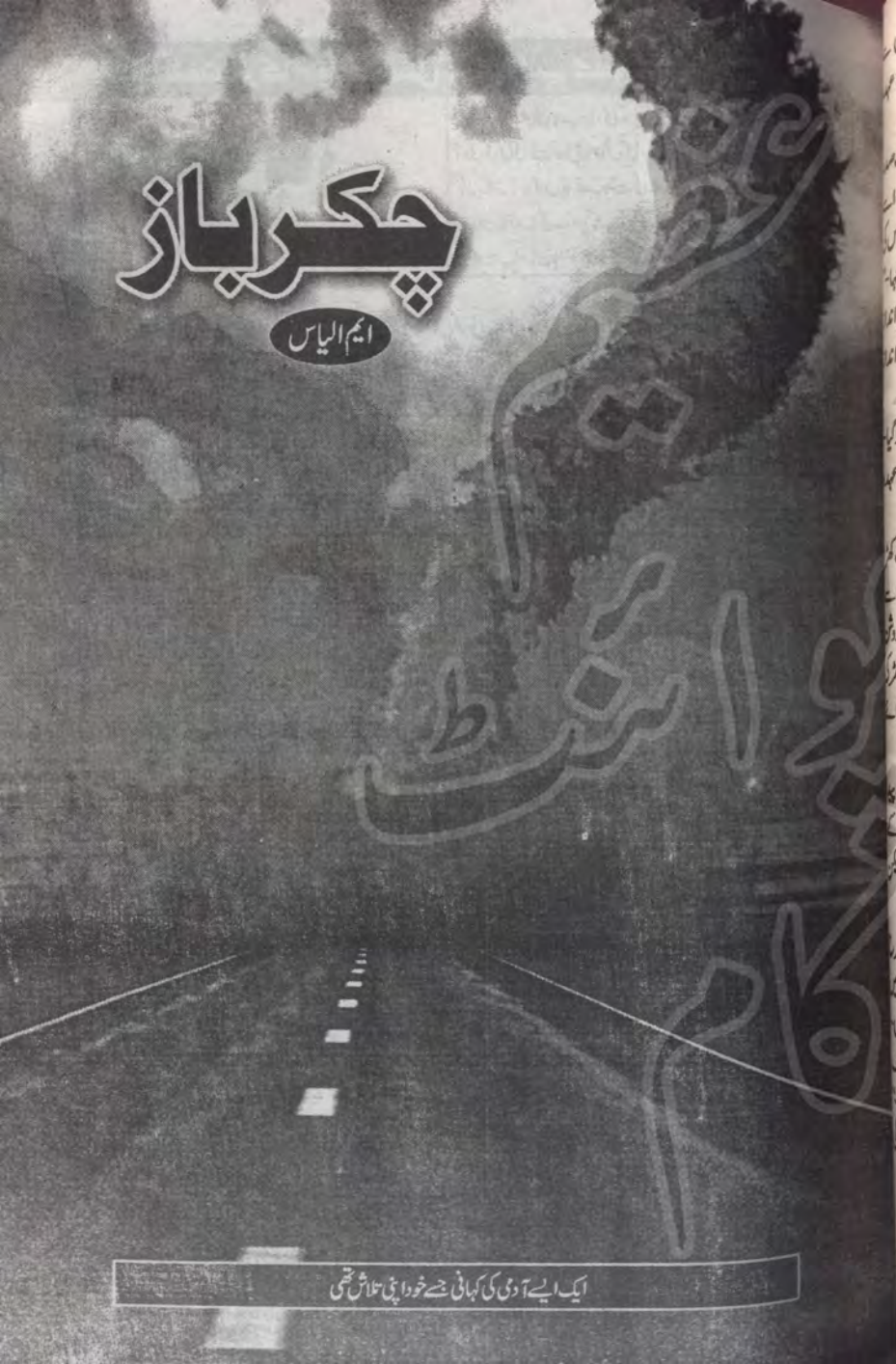

چکرباز

ایم الیاس

اُن لمحوں کا احوال جب ساری تدبیریں اچانک اُلٹی ہونے لگتی ہیں ایک ایسے آدمی کی کہانی جسے خود اپنی تلاش تھی' وہ بھول چکا تھا کہ وہ کون ہے۔ بے قابو حیرت کی ہنگامہ آرائیوں کا قصہ' وقت کی نارسائیوں کا احوال حوادث زمانہ کا شکار نوجوان کا قصۂ عجیب' اچانک قدرت نے اسے ملین مین بنا دیا تھا۔ ان لمحوں کی روداد جب انسان بااختیار ہونے کے باوجود خود کو بے بس محسوس کرنے لگتا ہے۔

مجھے ایک آوارہ سا خیال آیا کہ کہیں پروین نشہ تو نہیں کرتی۔ اس کا جس گھرانے سے تعلق تھا ایسے گھرانے کی لڑکیاں سگریٹ نوشی اور شراب نوشی بھی کرتی ہیں۔ اس کی ماں ایک اداکارہ تھی اور باپ بھی بحریہ کی فوج میں تھا شراب نوشی حیرت کی بات نہ تھی۔ پروین نے مجھ سے ایک اور سگریٹ طلب کیا۔ پھر اسے سلگایا اور ایک لمبا سا کش لے کر کہنے لگی۔

''تم جو کچھ کمال کے بارے میں کہہ چکے ہو مجھے تمہاری ان باتوں سے اتفاق نہیں ہے۔ وہ تو کسی کو دکھ درد میں دیکھ کر خود تڑپ اٹھتا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے تمہارے ساتھ کوئی برا سلوک کیا ہو۔ نیک دلی اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ رشیدہ کے رونے بسورنے پر ہوش کھو بیٹھا اور اس کے ساتھ شادی کر لی۔ کیوں کہ رشیدہ نے اسے اپنی مجبوری اور لاچاری کے لایعنی افسانے سنائے تھے۔ کمال کا دل بڑا نازک سا تھا اس لیے اس نے رشیدہ پر ترس کھا کر اسے اپنا لیا۔''

''ایسی حسین عورت کہ اس پر ترس کھانے کی ضرورت ہی نہیں۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ کمال پر اس نے ترس کھا کر شادی کر لی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''یا پھر یہ کہ کمال چوں کہ ایک بھنورا تھا اور عورتوں کا شکاری اس نے رشیدہ کو شکار کیا ہوا ہو۔ اس نے اپنی حیثیت اور وجاہت سے فائدہ اٹھایا ہو لیکن تمہیں یہ تمام باتیں کیوں کر' کیسے اور کس سے معلوم ہوئیں.....؟''

''اتوار کو وہ ڈھاکا سے آ کر مجھ سے ملا کرتا تھا۔'' پروین ہنس کر بولی۔ ''اور وہ بے چاری' مظلوم اور بے سہارا رشیدہ کے بارے میں بتایا کرتا تھا۔ اس وقت میں نے کمال کے سمجھانے پر کمال کو سپنوں کے شہزادے کے روپ میں دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ رشیدہ کے متعلق کمال کے بیان سے یہ اندازہ لگایا تھا کہ یہ بڑی آوارہ اور بدقماش عورت ہوگی لیکن میں کمال کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی کہ اس کا دل دکھ نہ جائے۔ یہاں تک ان دونوں کی شادی ہوگئی اور شادی کے جب میں نے پہلی مرتبہ رشیدہ کو دیکھا تو وہ اس خاکے سے ملتی جلتی دکھائی دی جو میرے ذہن نے بنایا تھا۔ وہ اس سے ذرا بھی مختلف نہ تھی۔ حیران تھی کہ کمال نے اسے کیوں اپنا لیا؟''

''جب کہ تم نے پہلے اس کے متعلق ایک رائے قائم کر چکی تھیں تو اس میں حیرانی کی کیا بات تھی۔'' میں نے کہا۔ ''جب تم نے اسے دیکھا تو وہ تمہیں اس رائے کے مطابق نظر آئی ہوگی۔ ظاہر ایک عورت دوسری خوب صورت عورت سے حسد و جلن کا شکار ہو جاتی ہے۔''

"اوہ..... یہ بات نہیں ہے۔" پروین کے چہرے پر ناگواری سی ابھر آئی۔ اس نے بل کھا کر کہا۔ 'وہ میری سوکن تھوڑی بن کر آئی تھی۔ جو میں اسے دیکھ کر جل جاتی۔ بلا مبالغہ وہ بے حد حسین تھی۔ جتنی حسین تھی اتنی ہی پرکشش بھی۔ اس کا سراپا' جسمانی نشیب و فراز اور خطوط اور چہرہ ایک مرد کو پاگل کر دینے والے تھے۔ اصل بات تو اس کے طور طریقے تھے۔ عورت میں یہی بات پہلے دیکھی جاتی ہے۔ جن سے عامیانہ پن ٹپکتا تھا۔ چہرے مہرے سے ٹھیک ہونے کے باوجود ایک ایسا پھوہڑ پن ٹپکتا تھا جسے محسوس تو کیا جاسکتا ہے لیکن الفاظ میں بیان کرنا بے حد مشکل ہے۔ پھر بہت بعد میں پتا چلا کہ وہ ایک حجام کی بیٹی ہے۔ شادی سے پہلے بہت سے چاہنے والوں کا دل بہلاتی رہی اور چینا بادام (مونگ پھلی کو بنگال میں چینا بادام کہا جاتا ہے) کے نام سے مشہور رہی تھی۔ یعنی اسے کوئی بھی آسانی سے چھیل کر کھالیا کرتا تھا۔ اسے میک اپ کا ذرا برابر بھی سلیقہ اور ڈھنگ نہیں تھا۔ لپ اسٹک اس طرح تھوپتی تھی کہ خدا کی پناہ شائستہ اور سلیقہ مند خواتین مثلاً آنٹی مسز بیگ تو نفرت کی حد تک اسے ناپسند کرتی تھیں۔"

اس نے توقف کر کے سانس لیا اور پھر سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا۔ "اکثر ایسا بھی ہوا کہ اس نے کسی ایسی پارٹی میں جس میں شراب کا اہتمام ہوتا تھا خوب شراب بھی پی تھی۔ اس طرح تو سخت پیاس میں آدمی پانی بھی نہیں پیتا ہوگا۔ ایک بار تو اس نے کسی پارٹی میں یوں بے تحاشا شراب پی کہ مدہوش ہوگئی اور کمال کو اسے اٹھا کر گھر لانا پڑا۔ جب وہ اسے گود میں اٹھا کر گاڑی تک لے گیا تھا مرد اور عورتیں خوب ہنسی تھیں۔ ان باتوں کو دیکھ کر کمال کی حالت پر بڑا دکھ ہوتا تھا۔ مگر وہ خود کردہ را علاج کلیت کے مصداق اس کی کوئی مدد نہ کی جاسکتی تھی اور پھر نہ جانے کیا بات تھی۔ میں سمجھتی ہوں کہ کمال کی نرم دلی اور حوصلہ مندی تھی کہ وہ جیسے تیسے اس اکھڑ اور بدسلیقہ عورت سے نباہ کرتا رہا۔ لوگ اسے لعن طعن بھی کرتے اور اس پر فقرے بھی کستے تھے مگر اس نے کبھی پروا نہ کی..... وہ بدستور رشیدہ کا ساتھ دیتا رہا تھا اس امید پر کہ ایک دن وہ سدھر جائے گی اور زندگی حسین بن جائے گی۔"

"کمال سے رشیدہ کے بارے میں سن سن کر کمال کو تو تم نے سمجھایا ہوگا.....؟" میں نے کہا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے سن کر چپ سادھ لی۔"

"کسی نہ کسی کو تو سمجھانا ہی تھا۔" پروین نے آخری کش لے کر سگریٹ کا ٹوٹا ایش ٹرے میں مسل دیا۔ پھر تیسرا سگریٹ سلگایا اور کش لے کر کہنے لگی۔ "مگر جب میں نے اس سے رشیدہ کی حرکتوں کا ذکر کیا تو پہلے پہل اس نے کوئی خیال نہیں کیا۔ پھر میں نے اسے رشیدہ کی پراسرار آمد و رفت کی طرف دھیان دلایا تو وہ بولا کہ آدمی کو اپنی بیوی پر پورا اعتماد ہونا چاہیے۔ شوہر کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنی بیوی کی جاسوسی کرے لیکن میں اصرار کرتی رہی کہ آخر پتا تو چلے کہ وہ کیا کرتی پھر رہی ہے تاکہ اگر وہ کسی الجھن میں ہو تو اسے نکالا جاسکے لیکن اس کا خیال تھا کہ اگر رشیدہ کسی الجھن میں ہے ہو تو اسے نکالا جاسکے لیکن اس کا خیال تھا کہ اگر رشیدہ کسی الجھن میں ہے بھی تو اس کا اس میں کوئی قصور نہیں کیوں کہ حالات نے اسے دوسروں کا آلہ کار بننے کے لیے مجبور کر دیا ہوگا۔ عورت کا حسن سمجھو اس کے لیے عذاب بن جاتا ہے۔ وہ رشیدہ کی ہمیشہ طرف داری کرتا اور اسے بچانے کی کوشش بھی کرتا رہا تھا۔ میں دل میں حیران ہوتی تھی کہ یہ کیسا شوہر ہے؟ دنیا میں کیا ایسے شوہر بھی ہوتے ہیں؟"

پروین نے میز کی دوسری سمت بیٹھے ہوئے مجھے دیکھا۔ اس کی نگاہیں سوالیہ تھیں۔ گویا وہ یہ جاننا چاہتی ہو کہ میں اس کی باتوں سے متاثر ہوا ہوں کہ نہیں.....؟ لیکن اس نے میرے بشرے سے بھانپ لیا تھا کہ میں قائل نہیں ہوا ہوں۔ اسے جیسے دکھ ہوا تھا۔

"رشیدہ نے تو بہ ظاہر میرے ساتھ مہربانی' خلوص اور

انسانیت آمیز برتاؤ کیا تھا۔" میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور کہا۔ "میں چٹاگانگ سے رنگامائی آرہا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اسے لفٹ مانگتے دیکھ کر مجھ سے اجازت لے کر اسے لفٹ دے دی تھی۔ کیوں کہ شام ہو چکی تھی اور اس وقت کوئی سواری رنگامائی نہیں جاتی تھی لیکن اس کا کیا علاج کہ جب میری آنکھ کھلی تو میں مجروح اور زخمی حالت میں اسپتال میں پڑا تھا۔" میں نے یہ کہتے ہوئے پروین کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے اعتمادی اور خوف کی جھلک دیکھ کر میں نے اپنی بات جاری رکھی۔

"پارو.....! تمہیں اپنے کمال کے متعلق بہت زیادہ خوش فہمی ہے۔ تم ایک غلط گھوڑے پر بازی لگا رہی ہو..... اس بات سے تم یہ نہ سمجھو کہ میں رشیدہ کو بے قصور سمجھتا ہوں۔ نہیں وہ بھی اس میں شریک تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی نے اسے مجبور کیا..... تاہم اسے مجبور کرنے والا تمہارا محبوب کمال ہے۔ اس کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتا اور تم اس پر....."

"اسے میرا محبوب مت کہو۔" پروین نے درمیان میں بات کاٹ کر جلدی سے کہا۔ "وہ ایک ایسا انسان تھا جس کی مصیبت مجھے گوارہ نہ تھی۔"

"چلو..... یوں ہی سہی۔" میں نے کہا۔ "مگر سوال یہ ہے کہ تم اس کے لیے کہاں تک قربانیاں دوگی اور ایثار کرتی رہوگی۔ تم اس کی بیوی نہیں ہو۔ اس بات سے بھی انکار کرتی ہو کہ اس کی محبوبہ نہیں اور نہ ہی اس سے تمہارے تعلقات رہے ہیں۔ جب کہ رشیدہ کہتی تھی کہ تم دونوں ایک مکان میں جو کمال کا ہے اس سمیلتی اور راتیں گزارتی رہی ہو۔ اس کے علاوہ یونی ورسٹی کے ہم جماعت لڑکوں سے بھی دوستی اور تعلقات رہے ہیں۔ خیر اب میں اس کے متعلق اور اس موضوع پر کوئی بات نہیں کروں گا۔ کیوں کہ وہ تمہارا ذاتی فعل ہے۔ تمہارا جسم' جوانی اور یہ ابلتا شباب تمہاری ملکیت ہے تم جسے چاہے اس کا نذرانہ پیش کرو یا نہ کرو اور اب تمہیں تفصیل سے وہ حالات سناتا ہوں جن میں کمال سے میری ملاقات ہوئی..... تمہیں کچھ بتا بھی چکا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے میں نے اس رات گاڑی کے رکنے سے لے کر اسپتال تک ساری کہانی پروین کے گوش گزار کر دی۔ کہانی سنانے کے بعد میں اس کے سرخ و گداز رسیلے لب کھلنے کا انتظار کرتا رہا۔ مگر جب وہ خاموش اور ایک ٹک مجھے دیکھتی رہی تو میں بولا۔

یہ ہے تمہارا دوست' ہمدرد اور مخلص انسان کمال جس پر تم بڑی نازاں ہو..... یہ دیکھو میری ناک پر جو زخم کا نشان نظر آرہا ہے..... تم جانتی ہو یہ زخم کیسے آیا تھا.....؟ تم کہو گی کہ کمال کی ناک سیدھی' صاف اور خوب صورت تھی۔ تمہاری ناک پر مندمل ہو جانے والی چوٹ کا نشان جو ہے وہ شاید بچپن میں فٹ بال کھیلتے ہوئے آیا ہوگا۔ تب تمہاری ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی ہوگی.....؟ اس کی ناک پر زخم کا نشان موجود تھا..... اس نے سوچا ہوگا کہ کہیں ناک پر زخم کے نشان کی وجہ سے کسی کو شک نہ پڑ جائے۔ اس نے مجھے بے ہوش کرنے کے بعد میری ناک کو بڑی بے رحمی سے زخمی کیا تاکہ یہی سمجھا جائے کہ یہ حادثاتی ہے اور اس نے یہ کام گاڑی کو آگ لگانے اور کھڈ میں دھکیلنے سے پہلے سرانجام دیا۔ تم نے اس کی ان خوبیوں کا ذکر مجھ سے تو نہیں کیا کیا تم ان سے واقف نہیں تھیں؟"

پروین ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔ پھر وہ میری طرف منہ کر کے بولی۔

"میں کبھی نہیں یقین کر سکتی..... کہ کمال ایسی سنگ دلانہ حرکت کر سکتا ہے کبھی نہیں..... اس پر سراسر الزام اور بہتان لگا رہے ہو....."

"تم یقین کرو یا نہ کرو....." میں نے بے پروائی سے کہا۔ "مگر میں خود کو اتنا زخمی کیسے کر سکتا تھا.....؟ کیا تم اپنے آپ کو زخمی کر سکتی ہو.....؟"

"مجھے کیا خبر کہ تم نے کیا کیا.....؟" وہ غصے سے چلا کر

بولی۔ ”میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ مجھے بحریہ کی یونی فارم کا جو ایک بٹن ملا ہے وہ تمہارا ہو سکتا ہے۔ شاید تمہارے پاس بھی یونی فارم ہو..... دوسری بات یہ ہے کہ محسن کمال غائب ہے اور تم اس کی بیوی کے شوہر بن بیٹھے ہو۔ پھر میں تمہارے بیان پر کیوں یقین کروں..... اس لیے کہ تمہارے کہنے کے مطابق تم نے کمال کو لفٹ دی۔ ٹیکسی میں بٹھایا۔ اگر ایسا ہوا بھی ہے تو پھر تم نے ہی اسے ہلاک کیا ہے اور اسے کہیں دفنا دیا ہوگا۔ اس میں کوئی مقصد یقیناً ہوگا۔“

”کیا کہہ رہی ہو میں بھلا.....؟“ میں اس کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے رک گیا کیوں کہ وہ دروازے کے قریب پہنچ چکی تھی۔

”میں پولیس کو بلا رہی ہوں۔“ پروین نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ”مجھے یہ کام پہلے ہی کر لینا تھا۔ میں نے بڑی حماقت کی ہے جو تاخیر کر دی۔“

”خیال نیک ہے پارو جان من!“ میں نے شوخ لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں یہ نیک کام پہلے کر چکا ہوں۔ پولیس کو اطلاع دے چکا ہوں۔“

”میں جب انہیں یہاں دیکھوں گی تو پھر تمہاری بات کا یقین کروں گی۔“ وہ بولی۔ ”تمہارا اور تمہاری کسی بات کا کوئی بھروسا نہیں۔“

یہ کہہ کر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ چند لمحوں کے بعد میں اٹھا۔ میں چاہتا تو اسے لپک کر دبوچ سکتا تھا۔ اس کے باوجود کہ وہ مسلح تھی لیکن اس سے کچھ حاصل نہ تھا۔ میں ناکام ہوتا تو شاید وہ پستول چلا دیتی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ وہ اس وقت سیڑھیوں کے پاس ٹیلی فون کے ساتھ مصروف تھی۔ وہ میری چاپیں سن کر تن گئی اور خوں بار نگاہوں سے مجھے تکنے لگی۔ اس کے چہرے پر اجنبیت اور کدورت کا غبار پھیلا ہوا تھا۔ جیسے میں اس کا جانی دشمن ہوں اور اسے دبوچنے کے لیے آیا ہوا ہوں۔

”کیا معاملہ ہے پارو بیگم!“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر دیں۔ ”فون کر کے تمہارا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا نا.....؟“

جواب میں پروین نے جھک کر فوراً ہی اپنا پستول نکال لیا۔ اس کا ریچ ٹھیک کرنے کے بعد اس کی نالی کا رخ میری طرف کر کے بولی۔

”تو تم نے واقعی ہی پولیس کو فون کر کے بلایا ہے پولیس کو..... ایک ناکارہ فون پر تمہارا رابطہ ہو گیا تھا؟“ اس کا لہجہ تمسخرانہ ہو گیا۔

”یہ آج سہ پہر ناکارہ نہ تھا پارو!“ میں ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔ ”ٹھہرو مجھے چیک کر لینے دو۔ شاید تار مل گئی ہوگی۔“

”وہیں کھڑے رہو.....؟“ وہ غرا کر بولی اس کے چہرے پر درندگی ابھر آئی اور وہ شعلہ بار نگاہوں سے گھورنے لگی۔

”او کے.....“ میں ایک لمبی سانس لیتے ہوئے سر ہلایا۔ ”پارو ڈرامے کا یہ سین پہلے بھی ہو چکا ہے۔ تم ری پلے کر رہی ہو؟“

”میں تم سے کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ تم مجھے پارو مت کہو تم میرے محبوب نہیں ہو اور نہ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔“ وہ دانستہ ہنس کر بولی۔

وہ دروازے کی طرف بڑی محتاط ہو کر بڑھی تو میں بے پروا اور لاتعلق سا کھڑا ہو گیا۔ جب وہ قریب سے گزرنے لگی تو میں نے چشم زدن میں اس کے ہاتھ سے پستول جھپٹ کر اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ اسے سنبھلنے اور مزاحمت کا موقع ہی نہ مل سکا۔ اس کے چہرے پر جھک گیا۔ اس کے ہونٹوں کی مٹھاس سے میرے ہونٹ تر ہو گئے۔ اس نے بہت کوشش اور جدوجہد کی کہ اپنے لب آزاد کر لے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ پھر اس نے جدوجہد اور مزاحمت ترک کر دی اور اپنے آپ کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ دیا پھر اس میں خود سپردگی آ گئی۔ پھر اس نے نہ صرف من مانی کرنے دیا بلکہ جذبات کی رو میں بہہ

گئی۔ اگر میں حد سے تجاوز کرتا تو وہ انکار نہ کرتی۔ مگر میں نے صرف اس پر اکتفا کیا۔ میری نیت میں فتور نہ تھا میں نے اسے اعتماد میں لینے کے لیے من مانی کی تھی۔ میں نے اس سے الگ ہونے کے بعد پستول اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ سرخ ہو رہی تھی۔ اس عالم میں وہ اتنی سرخ اور پیاری لگی کہ میں نے حیا کی سرخی اپنے ہونٹوں میں جذب کر لی۔ اس نے الگ ہونے کے بعد جیب سے رومال نکال کر رخساروں کو صاف کیا اور تیز لہجے میں بولی۔

”یہ تم نے کیا حرکت کی.....؟ کیا یہ مردانگی ہے کہ ایک لڑکی کو تنہا پا کر بے قابو ہو جاؤ۔“ پھر وہ بکھرے بالوں اور لباس کو درست کرنے لگی۔

”یہ حرکت میں نے اس لیے کی کہ تمہیں بتا سکوں کہ تم جیسی لڑکی مرد کو تنہائی میں ملے تو وہ قابو میں نہیں رہ سکتا۔ کمال کیسے رہا ہوگا.....؟“

اس نے جواب نہیں دیا۔ آگے بڑھ گئی کہ کہیں میں اسے گود میں اٹھا کر بیڈ روم میں نہ لے جاؤں۔ مگر میں نے اسے نہیں اٹھایا۔ بلکہ ریسیور اٹھا لیا۔ اسے کان سے لگایا۔ ٹیون نہیں آ رہی تھی۔ میں نے کریڈل دبایا بھی تو گھنٹی کی ٹن پھر بھی سنائی نہ دی۔ فون کسی مردے کی بیکار پڑا تھا۔ اس کی اچانک خرابی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ پروین نے بھی لائن خراب نہیں کی ہوگی۔ کہیں سے تار نہ کاٹ دیئے ہوں۔ اسے ایسی حرکت کرنے کی وجہ بھی نہیں تھی۔ پھر میں نے متفکرانہ انداز سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ پروین اب دروازے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ پھر وہ مڑی اور تیزی سے باہر نکل گئی لیکن دروازے کے باہر وہ ٹھٹک گئی۔ جیسے زمین نے اس کے پیر پکڑ لیے ہوں۔ میں اس کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے خفگی کے باوجود پرجوش محبت کا ثبوت دیا تھا۔ میں اسے رات رکنے کے لیے کہتا تو شاید وہ رک بھی جاتی لیکن اب پھر وہ سابقہ تنک مزاج کی ہو گئی تھی۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ بت کی طرح ہال میں ساکن کھڑی روشنی میں نہا رہی تھی۔ ایک خیال یہ آیا کہ کہیں وہ اس لیے تو نہیں رک گئی کہ میں اس کے پاس آ کر گود میں اٹھا کر بیڈ روم میں لے جاؤں۔ اس نے رات گزارنے کا ارادہ کر لیا ہو۔ لیکن میری خوش فہمی جلد ہی دور ہو گئی۔ اگر اس کا ایسا کوئی ارادہ ہوتا تو وہ میری طرف گھوم جاتی لیکن نہیں اس کی نگاہیں دریا کی طرف تھیں۔ میں قدم بڑھا کر اس کے پہلو میں پہنچا۔ پھر دریا کی طرف دیکھا۔ کمال کی کشتی رمنا گرین کے کیبن میں سے روشنی جھانکتے دیکھ کر میں دم بخود رہ گیا۔ حالاں کہ شام کو کشتی میں روشنی نہیں تھی۔ اس میں گھپ اندھیرا تھا۔ اس بات کا مجھے پورا یقین تھا۔

پروین نے سر گھما کر میری طرف دیکھا۔ اس کے تمام شک و شبہات فنا ہو چکے تھے۔ اس نے پلکیں جھپکائیں اور دھیمی آواز میں بولی۔

”کیا تم نے کمال کو آج شام دیکھا ہے.....؟ کہیں یہ تمہارا واہمہ تو نہیں تھا.....؟ سچ سچ بتانا۔“

”ہاں.....“ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”لیکن تمہیں میری بات کا کیا اب بھی یقین نہیں آ رہا ہے؟ کیا اب بھی کوئی شک ہے؟“

”تو کیا کشتی میں اس وقت.....“ وہ میرے اور قریب ہو گئی۔ ”کمال ہی ہے نا.....؟ ہاں وہی ہوگا اور کون ہو سکتا ہے؟“

میں نے دوبارہ کشتی کی طرف دیکھا اور رشیدہ کا یہ فقرہ میرے ذہن میں گونج گیا۔ ”آج رات ہم کینائی ڈیم جائیں گے۔ کیوں کہ اہم ملاقاتوں کے لیے وہی مقام مخصوص ہے۔“ میں نے یہ سوچتے ہوئے پروین کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش کھڑی تھی۔

مگر اس بات کا بھی تو امکان تھا کہ رشیدہ نے جھوٹ سے کام لیا ہو یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پولیس حرکت میں آ گئی ہو اور زیر زمین کام کرنے والوں کی سرگرمیاں اور منصوبے کسی اور رخ پر جا رہے ہوں۔ کمال کے اس مطالبے کا کہ کشتی کو رشیدہ یارڈ سے نکال کر ڈاک پر

پہنچادے۔ اس کے سوا کوئی اور مقصد نہ تھا کہ ضرورت کے مطابق یہ کشتی آسانی سے میسر ہو سکے۔

میرا ذہن الجھ سا گیا۔ یہ روشنی کس مقصد سے کی گئی ہے..... رشیدہ کی خواب گاہ کی کھڑکی پر کنکر کیوں پھینکے گئے۔ جب کہ سامنے خالی پڑا ہوا ڈاکسا صاف ظاہر کر رہا تھا کہ رشیدہ گھر پر موجود نہیں ہے۔ وہ موٹر بوٹ لے کر کہیں گئی ہوئی ہے۔

مجھے بھی گمان ہونے لگا کہ رشیدہ کی کھڑکی پر کنکر اس لیے پھینکے گئے کہ رشیدہ متوجہ ہو جائے بلکہ ان کا مقصد مجھے بیدار کرنا ہوگا اور یہ روشنی بھی رشیدہ کو بلانے کے لیے نہیں جلائی گئی تھی..... یہ روشنی مجھے برفساد رغبت گھر سے کشتی تک لانے کی غرض سے جلائی گئی تھی کیوں کہ انہیں اس بات کا علم ہے کہ میرے پاس پستول ہے اور اس لیے گھر میں گھس کر مجھ پر قابو پانا آسان نہیں ہوگا اور اس میں زبردست خطرہ موجود ہے۔ اس کے بجائے کنکر پھینک کر مجھے جگانا اور پھر میرے جذبہ تجسس کو ہوا دے کر کشتی تک لانا زیادہ مناسب ہوگا اور میں کشتی پر آجاؤں گا اور ٹیلی فون کی تاریں اس لیے کاٹ دی گئی کہ میں پولیس کو اس روشنی کے متعلق آگاہ نہ کر سکوں..... اس کے علاوہ کوئی اور بات ہو نہیں سکتی تھی اور نہ تھی بھی۔

یہاں تک سوچنے کے بعد میرے ذہن میں ایک اور سوال پیدا ہوا لیکن وہ مجھے صرف مجھے کشتی پر کیوں بلانا چاہتے ہیں.....؟

رشیدہ کی روانگی کو یاد کر کے مجھے اس سوال کا جواب پانے میں کوئی دقت نہ ہوئی ممکن ہے رشیدہ نے انہیں اطلاع دے دی ہو کہ میں نے پولیس کو خبردار کر دیا ہے اور کل رات وارد ہونے والی کشتی کے متعلق بھی بتا دیا ہو۔ اب اگر میں غائب کر دیا جاؤں اور اس طرح میرا کوئی نام ونشان تک نہ رہے تو پولیس کو یہی شک گزرے گا کہ میں نے جھوٹی اطلاعات دی تھیں اور اصل میں' میں ہی مجرم تھا۔ اس طرح مجرموں کی بہت ساری حل نہ ہونے والی گتھیوں کا بوجھ پولیس میرے کندھوں پر ڈال دے گی۔ پولیس میرے پراسرار انداز سے غائب ہونے کو میری موت نہیں بلکہ فرار سمجھے گی۔ میری لاش کے لیے وہ دریا کو ہرگز نہیں کھنگالے گی بلکہ میری موت کو ایک منشیات فروش اور اسمگلر اور تخریب کار قرار دے گی۔ اس کے نزدیک خس کم جہاں پاک.....

"ہاں....." میں نے خود کلامی کے انداز میں کہہ دیا تھا۔ "یہ محسن کمال ہی ہو سکتا ہے..... اس کی بدروح ہونے سے رہی۔ کیوں کہ وہ مرا نہیں ہے؟"

پروین خاموش رہی۔ مجھے ہر طرف خوف کے سائے پھیلتے دکھائی دے رہے تھے۔ میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن میں یہ بات بھی جانتا تھا کہ میں بھاگ کر بچ نہیں سکتا۔ یہ مافیا کے لوگ مجھے فرار ہونے نہیں دیں گے۔ اب تو مجھے خود سے کشتی کی طرف جانا ہوگا۔ ورنہ وہ خود مجھے پکڑنے آجائیں گے..... ان کا انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ میں ان کے مقابلے پر جاؤں..... دیکھوں کیا ہوتا ہے۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر پروین کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "پارو جانی! میرا پستول مجھے دے دو اب اس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔"

"نہیں....." پروین نے نفی کی صورت میں سر ہلا دیا۔ "نہیں۔ پستول میرے پاس ہی رہے گی۔ بہتر ہے تم پستول نہ لو۔"

"وہ کس لیے.....؟" اس کا جواب سن کر میں تیزی سے اس کی طرف گھوم گیا۔ "تم میرا پستول بھی اپنے پاس کس لیے رکھنا چاہتی ہو؟"

"اس لیے کہ مجھے ڈر ہے کہ تم اسے دیکھتے ہی مشتعل ہو جاؤ گے اور گولی مار دو گے۔" وہ بولی۔ "میں قتل وغارت گری نہیں چاہتی۔"

میں حالات کی نزاکت کا اندازہ کرتے ہوئے پروین کو نصیحت کرنا چاہتا تھا کہ وہ اپنی موٹر بوٹ میں بیٹھ کر

جتنا جلد ہو سکے یہاں سے بھاگ جائے۔ مگر میں یہ جانتا تھا کہ یہ ضدی لڑکی ہرگز ہرگز میرا کہا نہیں مانے گی اور خوامخواہ کی بحث وتکرار بازی اور حجت بازی پر اتر آئے گی۔

"اچھا....." میں نے مشتعل ہو کر کہا۔ "تم اب کس چیز کا انتظار کر رہی ہو مس پروین بیگم! اب قدم کیوں نہیں بڑھاتیں.....؟"

ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ڈاک کی شکستہ سیڑھیوں تک پہنچے اندھیرے کی وجہ سے مجھے ایک ہلکی ٹھوکر لگی لیکن میں فوراً ہی سنبھل گیا۔ البتہ اس ٹھوکر نے میرے سینے کے درد کو چھیڑ دیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ جب میں نے پروین کو بازوؤں میں بھرا تھا تب پروین نے میرے بازوؤں کی گرفت سے نکلنے کی بڑی کوشش' جدوجہد کی تھی۔ من مانی کرنے پر مزاحمت بھی لیکن اس وقت سینے میں درد نہیں اٹھا تھا لیکن ایک ہلکی سی ٹھوکر سے درد کی لہر سینے میں دوڑ گئی تھی۔ اس لیے اندھیرے میں ٹوٹی ہوئی سیڑھیوں سے اترنا میرے لیے بڑا دشوار ثابت ہوا۔ جیسے کسی پہاڑی سے اتر رہا ہوں۔ اس کے علاوہ کمال کا خوف بھی میرے اعصاب پر چھایا ہوا تھا۔ پروین میرے پیچھے پیچھے تھی۔

ڈاک پر ہلکورے لیتی ہوئی کشتی کے سوا اور کوئی شے متحرک نہ تھی۔ ہر طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ فضا میں وحشت تھی اور مردنی برس رہی تھی۔ ایک ویرانی کا سا عالم تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے آس پاس کوئی ذی نفس موجود نہیں جس سے قبرستان کا دھوکا ہوتا تھا۔ البتہ رمنا گرین کشتی کے کیبن کی کھڑکی سے بدستور زرد روشنی کسی شیطان کی طرح جھانکتی محسوس ہو رہی تھی جس سے اور خوف لگ رہا تھا۔

کھڑکی بند تھی اور اس کے اندھیرے شیشوں میں سے یہ روشنی باہر سے دکھائی دے رہی تھی۔ کشتی کے قریب پہنچ کر میں ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر تذبذب کے عالم میں میں کشتی میں کود گیا۔ اندھیرے میں ادھر ادھر کچھ نہ دکھائی دیا۔ پھر میں مڑا تا کہ ہاتھ بڑھا کر پروین کی مدد کروں لیکن اسی اثناء میں وہ بھی آہستہ سے چھلانگ لگا چکی تھی۔ کشتیوں میں اترتے چڑھتے ہوئے وہ کسی کی مدد لینے کو تیار نہ تھی اور نہ ہی اس کی عادی معلوم ہوتی تھی لیکن اس وقت ایک ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی وجہ سے وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی تھی اور لڑکھڑا گئی۔ میں نے اسے سنبھالنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میرے سینے سے آ لگی۔ چند لمحوں تک اس کا گداز' جوان اور گدرایا ہوا نوخیز سراپا میرے بازوؤں کی گرفت میں رہا۔ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا کہ خوف کے اس ماحول کے باوجود میں اس کے چہرے پر جھکے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ جب میں کچھ جذباتی اور پرجوش ہونے لگا تو وہ ایک جھٹکے سے میرے بازوؤں کی گرفت سے نکلی اور بل کھا کر ایک دم ہٹ گئی۔ چند لمحوں کی اس ہم آغوشی نے میرے دل ودماغ کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ آدمی پہلے ہی سے ہماری گھات میں بیٹھے تھے۔ ان دونوں نے اچانک ہلہ بول کر ہم دونوں کو قابو میں کر لیا۔ ہمیں تو ہاتھ ہلانے کی مہلت تک نہ ملی۔ ایک نے مجھے پیچھے سے دبوچ کر قابو میں کر لیا۔ دوسرا اچھل کر اس طرح پروین پر حملہ آور ہوا کہ ایک جھپٹے میں اس نے پروین کے ہاتھوں میں پکڑا ہوا پستول چھین لیا اور دوسرے جھپٹے میں اس نے پنڈلیوں کے فیتے میں اڑسا ہوا پستول بھی نکال لیا۔ حملہ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ پروین کچھ نہ کر سکی اور بے بس ہو کر رہ گئی۔ دونوں طرف سے بھی کسی نے بھی کچھ نہیں کیا۔ وہ دونوں شخص جن میں سے ایک قد آور تھا اور دوسرا درمیانہ قد کا۔ قد آور شخص نے جن نظروں سے پروین کو دیکھا وہ نظر بھی کہے دے رہی تھیں کہ اب پروین کی خیر نہیں۔ پروین اس کی آغوش سے نکل نہ سکے گی۔ اس کے بازو پروین کی ہڈیاں اور پسلیاں توڑ کر رکھ دیں گے۔ پروین کی یہ غلطی تھی کہ وہ ایسے لباس میں آئی تھی کہ بے لباس معلوم ہوتی تھی۔ اسے اس لباس میں دیکھ کر کسی

بھی مرد کا جذبات پر قابو پانا مشکل تھا۔ اب کیا کیا جا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ جو بھی واقعہ پیش آئے اسے پروین کو ہر حال میں برداشت کرنا اور سہنا بھی تھا۔

قد آور شخص نے اپنے ریوالور سے ہم دونوں کو کشتی کے کیبن کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ میں آگے بڑھا اور کھینچ کر کیبن کا دروازہ کھول دیا۔

وہاں دو افراد اور تھے۔ رشیدہ دیوار کے سہارے ایک سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں اسے یہاں دیکھ کر زیادہ حیران نہیں ہوا۔ لیکن اس کے چہرے کے تاثرات اور اس کی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی دہشت نے مجھے بری طرح دہلا دیا۔ اس کا سارا لباس کیچڑ سے بھرا ہوا تھا۔ اس کا پھٹا ہوا بلاؤز یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اس نے بھاگنے کی کوشش کی ہوگی۔ یہ کسی ایسے شخص کی کارستانی تھی جس کے دل میں رشیدہ اور اس کے لباس اور جسم کے لیے رتی برابر بھی عزت نہ تھی۔ ورنہ اس کا بلاؤز اس طرح پھاڑا نہ جاتا کہ وہ بے حجاب ہو جاتا۔ تاہم اس نے پلو سے اس بے حجابی کو ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے سوجے ہوئے منہ پر جا بجا خراشیں ابھری ہوئی تھیں۔ اس نے مجھے دیکھ کر جس بے تابی سے قدم اٹھایا اس سے یہ بھی ظاہر تھا کہ وہ کافی تھکی ہوئی ہے اور اس کے جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا ہے۔

جانی! اوہ میرے پیارے..... مجھے بے حد افسوس ہے کہ..... لیکن میں کچھ بھی نہ کر سکی۔" رشیدہ نے کہا اور بھاگتی ہوئی میرے بازوؤں میں آ رہی۔ مجھے اس کی ندامت اور اظہار افسوس سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ میں تو اس وقت اس دوسرے شخص کو دیکھ رہا تھا جو رشیدہ کے پیچھے تھا۔ اس شخص نے سفید رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے کالے بالوں میں سے سفیدی جھانک رہی تھی۔ قلمیں بھی سفید اور کالی تھیں اور وہ کیبن کے آخر میں بنے ہوئے کشتی کے کنٹرول بورڈ کے پاس کھڑا تھا۔ کیبن میں کافی روشنی تھی اور اس شخص کا چہرہ صاف دکھائی دیتا تھا۔

مجھے مگر یوں لگ رہا تھا جیسے میری آنکھیں دھوکا کھا رہی ہوں۔ اس طرح کا لباس کمال کا ہو سکتا تھا۔ مگر یہ شخص محسن کمال ہرگز نہیں تھا۔

اس شخص نے ریوالور سے میرا نشانہ لیا اور اس نے ایک قدم بڑھایا تو وہ اور روشنی میں آ گیا۔ اس طرح اس نے اپنی شناخت میرے لیے آسان بنا دی۔ اس کی اس حرکت نے اس کے گنجے سر کو نمایاں کر دیا اور وہ کچھ اور بوڑھا دکھائی دینے لگا۔

"کشتی پر خوش آمدید کہتا ہوں مسافر.....!" ڈاکٹر شاہ جہاں نے کامرانی کے تاثر میں ڈوب کر کہا اور اس کا چہرہ دمک اٹھا تھا۔

رشیدہ کہے جا رہی تھی..... "پیارے! میں کچھ نہ کر سکی۔ مجھے بے بس اور لاچار کر دیا گیا..... نہ صرف میری عزت سے کھیلا گیا بلکہ اس نے مجھے مارا پیٹا۔ عورت کا خیال بھی نہیں کیا بری طرح تشدد کیا۔ باندھ کر رکھا گیا اور سب کچھ بتانے پر مجبور کر دیا گیا۔"

ڈاکٹر نے مدھم آواز میں اپنے آدمیوں کو کچھ احکامات دیئے۔ میرے پیچھے کھڑے ہوئے شخص نے کیبن کا دروازہ بند کر دیا۔ چند لمحوں تک ہول ناک اور بھیانک سکوت طاری رہا۔ صورت حال انتہائی مخدوش تھی۔ میں رشیدہ اور پروین بتیسے کھڑے ہوئے تھے۔

پروین کا چہرہ زرد تھا لیکن اس کی آنکھوں سے خوف کے بجائے حیرت جھانک رہی۔ اس نے مجھے ملامت آمیز نظروں سے دیکھا اور بولی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تم نے جو کہا تھا کہ تم نے کمال کو دیکھا تھا.....؟ کمال کہاں ہے.....؟ وہ تو یہاں موجود نہیں ہے۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اپنی غلط فہمی کے نتائج پر ابھی تک گم صم تھا۔ ڈاکٹر شاہ جہاں نے ایک قہقہہ لگا کر کہا۔

"مس پروین.....! میں ہی کمال ہوں..... میرے سوا

یہ مسافر اجنبی کسی کمال سے نہیں ملا..... یہ غلطی اس نے انسانی فطرت کے تحت کی جو شخص راستے میں ملا اور لفٹ لی اس نے اپنے آپ کو شاید کمال کہہ کر متعارف کرایا۔ پھر اسے ضرب سے بے ہوش کر دیا گیا۔"

پروین نے پہلے تو نفرت اور غصے سے سرخ ہو کر ایک طرف اور پھر دوسری طرف دیکھا اور پھر چلا کر ہذیانی لہجے میں بولی۔

مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس نے تمہیں اسپتال میں نہ پہچانا ہو اور پھر تم گھر پر بھی کئی دفعہ اس کے علاج کے لیے آئے اور مجھے یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ اس نے تمہیں پہچانا نہیں اور اب تم کسی قدر غلط بیانی سے کام لے رہے ہو؟ آخر کس لیے؟ کیوں.....؟"

"مس پروین!" ڈاکٹر شاہ جہاں کہنے لگا۔ "اس اجنبی مسافر کی الجھن ناقابل فہم نہیں۔ اس رات جس شخص نے سر پر ضرب لگا کر بے ہوش کیا۔ اس کا چہرہ اس نے غور سے دیکھا ہی نہیں۔ البتہ اس کے ذہن پر یہ بات نقش تھی کہ اس شخص کا نام محسن کمال ہے۔ جو چند دنوں تک مجروح حالت میں اسپتال میں پڑا ہوا تھا۔ اسے ایک معزز ڈاکٹر شاہ جہاں سے متعارف کرایا گیا تو کیا اس کے ذہن میں یہ خیال آ سکتا ہے کہ اسے زخمی کرنے والا کمال اور ڈاکٹر ایک ہی شخص کے دو روپ ہیں..... نہیں ہرگز نہیں..... خصوصاً اس صورت میں کہ یہ دوسرا شخص یعنی ڈاکٹر اس پہلے شخص محسن کمال سے عمر میں بیس برس بڑا اور بوڑھا دکھائی دے رہا ہو۔"

مجھے دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ ڈاکٹر شاہ جہاں نے کمال عیاری سے مجھے بے وقوف بنائے رکھا۔ اگرچہ اسپتال میں ڈاکٹر کی آواز سنی ہوئی محسوس ہوئی لیکن میں اپنی خستہ حالت کی وجہ سے اس امر پر غور نہ کر سکا تھا اور درد نے بے چین کر دیا تھا۔

"لیکن یہ تو کہتا ہے کہ ایک رات اس پر کمال نے گولی چلائی تھی۔" پروین بولی۔ "اس نے آج رات بھی کمال کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"ہاں۔" ڈاکٹر شاہ جہاں نے مسرور لہجے میں بڑے فخریہ لہجے میں کہا۔ "انسانی نفسیات کا یہ ایک عجیب و غریب واقعہ ہے۔ اس مسافر نے مجھے اسپتال میں ایک ڈاکٹر کے روپ میں دیکھا۔ ایک ایسے ڈاکٹر کے روپ میں جو سر سے گنجا اور بوڑھا تھا۔ یہ مسافر مجھے کسی اور روپ میں دیکھنے کے لیے قطعی تیار نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس نے گھر کے باہر چاند کی روشنی میں ریوالور سمیت ہلکا ٹاپ کوٹ اور ہیٹ پہنے ایک شخص کو دیکھا تو اس کا خیال اس شخص کی طرف گیا جس سے وہ ایک رات مل چکا تھا اور جس نے یہی لباس پہنا ہوا تھا۔ اس مسافر نے غلطی یہ کی کہ مجھے ڈاکٹر شاہ جہاں کے طور پر بالکل پہچان نہ سکا اور مجھے وہی کمال سمجھا جس نے اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ حالات کے اس ارتقا میں میری منصوبہ بندی کا کوئی دخل نہ تھا۔ میں اس رات گھر کے باہر اندھیرے میں رشیدہ سے ملاقات کا انتظار کرتا رہا۔ دروازے پر اچانک مسافر کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پہچانے جانے سے بچنے کے لیے میں نے اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ پر گولی چلا دی۔ پھر یہ جان کر مجھے بڑی حیرت ہوئی اس مسافر نے مجھے کمال سمجھا۔ اس حیرت خیز خبر نے رشیدہ پر دیوانگی طاری کر دی تھی۔ مسافر کی اس غلط فہمی نے اسے عارضی طور پر پاگل کر دیا تھا۔ میں نے اس کی غلط فہمی سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور رشیدہ کو سمجھا دیا کہ وہ اسے اسی غلط فہمی میں مبتلا رکھے آج رات بھی میں نے مسافر کی اس غلطی سے فائدہ اٹھانے کی نیت سے وہی لباس پہنا اور حلیہ اختیار کیا اور اپنا وہ لباس ایک طرف رکھ دیا جس میں بوڑھا اور گنجا ڈاکٹر دکھائی دیتا تھا۔ اس کے بعد میں نے رشیدہ کے کمرے کی کھڑکی پر خشت باری کی تاکہ مسافر یہی سمجھے اس کی تمام تر مصیبتوں کے پس پردہ محسن کمال کا ہاتھ ہے۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب اور کامران رہا۔"

پروین چند لمحے تک اپنے ہونٹوں کو چبائی رہی اور اسے کچھ کہنے میں جیسے تامل سا ہو رہا ہو۔ پھر اس نے سکوت کو توڑا۔

"تم نے کہا کہ رات تم ٹیکسی میں تھے اور لفٹ لی تھی لیکن پھر محسن کمال کہاں تھا.....؟ یہ تو تم نے بتایا نہیں؟"

"کمال وہیں تھا جہاں اسی شام اسے دریا میں اتار گیا تھا.....اور اس کے سر میں گولی کا ایک سوراخ تھا اور اس کے گرد بھاری زنجیر کے کئی چکر دیئے گئے تھے تاکہ اس کی لاش دریا کی سطح پر نہ آسکے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو پھر لاش دریا کی تہ میں نہ ہوتی۔"

پروین حیرت، خوف اور دہشت اور کھلے منہ کے ساتھ اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اپنی زبان سے ہونٹوں کو نم کیا اور وہ اچانک ہی اندھا دھند دروازے کی طرف بھاگ اٹھی۔ دروازے پر کھڑے ہوئے ڈاکٹر کے گرگے نے اسے پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔ لڑکھڑاتی ہوئی کرسی پر جا گری اور پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگی۔

کیبن کے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ایک گرگے نے فوراً ہی باہر کی سمت دیکھا اور ڈاکٹر شاہ جہاں کی طرف رخ کر کے بولا۔

"ڈاکٹر! وہ آگئے ہیں.....؟ کیا میں ان سے کہوں کہ وہ باہر انتظار کریں.....؟"

"نہیں.....ان سے کچھ نہ کہو....." ڈاکٹر شاہ جہاں کی آنکھوں میں جوش کی سی چمک پیدا ہوئی۔ "صرف تم ان کا خیال رکھو۔"

یہ کہہ کر وہ کیبن کے تنگ دروازے سے گزر کر باہر چلا گیا۔ چند لمحوں کے بعد اس سلام دعا کی ہلکی ہلکی آوازوں کے بعد مدھم آواز میں گفتگو شروع ہوگئی۔ جن کی بھنبھناہٹ میرے کانوں تک آتی رہی لیکن الفاظ قطعی واضح نہ تھے لیکن ایسا لگا تھا کہ شاید یہ بردہ فروش ہیں جو رشیدہ اور پروین کا سودا کر رہے ہوں۔ عرب ریاستوں اور دبئی میں یورپی عورتوں کے مقابلے میں ایشیائی عورتوں کی بڑی مانگ تھی۔ وہ دونوں سیکڑوں میں نہیں، ہزاروں اور لاکھوں میں ایک تھیں۔ ہر لحاظ سے.....انہوں نے نگینوں کی طرح شاید اسی لیے وہ قید میں تھیں۔

پروین کی ایک لمبی سی سسکی سن کر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میری ہی طرف آنسو بھری آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے شکوہ شکایت ظاہر ہو رہا تھا۔ اب بھی اس کی خوب صورت آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے اس احمق لڑکی کو بھاگ جانے کا مشورہ دیا تھا لیکن اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ اس کی سزا بھگت رہی تھی۔ اس میں میرا کوئی دوش نہیں تھا۔ اب شاید وہ دل میں پچھتا بھی رہی تھی۔

معاً مجھے احساس ہوا کہ رشیدہ ابھی تک میرے سینے سے لگی کھڑی ہوئی ہے۔ اس کی حالت قابل رحم تھی اور قابل نفرت بھی۔ وہ خوف زدہ بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا چہرہ دھلی چادر کی طرح ہو رہا تھا۔ لہو کی ایک بوند بھی نہیں تھی لیکن اس کے باوجود کہ وہ فریبی تھی میرے سینے میں نفرت اور رحم کے متضاد جذبات اچانک بیدار ہوئے۔ اس نے میرے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ ہر قدم پر مجھے دھوکا دیا تھا۔ ہر قدم پر مجھ سے جھوٹ بولتی رہی تھی.....اس نے صرف مجھے ہی نہیں اس سے محبت کرنے والے ڈاکٹر شاہ جہاں کو بھی دھوکا دیا تھا۔ اب وہ اپنی اس دوعملی کی وجہ سے کہیں کی نہیں رہی تھی۔ دو کوڑی کی عورت نظر آرہی تھی۔ اب وہ نہ اس کی طرف اور نہ میری طرف.....نہ خدا ملا اور نہ ہی وصال صنم.....اب اس میں ایسی کوئی بات نہیں رہی تھی جس پر اسے لعنت ملامت کی جاتی اور کوئی دوش دیا جاتا۔

ایک بات اور بھی تھی کہ میں نے اسے دل کی گہرائیوں سے اس لیے چاہا تھا کہ اس نے میرا ہر طرح سے خیال رکھا۔ خدمت کی اور اپنا تن من بڑی دریا دلی سے سونپ دیا تھا۔ اب میں اسے نفرت سے دھتکار بھی نہیں سکتا تھا

چاہے اس نے میرے ساتھ جو کچھ بھی کیا۔ ایک طرح سے وہ میری محسن تھی اور میں اس کا احسان مند بھی تھا۔ لیکن اب اس کے ساتھ مزید رہنا اور نباہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ کیوں کہ اب ہم دونوں کے راستے جدا اور منزل الگ تھی۔ میں نے جب اسے غیر محسوس انداز سے الگ کرنا چاہا تو اس نے میرے ہونٹوں میں اپنے ہونٹ پیوست کر دیے۔ اس میں اتنی گرم جوشی اور شدت تھی کہ میں اسے الگ نہ کر سکا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ الگ ہوئی تو میں نے کرسی پر بٹھا دیا اور پوچھا۔

"یہ سب کیا ہے رشیدہ! کیا ہمیں یہاں سے کہیں لے جایا جا رہا ہے.....؟"

"ہاں....." وہ مردہ لہجے میں بولی۔ "ہمیں مقتل لے جایا جا رہا ہے....."

"مقتل کی طرف.....؟" پروین یک لخت بڑے زور سے چونکی۔ "وہ کیوں اور کس لیے.....؟ ہم نے کیا کیا.....؟ شاید تم نے .....لیکن اس نے.....؟" پروین نے میری طرف اشارہ کیا۔ "اس نے کچھ نہیں کیا۔ ہم دونوں ہی بے قصور ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہم تمہاری وجہ سے مارے جائیں گے۔"

"تم مجھے قصوروار نہ ٹھہراؤ۔" رشیدہ بولی۔ "سارے حالات تمہارے سامنے ہیں۔ میں خود بھی حالات کی زد میں ہوں۔ تم دیکھ رہی ہو کہ ڈاکٹر شاہ جہاں نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا.....اس جیسا ذلیل شخص کیا تم نے اپنی زندگی میں کبھی دیکھا؟ اسے ڈاکٹر کہنا، آدمی کہنا ان دونوں کی توہین ہے۔ کیا ڈاکٹر ایسا ہوتا ہے.....؟ آدمی ایسا کرتا ہے.....؟ جانتے ہو اس نے میرے ساتھ کیا کیا.....؟ اس حرامی، سور نے مجھے اپنے آدمیوں کے حوالے کر دیا اور کہا اسے لے جاؤ اس کے ساتھ جی بھر کے جشن مناؤ یہ تمہیں اس طرح خوش کرے گی جس طرح ایک فاحشہ کرتی ہے۔ پھر اس کے ساتھیوں نے میرے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا۔ مجھے جیسے حیوان سمجھ لیا تھا۔ میں نے ان کی بڑی منتیں کیں، سماجتیں کیں لیکن ان میں سے کسی ایک نے بھی مجھ پر ترس نہیں کھایا۔ میں نے جب بھی مزاحمت کی اور ان کی گرفت سے نکلنا چاہا مجھ پر تشدد کیا گیا۔ انہی لوگوں نے تو مجھے اس حال میں پہنچایا ہے۔ یہ اب ہم لوگوں کو لے جا کر ایسی جگہ ختم کر دینا چاہتا ہے تاکہ پولیس کو ہمارا سراغ اور لاشیں نہ ملیں۔"

پروین خوف زدہ سی ہو کر میرے پاس آگئی۔ اس کی آنکھوں سے دہشت جھانکنے لگی۔ وہ پھنسی پھنسی آواز میں مجھ سے بولی۔

"کہیں یہ درندے میرے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک درندگی تو نہیں کریں گے جیسا اس کے ساتھ کر چکے ہیں۔ کیا مجھے بھی زیادتی کا نشانہ بنائیں گے؟"

"کیوں نہیں کریں گے.....؟" رشیدہ نے استہزائیہ لہجے میں جلدی سے بولی۔ "کیا تم ان کی بہن لگتی ہو..... سب سے پہلے تو یہ کمینہ، حرامی ڈاکٹر شاہ جہاں تم سے منہ کالا کرے گا.....تم اس خبیث کو اتنا نہیں جانتی ہو جتنا میں جانتی ہوں۔ یہ تمہاری عمر کی لڑکیوں کا رسیا ہے۔ اس نے اسپتال کا سارا ماحول خراب کر رکھا ہے۔ جو نوجوان اور حسین نرس اس کی بات نہیں مانتی تو یہ اسے اغوا کر کے تصویریں بناتا ہے۔ جی بھر کے کھیلتا ہے۔ جب ضرورت محسوس کرتا ہے اپنے فلیٹ پر بلا لیتا ہے لیکن اب اسے اتنی دور جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اب تم اس کی قید میں ہو۔ تم سے جی بہلانے کے بعد وہ تمہیں بطور نذرانہ اپنے ساتھیوں کو خوش کرنے کے لیے پیش کر دے گا۔"

"کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم چلی جاؤ۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم نے میری بات نہیں مانی اور اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔ اب بھگتو۔"

"تم ایسی ستی ساوتری نہیں ہو جو تم ڈاکٹر کی کردار کشی کر رہی ہو یعنی اسے بلاوجہ بدنام اور رسوا کر رہی ہو....."

پروین میری بات کا جواب دینے کے بجائے رشیدہ سے الجھ پڑی تھی۔ اس کے لہجے میں شدید نفرت اور آنکھوں

میں حقارت بھری ہوئی تھی۔ دراصل وہ اس بات سے جل گئی تھی کہ رشیدہ نے اس کی اور کسی کی بھی پروا نہ کرتے ہوئے مجھ سے جذباتی اظہار کیا تھا۔ وہ زہر خند لہجے میں بولی۔ ”ڈاکٹر نے تمہاری سرزنش کی تو تم نے اس پر بہتان باندھ دیا۔ میں جانتی ہوں۔ ڈاکٹر ہرگز ایسا نہیں ہے جیسا تم بتا رہی ہو؟“

”ہاتھ کنگن کو آرسی کیا.....؟“ رشیدہ بولی۔ ”فکر نہ کرو بے بی.....! آٹے دال کا بھاؤ تمہیں جب پتا چلے گا جب ڈاکٹر تم سے دل بہلانے کے بعد اپنے بھیڑیوں کے سامنے اس طرح ڈال دے گا جس طرح کچا گوشت ڈال دیا جاتا ہے۔ وہ حیوان ہیں۔ انہیں اچھے برے کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ ان کے نزدیک عورت اور حیوان میں کوئی فرق نہیں۔ وہ انسانیت کے کسی فلسفے پر یقین نہیں رکھتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے ہیں کہ رحم کیا ہوتا ہے۔ وہ عورت کو جتنی اذیت پہنچا سکتے ہیں پہنچا کر خوش ہوتے ہیں لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟۔ تمہاری زندگی میں بہت سارے مرد آچکے ہیں اور تمہارے دوستوں میں لڑکوں کی کمی نہیں ہے لیکن تم شادی شدہ مردوں کو کچھ زیادہ ہی پسند کرتی ہو۔ اس کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارا دیوانہ بنا ہوا تھا اور اس نے میرے پاس آنا چھوڑ دیا تھا۔ روز بہ روز دور ہوتا چلا گیا۔ اگر تم ہم دونوں کے بیچ نہ آئی ہوتیں تو آج کہانی ہی کچھ اور ہوتی.....“

”تم اپنی زبان کو لگام دو.....“ پروین بھڑک گئی۔ اس کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ ”تو بذات، چھنال..... کتیا ہو جو..... جو.....“ میں نے جھٹ سے پروین کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”یہ تم دونوں کو کیا ہو گیا ہے جو تم ایک دوسرے پر کیچڑ اچھال رہی ہو؟ کیا یہ وقت ہے ان باتوں کا.....؟ ہم تینوں کی جان پر بنی ہے۔ اس بات کی تدبیر اور کوشش کرنی ہے کہ کس طرح ان کے شکنجے سے نکلیں۔“

”میں اسے ڈاکٹر کا اصل چہرہ دکھا رہی تھی کہ مشتعل ہو گئی اور ڈاکٹر کی حمایت میں بولنے لگی۔“ رشیدہ بولی۔ ”یہ ڈاکٹر شاہ جہاں ایسا نہیں ہے جیسا نظر آتا ہے اور جیسا تم سمجھتی ہو۔“

”نہیں..... نہیں.....“ پروین نے نفی میں سر ہلایا اور پریشان لہجے میں بولی۔ ”وہ میرے ساتھ بھلا ایسا کیوں کرے گا.....؟ میں نے اس کا.....“

”اس لیے کہ تم ایک نوخیز عمر کی بھرپور لڑکی ہو۔“ رشیدہ بولی۔ ”ڈاکٹر شاہ جہاں نے اپنی زندگی میں کبھی نیک کام نہیں کیا۔ اس نے میری اور دوسری لڑکیوں کی فلموں سے خوب کمایا۔ ان فلموں کی ہیروئن کے لیے اسے تم جیسی لڑکی کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔“

”کیا.....؟ کیا.....؟“ ”یہ سچ کہہ رہی ہے؟“ پروین سہم کر مجھ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ متغیر ہو گیا اور آواز گلے میں پھنسنے لگی۔

”ہاں..... یہ سچ ہی کہہ رہی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اسے جھوٹ بولنے کی ضرورت کیا ہے۔ اس نے ڈاکٹر کا اصل چہرہ دکھا دیا۔“

”اب..... اب ہم کیا کریں؟“ وہ روہانسی ہو گئی۔

”کاش! میں تمہاری بات مان کر اس موقع سے فائدہ اٹھا کر فرار ہو جاتی۔“

”اب ہم لوگ کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔“ رشیدہ بولی۔ ”کوئی بھی تدبیر کام نہیں آسکتی..... فرار کی تمام راہیں بند ہو گئی ہیں۔“

”تم..... تم.....“ حوصلہ کرو۔“ پروین بگڑ کر بولی۔ ”کوئی نہ کوئی راہ نکل آئے گی۔ ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔“

”خدا کی ذات سے مایوس نہ ہو.....“ میں نے بھی اسے دلاسا دیا۔ ”زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ڈاکٹر شاہ جہاں کے ہاتھ میں نہیں.....“

رشیدہ اسے نفرت اور جلن سے گھورنے لگی۔ اسے یہ گوارہ نہیں تھا کہ پروین محبت کے جذباتی لمحے میں

ڈوب جائے۔ پروین میرے چہرے پر جھک گئی۔ وہ رشیدہ کو جلا رہی تھی کہ..... ”جب تم ایسا کر سکتی ہو تو میں کیوں نہیں کر سکتی۔ یہ تمہاری ملکیت تو نہیں۔“

لیکن یہ محبت بھرے جذبات کے لمحات بہت طویل ہو گئے۔ اس میں اتنی شدت، جذباتیت اور خود سپردگی تھی کہ میں خود پر قابو نہ پا سکا رشیدہ نہ ہوتی اور صرف ہم دونوں ہوتے تو شاید سارے فاصلے مٹا دیتے۔ بہت دور نکل جاتے اور واپس نہیں آتے۔

دروازے پر دو آدمی کھڑے ہوئے تھے وہ ہماری طرف متوجہ نہ تھے اور نہ ہی انہوں نے ہماری گفتگو سنی تھی۔ سنی تھی تو انہیں اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ انہوں نے ہمارے جذباتی مناظر نہیں دیکھے تھے۔ اس لیے کہ دروازے بھڑے ہوئے تھے۔ جب باہر سے تیز آواز آئی تو وہ مجھ سے الگ ہو گئی۔ اچانک باہر سے واضح الفاظ سنائی دیے۔ ”بنگال ٹائیگر کو قرار واقعی سزا دی جائے گی کہ وہ کبھی بھول نہ سکیں گے۔ تم فکر مند اور پریشان نہ ہو..... ان کی ساری توجہ اس وقت کہیں اور ہے اس لیے تمہیں خلیج عبور کرتے ہوئے خطرے والی کوئی بات نہیں ہو گی۔ تم یہ بات مت بھولو کہ یہ ہماری آخری اور سب سے بڑی مہم ہے اور منزل مقصود پہنچنے پر ایک عظیم انعام تمہارا منتظر ہے۔ وہ انعام ایسا شان دار اور زبردست ہے کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ سوچ بھی نہیں سکتے ہو۔ یہ ایک طرح سے سرپرائز ہو گا۔“

”ڈاکٹر! تم نے دل خوش کر دیا۔ میں مبارک باد دیتا ہوں کہ تم نے ایک انتہائی عظیم کارنامہ انجام دیا جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ایسا کارنامہ تمہارے علاوہ کوئی اور انجام نہیں دے سکتا۔ تم نے ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ کیا اس خوشی میں کسی جشن کا اہتمام ہو گا.....؟“

”کیوں نہیں..... کیوں نہیں.....“ ڈاکٹر شاہ جہاں نے پرجوش لہجے میں جواب دیا۔ ”تمہاری مراد کس قسم کے جشن سے ہے؟ کب اور کہاں.....؟“

”جشن اس کو کہتے ہیں جس میں شباب اور شراب ہو۔“ اس نے کہا۔ ”اس کے بغیر جشن، جشن نہیں ہوتا ہے۔ عورت ہی جشن کی جان ہوتی ہے..... تم نے ماضی میں بھی ہمارا بڑا خیال رکھا۔ جن نرسوں کو تم نے راتیں رنگین کرنے کے لیے فراہم کیا تھا بس ایسی ہی نوجوان ہوں۔“

”ویسے میرے پاس ایسی نرسوں کی اور لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔“ ڈاکٹر شاہ جہاں بولا۔ ”تم انہیں دیکھ کر مدہوش ہو جاؤ گے۔“

”لیکن دو ایک پندرہ سولہ برس کی ایسی لڑکیاں تم نے بھیجی تھیں جنہوں نے رو رو کر نخرے دکھا کر، عزت کے واسطے دے کر رات خراب کر دی تھی“ یہ دوسرے مرد کی آواز تھی۔ ”ایسی لڑکیاں تو نہ بھیجو۔ وہ بعد میں اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہیں جیسے ان کی ماں مر گئی ہو۔“

”ان لڑکیوں میں جو بات ہوتی ہے وہ بے حجاب اور والہانہ انداز سے پیش آنے والی لڑکیوں میں کہاں ہوتی ہے۔“ ڈاکٹر شاہ جہاں نے ہنس کر کہا۔ ”یہ نورس کلیاں ہوتی ہیں۔ مجھے تو ایسی ہی لڑکیوں کی تلاش رہتی ہے۔ وہ جتنی مزاحمت، انکار اور نخرے کرتی ہیں اور ایک طرح سے انہیں فتح کرنا مشکل سا معلوم ہوتا ہے لیکن جب وہ مفتوحہ علاقے کی طرح تاخت و تاراج ہو جاتی ہیں تو پھر فاتح بن جانے کا احساس بڑا سرور بخشتا ہے۔ ٹھیک ہے میں آئندہ تم لوگوں کی پسند کا خیال رکھوں گا۔ فکر نہ کرنا جو حکم تم لوگوں کا۔“

”یہ جو عورت رشیدہ ہے ایسی حسین اور پرشباب گداز ہو، پہلے والے نے کہا۔ ”گو پہلے وہ بڑی پارسا بنی، بڑی مزاحمت کی..... گالیاں بھی دیں..... منہ پر تھوکا بھی تھا۔ ہمیں ہنٹر دے کام لینا پڑا۔ اس کا لباس بھی پھاڑ دیا۔ پھر بھی وہ کسی صورت سے کوئی بات مانتی نہ تھی۔ میں نے جب تیزاب کی بوتل اٹھا کر اس کی نظروں کے سامنے لہرائی اور دھمکی دی کہ سیدھی طرح ہماری بات نہ مانی تو نہ صرف تمہارے جسم بلکہ چہرے پر بھی پھینک دیں گے۔ تو

وہ ایسی سیدھی ہوئی کہ اس نے ہماری ہر بات مانی۔ اس طرح خوش کیا کہ وہ ہماری کمزوری بن گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے جشن میں لایا جائے۔ سنا ہے کہ رقص میں بڑی مہارت رکھتی ہے۔ جشن میں وہ نائٹ کلب کا رقص پیش کرے تو کیا بات ہوگی؟"

"عورت بدصورت ہونے سے جتنا ڈرتی ہے اتنا کسی اور سے نہیں۔" ڈاکٹر شاہ جہاں نے کہا۔ "میری زندگی میں بھی کبھی ایسی عورت نہیں آئی۔ وہ مردوں کو خوش کرنے کا فن جانتی ہے۔ کسی بات سے انکار نہیں کرتی ہے۔" جشن میں ضرور شرکت کرے گی۔ جس طرح کا ناچ دیکھنا ہے وہ پیش کرے گی۔ چوں کہ اسے ناچ گانے سے بے انتہا دلچسپی ہے اس لیے وہ مغربی' کلاسیکل اور نائٹ کلب کے رقص بھی جانتی ہے۔"

"ایک اور کلی جو اس وقت کیبن میں موجود ہے اور مہک رہی ہے مجھے وہ پسند آئی۔" دوسرے مرد نے کہا۔ "کیا وحشی حسن ہے۔ میں اس کے ساتھ دو ایک دن تک جشن مناؤں گا اور ساتھ ہی رکھوں گا۔ میں نے اسے ابھی سے بک کرلیا ہے؟ کیا تم نے اس کے وقت گزاری کی ہے؟"

"وہ تمہیں پسند آئی ہے تو میں اسے تمہاری خدمت میں پیش کروں گا۔" ڈاکٹر شاہ جہاں نے کہا۔ "جتنے دن تک اسے ساتھ رکھنا چاہو یہ خوش ہی سے رکھ سکتے ہو..... اب تک ایسا اتفاق نہیں ہوا لیکن میں برابر اس کے حصول کے بارے میں سوچتا رہا تھا لیکن میری دیرینہ حسرت اب پوری ہوگی۔ وہ ایک سیکس بم ہے۔ میں اس کام سے فراغت پا کر سب سے پہلے اس کے ساتھ جشن مناؤں گا۔ وہ وقت زیادہ دور نہیں....."

"اور سنو۔" دوسرے مرد نے کہا۔ "تم باس سے اپنے دوسرے ساتھیوں کا ذکر کرنا نہ بھولنا جو اس مشن کی کامیابی میں اہم کردار رہے ہیں۔ انہیں بھی باس نوازے گا۔ تم بھی باس سے بہت بڑا انعام پاؤ گے۔ باس کی خوشی ہماری خوشی اور انعام ہے۔"

"تم لوگ مجھے اتنا خودغرض نہ سمجھو۔" ڈاکٹر شاہ جہاں نے کہا۔ "میں نے یہ کام کسی انعام کے لالچ میں نہیں کیا ہے۔ میرا کام ہی اصل میں میرا انعام ہے۔ ایک عظیم انعام..... میری یہ اولین کوشش ہے کہ میرے باقی ساتھی بھی اپنا اپنا حصہ وصول کرلیں۔"

"اچھا دوست....." دوسری آواز نے کہا۔ "ہم جا رہے ہیں۔ تم سے جلد ہی ملاقات ہوگی۔ ویسے تم موبائل فون پر رابطہ مت کرنا۔ باس نے بھی منع کیا ہوا ہے۔ کیوں کہ پولیس کے پاس جو مشکوک افراد کی فہرست ہے اس میں ہمارے نام اور موبائل نمبر ہیں۔"

"ہاں..... میں جانتا ہوں۔" ڈاکٹر شاہ جہاں نے کہا۔ "میں اسے اکثر بند کر کے رکھتا ہوں۔ صرف ڈیوٹی دے رہا ہوتا ہوں تو استعمال کرتا ہوں۔ موبائل فون پر کسی سے بات کرنے کے بجائے میں پبلک ٹیلی فون استعمال کرتا ہوں۔"

دوسرے لمحے چاہیں سنائی دیں۔ اس کے مہمان اس طرف عرشے سے جا رہے تھے جہاں ان کی کشتی کھڑی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر شاہ جہاں نے ان سے کہا۔

تم اب چٹاگانگ کے لیے روانہ ہو جاؤ۔ تمہیں راستے میں شاید چیک کیا جائے۔ اس میں فکر اور پریشانی کی کیا بات ہے۔ اصل چیز میرے پاس ہے۔ ان کے فرشتوں کو بھی ہوا نہیں لگے گی میں کپتانی ڈیم سے ہو کر آ رہا ہوں۔ جب کہ وہ راستے میں راہ تک رہے ہوں گے..... اور ہاں کشتی کو ڈاک پر چھوڑ کر ٹیکسی سے چٹاگانگ چلے جانا..... پرائیویٹ ٹیکسی مت لینا۔"

پھر وہ انہیں مزید ہدایت دینے لگا۔ اِدھر پروین کی حالت بڑی غیر ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر لہو کی ایک بوند بھی نہ تھی' وہ سفید ہو رہا تھا۔

"تم نے دیکھ اور سن لیا اور جان لیا کہ ڈاکٹر شاہ جہاں کیسا خبیث' ذلیل اور سور ہے۔" رشیدہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تم اس کی بڑی تعریف کر رہی تھیں۔ میری بات

زہر لگی تھی۔ مبارک ہو..... آج کی رات وہ تمہیں بستر کی زینت بنائے گا۔ پھر وہ تمہیں اپنے ساتھیوں کو تحفہ کے طور پر پیش کردے گا جو گدھ ہیں۔ وہ تمہارے اس خوب صورت رسیلے بدن کے انگ انگ کو نوچ کھائیں گے جن سے مستی ابلی پڑ رہی ہے۔ سارے ارمان پورے کریں گے۔ اب تم ایسا کرنا جیسے ہی وہ خبیث اندر آئے تم اس کے گلے کا ہار بن جانا....."

اس وقت کشتی کے انجن کے اسٹارٹ ہونے کی آواز گونجی۔ ڈاکٹر شاہ جہاں کے ساتھی رنگا ماٹی ڈاک کی طرف چلے گئے۔ دروازہ کھلا ڈاکٹر شاہ جہاں ریوالور تھامے اندر داخل ہوا۔ پھر اس نے مجھ سے کیبن کے آخری میں بنے ہوئے کنٹرول روم کی طرف جانے کو کہا۔ جب میں وہاں پہنچا تو اس نے مجھ سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"میں باہر سے دیکھ رہا تھا تم نے ان دونوں سے خوب بوسہ بازی کی ہے۔ چھوڑو..... خیر ان باتوں کو..... اسے چلاؤ۔"

"کیا....." میں نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے انجان بن کر سوالیہ نظروں دیکھا۔ "میں سمجھا نہیں..... تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"اس کشتی کو چلاؤ۔" وہ برافروختہ ہوگیا۔ "اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے..... ہماری روانگی کا وقت ہو چکا ہے..... اور ہاں دیکھو..... کوئی شرارت نہ کرنا۔ میں تمہارے سر پر کھڑا ہوں۔ تمہاری کھوپڑی کو بجا دوں گا اگر تم نے چالاکی کی تو....."

اس وقت تو میں اس پر قابو پانے کی تدابیر سوچ رہا تھا۔ ایک تو اس کے ہاتھ میں خوف ناک قسم کا ریوالور تھا۔ وہ بے حد چوکنا اور مستعد تھا۔ وہ اس کشتی میں اکیلا ہی تھا۔ اس لیے کوئی ایسا موقع دینا نہیں چاہتا تھا کہ ہم اس پر قابو پالیں۔ اسے زیر کرنا آسان بھی تو نہ تھا۔ صرف ایک صورت ایسی تھی کہ پروین اس کے قریب جا کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس کے چہرے پر جھک جائے۔ وہ ایسا کر سکتی تھی لیکن اس وقت وہ حوصلہ ہارے ہوئے تھی۔ مجھے نگاہوں کی زبان سے اشارہ کرنے کو نہیں ملا۔ وہ مجھے کنٹرول بورڈ پر لے گیا تھا۔ کنٹرول بورڈ کی طرف آتے ہوئے میری حالت بڑی عجیب سی ہوگئی تھی۔ میں نے اپنے متعلق کوئی گفتگو نہیں سنی تھی۔ صرف رشیدہ اور پروین کے بارے میں..... مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ مجھے کپتانی ڈیم پہنچ کر ٹھکانے لگا دیں گے یا پھر راستے میں اکیلا ڈاکٹر ہی گولی کا نشانہ بنا دے گا۔ میری حالت ایسی نہیں تھی کہ میں ڈاکٹر سے گتھم گتھا ہو کر اس پر قابو پالوں اور ریوالور چھین لوں۔

"تم سوچ کیا رہے ہو.....؟" ڈاکٹر شاہ جہاں غرایا۔ "تم نے سنا نہیں۔ میں کیا کہا۔ چلو جلدی سے کشتی چلاؤ۔"

"ڈاکٹر!" میں نے کہا۔ "یہ کوئی سائیکل نہیں ہے جو یوں میں چلا لوں..... میں نے زندگی میں واٹر بوٹ تک نہیں چلائی ہے۔"

"تمہاری یہ تاویل میرے لیے قابل قبول نہیں ہے۔" ڈاکٹر شاہ گرجا۔ "چلاتے ہو یا کھوپڑی میں سوراخ کردوں؟" میں مجبوراً کنٹرول بورڈ پر جا بیٹھا۔ اس خیال سے بھی کہ شاید اس پر قابو پانے کی کوئی تدبیر سوچنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ پھر مجھے یاد سا آیا کہ میں کشتی خوب جانتا ہوں۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد بورڈ کی طرف دیکھا۔ پھر اگنیشن میں لگی چابی گھما دی۔ پھر بٹن دبا دیا۔ کشتی کا انجن گھر گھرانے لگا۔ اس کا انجن اسٹارٹ ہوگیا تھا۔

"تمام بتیاں بجھا دو....." ڈاکٹر شاہ جہاں نے ہدایات دیں۔ "ہم اندھیرے میں سفر کریں گے۔ کشتی کو دریا کے بیچ میں لے چلو..... لیکن اس بات کا خیال رکھنا کسی چھوٹی کشتی سے ٹکرا مت دینا اگرچہ اس وقت ماہی گیروں کی کشتیاں ہوتی نہیں ہیں۔"

یاد کی ایک لہر ایک جھونکا سا ذہن میں آیا اور وہ روشن

ہوگیا۔ چھ برس پہلے میں نے کشتی چلائی تھی۔ کب اور کہاں..... یہ سب کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔ ایک دھندسی تھی اس یاد پر پٹی ہوئی۔ میری حالت بڑی غیر ہورہی تھی۔ پھر مجھے وہ خواب یاد آیا۔ جو میں نے دیکھا تھا۔ جس میں اس جہاز کو حادثہ پیش آیا تھا جس میں سفر کررہا تھا۔ خواب کیا حقیقت ہوتے ہیں؟

میں چوں کہ یادداشت سے محروم تھا اور یہاں آنے کے بعد جو یادداشت تھی اس سے کسی قدر ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ میں نے جو جہاز کے تباہ ہونے اس میں آگ لگ جانے کا جو خواب دیکھا تھا وہ شاید حقیقت ہی ہو۔ برسوں پہلے کی بات جو خواب میں دیکھی تھی۔ گزشتہ دنوں کے عجیب وغریب واقعات نے میرے اعصاب کو پہلے سے کمزور کردیا تھا۔ اب اس واقعے نے اور خوف زدہ کردیا تھا۔ کیوں کہ رشیدہ نے بتایا تھا کہ ڈاکٹر ہمیں مقتل کی طرف لے جارہا ہے۔ نہ صرف مجھے بلکہ ان دونوں کو بھی وہ درندگی اور بے وقتی کا نشانہ بنانے والا تھا۔ میرا دماغ سن سنانے لگا۔ میں خود پر قابو پا کر اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرنے اور تدبیر سوچنے لگا۔

ڈاکٹر شاہ جہاں ایک ایسی جگہ کھڑا ہوگیا جہاں سے وہ ہم سب کو دیکھ سکے اور ہم ریوالور کی زد میں رہیں۔ اس کے ہمارے درمیان فاصلہ تھا۔ پروین جو دیوار کے سہارے کھڑی تھی وہ خوف ودہشت سے کانپ رہی تھی۔ وہ شاید یہ سوچ رہی تھی کہ ڈاکٹر شاہ جہاں اس کی عزت سے کھیلنے والا ہے اس سے کیسے بچا جاسکتا ہے۔ صرف ایک ڈاکٹر شاہ جہاں کی بات تو نہیں ہے وہ اور درندہ مردوں کے بھی حوالے کرنے والا ہے۔ بار بار اس کی آنکھیں اس دروازے کو دیکھ رہی تھیں جس سے باہر جایا جاتا ہے۔ وہ شاید اس موقع کی تاک میں تھی کہ کسی طرح عرشہ پر پہنچ جائے اور پانی میں چھلانگ لگادے۔

"اِدھر آؤ بے بی!" ڈاکٹر شاہ جہاں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر ریوالور کی نال سے اشارہ کیا۔ "یہ تم اتنی دور کیوں کھڑی ہو؟"

پروین ایک دم سے چونکی۔ پھر اس نے بے جان لہجے میں کہا۔ "میں تمہارے پاس آکر کیا کروں گی؟۔ میں یہاں ٹھیک ہوں۔ مجھے یہیں کھڑے....."

"پاس رہ کر بھی اتنی دور.....؟" ڈاکٹر شاہ جہاں نے اسے لگاوٹ بھری نظروں سے دیکھا۔ "یہ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ میرے پاس آؤ تو تمہیں بتاؤں کہ میں نے تمہیں کس لیے اپنے پاس بلایا ہے؟ اس لیے کہ تم میرے دل کے پاس رہو۔ میں تمہیں قریب سے اور غور سے دیکھوں۔"

"میں تم سے اتنی زیادہ دور بھی نہیں ہوں جو تمہیں صاف نظر نہیں آرہی ہوں۔" پروین نے تنک کر کہا۔ "تم وہاں سے دیکھ ہی تو رہے ہو.....؟"

"بات یہ ہے میری جان!....." ڈاکٹر شاہ جہاں نے کسی عاشق نامراد کے انداز سے کہا۔ "اتنی دور سے محبت بھری باتیں نہیں کی جاسکتی ہیں۔ تم ذرا پاس آؤ تو تم سے میٹھی میٹھی اور محبت بھری باتیں کروں۔ محبت بھری باتیں سرگوشی میں کی جاتی ہیں۔ دل بھی تو سرگوشی کرتا ہے۔"

"لیکن میں تم سے محبت بھری نہیں بلکہ نفرت بھری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔" پروین نے تیز لہجے میں کہا۔ "کہو تو تمہیں نفرت انگیز جملے سناؤں؟"

"میں نے سنا ہے کہ عورت کی نفرت میں محبت چھپی ہوتی ہے۔" ڈاکٹر شاہ جہاں معنی خیز انداز سے مسکرایا۔ "چلو محبت نہ سہی..... نفرت ہی سہی لیکن میرے پاس تو آؤ..... میرے دل میں کتنے ارمان ہیں اس کا اندازہ تمہیں میرے پاس میرے قریب آکر ہی ہوگا۔"

"نہیں..... میں نہیں آؤں گی.....؟" پروین بڑبڑیے بولی۔ "میں جانتی ہوں۔ سمجھ گئی ہوں کہ تم مجھے کیوں قریب بلا رہے ہو؟"

"گوری....." جانی..... پھولوں کی ملکہ..... تمہیں آنا پڑے گا۔" ڈاکٹر شاہ جہاں ہنسا۔ "اب جب کہ تم جان گئی ہو تو پھر یہ تکلف کیا؟"

"تمہارے ارادے اچھے نہیں ہیں۔" پروین نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔ "تمہاری آنکھوں سے پتا چل رہا ہے کہ تمہاری نیت کیا ہے؟"

"سنو پروین!" ڈاکٹر شاہ جہاں ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔ "آج کی رات منزل پر پہنچنے کے بعد میرے ساتھ گزارو گی۔ میں شاید تمہیں دو تین دن رکھوں..... پھر تم میرے تین ساتھیوں کا اس وقت تک دل بہلاؤ گی جب تک ان کا دل تم سے نہیں بھر جاتا..... تم میرے ساتھیوں کو بہت پسند آئی ہو..... وہ تینوں تم پر ریشہ خطمی ہوچکے ہیں۔ میں نے ان سے وعدہ کرلیا ہے..... چوں کہ سفر چار پانچ گھنٹوں کا ہے اس لیے میں تم سے من مانی کرنا چاہتا ہوں تاکہ سفر آسانی سے کٹ جائے۔ اس طرح نہ تم بوریت محسوس کروگی اور نہ میں..... اس لیے آجاؤ.....!"

"میں کوئی فاحشہ نہیں ہوں۔" پروین بگڑ گئی اور اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ "میں نہیں آؤں گی..... تم مجھے مجبور اور پریشان نہ کرو۔"

"پروین!" رشیدہ نے اسے سمجھایا۔ "تم اس خبیث مردود اور سور کی بات مان لو..... تمہاری نفرت اور انکار سے کیا تم اس کی ماں بہن کو گالیاں دو تب بھی یہ باز نہیں آئے گا۔ یہ وہ کمینہ ہے کہ اپنی بہن سے بھی دل بہلائے تم نے ایسے حرام زادے کہیں دیکھے ہیں؟"

"تم پر پھر ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا ہے؟" ڈاکٹر شاہ جہاں نے کہا۔ "تم اپنی چونچ بند رکھو اور خاموشی سے دیکھتی رہو۔ اگر تم نے....."

"تم اس کے پاس جاؤ..... وہ تم سے جو کرتا ہے اس پر اف نہ کرو۔" رشیدہ کہنے لگی۔ "تم اسے کسی بات سے روک نہیں سکتی ہو۔ ہم تینوں مجبور اور اس کے رحم وکرم پر ہیں۔ اس کا بال تک بیکا نہیں کرسکتے..... نہ یہاں سے فرار ہوکر جاسکتے ہیں۔ اسے خوش کرو۔"

کیا یہ کمینہ..... شیطان تم دونوں کے سامنے میری بے حرمتی کرنا چاہتا ہے؟ نہیں..... نہیں....." وہ چیخنے لگی۔

"نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں ہوگی؟" ڈاکٹر شاہ جہاں بولا۔ "یہ تمہارا خیال ہے۔ وہم ہے۔ آخر مجھے یہاں دل کے ارمان نکالنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے لیے تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بس دو چار گھنٹے کی بات ہے۔"

"نہ یہاں..... نہ وہاں..... میں تمہاری کوئی آرزو پوری نہ ہونے دوں گی۔" پروین زہرناک لہجے میں بولی۔ "اس میں مت رہنا....."

"پروین.....!" رشیدہ پھر بولی۔ "تم اس کے پاس جاؤ اس کا کلیجہ ٹھنڈا کرو۔ تم خوامخواہ غصے کررہی ہو۔ اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا؟"

"تم چلی جاؤ نا....." پروین نے زہرخند کہا۔ "تمہیں تو مردوں کو خوش کرنے کا فن آتا ہے اس میں تمہیں جتنی مہارت ہے شاید کسی اور کو نہیں ہوگی؟"

"اگر یہ مجھے بلاتا میں چلی جاتی..... جب کہ میں ان روندوں کے ہاتھوں اس قابل نہیں رہی کہ چند قدم بھی چل سکوں۔" رشیدہ بولی۔

"مجھے تمہاری نہیں بلکہ پروین کی ضرورت ہے۔" ڈاکٹر شاہ جہاں نے کہا۔ "میں رشیدہ سے خوب دل بہلا چکا ہوں۔ لیکن تمہاری بات اس میں کہاں؟..... تم سرکش اور بے لگام گھوڑی کی طرح ہو اور تازہ اور پکے ہوئے رسیلے پھل کی طرح..... اب تم میرے پاس آتی ہو کہ نہیں.....؟"

"نہیں..... نہیں....." وہ فرش پر پیر پٹخ کر جذباتی لہجے میں بولی۔ "تم میرا کچھ بگاڑ سکتے ہو بگاڑ کر دکھاؤ۔"

ڈاکٹر شاہ جہاں کھڑا تھا وہاں اس کی پشت پر دیوار میں نصب ایک الماری تھی۔ اس میں کچھ بوتلیں تھیں۔ ان میں شاید کیمیکل تھا۔ اس نے اس میں ایک بوتل نکالی جو شربت کے بوتل کے سائز کی تھی۔ وہ رنگین تھی۔ اس کے اندر کس رنگ کا سیال ہے معلوم نہ ہوتا تھا۔ اس

پر ایک چٹ لگی ہوئی۔ جلی حروف سے اس پر کچھ لکھا ہوا تھا جسے میں اتنی دور سے پڑھ نہیں سکا۔ ڈاکٹر شاہ جہاں نے اس بوتل کے اس حصے کو جس پر چٹ لگی ہوئی تھی پروین کی نظروں کے سامنے لہرایا تو اس کے چہرے پر درندگی ابھر آئی۔

"یہ کیا لکھا ہوا ہے..... تیزاب..... یہ پوری بوتل تیزاب سے بھری ہوئی ہے۔" وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔ "اگر تم میرے پاس نہیں آئیں اور میری بات نہیں مانی تو میں تمہیں تیزاب سے نہلا دوں گا۔ یہاں تمہاری مدد کرنے کے اور ہمارے سوا، چیخیں سننے والا کوئی نہیں ہے۔ پھر میں تمہیں اٹھا کر دریا میں پھینک دوں گا۔ بولو کیا بولتی ہو؟ کیا فیصلہ کیا تم نے.....؟"

"یہ سچ کہہ رہا ہے پروین!" رشیدہ بولی۔ "یہ بہت حرامی شخص ہے۔ ایسے حرامی تمہیں دنیا میں بہت کم ملیں گے۔ اسے کسی کا انکار بالکل پسند نہیں ہے اور پھر یہ عورت کو حیوان اور بہت ارزاں سمجھتا ہے۔ اسے من مانی کرنے دو یا پھر اس کی بربریت کا نشانہ بن جاؤ۔ میرے خیال میں تمہارا اسے خوش کر دینا بہتر ہوگا۔ اس کی بربریت کے عذاب سے بچ جاؤ گی۔ بے وقوفی نہ کرو۔"

پروین کا چہرہ دھلی ہوئی چادر کی طرح ہو رہا تھا۔ اس وقت اس کی حالت مردے سے بھی یہ بدتر ہو رہی تھی۔ تیزاب کی بوتل نے اسے بری طرح وحشت زدہ کر دیا تھا۔ وہ ریوالور سے اس قدر خوف زدہ نہیں ہوئی تھی جتنی تیزاب سے..... وہ دیوار سے ہٹ گئی۔ میری طرف بے بسی سے دیکھا اور بجلی کا کوندا بن کر میرے پاس آئی۔

"تم..... تم کیا مجھے اس سور سے بچا نہیں سکتے؟"

"سنو۔" میں نے سرگوشی میں اسے مشورہ دیا۔ "تم اس کے پاس جاؤ اسے من مانی کرنے دو۔ موقع پا کر ریوالور....." میں اتنا ہی کہہ سکا۔

ڈاکٹر شاہ جہاں میری آواز اور الفاظ سن نہ سکا تھا۔ البتہ پروین کی سمجھ میں میری بات آ گئی تھی۔ پھر وہ مڑی اور ڈاکٹر شاہ جہاں کی طرف بڑھی۔ پھر چمکتی، تھرکتی اور مچلتی اور لہراتی ہوئی، ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں خود سپردگی لیے اس کی طرف بڑھی۔

ڈاکٹر شاہ جہاں نے پروین میں جو ایک دم سے تغیر دیکھا تو حیران ہونے کی جگہ بہت زیادہ خوش ہو گیا۔ اس نے الماری میں بوتل رکھ دی۔

"یہ تم نے اسے مشورہ جو دیا وہ کیا تھا؟" ڈاکٹر شاہ جہاں خوش ہو کر بولا۔ "ایک پل میں بدل گئی۔ کیا کوئی جادو کیا اس پر؟"

"میں نے اس سے یہ کہا کہ یہ تم اتنا کیوں من رہی ہو.....؟ جب تم نے مجھے خوش کیا ہے تو اسے بھی خوش کر دو۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ لڑکی بڑی حقیقت پسند ہے اور اس نے تمہارا مشورہ مان کر ہوش مندی کا ثبوت دیا ہے۔" ڈاکٹر شاہ جہاں نے خوش ہو کر کہا۔

"ڈاکٹر شاہ جہاں!" میں نے قدرے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ "تم سے میری ایک درخواست ہے۔ پلیز! اسے منظور نہ کرنا....."

"کیسی درخواست....." ڈاکٹر شاہ جہاں نے متعجب لہجے میں پوچھا۔ "جو کہنا ہے کھل کر کہو۔ میں تمہاری کسی بات کو مسترد نہیں کروں گا۔"

"رشیدہ اور پروین نے تمہیں بہت کوسا اور بہت گالیاں دی ہیں۔ نہ جانے کیا کیا کہا۔ اسے نظر انداز کر دینا۔ انہیں معاف کر دینا۔"

"اوہ....." یہ بات ہے۔" پروین اس کے پاس پہنچ چکی تھی۔ "تم فکر نہ کرو۔ میں لڑکیوں کی گالیاں سن کر خوش ہوتا ہوں۔"

پروین نے ڈاکٹر شاہ جہاں کو مخمور نگاہوں سے دیکھا اور وہ ایک دم سے خوش ہو گیا۔ پھر پروین نے اس کے گلے میں بانہیں حائل کر دیں۔

ڈاکٹر شاہ جہاں اس کے فریب میں نہ آیا۔ اس نے ریوالور والا ہاتھ اس طرح سے پروین سے دور رکھا کہ وہ اس پر جھپٹ نہ سکے۔ پھر اس نے دوسرے ہاتھ سے پروین کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے بازو کے حلقے میں لے اس کی مستی بھری آنکھوں میں جھانکا۔

"بے بی!....." ڈاکٹر شاہ جہاں لحظہ بھر کے لیے اس کے چہرے پر جھکا کر بولا۔ "تمہاری زندگی میں بہت سارے مرد آئیں گے..... جب تین چار گھنٹے بعد ہم دونوں ایک کمرے میں سہاگ رات منائیں گے۔ تب تم کہو گی کہ میری زندگی میں تم جیسا مرد نہیں آیا؟"

ڈاکٹر شاہ جہاں کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن پروین کے ہونٹوں نے اس کے ہونٹوں کو بولنے نہیں دیا۔ پھر ڈاکٹر شاہ جہاں وحشی بن گیا۔ اسے بھنبوڑنے لگا۔ وحشیانہ انداز سے من مانی کرنے لگا۔ رشیدہ اپنی جگہ سے اٹھی تاکہ ڈاکٹر شاہ جہاں کی جذباتی شدت کی کیفیت اور وحشیانہ پن سے فائدہ اٹھا کر اس کے ہاتھ سے ریوالور جھپٹ لے۔ ڈاکٹر شاہ جہاں اس وقت پوری طرح پروین کی طرف متوجہ تھا۔ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گیا۔ پروین اپنا کردار بہ خوبی ادا کر رہی تھی۔

رشیدہ ایک قدم بھی چل نہیں پائی۔ اس کا پیر فرش کے قالین سے الجھا تو وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔ فرش پر گر گئی۔

ڈاکٹر شاہ جہاں نے اس کے گرنے کی آواز سن کر پروین کو ایک طرف تیزی سے ہٹا کر دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ پھر ریوالور تان لیا۔

"کتیا کی پلی....." وہ حقارت بھری نظروں سے رشیدہ کو گھورتا ہوا بولا۔ "تو..... ریوالور چھیننے آ رہی تھی۔"

رشیدہ کی ناکامی نے میری حالت غیر کر دی۔ نہ جانے کیا ہوا کہ میرے حواس جواب دینے لگے۔ میں بے ہوش ہو گیا۔

کافی دیر بعد ہوش آیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ رشیدہ کنٹرول بورڈ پر بیٹھی ہوئی ہے۔ پروین مجھے متفکرانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے بال، لباس اور حلیہ سے میں نے اندازہ کر لیا کہ ڈاکٹر شاہ جہاں نے جی بھر کے من مانی کی ہے اور وہ اپنے منصوبے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔ اس کے چہرے پر بیتے لمحات کا فسانہ صاف پڑھا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے بے حال کر دیا تھا۔

مجھے ہوش میں آتا ہوا دیکھ کر ڈاکٹر شاہ جہاں نے پروین سے کہا۔ "اب یہ ٹھیک ہو گیا ہے۔ دراصل اس پر اعصابی دورہ پڑ گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں اور بہتر ہو جائے گا۔ پروین جان! اب تم کشتی سنبھال لو۔ ذرا میں رشیدہ کو بھی خوش کر دوں۔"

پروین کنٹرول بورڈ کی طرف بڑھی تو رشیدہ اٹھ آئی۔ جب وہ اپنی جگہ جانے لگی تو ڈاکٹر شاہ جہاں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ وہ اپنا بازو چھڑا کر اسے جھڑک کر اپنی جگہ آ بیٹھی۔ وہ بڑی نڈھال سی ہو رہی تھی۔ درندوں نے اس کا جو حال کیا تھا وہ عیاں تھا۔ وہ ابھی تک اپنے آپ کو سنبھال نہ سکی تھی۔ نڈھال تو پروین بھی دکھائی دی تھی لیکن اس نے خود کو سنبھال رکھا تھا۔ مایوس دکھائی نہ دیتی تھی جس سے میں نے یہ محسوس کیا کہ اس کے ذہن میں کوئی منصوبہ پرورش پا رہا ہے۔ وہ عجلت سے کام لینا نہیں چاہتی ہے۔

انجن کی ہلکی ہلکی تر تراہٹ مجھے اپنے جسم میں نمایاں طور پر محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے پیچھے واقع کیبن کی کھڑکی بار بار بج اٹھتی تھی۔ کشتی اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ میں نے ایک بات محسوس کی تھی کہ اس کی وہ رفتار نہیں تھی جس رفتار سے میں نے کشتی چلائی تھی۔ رشیدہ نے اس کی رفتار میں کمی کر دی تھی۔ شاید وہ بھی کچھ سوچ رہی تھی۔ شاید وہ یہ چاہ رہی ہو گی کہ ہم کپتائی ڈیم سورج نکلنے کے بعد پہنچیں۔ اندھیرے میں نہیں..... دن کی روشنی میں بہت فائدہ اٹھایا اور بچا بھی جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر شاہ جہاں نے اس بات کو شاید اس لیے محسوس نہیں کیا ہوگا کہ پروین اس کے ہاتھوں کھلونا بنی ہوئی تھی۔ لہٰذا ڈاکٹر شاہ جہاں کی توجہ

پروین پر رہی تھی اس لیے اسے خیال نہ آسکا۔

پروین بڑی مہارت سے ڈاکٹر شاہ جہاں کی ہدایتوں پر عمل کرتی ہوئی کشتی کو لیے جارہی تھی لیکن میں نے ایک بات محسوس کی تھی کہ کشتی کی رفتار اور کم تھی۔ ڈاکٹر شاہ جہاں اس کی پشت پر کھڑا ہوا شوخیاں کررہا تھا۔ میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ وہ ڈاکٹر شاہ جہاں کی ہر نامناسب حرکت کو برداشت کررہی ہے کہ ریوالور والا ہاتھ سامنے آجائے پر وہ بہت شاطر تھا اور اس نے وہ ہاتھ دور رکھا ہوا تھا۔

میں اپنی خستہ حالت کی وجہ سے دل ہی دل میں اس بات پر مطمئن تھا کہ کشتی چلانے سے نجات تو ملی۔ اس طرح مجھے مہلت ملی تھی کہ میں ڈاکٹر شاہ جہاں پر قابو پا سکوں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کسی طرح ڈاکٹر شاہ جہاں کے ہاتھ سے ریوالور چھین کر اسے گولی ماردوں۔ میرے لیے ایسا مشکل نہ تھا۔ کیوں کہ وہ پروین کی پشت پر کھڑا ہوا تھا مشکل یہ تھا کہ وہ میری چاپیں سن لیتا اور پھر فاصلہ اتنا نہ تھا کہ میں اس پر صبت لگا سکوں اور پھر کمزوری بھی برقرار تھی۔ وہ بڑی مستعدی سے ریوالور تھامے ہمارے سروں پر موجود تھا۔ رشیدہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آئی۔ میرے بالوں کو سہلایا اور میری آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی آنکھوں میں تاسف تھا اور چہرے پر شکستگی اور مایوسی تھی۔ دوسرے لمحے وہ میرے چہرے پر جھک گئی۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

رشیدہ کے ہونٹوں کی نرمی اور تپش میرے ہونٹوں اور پورے چہرے پر محسوس ہوتی رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ میرے متضاد جذبات تھے۔ ایک طرف نفرت تھی۔ دوسری طرف محبت میں تھی۔ اگر ترازو میں وزن کیا جائے تو دونوں پلڑے برابر رہیں۔

"رشیدہ!" میں بڑی آہستگی سے کہا۔ "تمہارے ساتھ جو درندگی اور وحشیانہ سلوک کیا گیا مجھے اس کا بڑا دکھ اور افسوس ہے۔"

"لیکن اب مجھے کسی بات کا دکھ اور افسوس نہیں ہوتا ہے۔" رشیدہ نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے دکھوں کا سمندر پار کیا ہے۔ میرے ساتھ جو ہوا ہے اور آئندہ جو کچھ بھی ہوگا اس کا بھی کوئی دکھ نہیں ہوگا۔ اس سور کو دیکھو..... اس معصوم لڑکی کے ساتھ ہمارے سامنے کیسی نازیبا حرکتیں کررہا ہے..... پتا نہیں اس کا باپ کون تھا؟ کیسا تھا.....؟ اس کی ماں بھی کون تھی.....؟ ڈاکٹر کی رگوں میں جو خون دوڑ رہا تھا وہ شریف ماں باپ کا نہیں ہوسکتا۔ اس کی ماں ایکٹرتھی۔ یہ تو میں جانتی ہوں۔ اس کا باپ کیا تھا یہ نہیں جانتی..... وہ بھی اچھا آدمی نہیں تھا۔ اچھا آدمی کبھی بدکار، بدچلن اور فاحشہ عورت سے شادی نہیں کرسکتا۔ ڈاکٹر کی ایک بہن ہے نیلم..... وہ چالیس برس کی ہے۔ اس کی نوجوان بیٹی ڈول ہے۔ یہ لڑکی بھی ناجائز اولاد ہے۔ اس کی ماں اور بیٹی نے بڑا نام پیدا کیا۔ ان کی زندگی میں کتنے مرد آئے انہیں خود نہیں معلوم..... اس کی بہن اور بھانجی کی فلمیں وڈیو کیسٹ میں شہر کی ہر دکان پر بلکہ پورے دیش میں کرائے پر ملتی اور بکتی بھی ہیں۔ خوب صورت بلا..... آسامی بلی کے نام سے..... لیکن بھائی کو کبھی شرم نہیں آئی۔ کیا معلوم اس نے یہ فلمیں دیکھی بھی ہوں اور....."

"اوہ کتیا.....!" ڈاکٹر شاہ جہاں اپنی جگہ زور سے چیخا۔ "زبان بند کرو ورنہ تیری ٹانگیں چیر کر سمندر میں پھینک دوں گا۔"

"تم جا کر اپنی جگہ بیٹھ جاؤ۔" میں نے رشیدہ سے کہا۔ "مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ان معلومات سے کرنا کیا ہے۔؟"

"میں تمہیں اس خبیث کا اصل چہرہ دکھا رہی ہوں۔" رشیدہ نے کہا۔ "ایسے کمینے سے کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ اس کے نزدیک ایک عورت کی عزت اور حرمت کیا معنی رکھتی ہے۔ میں کوئی نئی بات کررہی ہوں۔ پھر بھی یہ بے شرم دنیا کو اپنا گھناؤنا چہرہ دکھا رہا ہے۔"

"رشیدہ!..... بس کرو۔" میں نے اس کا ہاتھ تھام کر

کہا۔ "یہ باتیں سن کر ڈاکٹر مشتعل ہورہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں شوٹ کردے؟"

"شوٹ کردے گا.....؟ ہرگز نہیں۔" وہ بڑی بے نیازی سے بولی۔ "وہ مجھے اس لیے نہیں مار سکتا کہ اس نے اپنے ساتھیوں سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ وہ مجھے اپنا یہ مشن کرنے کے بعد خوش کرنے کے لیے بطور نذرانہ پیش کرے گا اور پروین کو بھی..... ہم نے اس کی گفتگو سنی ہے۔ میں انہیں اس طرح سے خوش کیا ہے کہ کوئی اور عورت نہیں کرسکتی۔ اس لیے میں ان کی ضرورت اور کمزوری بن گئی ہوں۔"

"مجھے نیند آرہی ہے اور بڑی نقاہت سی محسوس ہورہی ہے۔" میں نے ٹالنے کے خیال سے کہا۔ وہ ڈاکٹر شاہ جہاں کے وجود پر انگارے رکھنے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ جیسے دل کی بھڑاس نکال رہی تھی اور انتقام لے رہی تھی۔

رشیدہ نے میرے چہرے پر طویل ترین بوسہ دیا۔ پھر میرے بالوں کو سہلایا۔ پھر میرا ہاتھ تھام کر اور اُسے چوم کر اپنی جگہ کی طرف بڑھ گئی۔

میں نے ڈاکٹر شاہ جہاں کی طرف دیکھا۔ وہ رشیدہ کو بڑی نفرت، حقارت اور قہر آلود نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ رشیدہ کو شوٹ کردیتا لیکن اس کی مجبوری یہ تھی کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اسے قتل کرنے سے قاصر تھا۔ کیوں کہ رشیدہ کا جادو اس کے ساتھیوں پر چل گیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ وقت گزارنا اور اپنے لمحات رنگین کرنا چاہتے تھے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ ایک ایسی پرکشش اور ہیجان خیز عورت تھی، مرد جسے دیکھتے ہی دل تھام لیتا تھا۔ جس مرد کو وہ ایک بار خوش کردے وہ دوبارہ اس کا طالب ہوجاتا تھا۔ اس کا بجلی بھرا بدن مردوں کو خاکستر کردینے والا تھا۔ رشیدہ نے اس کی ماں، باپ، بہن اور بھائی کے بارے میں بتا کر جلتی پر تیل گرا دیا تھا۔ رشیدہ نے جو میرے ساتھ جذباتی محبت کی تھی اس نے بھی ڈاکٹر شاہ جہاں کو بہت بری طرح تپا دیا تھا۔

پروین اور رشیدہ کو وہ ختم کرنے سے رہا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو بھی پروین سے نوازنے کا وعدہ کیا تھا لیکن میری سلامتی کی کوئی گارنٹی نہیں تھی۔ میں تو اس کے لیے ایک فالتو چیز تھا۔ اس نے ابھی تک کسی مصلحت کی بنا پر مجھے ٹھکانے نہیں لگایا تھا۔ نیم تاریکی میں آنکھیں کھول کر تکتے ہوئے اور سوچتے ہوئے میری نگاہیں گیسولین کے ایک گیلن کے ڈبے پر مرکوز ہوگئیں۔ یہ ڈبا میرے پاؤں ساتھ کے اور دیوار کے پاس رکھا تھا تاکہ ضرورت کے وقت اسے لینے کیبن سے باہر نہ جانا پڑے۔ اس ڈبے پر سرخ دوشنائی کے حروف سے واضح تھا کہ اس میں گیسولین ہے۔ ملگجے رنگ کا یہ ڈبا میری نگاہوں کے سامنے تھا اور مجھے خیال آرہا تھا کہ شاید ڈبا اس مقصد سے رکھا گیا ہو کہ جب ڈاکٹر شاہ جہاں اپنی منزل پر پہنچ جائے تو اس گیسولین سے کشتی کو آگ لگا کر دریا میں ڈبو دے مجھ سمیت..... یہ ظاہر تھا کہ منزل پر پہنچنے کے بعد اسے نہ تو میری ضرورت تھی اور نہ ہی اس کشتی کی۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔

اندھیرے میں رشیدہ نے کسمساتے ہوئے اپنے تار تار لباس کو دیکھا اور ایک سرد آہ بھری۔ "میری جان سو نہیں گئے؟"

"نہیں....." میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ویسے نیند آرہی ہے۔ تم میرے پاس نہ آنا اور نہ ہی میرے جذبات سے کھیلنا۔"

"یہ تم نے اندازہ کیا کہ..... یہ سور، خبیث ہمارے ساتھ کیا کرنے والا ہے۔ اس کے تہور اچھے نہیں۔" وہ بولی۔

"اس سے پوچھو..... لیکن یہ نہیں بتائے گا۔ کیوں کہ اس کا یہ مشن بہت ہی اہم نوعیت کا بلکہ آخری بھی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

پھر رشیدہ اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اس وقت ڈاکٹر کا کیبن سے باہر جھانک رہا تھا۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

"ڈاک..... تم جانتے ہو کہ میں نے تم سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی..... میں تو تمہیں ساری باتیں بتا چکی ہوں۔ تم سے کوئی بات نہیں چھپائی پھر کہہ رہی ہو..... میں تمہیں بتانے کے لیے آ رہی تھی۔ بھاگ نہیں رہی تھی لیکن تم نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ تم نے اپنے درندہ صفت ساتھیوں کے حوالے کر دیا اور تم منزل پر پہنچ کر مجھے اور پروین کو بھی....." اس نے اپنا جملہ ادھوڑا چھوڑ دیا۔

ڈاکٹر شاہ جہاں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ پروین کے بالوں کو سہلا رہا تھا۔ اس نے رشیدہ کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔

"رشیدہ!" میں نے تیز آواز میں کہا۔ "تم پتھر سے کیوں فریاد کر رہی ہو بہتر ہے کہ تم خاموش رہو۔ دیکھو آگے کیا ہوتا ہے؟"

میری بات سن کر رشیدہ نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ کشتی کی رفتار پروین نے اور کم کر دی تھی۔ اس کے ذہن میں جو منصوبہ تھا وہ اس پر عمل نہ کر سکی۔ ڈاکٹر شاہ جہاں نے اسے موقع ہی نہیں دیا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر کشتی چلا رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ ڈاکٹر ہے لیکن ایک اسمگلر ہے اور نہ جانے کتنے اسمگلر موجود ہیں جو ملک و قوم کے دشمن ہیں۔ جو گھناؤنا کاروبار کر کے نئی نسل کو اور انسانیت کو تباہ کر کے ذاتی خوشیاں خریدتے ہیں۔ اس خدموم کاروبار کی وجہ سے کتنے لوگ مر نہیں جاتے ہوں گے۔ میں تو ان میں ایک ہوں جو اس ذلیل دشمن کے ہاتھ مارا جاؤں گا۔

میں یہ سب کچھ سوچ تو رہا تھا لیکن میری نگاہیں بدستور گیسولین کے ڈبے پر مرکوز تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے یہ ڈبا مجھے کچھ کرنے کی تحریک دے رہا ہے۔ مجھ سے کہہ رہا ہے کہ..... میں تمہارا ہر طرح سے ساتھ دے سکتا ہوں۔ تم مجھ سے کام لو۔ پھر میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ میرا ذہن بہت تیزی سے سوچنے لگا۔ مجھے گھپ اندھیرے میں اُمید کی کرن نظر آ رہی تھی۔

ڈاکٹر شاہ جہاں چوں کہ جی بھر کے پروین سے من مانی کر چکا تھا۔ اس لیے اب وہ پروین کے کندھوں پر جھک کر کشتی کا کنٹرول خود سے دیکھنے لگا۔ پروین نے اس کی ناشائستہ حرکتوں کو جو برداشت کیا تھا اس نے خلاف توقع بڑی جذباتی آواز مخاطب کیا تھا۔

"ڈاکٹر شاہ جہاں.....! اب جب کہ میں تمہاری ہر خواہش پوری کروں گی اور ایک دوست کی طرح....."

"تم واقعی بہت سمجھدار ذہن اور حقیقت پسند لڑکی ہو لیکن یہ تو بتاؤ کہ اس کتیا اور کتے کی موجودگی میں کیسے ممکن ہے؟" وہ بولا۔

"اس کی ایک صورت یہ ہے کہ تم ان دونوں کو نیچے والے کمرے میں بند کر دو..... میں کشتی ایک کھڑی طرف کر دیتی ہوں۔ جب تک کھڑی رہے گی تمہارا دل بھر نہیں جاتا..... پھر ہم دونوں منزل کی طرف روانہ ہو جائیں گے اس کے بعد تم جو چاہو میں اس کے لیے تیار ہوں گی۔" پروین بولی۔

"ان دونوں کو اس کمرے میں بند کرنے سے ایسا نہ ہو کہ وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر فرار ہو جائیں۔" ڈاکٹر شاہ جہاں بولا۔ "میں رشیدہ کو کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا ہوں۔ یہ کتیا بڑی زبردست چیز ہے۔ حرام زادی بھاگ کر جا رہی تھی۔ میں بروقت نہ پہنچتا تو یہ چکمہ دے چکی ہوتی۔"

"اس کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں ہے۔" پروین بولی۔ "وہ دونوں ایک دوسرے کو تنہائی میں پا کر کھو جائیں گے۔ اِدھر ہم دونوں.....!"

"میں اتنا عجلت پسند بھی نہیں ہوں۔" ڈاکٹر شاہ جہاں نے اپنی دستی گھڑی میں وقت دیکھا۔ "ہم ساڑھے تین گھنٹے بعد منزل پر پہنچ جائیں گے۔ میں رشیدہ کو اپنے مہمانوں کے حوالے کر کے تمہیں اپنے ہاں لے جاؤں گا۔ جہاں ہم سویرے تک زبردست جشن منائیں گے۔ یہ ایسا جشن ہے کہ تم ساری زندگی اس جشن کو اور مجھے بھول نہ سکو گی۔ تم میری عمر اور سفید بالوں پر نہ جاؤ۔ میرے

ارے میں رشیدہ تمہیں بتا سکتی ہے۔"

"ہاں تم نے جو من مانیاں اور شوخیاں کیں اور جس قدر جذباتی محبت کا اظہار کیا اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ تم کیسے مرد ہو" پروین نے تعریفی لہجے میں کہا۔ وہ ڈاکٹر شاہ جہاں کو اپنی ان باتوں سے خوش کر کے اس کا دل مول رہی تھی اس لیے کہ اس کے ذہن میں شاید نادر منصوبہ آ گیا تھا۔ اس نے اپنا جال جیسے بچھا دیا تھا۔ "واقعی تم میں اور ایک نوجوان مرد میں کوئی فرق نہیں لیکن تمہاری بات کسی جوان مرد میں نہیں آ سکتی۔ تم میں نہ صرف مہارت ہے بلکہ سلیقہ اور ایک شائستگی بھی ہے۔ اس لیے میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ تمہاری کسی بات کا برا نہیں مانا۔ رشیدہ اور دوسری عورتیں اور لڑکیاں جو تمہاری زندگی میں آئیں وہ بڑی خوش نصیب تھیں۔"

"اب تم بھی ان میں شامل ہونے والی ہو۔" ڈاکٹر شاہ جہاں نے کہا۔ "تم نے میری بہت تعریف کری۔ جشن منانے کے بعد تمہیں میرے بارے میں اندازہ ہو گا۔"

"یہ جشن کس خوشی میں منا رہے ہو اور مناؤ گے.....؟ تم نے مجھے نہیں بتایا؟" پروین نے کہا۔

"جشن.....؟" ڈاکٹر شاہ جہاں کہنے لگا۔ "میرے خیال میں بتا دینے میں کوئی حرج نہیں۔ کیوں کہ میں تین دن بعد اس دیش سے کسی غیر ملک کو جا چکا ہوں گا اور پھر پولیس کے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت بھی نہیں ہو گا۔ اس ملک سے باہر جانے تک تم اور رشیدہ میرے مہمانوں کی مہمان رہو گی۔ پھر وہ تم دونوں کو کسی عرب ریاست یا پھر دبئی لے جائیں گے۔ وہاں تم جیسے نگینوں کی بڑی مانگ اور قدر ہے۔ وہاں تم نہ صرف عرب شیخوں کا دل بہلاؤ گی بلکہ تمہاری جو وڈیو کیسٹ بنائی جائیں گی وہ ساری دنیا میں فروخت کی جائیں گی۔ میں کسی ڈر اور خوف کے بغیر تمہیں بتا دیتا ہوں تم اس کی راز داری کرنا۔ نہ بھی کرو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"ڈاکٹر شاہ جہاں نے کر گہرا سانس لیا۔ پھر وہ مسرور لہجے میں بتانے لگا۔" بات صرف اتنی سی ہے کہ اس لانچ میں چالیس کروڑ کی ہیروئن ہے۔ میں نے اسے فروخت کر دی ہے۔ اس کی رقم بھی اس کشتی میں موجود ہے۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ یہ رقم اور ہیروئن اس کشتی میں ایسی جگہ محفوظ ہے جس پر کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی۔ کپتائی ڈیم سے ایک کلو میٹر پر میرے مہمانوں کی کشتی ہو گی جس میں یہ ہیروئن منتقل کر دی جائے گی اور یہ ہیروئن....." اس نے رشیدہ کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ میرے مہمانوں کے ساتھ اس ہیروئن کے ساتھ جائے گی اور تم میرے ساتھ..... میں تمہارے ساتھ دو دن تک ہنی مون منانے کے بعد تمہیں اپنے مہمانوں کی خدمت میں ہی بطور تحفہ پیش کر دوں گا۔ دیکھو..... تم اس کا برا نہ ماننا تم ابھی نوجوان ہو۔ اپنی جوانی سے بھرپور لطف اٹھاؤ۔"

"تم اس کے مشورے پر ضرور عمل کرنا۔" رشیدہ نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "اس کی ماں اور بہن اور اس کی بھانجی بھی اس کے مشوروں پر عمل کر رہی ہیں۔ اس کی ماں زندہ نہیں ہے۔ ورنہ وہ بتاتی کہ میری زندگی میں کتنے مرد آئے۔ ہاں اس کی بہن اور بھانجی....."

"او کتیا.....!" ڈاکٹر شاہ جہاں ایک دم بھڑک اٹھا اور تڑختے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تو نے اگر زبان کھولی تو میں....."

"اچھا یہ بتاؤ کہ تم اس کشتی اور اس سارکا کیا کرو گے؟" پروین بولی۔ "رشیدہ نے بتایا تھا کہ یہ کشتی پولیس کی نظروں میں آ چکی ہے؟"

"کرنا کیا ہے۔" وہ سفاک لہجے میں بولا۔ "ان دونوں کو عدم آباد کی طرف روانہ کر دینا ہے۔ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔"

"یعنی....." پروین نے پلکیں جھپکائیں۔ "میں تمہاری بات سمجھی نہیں۔ اس مسافر کے ساتھ تم کیوں یہ ظالمانہ سلوک نا چاہتے ہو؟"

"میں اس کشتی کو بم سے اڑا دوں گا جو انجن روم میں رکھا

ہوا ہے۔" وہ کہنے لگا۔ "یہ مسافر نہیں ہے سانپ ہے۔ بنگلہ دیش میں روزانہ کتنے ہی مر جاتے ہیں۔ اس کے مرنے سے کیا ہوگا؟ اس نے رشیدہ کو زخمی حالت میں بھی اپنا بنا کر خوب عیش کرلیا۔ میرے خلاف ورغلایا اور یہ پیش آنے والی ساری باتوں کا چشم دید گواہ بھی ہے۔ میں نے کمال کو اس لیے راستے سے ہٹایا کہ وہ مجھے بلیک میل کررہا تھا۔ پانچ کروڑ کی رقم مانگ رہا تھا۔ پانچ ٹاکا کی ایک گولی نے مجھے پانچ کروڑ کی رقم سے ہاتھ دھونے سے بچادیا۔"

پروین نے اسے باتوں میں لگا رکھا تھا۔ میرے ذہن میں ایک خطرناک منصوبہ آ گیا تھا۔ اس پر عمل کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ مجھے اللہ کی ذات پر یقین تھا۔ میں کیا ہر وہ شخص جو اللہ پر یقین رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ موت کا دن تعین ہے۔ نہ ایک منٹ پہلے آتی ہے اور نہ ہی ایک منٹ بعد..... اس کے پیش نظر میں اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے تل گیا تھا۔ میں گیسولین کے ڈبے کو غیر محسوس انداز سے اپنے پیر سے اپنی طرف کھسکانے لگا۔ کشتی کے موٹر کی آواز میں ڈبا سرکنے کی آواز جذب ہوگئی۔ اس خیال سے بھی میرا حلق خشک ہو رہا تھا کہ جو ہی آتش گیر گیسولین چلتی ہوئی کشتی کے سلنڈروں تک پہنچی تو کشتی یوں بھک سے اڑ جائے گی جیسے اس پر دو ہزار پونڈ وزنی بم پھینکا گیا ہو۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ڈبے کا منہ کھولا۔ دل کی رفتار خطرناک حد تک تیز ہوگئی تھی۔

ڈاکٹر شاہ جہاں اس وقت پروین پر جھکا ہوا تھا۔ یکا یک وہ میری طرف مڑا۔ پھر وہ تیز لہجے میں بولا۔ "یہ تم اندھیرے میں کیا کررہے ہو؟"

میں نے اسے جملہ مکمل کرنے نہیں دیا۔ گیسولین کا کھلا ہوا ڈبا اس کے منہ پر دے مارا۔ ڈاکٹر شاہ جہاں اس اچانک اور غیر متوقع حملے کے لیے تیار نہ تھا۔ ڈبے کی چوٹ نے اسے بری طرح بوکھلا دیا۔ اس پر سراسیمگی طاری ہوگئی۔

"پارو!" میں نے جذباتی لہجے میں چیخ کر کہا۔ "تم انجن بند کرکے فوراً دریا میں کود جاؤ۔ یہ گولی نہیں چل سکتا..... یہ حرام زادہ اب گولی نہیں چلا سکتا۔ گولی کے دھماکے سے کشتی میں آگ لگ جائے گی۔ اس کی ہیروئن اور رقم بھی کشتی میں موجود ہے۔"

پروین نے فوراً ہی انجن بند کردیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈاکٹر شاہ جہاں اس ڈبے کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہ ڈبا تو پہلے ہی آدھا خالی ہو چکا تھا۔ اس طرف سے وہ مایوس ہوکر میری طرف لپکا اور بائیں ہاتھ کا ایک مکا میری پسلیوں میں جڑ دیا۔ زخمی جسم پر میں مکا کھا کر میں اچھلا اور رشیدہ کے پاؤں سے الجھ کر جو میری طرف آ رہی تھی دروازے سے باہر عرشے پر جا گرا۔ اتنے میں پروین کسی ہرنی کی طرح تیزی سے گزر گئی۔ ڈاکٹر شاہ جہاں تیزی سے لپکا۔ مگر وہ دریا میں کود چکی تھی۔ کپتانی کے ساحل پر بتیاں کچھ فاصلے پر دکھائی دے رہی تھیں۔ ڈاکٹر شاہ جہاں نے میرے قریب آ کر تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "چلو..... کشتی چلاؤ۔"

"گیسولین..... اب کشتی کے انجن تک پہنچ چکی ہے۔ انجن کے چلتے ہی کشتی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی اور اب تمہارا ریوالور دکھانا ہی بیکار ہے۔ دھماکے سے گیسولین آگ پکڑے گی اور ہمارے ساتھ تم بھی ختم ہو جاؤ گے۔ اب آرام سے انتظار کرو۔"

استعمال کے عالم میں ڈاکٹر شاہ جہاں اندھا ہو رہا تھا۔ اس نے میری بات کی کوئی پروا نہیں کی اور ریوالور سیدھا کرنے لگا۔ ستاروں کی دھندلی دھندلی روشنی میں ریوالور کی نال مجھے اپنی طرف اٹھی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اچانک میں نے رشیدہ کے ہاتھ کی گرفت اپنے بازو پر محسوس کی اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتا وہ میرے اور ڈاکٹر شاہ جہاں کے درمیان کھڑی ہوگئی۔ اس وقت ریوالور کی نال نے گولی اگلی۔ شعلہ چمکا اور ریوالور کے دھماکے کے بعد فوراً ہی ایک اور دھماکا ہوا۔ مجھے صرف اتنا یاد تھا کہ رشیدہ گولی کھا کر دہری ہوگئی تھی۔ اس کے بعد

ایک زلزلہ سا آیا اور میں نے اپنے آپ کو گہری تاریکیوں میں ڈوبتا پایا۔

میرے آس پاس دریا کی سطح پر آگ کے شعلے ناچ رہے تھے۔ میں نے جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے۔ مگر مجھے اپنے دائیں ہاتھ میں شدید درد محسوس ہوا اور پھر میں نے بے ہوش ہونے سے پہلے ایک بحری پولیس کی کشتی اپنی جانب آتی ہوئی۔ دیکھی سرچ لائٹ اپنے چہرے پر پڑتے ہی میں بے ہوش ہوگیا۔ یہ کشتی میرے لیے فرشتہ رحمت بن کر آئی تھی۔

دوسرے دن ہسپتال کے ایک کمرے میں میری آنکھ کھلی۔ اس کمرے میں اکیلا نہ تھا۔ پروین میرے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ دل کش انداز سے مسکرائی۔ اس کی آنکھوں میں ان گنت چراغ جل اٹھے تھے۔

"کیسے ہو تم.....؟" وہ کرسی سے اٹھ کر بستر کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے بڑے محبت بھرے انداز سے میرے بالوں کو سہلایا۔

"ٹھیک ہوں۔" میں نے کمزور لہجے میں جواب دیا۔ پھر جواباً مسکرانے کی کوشش کی۔ "تم تو ٹھیک ہو نا.....؟"

"ہاں..... میں بالکل ٹھیک ہوں۔" "تمہارا احسان جس نے مجھے نئی زندگی دی۔"

"زندگی لینے اور دینے والا تو اوپر والا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم تو صرف ایک بہانہ یا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ یہ احسان تو نہ ہوا۔"

"تم نے مجھے پہلے ہی کہا تھا کہ میں چلی جاؤں لیکن میں نے تمہاری بات نہیں مانی لیکن دوسری بات تو مان لی تھی۔" وہ ہنس پڑی تھی۔

اچانک ایک خیال کے زیر اثر میں نے اس سے پوچھا۔ "اچھا یہ بتاؤ۔ کشتی میں کون کون بچا.....؟ رشیدہ اور ڈاک.....؟"

"میں تو پہلے ہی کود گئی تھی۔" پروین نے جواب دیا۔ "نیوی اور کرسٹ گارڈ کی لانچیں رضا گرین کے تعاقب میں آ رہی تھیں۔ معاملہ چوں کہ بے حد نازک تھا اس لیے انہوں نے جلد بازی سے کام نہیں لیا۔ انہیں اس بات کی اطلاع مل چکی تھی کہ اس کشتی میں ہیروئن ہے۔ میرے کودنے کے چند لمحوں کے بعد کشتی ایک دھماکے سے پھٹی اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ تمہیں دریا میں گرتے ہوئے دیکھ لیا گیا تھا۔ تمہیں بے ہوشی کی حالت میں اٹھا لیا گیا۔ پھر فوراً ہی ایک لانچ اور ایمبولینس سے ہسپتال پہنچایا گیا۔"

"لیکن تم نے رشیدہ اور ڈاکٹر شاہ جہاں کے بارے میں نہیں بتایا؟" میں نے پوچھا۔ "وہ زندہ ہیں یا مر گئے ہیں؟"

"ان دونوں میں سے کوئی نہیں بچا۔" پروین نے بتانے لگی۔ "ان دونوں کی لاشیں بعد میں مل گئیں۔ انتہائی مسخ شدہ حالت میں..... تم شاید اس بچ گئے کہ تم عرشے پر تھے۔ وہ ہیروئن اور چالیس کروڑ کی رقم نذر آتش ہوگئی۔ وہ لوگ بھی گرفتار ہوگئے۔ جو ہیروئن لینے آئے تھے۔ مجھے اور رشیدہ کو زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد دبئی لے جا کر عرب شہزادوں کے فروخت کرنے والے تھے۔"

لیکن اس وقت میں کچھ نہ سن رہا تھا۔ مجھے رشیدہ کا خیال آیا تو وہ میرے چشم تصور میں آ کھڑی ہوئی۔ میں اس عورت کو کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ اس کے ساتھ بیتے لمحات گھڑیاں اور دن میرے لیے یادگار اور ناقابل فراموش تھے۔ کیا عورت تھی..... اس نے اس محبت کی خاطر اور میری زندگی کی خاطر قربانی دے کر ڈاکٹر کی گول سینے پر لے لی تھی۔

اس خیال کے ساتھ ہی میرے دل کے تمام گوشوں میں ایک ہوک سی اٹھی۔ اس سے کیا رشتہ تھا؟ محبت کا رشتہ.....؟ اس رشتے نے اسے ایثار اور قربانی پر مجبور کیا تھا۔ میں نے کیا دیا تھا.....؟ محبت..... محبت..... محبت.....!

"تم کیا سوچ رہے ہو؟" پروین نے میرے چہرے پر نگاہیں مرکوز کرکے کہا۔ "تم بہت اداس اور غم زدہ اور

پریشان ہو رہے ہو۔

شاید اس لیے کہ تم دوبارہ زخمی ہو گئے ہو اور ہسپتال میں زیرِ علاج ہو لیکن اب وہ کہانی اور واقعات تمہارے ساتھ دوبارہ پیش نہیں آئیں گے۔ تم جلد ہی ٹھیک ہو جاؤ گے۔" اس نے توقف کر کے مجھے دلاسا دیا۔ "کچھ ہی دنوں میں صحت یاب ہوں جاؤ گے۔ تمہارے بازو تو بھی آرام آ جائے گا۔ ڈاکٹر نے مجھے آج صبح بتایا تھا۔ یہاں تمہارا بہت اچھا علاج ہو گا۔"

"میں اس عظیم عورت رشیدہ کے بارے میں سوچ رہا ہوں جس نے میری زندگی بچانے کی خاطر اپنی جان قربان کر دی۔" میں نے کہا۔

"تم اس عورت کو عظیم کہہ رہے ہو.....؟ اسے شاید ڈاکٹر شاہ جہاں نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔" پروین نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"میں نے بتایا نا کہ اس نے میری خاطر اپنی جان قربان کی ہے۔" میں نے جواب بتایا۔ "تمہیں اصل واقعہ کا کوئی علم نہیں ہے۔ تمہارے کشتی سے دریا میں چھلانگ لگانے کے بعد ڈاکٹر شاہ جہاں نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ وہ میرے سامنے نہ آتی تو میری لاش دریا میں تیرتی ہوئی نظر آتی۔ وہ جیسی بھی تھی جو بھی تھی باطنی طور پر ایک اچھی عورت تھی۔ وہ دراصل محبت کی بھوکی تھی۔ اسے وہ محبت نہ مل سن کر جس کی وہ بھوکی تھی۔ شاید اس نے مجھ میں وہ محبت محسوس کی جس کی وہ متلاشی تھی۔"

"لیکن یہ کیسی محبت تھی جو کئی مردوں کے ہاتھوں آلودہ ہو چکی تھی اور اس نے تمہیں محبت کے نام پر آلودہ بھی کیا۔" پروین بولی۔

"محبت اور جنگ میں ہر بات جائز ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم میری باتوں کا برا نہ ماننا..... ذرا تم اپنا محاسبہ کرو کیا تم نے ایک ایسے شخص سے محبت نہیں کی جو ایک شوہر تھا اور بدکار بھی تھا۔ فوجی وردی پہن کر لڑکیوں اور عورتوں کی زندگی سے کھیلتا بھی رہا اور پھر منشیات فروش اور منشیات کا اسمگلر بھی تھا۔ اس نے تمہاری کم سنی کا خیال بھی نہیں کیا۔ تمہیں آلودہ کیا۔ یہ محبت ہی تھی نا.....؟ محبت اندھی ہوتی ہے۔ ہم کسی کے احسانات کو فراموش نہیں کر سکتے..... میں تمہارا بھی احسان مند ہوں جو تم یہاں میری تیمارداری کے لیے موجود ہو۔"

"تم سچ کہتے ہو۔" پروین نے اپنا سر جھکا لیا۔ "میں محبت کے ہاتھوں لڑکی سے عورت بن گئی۔ اب چھوڑو ان تلخ باتوں، واقعات اور یادوں کو..... جو نہیں ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ اب لکیر پیٹنے سے کیا حاصل؟ ایسی نادانیاں ہو ہی جاتی ہیں۔"

"تم جتنی حسین ہو اتنی ہی سمجھدار بھی....." میں نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم سچ بولتی ہو۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔"

"صحت یاب ہونے کے بعد تم چلے جاؤ گے؟" پروین کی آواز میں لرزش سی تھی۔ اس کی آواز ویران اور دور سے آتی سنائی دی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ وہ سرد ہو رہا تھا۔ اس کے سینے میں سانسوں کا تلاطم ہچکولے کھا رہا تھا۔

"میں ایک مسافر ہوں۔" میں نے کہا۔ "مسافر کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ وہ نگر نگر گھومتا رہتا ہے۔ کیا تمہیں میری روانگی سے افسوس ہو گا؟"

"شاید ہو..... یا نہ بھی ہو۔" اتنا کہہ کر لمحوں تک میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ "آنٹی بیگ کو ہو گا..... وہ تمہیں بہت شریف آدمی سمجھتی ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تم جیسے ہی صحت یاب ہو جاؤ تو مجھ سے ملانے ضرور آنا۔ کیا تم چلو گے؟"

"کیا تم مجھے شریف آدمی نہیں سمجھتیں.....؟" میں نے اس کا ہاتھ سینے پر رکھ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "میں کیا برا آدمی ہوں؟"

"گو کہ تم بہت شریف آدمی ہو لیکن مجھے تمہاری شرافت بڑی عجیب و غریب اور ناقابلِ فہم سی لگی۔" وہ ہنس کر بولی۔

"یہ کیا بات ہوئی.....؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "شرافت عجیب و غریب کیسی ہو گی؟"

"تم نے رشیدہ سے محبت کی اور رشیدہ اور تم نے سارے فاصلے مٹا دیئے اور کوئی حجاب نہیں رہا....." وہ کہنے لگی۔ "میں ایک رات آئی تھی۔ میں نے تم دونوں کو دیکھا تو دل میں تمہیں مورد الزام ٹھہرایا کہ تم نے رشیدہ سے تنہائی سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس وقت مجھے شک سا ہوا تھا کہ تم کمال نہیں ہو۔ اس لیے میں نے یہ دیکھنے کے لیے تم کمال ہو کہ نہیں تمہارے ساتھ خود سپردگی سے پیش آئی لیکن تم نے فائدہ نہیں اٹھایا۔ کمال ہوتا تو ایسا نہ کرتا۔ کوئی اور مرد ہوتا ایسا نہ کرتا۔ اس لیے تم عجیب و غریب شریف آدمی ہو۔"

"لیکن میں اب شریف آدمی نہیں رہا ہوں اور نہ کوئی شخص تمہارا قرب پا کر شریف آدمی رہ سکتا ہے۔" میں نے شوخی سے کہا۔ "تمہارا یہ لباس، جوانی اور شباب یہ سب قتل کے ساماں ہیں۔ لیکن میں نے تم سے من مانی بھی تو کی ہے۔"

"میں نے اس کا برا نہیں منایا۔" وہ بولی۔ "اگر تم بروقت کارروائی نہ کرتے میں اب تک مچھلیوں کی خوراک بن چکی ہوتی۔"

پروین نے میری پرشوق نگاہوں کی تاب نہ لا کر نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا تم صحت یاب ہونے کے بعد کچھ دنوں تک ہمارے مہمان رہو..... میری امی تم سے ملنا چاہتی ہیں۔ وہ سہ پہر کے وقت ہسپتال آئیں گی۔"

"تمہاری امی مجھ سے کس لیے ملنا چاہتی ہیں؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔ "کیا تم نے انہیں میرے بارے میں بتایا تھا؟"

"اس لیے کہ تمہارا شکریہ ادا کریں۔" پروین نے جواب دیا۔ "میں کیا بتاتی۔ بنگلہ دیش کے تمام اخبارات میں تمہارے کارناموں کی خبریں شائع ہوئی ہیں۔ ٹی وی اور ریڈیو کی خبروں میں بھی تمہیں کوریج دی جا رہی ہے۔ ہسپتال میں تمہارا ایک وی آئی پی کی طرح سرکاری خرچ پر علاج کیا جا رہا ہے۔ اس وقت تم ہیرو بنے ہوئے ہو۔ ہیروئن تو ضائع ہو گئی لیکن وہ بریف کیس جو فائر پروف تھا جس میں چالیس کروڑ کی رقم تھی وہ مل گئی اور حکومت تمہیں پچاس لاکھ کا انعام دے گی۔"

اگر رشیدہ زندہ بچ گئی تو میں اسے اس میں سے نصف رقم دے دیتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں وہ انعامی رقم خیر سگالی کے طور پر سیلاب زدگان کے فنڈ میں دے دوں گا۔ مجھے رقم کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ نے اتنا کچھ دیا ہے کہ وہ میری اکیلی ذات کے لیے بہت ہے۔"

"تمہارا دل تو بہت بڑا ہے۔" پروین نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "پچاس لاکھ کی رقم کم نہیں ہوتی ہے۔ تم تو حاتم طائی ہو۔"

"پروین!..... بات یہ ہے کہ دولت جتنی اچھی چیز ہے اتنی خراب بھی....." میں نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔ "اس کی زیادتی انسان میں ہوس اور بہت ساری خرابیاں پیدا کر دیتی ہے۔ اس لیے میں اس سے بہت دور بھاگتا ہوں۔"

"تم کتنے اچھے ہو۔" پروین نے فرطِ مسرت سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ایک چاق و چوبند نرس دو ڈاکٹروں کے ساتھ داخل ہوئی۔ اس نے اور پھر دونوں ڈاکٹروں نے مجھے سلام کیا۔ رسمی طور پر خیریت دریافت کی۔ پھر میرا معائنہ کیا اور چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہی نرس آئی۔ جس نے مجھے ایک انجکشن دیا۔ ایک گولی کھلائی پھر میں تھوڑی دیر بعد گہری نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

میں صبح نو بجے سویا تھا۔ دوپہر ایک بجے بیدار ہو گیا۔ وہ نرس جس کا نام یاسمین تھا کمرے میں موجود تھی اور کرسی پر بیٹھی کوئی بنگلہ کا ناول پڑھ رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر بعد میرے لیے لنچ لے آئی۔ دو بجے میرا کمرا پریس والوں سے بھر گیا۔ ٹی وی والوں نے میرا انٹرویو لیا۔ فلم بنائی،

پریس والوں نے انٹرویو لیا اور تصویریں بھی بنائیں۔ وہ اس بات سے بہت خوش ہوئے کہ میں پچاس لاکھ ٹاکا کی انعامی رقم سیلاب زدگان فنڈ دے دوں گا۔ انہوں نے میرے اس جذبے کی بڑی تعریف سہ پہر کے وقت پروین اپنی ممی کو ہسپتال لے آئی۔ اس وقت پریس کے لوگ جا چکے تھے۔ اس کی ممی ایک جوان اور بہت حسین عورت تھی۔ متناسب بدن کی وجہ سے اس کی عمر کا پتا نہیں چلتا تھا۔ وہ پروین کی ماں نہیں بہن لگتی تھی۔ وہ کافی ماڈرن تھی۔ ایک ایسی عورت کو جو ایک جوان لڑکی کی ماں ہو ایسا لباس نہیں پہننا چاہیے جس سے بے حجابی ظاہر ہو۔ مگر فیشن فیشن ہی ہے۔ عورت فیشن کرتے وقت اپنی عمر نہیں دیکھتی ہے۔ پروین کا سوتیلا باپ کل کسی کام سے ڈھاکا گیا ہوا تھا اس لیے وہ ساتھ نہیں آیا تھا۔ پروین کی ماں ایک دولت مند خاتون تھی۔ وہ مجھ سے بہت اچھی طرح ملی۔ وہ ایک ملنسار عورت تھی۔ بہت دیر تک بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ چلتے وقت اس نے مجھ سے کہا کہ میں صحت یاب ہونے کے بعد کچھ دن اس کے ہاں مہمان رہوں۔

پروین کی ماں کا نام گلنار تھا۔ وہ چلی گئی پروین رات دس بجے تک ہسپتال میں رہی۔ اس نے ڈنر ایک ہوٹل کو فون کر کے منگوایا تھا۔ اس کے جانے کے بعد نرس آئی۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں کافی بہتر ہوں۔ نرس کے جانے کے بعد واش روم سے ہو کر نکلا تو میرا پیر راستے میں رکھی کرسی سے ٹکرایا۔ چوں کہ میں توازن قائم نہ رکھ سکا تھا اس لیے میر سر دیوار سے ٹکرایا۔ چوٹ ہلکی سی تھی۔ میں نے بستر میں جانے سے پہلے شیشے میں ماتھا دیکھا۔ وہ صاف تھا۔ کوئی گومڑ وغیرہ نہ تھا۔ میں نے نرس کو گھنٹی کا بٹن دبا کر بلانا مناسب نہیں سمجھا۔ بستر پر دراز ہونے سے پہلے روشنیاں گل کیں۔ صرف نائٹ بلب جلا دیا۔

بستر پر دراز میں ہو کر رشیدہ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ..... اچانک میں نے محسوس کیا کہ میری یادداشت لوٹ آئی ہے۔ صرف وہ یادداشت جس سے میں رنگا ماٹی جاتے ہوئے ٹیکسی کے حادثے سے محروم ہو گیا تھا۔ یاد آیا کہ میں یہاں کیوں اور کس لیے آیا۔ ایک صوفی بزرگ مولانا تنزیل رحمان جو رنگا ماٹی میں ہوتے ہیں۔ وہ روحانی علاج کرتے ہیں اور ان کے پاس موکل بھی ہیں جن کی مدد سے میرے ماضی، میرے والدین اور میرے گھر اور میں اپنی ذات کے بارے میں معلوم کر سکتا ہوں۔ لیکن میں ایسے حالات کے گرداب میں پھنس گیا کہ جو یادداشت تھی اس سے بھی محروم ہو گیا تھا لیکن آج اچانک سر کی چوٹ سے میری یادداشت لوٹ آئی تھی۔ ایک ایک کر کے تمام واقعات یاد آنے اور فلمی مناظر کی طرح گھومنے لگے۔ اب میری خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا تھا۔ پہلی فرصت میں صحت یاب ہوتے ہی مجھے تنزیل الرحمان صاحب کی خدمت میں باریاب ہونا تھا۔ میں دل میں دعا کرنے لگا کہ وہ مجھے میرے اور گھر والوں کے بارے میں بتا دیں۔

پھر مجھے یاد آنے لگا کہ میں کن کن پر اسرار قوتوں کا مالک ہوں۔ میں یہ نہیں جانتا تھا کہ ان پر اسرار قوتوں کا مالک میں کیسے بنا اور کس نے مجھے بتایا۔ یہ تو تنزیل الرحمان ہی بتا سکتے تھے۔ البتہ میں کسی کی بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی آنکھوں سے وہ تمام مناظر کا پتا پل بھر چلا لیتا تھا جو وہ شخص دیکھتا ہے۔ میں اپنی اس صلاحیت کو آزما چکا تھا۔ یہ کبھی بھی غلط ثابت نہیں ہوا اور نہ میں ناکام ہوا تھا۔

دوسری صلاحیت یہ تھی کہ میں کسی کے ماضی میں اس کی پیدائش کے وقت پہنچ سکتا تھا اور موجودہ لمحے تک بتا سکتا تھا لیکن یہ کیا المیہ تھا کہ میں اپنے ماضی اور اپنے گھر والوں کے بارے میں پتا نہیں چلا سکتا تھا۔ میں کوشش کرتا تو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔

"تیسری صلاحیت یہ تھی کہ میں ہپناٹائزم کے علوم کا ماہر تھا۔ مجھ میں اتنی قوت پوشیدہ تھی کہ..... سامنے والے کسی

بھی شخص کو پل بھر میں ساکت کر سکتا تھا۔ اس کے ہتھیار ناکارہ، بے اثر ہو سکتا تھا لیکن میں نے ابھی اس صلاحیت کو آزمایا نہیں تھا لیکن اس سے واقف تھا۔ البتہ میں نے خوں خوار کتوں پر اسے آزمایا تھا اور کامیاب رہا تھا۔ وہ کتے مجسمے بنے کھڑے رہ گئے تھے۔

میں نے اپنی دستی گھڑی کو دیکھا جس میں ٹرانسمیٹر موبائل فون اور کیمرا بھی تھا جو ڈیجیٹل تھا۔ اس کے علاوہ میں اس سے ہتھیار کا کام لے سکتا تھا۔ اس میں ایک ایسا بٹن تھا جسے دبانے سے مہلک شعاعیں نکلتی تھیں اور اس ٹرانسمیٹر کی مدد سے میں سیکڑوں اور ہزاروں میل دور کی آوازیں سیٹ کر کے سن سکتا تھا۔ اس میں اور بھی خوبیاں تھیں۔ یہ گھڑی فاخرہ سلطانہ نے دی تھی۔ اسے باس نے دی تھی مجھے دینے کے لیے..... یہ کروڑوں کی مالیت کی تھی لیکن دیکھنے میں عام سی رسٹ واچ تھی۔ میں نے دیکھا۔ اس کا مین بٹن بند تھا جس کے باعث میرا رابطہ فاخرہ سلطانہ، باس اور ساری دنیا سے کٹا ہوا تھا۔ اس کا بٹن کیسے بند ہو گیا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر کھلا ہوا ہوتا تو فاخرہ سلطانہ اب تک میری مدد کو پہنچ چکی ہوتی۔ میں نے کشتی میں اس گھڑی سے اس لیے کام نہیں لے سکا تھا کہ میں اس کے بارے میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ یہ حیرت کی بات تھی کہ میں نے کسی بھی حالت میں اسی گھڑی کو اتارا نہیں تھا اور نہ ہی اس کا خیال آیا تھا۔

مجھے جو مسرت ملی تھی اس کا اندازہ اور احساس میرے علاوہ کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔ میں جب تک ہسپتال سے صحت یاب نہیں ہو جاتا میں تنزیل الرحمان صاحب سے ملنے جا نہیں سکتا تھا۔ مجھے رنگا ماٹی میں ان کا ایک بار بھی خیال نہیں آیا تھا اس لیے کہ میں اپنی یادداشت سے محروم تھا۔ اب مجھے پھر رنگا ماٹی جانا تھا جہاں سے بڑی تلخ یادیں وابستہ تھیں۔

مجھے یادداشت کیا ملی میں مارے جوش کے رات کافی دیر تک سو نہیں سکا۔ میری توانائی لوٹ آئی تھی۔ میں اپنے آپ کو صحت مند سا محسوس کر رہا تھا لیکن میری پوشیدہ اور پر اسرار قوتوں میں ایسی کوئی صلاحیت نہیں تھی جس سے میں اپنے زخموں اور بیماری کا علاج کر سکوں۔ اب مجھے ہسپتال میں اس وقت تک رہنا تھا جب تک میرے زخم مندمل نہیں ہو جاتے اور دور نہیں ہو جاتا۔

صبح نرس یاسمین میرے لیے ناشتہ لے کر آئی تو میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا تم نے تنزیل الرحمان صاحب کا نام سنا ہے؟ انہیں جانتی ہو؟"

"انہیں کون نہیں جانتا۔؟" یاسمین نے جواب دیا۔ "وہ بڑے مشہور اور برگزیدہ بزرگ ہیں اور بڑی ہی قابل احترام ہستی ہیں۔"

"میں نے سنا ہے کہ وہ رنگا ماٹی میں رہتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "میں ان سے ملنے آیا تھا اتنی دور سے۔ میں ٹھیک ہوتے ہی جانا چاہتا ہوں ان سے ملنے کے لیے..... کیا تمہارے جاننے والوں میں کوئی ایسا شخص ہے جو مجھے ان سے ملانے لے جائے۔ میں اسے کچھ پیش بھی کر دوں گا۔"

"میرا چھوٹا بھائی کل ہی رنگا ماٹی سے آیا ہے اور وہ کل جانے والا ہے۔" وہ کہنے لگی۔ "وہاں اس کی اسٹیشنری کی دکان ہے۔ وہ آپ کو ان سے ملا دے گا لیکن آپ کو ابھی آرام اور علاج کی ضرورت ہے۔ جب آپ صحت یاب ہو کر ڈسچارج ہوں گے میں اسے بلا لوں گی۔ تب آپ اس کے ساتھ چلے جائیں۔ میرا بھائی ان کے مریدوں میں سے ہے اور ان کا بڑا معتقد بھی ہے۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا تم اسے آج ہی ہسپتال بلا کر میرا اس سے تعارف کرا دو۔" میں نے کہا تا کہ میں خود رنگا ماٹی جا کر اس سے مل لوں۔"

میں اسے فون کر کے بلاتی ہوں۔" یاسمین بولی۔ "وہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں آ کر مل لے گا۔ وہ آپ کی ہر طرح مدد کرے گا۔"

کوئی ایک گھنٹے کے بعد اس کا چھوٹا بھائی عبدالجبار مجھ سے ملنے آیا۔ وہ اٹھارہ بیس برس کی عمر کا ہو گا۔ اپنی بہن کی

طرح خوب رو نوجوان تھا۔ باریش تھا۔ داڑھی اس کے چہرے پر خوب جچ رہی تھی اور اس کے چہرے پر تقدس تھا اور متانت تھی۔ اس کی آنکھیں چمکیلی تھیں۔ وہ ایک شریف، متقی اور پرہیزگار بھی معلوم ہوتا تھا۔

جب میں نے اس سے تنزیل الرحمٰن کا تذکرہ کیا تو اس نے بتایا کہ وہ ان دنوں ہندستان تبلیغی مشن پر گئے ہوئے ہیں تقریباً بیس دن ہوئے ہیں۔ وہ اکیلے ہی گئے ہیں۔ کچھ بتا کر نہیں گئے کہ کہاں اور کس جگہ گئے ہیں اور ان کی واپسی کب تک ہوگی۔ وہ سال دو سال میں ایک مرتبہ تبلیغی مشن پر جاتے ہیں۔ ان کی واپسی میں تین ماہ سے چھ ماہ کا عرصہ لگتا ہے۔ وہ چوں کہ دو برس کے بعد گئے ہیں لہٰذا اب ان کی واپسی چھ ماہ سے پہلے بہت مشکل ہے۔ اس سے زیادہ مشکل انہیں تلاش کرنا ہے۔"

اس کی زبانی یہ باتیں سن کر مجھے بہت افسوس، دکھ اور مایوس ہوئی۔ اس کے رخصت ہونے کے بعد میں بہت دیر تک گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں۔ ان کی تلاش میں جانا میرا فضول ہی تھا۔ میں انہیں کہاں کہاں تلاش کروں۔ وہ ایک عظیم ہستی تھی خاموشی سے کام کرنے والے، انہیں نام و نمود کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ اس لیے کہ ان کے نیک کام کا صلہ اللہ دیتا تھا۔ اس سے بڑا صلہ دنیا میں اور آخرت میں بھی کیا ہوسکتا تھا۔ میں نے سوچا شاید اس میں اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی کہ میں خود ہی اپنے آپ کو تلاش کرتا رہوں۔ کسی دن اپنے آپ کو پالوں۔ اب مجھے صبر سے کام لینا چاہیے۔

میں نے فیصلہ کیا کہ صحت یاب ہوتے ہی اب میں واپس چلا جاؤں گا۔ مجھے یہاں رہ کر کرنا بھی کیا ہے۔ میں نہ تو یہاں اپنے آپ کو پا سکتا ہوں اور نہ خزانے کا پتا چلا سکتا ہوں۔ مجھے وہیں واپس جا کر اپنے آپ کو تلاش کرنا ہے۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ میں نے اپنے نتھنوں میں بینی بینی خوشبو محسوس کی۔ کوئی اندر آیا تھا۔ بڑی خاموشی سے۔ اس نے دروازہ بھی بے آواز کھولا تھا۔ اس بینی بینی خوشبو میں جوان بدن کی سوندھی سوندھی خوشبو تھی۔ میں سمجھ گیا کہ نرس یاسمین ہے۔ وہ چوبیس برس کی جوان عورت تھی۔ اس نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔ کیوں نہیں کی اس لیے حیرت کی بات تھی کہ وہ بہت حسین تھی۔ یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ معلوم نہیں اس کی زندگی کیا تھی۔ کیا مسائل تھے۔ میں آنکھیں بند کیے سوچ رہا تھا وہ یہ سمجھی کہ میں سو رہا ہوں۔ اس نے میری نیند خراب کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اس نے میرے قریب آ کر میرے سر کے بالوں میں اپنی مخروطی انگلیاں پھیریں۔ میں دل میں حیران ہوا۔ یاسمین سے اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ کیا معلوم..... وہ مجھے بے حد پسند کرنے لگی ہو۔ ایک انسانی جذبے کے تحت وہ اتنی محبت سے پیش آ رہی ہو لیکن پھر بھی نرس سے اس بات کی توقع ممکن نہیں تھی۔ عموماً ایسا ہوتا نہیں تھا لیکن جب میں نے اپنے ہونٹوں پر گرم گرم ہونٹ محسوس کیے تو میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ ششدر سا ہوگیا۔

وہ یاسمین نہیں پروین تھی۔ دوسرے لمحے اس نے اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں مستی بھری ہوئی تھی اور اس کے یاقوتی لبوں پر ایک شوخ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"سنو پروین!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "تم بھول رہی ہو کہ میں ایک مسافر ہوں۔ کچھ دنوں بعد یہاں سے چلا جاؤں گا۔ یہ تم جس جذباتی انداز سے پیش آ رہی ہو تمہیں زیب نہیں دیتا اور نہ ہی کسی طرح مناسب ہے۔"

"زیب کیوں نہیں دیتا؟" پروین اٹھلا کر بولا اور اس نے اپنے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھام لیا۔ "کیا محبت کرنا جرم ہے؟ کیا بری بات ہے؟"

"اس لیے کہ تم اور میں کبھی جیون ساتھی نہیں بن سکتے اور میں ایک اجنبی بھی ہوں اور مسافر بھی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "محبت کرنا جرم نہیں ہے؟ کیا تم نے کمال کی محبت سے سبق نہیں سیکھا؟ شاید تم نے اور بھی لڑکوں سے محبت کی۔" میں نے اس لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو اس کا سارا ماضی سامنے آ گیا۔ "ان لڑکوں کی محبت راس نہیں آئی۔ وہ بھونرا ثابت ہوئے۔ تم نے اتنی کم سنی میں محبت کے بڑے کھیل کھیلے۔ لیکن تم نے کھویا ہی کھویا ہے۔ پایا کچھ نہیں۔ اب جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔ اب کسی ایک کو اپنا لو۔"

"یہ تم سے کس نے کہا اور کس نے بتایا کہ میری زندگی میں کچھ لوگ آئے اور انہوں نے محبت کے نام پر فائدہ اٹھایا؟" وہ حیران ہو کر بولی۔ "شاید رشیدہ نے بتایا ہوگا۔ وہ میرے بارے میرے میں اچھی رائے نہیں رکھتی تھی اور بڑی مشکوک بھی تھی۔ مجھ سے....."

"رشیدہ نے کچھ باتیں بتائی تھیں۔" میں نے کہا "لیکن میں قیافہ شناس ہوں۔ میں بہت کچھ بتا سکتا ہوں۔ تمہارا چہرہ بتا رہا ہے۔ تمہاری آنکھیں ماضی کے فسانے سنا دے رہی ہیں۔ تم دھول بھرے راستے سے گزرتی رہی ہو۔ تم اس بات سے انکار نہیں کرسکتی ہو۔"

"ہاں..... مجھے اقرار ہے۔" وہ کہنے لگی۔ "تم ہمارے معاشرے سے واقف نہیں ہو اور پھر میں جس طبقے سے تعلق رکھتی ہوں وہاں لڑکیاں بہت ہی آزاد خیال ہوتی ہیں اور پھر محبت میں بھی۔ ایسا ہونا فطری عمل ہے۔ تم جب تک یہاں ہو میں تم سے محبت سے پیش آتی رہوں گی۔ محبت کرتی رہوں گی۔ ایک دوست اور محبوبہ کی طرح اس لیے بھی کہ تم میرے محسن ہو۔"

"تم مجھے دوست سمجھو اور دوستی کا جذبہ برقرار رکھو تو اس سے اچھی بات کیا ہوسکتی ہے؟" میں نے کہا۔ "یہ لیکن دوستی کے جذبہ کو آلودہ نہ کرنا۔"

"اچھا..... میری ایک بات کا سچ سچ اور ایمان داری سے جواب دو۔" وہ بولی۔ "کیا تمہاری زندگی میں کوئی لڑکی نہیں آئی۔ اسے دوستی اور محبت کے نام پر آلودہ نہیں کیا؟ کیا تم نے رشیدہ کے ساتھ ہنی مون نہیں منایا؟ کیا تم پارسا ہو؟"

"دراصل میری زندگی میں ایسے حالات رہے کہ میں حسین اور نوجوان لڑکیوں سے اپنا دامن بچا نہیں سکا۔" میں نے کہا۔ "میرا دعویٰ تو شرافت کا ہے اور نہ ہی پارسائی کا ہے۔ یہ وہ لڑکیاں اور عورتیں تھیں جنہوں نے غرض کے لیے شکار کیا۔ میں ایک طرح سے سیاہ کار ہوں۔ میں کسی کو ورغلا نہیں دیتا لیکن میں اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ کسی کی عورت سے نہ کھیلوں رشیدہ دنیا میں نہیں رہی۔ اس نے پہل اور پیش قدمی کی تھی۔ اس لیے اسے محبت اور ایک ہمدرد دوست اور اور پرخلوص ساتھی کی ضرورت تھی۔"

"جس طرح جنگ اور محبت میں ہر چیز جائز ہے اس طرح دوستی میں بھی۔ لہٰذا تم میرا اور میری دوستی کے جذبات کا خیال رکھ کرو گے؟"

اتنا کہہ کر وہ میرے چہرے پر جھک گئی۔ تھوڑی دیر بعد سیدھا ہو کر بولی۔ "تم جب تک مجھ سے قریب ہو اور میرے سامنے ہو میں اپنی محبت تم پر نچھاور کرتی رہوں گی۔ لہٰذا تم میری کسی بات سے انکار نہیں کرو گے؟"

چوں کہ اس وقت نرس یاسمین کمرے میں داخل ہوئی تھی اس لیے پروین نے فوراً ہی موضوع بدل دیا۔ یاسمین چائے لے کر آئی تھی۔ میں تین دن میں بڑی تیزی سے روبہ صحت ہوگیا تھا۔ ان تین دنوں میں پروین روزانہ ہسپتال آتی تھی۔ وہ دس گیارہ بجے دن آتی اور اس کی واپسی شام کے وقت ہوتی۔ اس کمرے میں ٹی وی بھی تھا۔ وہ میرے ساتھ لنچ کرتی۔ ٹی وی دیکھتی، مختلف موضوعات پر گفتگو کرتی۔ وہ گانے اور گیت بھی سناتی تھی۔ اس کا باپ اب تک مجھ سے ملنے نہیں آیا تھا۔ وہ ڈھاکا ہی میں کسی کام سے رکا ہوا تھا۔ البتہ اس کی ماں دو ایک مرتبہ میری عیادت کو آئی تھی۔ کچھ تحائف بھی لائی تھی۔

جس روز مجھے ہسپتال سے ڈسچارج ہونا تھا اس سے ایک روز پہلے رات کے وقت میں نے دستی گھڑی سے فاخرہ سلطانہ سے رابطہ کیا۔ وہ اس بات سے سخت پریشان تھی کہ

میں نے اسے رابطہ نہیں کیا اور نہ ہی گھڑی آن کی ہوئی تھی۔ میں نے اسے مختصر الفاظ میں بتا دیا تھا کہ میرے ساتھ کیا واقعات پیش آئے تھے۔ اب چوں کہ بار بار آنا مشکل ہے لہٰذا میں کچھ اور دن گزار کے واپس لوٹ آؤں گا۔

فاخرہ سلطانہ نے مجھ سے شوخ لہجے میں پوچھا تھا۔ ”کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی بنگالی ساحرہ نے تمہیں اپنا اسیر بنا لیا ہو؟“

میں نے اسے جواب دیا تھا۔ ”تمہارا جو جادو ہے اس کا توڑ یہاں کسی ساحرہ کے پاس نہیں ہے۔“

مجھے سہ پہر کے وقت ڈسچارج ہونا تھا۔ پروین نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ سہ پہر کے وقت مجھے لینے آئے گی۔ گھر لے جائے گی۔ جب میرے لیے لنچ یاسمین کے بجائے دوسری نرس روزی جو سہ پہر کے وقت چائے لے کر آئی تھی تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ یاسمین ایک بہت ہی اچھی اور مستعد قسم کی نرس تھی۔ مجھے اس سے ایک انسیت سی ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے اپنی نجی زندگی کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ اس نے دو ایک روز پہلے مجھ سے کہا تھا کہ وہ اس ہسپتال کی ملازمت کو خیر باد کہہ کر ریڈ کراس میں ملازمت کرے گی۔ میں نے اس سے پوچھا نہیں کہ کیوں اور کس لیے وہ ایسا کر رہی ہے۔ اس نے مجھے اشارے کنارے میں یہ بتایا تھا کہ یہ ہسپتال شہر کا مہنگا ترین ہسپتال ہے لیکن اسٹاف کی تنخواہیں بہت کم ہیں۔ اس ہسپتال کی آمدنی یومیہ لاکھوں کی ہے۔ مریضوں کو لوٹا جاتا ہے۔ اسٹاف کو کوئی طبی اور دوسری کوئی سہولت اور مراعات حاصل نہیں ہیں۔ بہت کم ٹیکس دیا جاتا ہے۔ اتنا ٹیکس تو ایک درمیانہ درجے کا کلینک دیتا ہوگا۔ بہت سارے مریضوں کو کچے کاغذ پر بل دیئے جاتے ہیں یا جو بل دیئے جاتے ہیں ان کا اندراج اصل کھاتوں میں نہیں ہوتا ہے۔ دو کھاتے ہیں۔ بلیک منی اس ہسپتال کا مالک ہسپتال ہی میں رکھتا ہے۔ اصل منی بھی بینک میں کسی وجہ سے نہیں رکھتا ہے۔ ہسپتال کا مالک، ملک کا ممتاز سرجن اور ڈاکٹر ہے۔ انتہائی بدتمیز مغرور اور بے رحم قسم کا شخص ہے۔ اسٹاف کی جن میں ڈاکٹرز نرسیں اور سسٹرز ہیں ان کی سب کے سامنے بے عزتی اور تذلیل کرنے سے نہیں چوکتا ہے۔ جب کوئی ملازم اڈوانس اور قرض کی درخواست دیتا ہے تو وہ اس کے منہ پر دے مارتا ہے۔ اس کے علاوہ ہسپتال میں اس کی اپنی ڈسپنسری ہے۔ مریض پابند ہیں کہ ادویات جن کی ضرورت مریضوں کو پڑتی ہے وہ اس ڈسپنسری سے خریدیں گے اور پھر ہر ڈاکٹر نرس اور سسٹرز کو ہدایت دی ہوئی ہے اگر چار انجکشن منگوائے گئے ہوں تو ان میں سے دو استعمال کریں بعد میں اس ڈسپنسری میں پہنچا دی جائیں۔ اس طرح دوسری ادویات میں بھی ڈنڈی ماری جائے۔

یاسمین نے جو کہانی سنائی تھی وہ کہانی کراچی کے بڑے اسپتالوں اور پرائیوٹ کلینکس کی بھی تھی۔ مریضوں کی کھال کھینچی جاتی تھی۔ انہیں پوچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ دولت کے حصول کے اندھے جنون نے پاگل کیا ہوا تھا۔ یہ ڈاکٹر نہیں قصائی اور ڈاکو تھے۔ ڈاکو کے دل کے کسی کونے میں رحم اور انسانیت تو ہوتی تھی لیکن ڈاکٹروں کے نہیں۔ ان کے کلینک اور ہسپتال مذبح خانے تھے۔ انہیں کھلی چھوٹ کا لائسنس ملا ہوا تھا۔ وہ یہ بھولے ہوئے تھے کہ انہیں ایک دن مرنا اور خدا کو جواب دہ ہونا ہے۔

روزی کچھ پریشان اور افسردہ سی دکھائی دی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”یاسمین کیوں نہیں آئی؟ وہ صبح تو آئی تھی.....؟“

”یاسمین باجی کو پولیس گرفتار کرنے آئی ہوئی ہے۔“ روزی نے افسردگی سے جواب دیا۔ ”وہ ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں ہے جہاں پولیس انسپکٹر اس سے پوچھ گچھ کر رہا ہے۔ وہ رو رہی ہے اور کمرے میں کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔“

”وہ کس لیے.....؟“ میں نے تحیر زدہ لہجے میں پوچھا۔ ”پولیس انسپکٹر اسے کس لیے گرفتار کرنے آیا ہوا ہے یاسمین نے کیا کیا.....؟“

”اس لیے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس پر الزام لگایا ہے کہ اس نے ان کے کمرے میں جو تجوری ہے اس میں سے بیس لاکھ کی رقم چوری کی ہے۔“ روزی بتانے لگی۔ ”تجوری کی چابیاں میز کی دراز میں تھیں۔ اس نے وہ رقم ہسپتال میں کہیں چھپائی ہوئی ہے۔“

”کیا تمہارے خیال میں یاسمین نے واقعی چوری کی ہوگی؟“ میں نے روزی سے دریافت کیا۔ ”کیا وہ اس قسم کی لڑکی ہے؟“

”جی نہیں..... یاسمین باجی ہرگز ایسی نہیں ہے۔“ روزی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ بڑی نیک اور مخلص اور اچھی نرس ہے۔“

”اگر وہ ایسی نہیں ہے تو ڈاکٹر نے اس پر اتنی بڑی رقم کی چوری کا الزام کیوں لگایا؟“ میں نے روزی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”اصل بات یہ ہے کہ دو دن پہلے زمان بابا نے جو اس ہسپتال میں بیس برس سے چوکیدار ہیں اپنی بیٹی کی شادی کے لیے دس ہزار ٹاکا مانگے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو بہت غصہ آ گیا۔ انہوں نے اس غریب کو خوب لتاڑا۔ گالیاں دیں۔ ذلیل کیا۔ جب کہ اس کا کوئی جواز نہیں تھا۔ انکار کر دیتے۔ یاسمین باجی کو ڈاکٹر صاحب کی بدسلوکی بہت ناگوار لگی۔ انہوں نے احتجاج کیا اور ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ آپ کے لیے دس ہزار کی رقم دس ٹاکا کے برابر ہے۔ وہ بیس برس سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہ بات سن کر وہ بھڑک اٹھے۔ وہ یاسمین باجی کے خلاف کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ اس لیے کہ وہ یونین کی جنرل سیکریٹری ہیں۔ یاسمین باجی نے انہیں خوب سنایا تھا۔ انہوں نے یہ الزام لگا کر اس سے بدلہ رہے ہیں۔“

”ایسا کرو..... تم مجھے اس کمرے میں لے چلو۔“ میں نے کہا۔ ”میں پولیس کو یاسمین کو گرفتار کرنے نہیں دوں گا۔ سے بچا لوں گا۔“

روزی نے مجھے ڈاکٹر شیخ کے کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے بتایا۔ ”یاسمین باجی نے محکمہ صحت کو ایک خط لکھ کر بتایا تھا کہ اس ہسپتال میں مریضوں کو کس طرح علاج کے نام پر لوٹا جاتا ہے۔ دوسرا خط انہوں محکمہ لیبرڈ ویژن کو لکھا کہ اسٹاف کو کوئی سہولت نہیں ہے۔ تیسرا خط انہوں نے انکم ٹیکس کمشنر کو لکھا جس میں انہوں نے یومیہ آمدنی اور دو کھاتوں کے بارے میں بتایا تھا۔“

اب میں سمجھ گیا کہ اصل ماجرا ہے۔ جب ہم ڈاکٹر کے دفتر پہنچے تو وہاں بہت ساری نرسیں اور سسٹرز موجود تھیں اور بھی ملازمین تھے۔ جنہیں یاسمین کی گرفتاری کی اطلاع مل گئی تھی۔ وہ سخت تشویش میں مبتلا تھے اور ایک اضطراب میں تھے۔

دروازے پر جو مسلح کانسٹیبل پہرہ دے رہے تھا اس نے مجھے اندر جانے سے روکا تو روزی اس سے بولی۔ ”ڈاکٹر صاحب نے انہیں بلایا ہے۔“

کانسٹیبل نے روزی کی بات سن کر اس کا یقین کر لیا اور وہ دروازے کے پاس سے ہٹ گیا۔ میں نے روزی کو باہر کھڑے رہنے کا اشارہ کیا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ پھر اسے بند کر دیا۔ یہ بہت بڑا کمرا تھا۔ یہ دفتر تھا اس میں ایک بڑی سی میز تھی جس کے گرد ملاقاتیوں کے لیے چھ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ریوالونگ چیئر پر ڈاکٹر شیخ دھنسا ہوا تھا۔ ملاقاتیوں کی کرسی پر انسپکٹر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے قریب والی کرسی پر یاسمین بیٹھی رو رہی تھی۔ ڈاکٹر کی پشت پر ایک تجوری تھی۔ اس کے ساتھ کتابوں کی ایک الماری تھی۔ اس کے علاوہ کمرے میں تین عدد صوفہ سیٹ پڑے ہوئے تھے۔ یہ کمرہ نہایت آراستہ و پیراستہ تھا۔

ڈاکٹر شیخ نے مجھے بڑی ناگواری سے دیکھا۔ جانے کیوں میرا آنا اسے سخت ناگوار لگا تھا۔ اس کے چہرے پر جو خباثت ٹپک رہی تھی وہ اور بڑھ گئی۔ انسپکٹر نے بھی میری آمد کو پسند نہیں کیا تھا لیکن وہ مجھے پہچان گیا تھا۔ اخبارات میں میری تصویریں جو شائع ہوئی تھی۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر مجھ سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ ”آپ سے مل

کر بڑی خوشی ہوئی۔ اب آپ کیسے ہیں؟"

"مجھے بھی بڑی خوشی ہو رہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں اب بالکل ٹھیک ہوں اور سہ پہر کے وقت میری چھٹی ہو رہی ہے۔"

"آپ کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں؟" ڈاکٹر شیخ نے جز بز ہوتے ہوئے کہا۔ "آپ کچھ دیر بعد تشریف لائیں تو مناسب ہوگا۔" کیوں کہ اس وقت ایک کیس کے سلسلے میں ہم لوگ مصروف ہیں۔ جو بہت ہی اہم نوعیت کا ہے اور بے حد سنگین بھی۔"

"میں اس کیس کے سلسلے میں مس یاسمین کی معاونت کے لیے حاضر ہوا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "مس روزی نے مجھے سب کچھ بتایا ہے۔"

یاسمین جو دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر رو رہی تھی اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے دیکھا۔ حیرت اور خوشی سے۔ اس کا چہرہ دمک گیا۔ اسے جیسے یقین نہیں آیا کہ اس کی مدد کے لیے میں آ سکتا ہوں۔ وہ اس وقت بے یار و مددگار سی تھی۔ ڈاکٹر شیخ اسے اس بات کی سزا دے رہا تھا کہ اس نے محکمہ صحت اور لیبر ڈویژن والوں سے اس کی شکایت کر دی تھی۔ ڈاکٹر شیخ نے ان دونوں محکموں کے کال بھیڑوں کو کھلا پلا کر ان کا منہ بند کر دیا تھا۔ اسے بڑا غصہ آیا تھا کہ ایک نرس نے اس کے خلاف اتنا بڑا انعام کیا۔ اس کی یہ مجال.....؟ آخر اس کی حیثیت ہی کیا ہے۔ میں نے بدلہ لینے اور ذلیل کرنے کے لیے چوری کی واردات کی رپورٹ کر دی تھی۔ وہ اسے جیل کی ہوا کھلانا چاہتا تھا۔

"کیا آپ اس کے وکیل ہیں جو اس کی معاونت کے لیے آئے ہیں؟" ڈاکٹر شیخ نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ کھول رہا تھا۔

"آپ مجھے اس کا وکیل ہی سمجھ لیں۔" میں نے کہا۔ "یہ ایک شریف اور باعزت لڑکی ہے۔ یہ چوری کرے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔"

"آپ کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ اس نے رقم نہیں چرائی.....؟" ڈاکٹر شیخ تلملا کر بولا۔ "آپ اس کی بے گناہی ثابت کرنے آ گئے۔"

"ثبوت ہے اس لیے میں آیا ہوں۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "آپ کے پاس کیا ثبوت ہے؟ آپ کے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ محض بے بنیاد الزام اور بہتان ہے۔ اس کا پس منظر کیا ہے وہ میں جانتا ہوں۔ کیا اتنی بڑی رقم اکیلی ایک لڑکی چرا سکتی ہے؟

"میرے پاس دو عینی گواہ موجود ہیں۔" ڈاکٹر شیخ نے کہا۔ "یہ انسپکٹر صاحب کا کام ہے۔ وہ جانے میں جانوں..... آپ ایک مریض کی حیثیت سے یہاں زیر علاج رہے ہیں۔ آپ کی آج سہ پہر چھٹی ہے۔ آپ کے علاج معالجے پر تین لاکھ دس ہزار ٹا کا خرچ ہوئے ہیں۔ وہ بل ادا کر کے تشریف لے جائیں..... اس کے خلاف جو میں نے رپورٹ درج کرائی ہے اس کا پس منظر کوئی نہیں ہے۔ یہ واردات اس لڑکی نے اکیلی نہیں کی ہے۔ اس کے ساتھ دو اور نرسیں ہیں۔ ان میں مس روزی اور ساجدہ بھی ہے۔"

"میں آپ کے ان دونوں زر خرید گواہوں سے ملنا پسند کروں گا۔ ذرا ان کے چوکھٹے بھی دیکھوں....." میں نے تند لہجے میں کہا۔ "میں یہ بل ادا نہیں کروں گا اور نہ آپ مجھ سے وصول کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ سرکار نے مجھے یہاں علاج معالجے کے لیے داخل کرایا ہے۔ میں ہوم سیکریٹری سے آپ کے خلاف شکایت کروں گا کہ یہاں میرا خاطر خواہ علاج نہیں ہوا۔ آپ کو ایک کوڑی بھی نہیں ملے گی۔ آپ اگر ان تینوں پر الزام ثابت کرنے میں ناکام رہے تو آپ پر تین کروڑ ٹا کا کا ہرجانے کا دعویٰ کر دیا جائے گا۔ آپ یہ بات اچھی طرح سوچ لیں۔"

"اب میں سمجھا کہ اصل بات کیا ہے؟" ڈاکٹر شیخ تپ کر بولا۔ "یاسمین نے آپ پر اپنی محبت کا جادو چلا دیا۔ آپ اس کے حسن و شباب کے اسیر بن گئے۔ آپ دونوں میں شاید تعلقات بھی استوار ہو گئے اس لیے آپ

اس کی معاونت کرنے منہ اٹھائے چلے آئے۔"

میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے منہ پر اتنے زور سے تھپڑ رسید کیا کہ وہ اپنی چیئر سے باہر فرش پر گر گیا۔ وہ اس کے لیے تیار نہ تھا۔ یہ اچانک اور غیر متوقع تھا۔ میرے اس زور دار تھپڑ نے اس کے دماغ کی چولیں ہلا دی تھیں۔ وہ بھونچکا ہو کر سکتے کی حالت میں آ گیا۔

جیسے اس پر کوئی بجلی سی آ گری ہو۔ لمحے کے لیے اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا..... دوسرے لمحے اس کا دماغ درست ہوا تو اس کی کھوپڑی میں آیا کہ اس پر ہاتھ اٹھایا گیا ہے۔ وہ خواب و خیال میں بھی سوچ نہیں سکتا تھا اس پر کوئی ہاتھ اٹھا بھی سکتا ہے۔

چند ثانیوں کے بعد وہ کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تو اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اور اس کی آنکھیں حیرت، خوف اور غصے سے اُبلنے لگیں۔ وہ کرخت لہجے میں چیخا..... "انسپکٹر!..... کیا یہ تماشا ہے جو تم دیکھ رہے ہو..... اس حرام زادے نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا..... کیا تمہیں نظر نہیں آیا۔ اس سور کو دو چار لاتیں مار کمرے سے نکالو اور اپنے آدمیوں سے کہو اسے لے جا کر حوالات میں بند کر دیں اس کے خلاف ایف آئی آر کٹوانے والا ہوں۔ ذرا اس حرافہ سے نمٹ لوں۔ اسے بیس برس کے لیے جیل میں سڑا دوں گا۔"

ڈاکٹر شیخ نے اپنا جملہ پوری کیا تھا کہ میں نے ایک مکا اس کے منہ پر دے مارا۔ اس کا جبڑا سوج گیا۔ وہ درد سے چیخ پڑا۔

"انسپکٹر..... او گدھے..... تو دیکھ نہیں رہا ہے اس نے مجھے دوسرا ہاتھ بھی مار دیا۔ اس کی خبر کیوں نہیں لے رہا ہے؟" وہ جذباتی لہجے میں چیخا۔ اس نے اپنا ہاتھ جبڑے پر رکھ لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ "میں..... میں....." پھر وہ خاموش ہو گیا۔

"میں آپ کو گرفتار کرتا ہوں۔" انسپکٹر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ نے ایک ناموز باعزت اور معزز شخصیت پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ اس کی جان لینے کی کوشش کی ہے۔" وہ توقف کر کے بیلٹ سے ہتھکڑی نکالنے لگا۔

"انسپکٹر!....." میں نے بگڑ کر برہمی سے کہا۔ "تم اس خبیث مردود سے دس ہزار ٹا کا لے کر اس کا حکم مان رہے ہو.....؟ اس سور اور کمینے نے مجھے گالی کیوں دی.....؟ اگر تم نے مجھ پر ہاتھ ڈالا تو تم نہ صرف نوکری سے گئے بلکہ جیل بھی جاؤ گے۔ ہوم سیکریٹری کو میں صرف ایک ٹیلی فون کروں تو تمہارا پتا بھی نہیں چلے گا اور شاید تمہیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ وزیر اعظم نے مجھے اتوار کے روز ڈنر پر مدعو کیا ہے۔ میری حیثیت ایک سرکاری مہمان کی سی ہے۔ حکومت کی نظروں میں ہیرو بھی ہوں۔ ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھ کر مجھ پر ہاتھ نہ ڈالنا..... لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔" میں نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

انسپکٹر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ڈاکٹر شیخ کا چہرہ زرد پڑ گیا اور سفید پڑتا چلا گیا۔ اس کی حالت غیر ہونے لگی۔

"انسپکٹر!" میں نے یاسمین کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا اور آنکھیں چمک اٹھی تھی۔ "مجھے یہ بات قطعی پسند نہیں ہے کہ میں قانونی معاملات میں دخل اندازی کروں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ ضابطے کی کارروائی کریں۔ بغیر ثبوت کے مس یاسمین کو گرفتار نہ کریں۔ پہلے آپ اس کے گواہوں کو بلائیں جنہوں نے مس یاسمین کو رقم چراتے دیکھا تھا اور اس کے ساتھ مس روزی اور سسٹر ساجدہ بھی تھی۔ پھر میں اپنا گواہ پیش کروں گا اور رقم بھی برآمد کرا دوں گا۔ اصل چور کون ہے وہ سامنے آ جائے گا۔ اگر آپ نے رشوت کی رقم حلال کرنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

"ڈاکٹر شیخ!" انسپکٹر نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ اپنے ان گواہوں کو بلائیں جنہوں نے رقم چوری کرتے ہوئے دیکھا تھا۔"

ڈاکٹر شیخ نے انٹر کوم پر اپنی سکریٹری سے کہا۔ "مس

مشتاق! آپ حمید اور شاہد کو کمرے میں فوراً بھیج دیں۔"

چند لمحوں کے بعد کمرے میں دو آدمی داخل ہوئے۔ ان میں ایک جس کا نام حمید تھا۔ اس کی عمر تیس برس کی ہوگی۔ وہ ہسپتال میں وارڈ بوائے تھا۔ اس کے چہرے مہرے سے بیماری ٹپک رہی تھی۔ وہ بہت ہشیار بنتا تھا۔

دوسرے کا نام شاہد تھا۔ وہ چالیس برس کی عمر کا ہوگا۔ کالے رنگ کا تھا۔ اس کے چہرے پر چیچک کے نشان تھے جس نے اسے بہت بدصورت بنا دیا تھا۔ اس کی آنکھیں بہت چھوٹی چھوٹی تھیں۔ اس کے چہرے پر خباثت ٹپک رہی تھی اور آنکھوں سے کمینہ پن جھانک رہا تھا۔ اس کا اصل نام تو کالو میاں تھا لیکن اس نے اپنا نام شاہد رکھ لیا تھا لیکن اس کے باوجود لوگ اسے کالو میاں ہی کہہ کر بلاتے اور مخاطب کرتے تھے۔ وہ ڈاکٹر شیخ کا بارہ برس سے چپراسی تھا۔ بڑا منہ چڑھا تھا۔ ہسپتال کا اسٹاف اس سے خار رکھتا تھا۔ کیوں کہ ڈاکٹر نے اسے سر چڑھا رکھا تھا۔

"کیا یہ سچ ہے کہ تم نے مس یاسمین کو رقم چوری کرتے ہوئے دیکھا تھا اور ان کے ساتھ مس روزی اور ساجدہ سسٹر بھی تھیں؟"

"جی ہاں جناب!" اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔ "بالکل سچ ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"کیا تم نے تجوری میں سے رقم نکالتے ہوئے دیکھا.....؟" میں نے پوچھا۔ "اس وقت تم کہاں تھے؟ کیا مس یاسمین نے تمہیں دیکھا تھا؟"

"جی....." اس نے پھر اپنی گردن ہلا دی۔" میں اس وقت واش روم کی صفائی کر رہا تھا۔ میں روز صبح نو بجے صاحب کے کمرے کے واش روم کی صفائی کرتا ہوں لیکن میں آج صبح سات بجے ہی آ گیا تھا۔ میں واش روم کی صفائی کر رہا تھا کہ میں نے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ میں حیران ہوا کہ صاحب اتنی جلدی کیسے آ گئے؟ وہ تو دس بجے آتے ہیں۔ واش روم کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ میں نے ذرا سا کھولا تو ایک جھری سی بن گئی۔ میں نے ان تینوں کو دیکھا۔ مس یاسمین نے میز کی دراز کھول کر اس کی تلاشی لی۔ پھر انہوں نے تجوری کی چابی نکالی۔ اسے کھولا۔ روزی کے ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا۔ جسے کھول کر میز پر رکھ دیا گیا۔ پھر مس یاسمین اور ساجدہ سسٹر نے تجوری میں سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر بریف کیس میں رکھنا شروع کیں۔ مس روزی دروازے کے پاس کھڑکی کی ہول میں سے باہر جھانک رہی تھی۔ جب ان دونوں نے خام گڈیاں نکال کر بریف کیس میں رکھ دیں تو روزی نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور بولی کہ راستہ صاف ہے۔ مس یاسمین نے تجوری مقفل کر کے اس کی چابی میز کی دراز میں رکھ دی۔ مس یاسمین نے بریف کیس اٹھا لیا اور باہر نکل گئیں۔"

"یہ چوری کی واردات ان تینوں نے کس وقت کی تمہیں کچھ صحیح وقت یاد ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"میں سات بجے صفائی کے لیے دفتر میں داخل ہوا تھا۔ اس وقت اس کمرے کی دیوار گیر گھڑی میں سات بج رہے تھے۔" اس نے جواب دیا۔ "یہ تینوں سوا سات بجے کمرے میں آئی تھیں اور ساڑھے سات بجے کمرے سے نکلی تھیں۔ دفتر کی گھڑی میں یہی وقت ہو رہا تھا۔"

"تم یہ سب کچھ خاموشی سے اور چوروں کی طرح چھپ کر کیوں دیکھتے رہے تھے؟" میں نے اسے تیز نظروں کی گرفت میں لے لیا۔ "جس وقت تجوری کھول کر رقم نکالی جا رہی تھی تب تم نے باہر نکل کر شور کیوں نہیں مچا دیا؟ جب کہ یہ عورتیں تھیں۔ مرد ڈکیت نہ تھے۔"

"اس لیے کہ ساجدہ سسٹر کے ہاتھ میں پستول تھا جو اس نے تجوری سے گڈیاں نکالتے ہوئے مس روزی کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔" اس نے بتایا۔

"جب وہ تینوں بریف کیس میں رقم بھر کر کمرے سے نکل گئیں تب تم نے کیا کیا.....؟" میں نے سوال کیا۔

"کیا واش روم کی صفائی کرتے رہے۔"

"میں اس لیے فوراً کمرے سے نہیں نکلا کہ کہیں وہ مجھے باہر نکلتے نہ دیکھ لیں۔" وہ بولا۔ "میں ڈر گیا تھا کہ انہوں نے مجھے دیکھ لیا تو کہیں گولی نہ مار دیں۔ میں کوئی دس منٹ کے بعد باہر نکلا تو کالو میاں کو دیکھا جو کمرے کے باہر حیران و پریشان کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ان تینوں کو بریف کیس لے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان میں سے کسی نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ کیوں کہ وہ انہیں اس وقت بریف کیس لے کر نکلتے اور روزی کے ہاتھوں میں پستول دیکھ کر معاملے کی تہہ میں پہنچ گیا تھا۔ وہ بھی ڈر گیا تھا کہ کہیں اسے شوٹ نہ کر دیا جائے۔"

"اچھا تو تم نے اپنے صاحب کو اس واردات کی اطلاع کب دی تھی؟" میں نے پوچھا۔ "کیا صاحب اطلاع پاتے ہی فوراً آ گئے تھے؟"

"میں نے انہیں فوراً اطلاع نہیں دی تھی؟" اس نے جواب دیا۔ "میں اور کالو ان کے دفتر آنے کے انتظار کرتے رہے تھے۔ جب وہ دس بجے ہسپتال آئے تو تب میں نے انہیں بتایا تھا۔ اس لیے اس وقت ان کے ایک دوست آ گئے تھے۔ وہ ساڑھے بارہ بجے گئے تو تب میں نے انہیں بتایا۔ انہوں نے فوراً ہی انسپکٹر کو فون کر کے بلا لیا تھا۔"

"تم نے انہیں کس لیے گھر پر اس واردات کی اطلاع نہیں دی تھی؟" میں نے کہا۔

"اس لیے کہ انہوں نے گھر فون کرنے کے لیے منع کیا ہوا ہے۔" وہ بولا۔ "اس لیے میں ان کے ہسپتال آنے کا انتظار کرتا رہا۔"

"تم نے چلو انہیں اطلاع نہیں دی لیکن ہسپتال میں تو کسی کو بتایا ہوگا؟"

"کالو میاں نے مجھے منع کیا تھا کہ اس کی اطلاع صرف اور صرف صاحب کو دی جائے؟"

"بڑی عجیب سی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "انسپکٹر! آپ اس کی باتوں کو ذہن میں رکھیں۔ اس کا بیان بڑا عجیب و غریب ہے۔"

"یہ سب جھوٹ ہے۔ من گھڑت ہے۔ آپ اس کی باتوں کا یقین نہ کریں۔" یاسمین جو اتنی دیر سے خاموش تھی اچانک پھٹ پڑی۔

"مس یاسمین! پلیز!" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ خاموشی سے دیکھتی اور سنتی رہیں۔ اس نے بڑی غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ کہانی تراشی ہے۔ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے ہیں۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوا جاتا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ آپ بے گناہ ہیں۔ میں آپ کی بے گناہی ثابت کر دوں گی۔ آپ کا بال تک بیکا نہ ہوگا۔ اللہ پر بھروسا رکھیں وہ آپ کو بچائے گا۔"

ڈاکٹر شیخ نے منہ بنایا۔ انسپکٹر کے ہونٹوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ سی ابھری۔ حمید بوکھلا سا گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ باہر جا کر کالو میاں کو اندر بھیج دے۔ حمید جب دروازے کی طرف جا رہا تھا اس کے پیروں میں لڑکھڑاہٹ سی تھی۔ وہ خوف زدہ سا ہو رہا تھا۔

کالو میاں اندر آیا۔ اس نے میرے پوچھنے پر جو کچھ بتایا وہی کچھ تھا جو حمید نے بتایا تھا۔ اس کا بیان لینے کے بعد میں نے حمید کو بھی بلایا۔ پھر میں نے انسپکٹر سے کہا۔" آپ بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے ان تینوں میں سے کسی پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ مس یاسمین کے خلاف ڈاکٹر شیخ نے اس لیے سازش تیار کی اسے پھنسانے کے لیے منصوبہ بنایا کہ..... مس یاسمین نے محکمہ صحت اور لیبر ڈویژن کو شکایتی خطوط لکھے تھے۔ ڈاکٹر شیخ نے انکم ٹیکس میں گھپلے کیے ہوئے تھے۔ اسٹاف کے نام پر ہر سال سہولت اور مراعات ظاہر کر کے یہ انکم ٹیکس بچاتے ہیں۔ مس یاسمین نے انکم ٹیکس والوں کو لکھا کہ دو کھاتے ہوتے ہیں۔ مریضوں کو بل تک نہیں دیا جاتا ہے۔ ان تینوں محکموں کا منہ بند کرنے کے لیے انہیں چودہ لاکھ ٹا کا رقم دینا پڑی۔ جو جلتی پر تیل گرا دینے کے مترادف تھی۔ جب کہ اس شخص

کی جیب سے کسی کے لیے چھٹا کا بھی نہیں نکلتے۔ اس نے کل رات آپ کو ہوٹل بلیو ہیون میں بلا کر ایک لفافہ دیا جس میں دس ہزار ٹا کا کی رقم تھی۔ پھر اس نے حمید اور کالو میاں کو پانچ پانچ سو ٹا کا دیئے۔ انہیں جو کچھ کہنے کہا گیا اس کے پروفیسر آپ ہیں۔ آپ کے لیکچر پر انہوں نے عمل کیا ہے۔ اب میں بتاتا ہوں کہ اس منصوبے میں کیا خامی، جھول اور عیب ہے۔"

"آپ کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ مجھے دس ہزار ٹا کا رشوت دی گئی۔" انسپکٹر ایک دم بھڑک اٹھا اور اس کا چہرہ لال ہو گیا۔ "سب سے پہلا ثبوت تو ہوٹل کا منیجر اور ویٹر دے گا کہ ان دونوں نے ڈاکٹر کو آپ کو لفافہ دیتے ہوئے دیکھا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس وقت آپ کی جیب میں دس ہزار کی رقم میں سے سات ہزار موجود ہیں۔ میں ان کے نمبر بتاتا ہوں۔ یہ نئے نوٹ ہیں۔ سیریل نمبر کے ہیں۔ آپ نے ان میں تین ہزار کی رقم اپنی بیوی کو دے دی۔ آپ یہ نمبر ملا کر دیکھیں۔ سچ جھوٹ کا پتا چل جائے گا۔"

میں نے ایک کاغذ پر ایک نوٹ کا نمبر لکھ کر اس کی طرف بڑھایا۔ انسپکٹر نے جھنجلاتے ہوئے نوٹ نکالے۔ جب اس نے نمبر ملایا تو وہ بھونچکا ہو گیا۔ اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے اور سوالیہ انداز سے ڈاکٹر شیخ کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر سناٹے میں آ گیا۔

"یہ معاملہ بعد میں حل کریں کہ یہ کیا ماجرا ہے اور مجھے ان نوٹوں کے نمبروں کا علم کیسا ہو گیا....." میں نے کہا۔ "سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ مس یاسمین، روزی اور ساجدہ سسٹر روزانہ صبح آٹھ بجے ڈیوٹی پر آتی ہیں اور آج بھی آئی تھیں۔ ان کے کارڈ چیک کریں۔ ان پر آٹھ بجے کا وقت درج ہے۔ جب کہ یہ واردات صبح سوا سات بجے ہوئی ہے ڈاکٹر شیخ کے گواہوں کے بیانات کے مطابق حیرت کی بات ہے کہ بریف کیس میں رقم رکھ کر لے جائی گی۔ ملازمین میں سے کسی کی نظر نہیں پڑی۔ ایک اور بات یہ ہے کہ تجوری چابی سے نہیں بلکہ کوڈ نمبر سے کھلتی ہے۔ اگر اس کی چابی ہے تو ڈاکٹر شیخ پیش کریں۔ میرے خیال میں اتنا ہی کافی ہے۔"

ڈاکٹر شیخ، انسپکٹر اور دونوں گواہوں کے چہرہ پر پسینہ پھوٹ پڑا۔ "اصل چور ڈاکٹر شیخ ہی ہے۔ اس نے تجوری میں سے رقم نکال کر اس الماری کے پیچھے جو تجوری ہے اس میں کل ہی رکھ دی تھی۔ یقین نہ آئے تو تجوری کھول کر دیکھ لی جائے۔"

"یہ تمہیں کس نے بتایا کہ اس الماری کے پیچھے تجوری ہے؟" ڈاکٹر شیخ ہونق ہو گیا۔ اس کی آواز حلق میں پھنسنے لگی۔ "میرے سوا کسی کو علم نہیں ہے۔ آخر تم ہو کون جو اتنا کچھ جانتے ہو؟" وہ خوف زدہ ہو گیا۔ "کیا تم کوئی جادوگر ہو یا....."

"تم جو چاہے سمجھو۔" میں نے کہا۔ "جب وزیر اعظم سے ڈنر پر ملاقات ہو گی تب میں ان سے کہوں گا کہ تم نے حکومت کے کروڑوں کی رقم ہڑپ کی ہوئی ہے۔ پورے دس برس کا حساب آڈٹ ہو گا۔ انکم ٹیکس میں گردن ناپی جائے گی۔ اب تم بچ نہیں سکتے۔"

"تم آخر چاہتے ہیں.....؟" ڈاکٹر شیخ کی آواز حلق میں پھنسنے لگی۔ اس کی حالت غیر ہونے لگی۔

میرے خیال میں کیا یہ مناسب نہیں ہو گا کہ آپ کچھ رقم لے کر معاملہ "رفع دفع کر دیں۔" انسپکٹر نے میرے جواب دینے سے پہلے کہہ اٹھا۔

"یہ تو بعد کی بات ہے کہ معاملہ کس طرح رفع دفع کیا جائے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پہلے یہ شخص اس بات کا اعتراف کرے کہ اس نے مس یاسمین، روزی اور سسٹر ساجدہ کو جھوٹا الزام لگا کر پھنسانے کی کوشش کی تھی۔ وہ رقم اس کے پاس محفوظ ہے۔"

"کیا یہ ضروری ہے؟" انسپکٹر نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "اب اس قصے کو دفن کر دیں۔ یہ اقرار کر چکے ہیں کہ وہ رقم....."

ہے کہا۔ "اس نے جس طرح ایک معصوم لڑکی کو ذلیل اور پریشان کیا اس کی یہی سزا ہے۔"

ڈاکٹر شیخ میری بات سن کر خاموش رہا تو انسپکٹر نے اس کی طرف دیکھا۔ "سر! آپ ان کی بات مان لیں۔ اس میں آپ کی بہتری ہے۔"

"میں اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نے ان تینوں کو ایک جھوٹے کیس میں ملوث کرنے اور جیل بھجوانے کی سازش کی تھی۔" اس کی آواز ویران، کھوکھلی اور بہت دور سے آتی ہوئی سنائی دی۔ اس کے چہرے پر ندامت کی سرخی پھیل گئی۔ وہ خاموش ہو گیا۔

"اب تم مس یاسمین سے معافی مانگو کہ میں اپنے کیے پر پشیمان ہوں اور آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ پلیز! مجھے معاف کریں۔" میں نے کہا۔

"میں..... میں..... اس معمولی نرس سے معافی مانگوں.....؟" وہ ایک دم سے بھڑک اٹھا۔ "نہیں اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"تو ٹھیک ہے، ہم جا رہے ہیں۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "میں جاتے جاتے ایک بات کہہ کر جا رہا ہوں۔ انسپکٹر! اب تمہاری بھی خیر نہیں۔"

"پلیز!..... پلیز....." انسپکٹر سراسیمہ سا ہو گیا۔ پھر وہ میری منت سماجت کرنے لگا۔ "آپ تشریف رکھیں....." پھر اس نے ڈاکٹر شیخ سے کہا۔ "معافی مانگنے میں کوئی حرج نہیں۔ ورنہ آپ کے گلے میں آ جائے گی۔ کیوں کہ بات بہت اوپر تک جائے گی۔"

آخر ڈاکٹر شیخ نے یاسمین کی طرف منہ کر کے کہا۔ "مس یاسمین! میں نے آپ کے ساتھ جو زیادتی کی ہے اس کی معافی چاہتی ہوں۔"

"اس کی معافی اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ معاملہ رفع دفع ہو۔" میں کہنے لگا۔ "ڈاکٹر شیخ! تم آج ارب پتی ہو۔ تم نے دس برسوں میں کروڑوں کمائے اور اتنا ہی ٹیکس پڑتال کرے گی اور کھاتا نمبر دو اور بلیک منی اس کے قبضے میں آ جائے گی تو تب تم کیا کرو گے؟ کروڑوں کی بات ہے۔ شاید بیس سے تیس کروڑ کے ہیر پھیر میں آ جاؤ گے۔ میں زیادہ تنگ اور پریشان اور ہراساں نہیں کروں گا۔ تین چار کروڑ ٹا کا میں تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔"

"تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو؟" ڈاکٹر شیخ کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھیل گئیں۔ "میرے پاس اتنی رقم کہاں سے آئے گی؟"

"تمہاری اس تجوری میں جو الماری کے عقب میں دیوار میں نصب ہے اس میں تم نے اسی تجوری سے بیس لاکھ کی رقم رکھی ہے اس میں پورے سات کروڑ کا ٹا کا موجود ہیں جو بلیک منی ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہیں ابھی تک اسے وہائٹ کرنے کا موقع نہیں مل سکا ہے۔ میرے ایک فون پر انکم ٹیکس والے آ کر اس تجوری کو سیل کر دیں گے۔ تم میری بات مان لو تو دو تین کروڑ بچ جائیں گے۔"

ڈاکٹر شیخ خوف زدہ ہو کر سوچتا رہا۔ اس کا چہرہ کفن کی طرح ہو رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے مردہ لہجے میں کہا۔

"تم میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہو..... میں تمہیں تین کروڑ ٹا کا دیئے دیتا ہوں۔ تم یہ رقم لے کر یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

مجھے اندازہ نہ تھا کہ اندھیرے میں چلائے ہوئے تیر ٹھیک نشانے پر جا لگیں گے۔ وہ میرے رعب میں آ گیا تھا۔ بری طرح ڈر گیا تھا۔

"یہ رقم مجھے نہیں چاہیے۔" میں نے کہا۔ "اس میں سے بیس بیس لاکھ تو تم..... مس یاسمین، مس روزی اور ساجدہ سسٹر کو دو گے۔ باقی رقم میں سے ہر نئے پرانے ملازم کو پانچ پانچ لاکھ روپے بونس کے طور پر دو گے..... اس سے تم فقیر نہیں ہو جاؤ گے۔ تم یومیہ لاکھوں کماتے ہو اور ہاں..... تم یہ مریضوں کو لوٹنا بند کرو۔ مریض ویسے ہی بہت پریشان حال ہوتے ہیں۔"

نکل نہیں سکتا تھا۔ میں رات دس بجے تک موجود رہا تھا۔ بونس کی تقسیم میری نگرانی میں ہوتی رہی تھی۔ میری دھونس اور دھمکی نے خوب کام کر دکھایا تھا۔

میرے اس کارنامے نے پورے ہسپتال کے اسٹاف میں بے پناہ خوشی و مسرت کی لہر دوڑا دی تھی۔ انہیں یہ سب کچھ کسی خواب کی طرح لگا تھا۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا۔ انہیں کیا مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا۔ میں ان کی نظروں میں ہیرو بن گیا تھا۔ انہوں نے نہ صرف مجھے کندھوں پر اٹھا لیا تھا بلکہ پھولوں سے لاد دیا تھا۔ اس خوشی میں مٹھائی بھی تقسیم کی گئی تھی۔ ڈاکٹر شیخ کے دل کو اتنا درد ہوا کہ اسے دل کا دورہ پڑ گیا۔ اسے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ بڑا شدید دورہ تھا۔ اس پر دل کا جو دورہ پڑا اس کا کسی کو دکھ اور افسوس نہ ہوا۔ آخر کیوں ہوتا۔ اس لیے کہ اس نے کبھی کسی مریض کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی تھی۔ رحم نہیں کھایا تھا۔ ان کی مجبوریوں کا احساس نہیں کیا تھا۔ اس نے جو اندھا دھند اور لوٹ کھسوٹ کر کے دولت کمائی تھی آج وہ اس کے کام نہیں آئی تھی اور نہ آ سکتی تھی۔ وہ دولت اسے صحت نہیں دے سکتی تھی۔ وہ بے دست و پا ہو کر رہ گیا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس کا بیٹا جو اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ گیا ہوا تھا اپنی ماں کے ساتھ نو بجے کی فلائٹ سے چٹا گانگ پہنچا تھا۔ وہ باپ کے ہارٹ اٹیک کی خبر سن کر آیا تو یہاں صورت حال ہی اور تھی۔

اس کا بیٹا اپنے باپ کے برعکس تھا۔ جب تمام واقعات اس کے علم میں آئے تو اسے سن کر بہت افسوس ہوا تھا۔ اس نے اسٹاف سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے باپ نے جو کچھ اسٹاف اور مریضوں کے ساتھ کیا اس کا اعادہ نہیں ہوگا۔ وہ ہر ایک کے ساتھ انسانی سلوک کرے گا۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا کہ میری وجہ سے جو کچھ ہوا وہ اچھا ہوا۔ تاہم باپ کی بیماری سے وہ افسردہ ضرور تھا لیکن اس کے باپ کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ وہ باپ کے باپ کو سدھار دے۔

جب میں پروین کے ساتھ اس کے ہاں پہنچا تو اس کی ماں گلنار سونے کے لیے اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ رات کا کھانا میں نے اور پروین نے ساتھ کھایا۔ اس کے گھر میں ایک بوڑھا خانساں اس کی بیوی اور دو جوان لڑکیاں تھیں جو سرونٹ کوارٹرز میں رہتی تھیں۔ وہ سب مل کر نہ صرف کھانا پکاتے۔ صفائی اور گھر کے سارے کام کاج کرتے تھے۔ پروین نے کھانے سے فراغت پانے کے بعد ہم دونوں رات بارہ بجے تک نشست گاہ میں بیٹھے مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ اس نے مجھے اپنا کمرا لے جا کر دکھایا۔ پھر مجھے اس کمرے میں لے آئی جو میرے لیے تھا۔ اس کا کمرا میرے کمرے کے برابر تھا۔ اس کی ماں کا کمرا راہ داری کے آخری سرے پر تھا۔ یہ ایک پرشکوہ کوٹھی تھی جو ہزار گز کے رقبے پر بنی ہوئی تھی۔ میں نے یہ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا کہ اس کی ماں کا کاروبار کیا ہے۔ وہ میرے کمرے سے رخصت ہوتے وقت بڑے جذباتی انداز سے رخصت ہوئی۔ وہ ایک آزاد ماحول میں پرورش پائی ہوئی لڑکی تھی۔

صبح ناشتے کی میز پر اس کی ماں اور باپ سے ملاقات ہوئی۔ وہ صبح سات بجے کی فلائٹ سے چٹا گانگ آیا تھا۔ اس کی ماں نے میرے بارے میں ہاشم کو بتا دیا تھا۔ وہ مجھ سے بڑے خلوص اور گرم جوشی سے ملا۔ اس نے میرے کارنامے کو خوب سراہا تھا لیکن یہ شخص مجھے بھی پسند نہیں آیا تھا۔ معلوم نہیں پروین کی ماں کیسے اس شخص کو دل دے بیٹھی تھی۔ یہ دل کے معاملات تھے۔ میں کیا کہہ سکتا تھا۔

دوسرے دن صبح کاکسس بازار جانے کا پروگرام بنا۔ ہم لوگ آٹھ بجے صبح کاکسس بازار روانہ ہو گئے۔ کاکسس بازار چٹا گانگ شہر سے سو میل کے فاصلے پر تھا۔ گاڑی ہاشم نے چلائی تھی۔ اس کی ماں اپنے شوہر کے ساتھ اگلی سیٹ پر براجمان تھی۔ میں اور پروین پچھلی نشست پر تھے۔

[illegible] بازار دنیا کا سب سے بڑا ساحل ہے۔ یہاں ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ اس کے علاوہ دو تین ہوٹل اور ایک فائیو اسٹار ہوٹل تھا۔ اس کے علاوہ چھوٹے بڑے خوب صورت اور بڑے شان دار کاٹیج بھی تھے۔ ان کا اپنا ایک بہت بڑا کاٹیج ایک دم آخری سرے پر تھا۔ اس میں انتہائی خوب صورت اور ہر طرح سے آراستہ و پیراستہ بیڈ روم تھے۔ اس کے علاوہ نشست گاہ اور ٹی وی لاؤنج بھی تھا۔ ریڈنگ روم بھی تھا۔ کچن بہت بڑا تھا۔ اس میں فریج، ڈیپ، فریزر اور گیس کے چولہے بھی تھے۔ اسٹور روم بھی تھا جس میں نہانے کا لباس، مچھلی کے شکار اور بھی بہت سارا سامان ضرورت کا بھی تھا۔ اس کاٹیج کی دیکھ بھال کے لیے ایک بوڑھا مگر چاق و چوبند ملازم جس کا تعلق چکمہ قبیلہ سے تھا رکھا ہوا تھا۔ آج چھٹی کا دن نہ تھا اس لیے یہاں بہت کم لوگ آئے ہوئے تھے۔ اس کاٹیج سے فاصلے پر جو ہوٹل، کاٹیج اور ہٹ تھے ان کے سامنے بہت ہی کم لوگ نہاتے تیرتے دکھائی دیے۔ ان میں دو ایک جوڑے غیر ملکی بھی تھے۔ دور سے ان کے چہرے اور خدوخال واضح نہ تھے۔ صرف دھوپ میں چمکتے دکھائی دیتے تھے۔ ایک پرسکون اور دل میں اتر جانا والا سناٹا طاری تھا۔ تاحد نگاہ ساحل تھا۔ یہ ساری دنیا میں مشہور تھا اور اسے دیکھنے کے لیے سیاح دنیا کے کونے کونے سے آتے تھے۔ ایک جوان امریکی موٹر بوٹ چلاتا ہوا ہمارے سامنے سے گزرا تو اس نے ہمیں دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ ایک موٹر بوٹ پروین کے کاٹیج میں بھی تھی۔

پروین کے باپ ہاشم نے بڑی تیز رفتاری سے گاڑی چلائی تھی۔ کہیں بھی تھوڑی دیر کے لیے رکے بھی نہیں تھے۔ میں خاصا تھک گیا تھا۔ بوڑھے ملازم نے جس کا نام بنگا تھا اس نے کافی بنا کر پیش کی۔ کافی پینے کے بعد ان کا پروگرام سمندر میں نہانے اور تیرنے کا تھا۔ میں کچھ دیر ستانے کے لیے اپنے کمرے آ کر بستر پر دراز ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے آنکھ بھی لگ گئی تھی۔ جب میں بیدار ہوا تو طبیعت بڑی بحال اور تازہ دم سی محسوس ہوئی۔

جب میں کمرے سے باہر آیا تو کاٹیج میں کوئی نہ تھا۔ بوڑھا ملازم کچن میں دوپہر کا کھانا بنا رہا تھا۔ باپ، ماں اور بیٹی نہانے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ کاٹیج سے پچاس قدم پر سمندر تھا۔ سمندر کی لہریں کنارے تک آ آ کر ٹوٹ رہی تھی۔ سمندر میں بڑی طغیانی تھی۔ میں نے دیکھا گلنار اور ہاشم ایک ساتھ نہا رہے تھے۔ ان سے قدرے فاصلے پر پروین تیر رہی تھی۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی تھی ماں اور بیٹی پیراکی کے جس لباس میں تھیں وہ امریکی اور یورپی عورتیں پہنتی تھیں۔ بڑا ہی مختصر سا لباس تھا جس نے ماں بیٹی کو بے حجاب کر دیا تھا۔ اس لباس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ مشرقی اور ایشیائی لوگ اور عورتیں لاکھ آزاد خیال سہی لیکن ایسا لباس نہیں پہنتی تھیں۔ میں ان کے قریب جانے کے بجائے دور ہی کھڑا رہا۔

جب وہ تینوں سمندر سے نکل کر چھتری کے نیچے جو کنارے سے قدرے فاصلے پر تھی وہاں آئے۔ ریت پر ایک بہت بڑی چادر بچھی ہوئی تھی۔ جس پر تولیا اور مشروب کی بوتلیں اور گلاس جو ایک باسکٹ میں تھیں وہ چادر پر رکھی ہوئی تھیں۔ پروین جب تولیے سے بدن پونچھ رہی تھی اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلایا۔ میں قدرے جھجکتا ہوا وہاں چلا گیا۔

"تم نے زیر جامہ تو پہنا ہوا ہوگا؟" ہاشم نے کہا۔ "کپڑے اتار دو اور نہا کر آ جاؤ۔ بڑا لطف آئے گا۔ ساری تھکن دور ہو جائے گی۔"

"اس وقت موڈ نہیں ہو رہا ہے۔" میں نے ٹالنے کے خیال سے کہا۔ "بعد میں کسی وقت نہا لوں گا۔ ابھی بھی کچھ کمزوری سی محسوس کر رہا ہوں۔"

"یہ لو پی لو....." گلنار بیگم نے میری طرف ایک گلاس بڑھایا جس میں کولڈ ڈرنک بھری ہوئی تھی۔ "کچھ دیر بعد نہا ضرور لینا....."

میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی پروین کی ماں کو دیکھے بغیر

نہ رہ سکا تھا۔ وہ چالیس برس کی ہوتی تھی وہ پھر بے اور متناسب بدن کے باعث پچیس برس کی دکھائی دیتی تھی۔ اس پر پروین کی بڑی بہن اور ایک دوشیزہ کا گمان سا ہوتا تھا۔ اس کا سراپا۔ پرکشش بدن اور شباب مجھے ورغلا رہا تھا۔ بہکا رہا تھا۔ دعوت گناہ دے رہا تھا۔ وہ کس رسیلے پھل کی طرح تھی اور پروین سے کہیں پرکشش تھی۔ وہ جب ہسپتال میں مجھ سے ملنے پہلی بار آئی تھی اور جس نا مناسب سے لباس میں تھی اس سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کیا قیامت ہے۔

جب اللہ حسن دیتا ہے تو نزاکت آ جاتی ہے۔ اس طرح وہ دولت دیتا ہے تو بہت کم لوگ صحیح فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پھر دولت کی زیادتی انہیں اندھا کر دیتی ہے۔ وہ غلط راستوں پر چلے جاتے ہیں۔ اپنی سوچ، رہن سہن اور بہت کچھ بدل لیتے ہیں۔ چوں کہ گلنار بیگم یوروپ میں برسوں رہ کر آئی تھیں اس لیے ان کی تہذیب اور اقدار بھی مشرقی نہیں رہے تھے۔ کوئی بات معیوب نہیں رہی تھی۔ ماں بیٹی بے لباس ہی دکھائی دیتی تھیں۔ ان کے جسم پر لباس نہیں دھجیاں تھیں۔ اس کی برائے نام ستر پوشی سے کیا ہوتا تھا۔

رات کے کھانے سے فراغت پانے کے بعد ہم چاروں چہل قدمی کے لیے باہر آ گئے۔ چاندنی رات تھی۔ چودھویں کا چاند تھا۔ چاندنی کے باعث سمندر کی لہروں میں طغیانی آ گئی تھی۔ گلنار بیگم اور ہاشم ہم سے آگے آگے تھے۔ ہم ان سے دس قدم پیچھے..... پھر ہم واپس ہوئے۔ ہاشم اور گلنار کاٹیج کی طرف بڑھ گئے۔ پروین نے میرا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔ ”ہم یہاں بیٹھتے ہیں..... مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں اور مشورہ بھی لینا ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں.....؟ کہاں جاؤں.....؟“

ہم دونوں سمندر کے کنارے بیٹھ گئے۔ میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے قریب کر لیا۔ یہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا صرف لہر اسلوت تھا۔ جو سمندر کی لہروں کی پرجوش آواز سے درہم برہم ہو جاتا تھا۔

”تمہاری کیا پریشانی ہے؟“ میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”مجھے تم پر بہت اعتماد اور اعتبار بھی ہے۔“ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ ”میں اپنی یہ پریشانی ماں کو نہیں بتا سکتی..... اگر میں بتا دیا تو ایک بھونچال آ جائے گا۔ وہ میری اس بات کا یقین نہیں کریں گی۔ کہیں گی کہ یہ تمہارا وہم ہے۔ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“

”آخر ایسی بھی کیا پریشانی ہے۔ جو تم اپنی ماں کو اعتماد میں نہیں لے سکتیں؟“ میں نے تعجب سے کہا۔ ”جب تمہاری ماں تمہیں بیٹی نہیں دوست سمجھتی ہے۔“

”اس لیے کہ وہ بہت حسین اور پرشباب عورت ہیں۔“ پروین بولی۔ ”اس میں شک بھی تو نہیں ہے۔ ان میں پندار حسن بھی ہے۔“

”لیکن اس بات کا ان کے حسن اور شباب سے کیا تعلق.....؟“ میرا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔ مجھے اس کی بات بڑی پراسرار اور عجیب سی لگی۔

”بہت ہی گہرا تعلق ہے۔“ پروین نے ایک گہرا سانس لیا۔ وہ چند لمحوں تک خاموش رہی۔ اس کے چہرے پر ایک کرب سا ابھر آیا۔

”اگر ایسی بات ہے تو تم اپنی کسی سہیلی یا دوست کو اعتماد میں کیوں نہیں لیتی ہو۔“ میں نے اسے مشورہ دیا۔ ”کیا تمہاری ایسی کوئی.....“

”میری ایک نہیں دو تین سہیلیاں ہیں تو سہی۔“ اس نے اپنا سر ہلایا۔ ”تم جانتے ہو کہ عورتوں کے پیٹ میں کوئی بات محفوظ نہیں رہتی۔“

”ہاں..... یہ بات تو ہے۔“ میں نے بھی اپنا سر ہلا دیا۔ ”وہ پیٹ کی بڑی کچی ہوتی ہیں۔ کوئی بات راز رکھنا ان کے لیے بڑا امتحان اور آزمائش ہوتی ہے۔ ایسی کیا بات ہے جو تم کسی سہیلی کو ہمراز بنانا نہیں چاہتی ہو۔ ایسا لگتا ہے

کہ بہت ہی اہم اور نازک سی بات ہے؟ کیوں؟“

”میں کسی سہیلی کو ہمراز بناؤں تو..... پھر میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔“ اس نے بکھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس لیے میں.....“

”لیکن یار! اگر ایسی نازک سی بات ہے تو کیا تم مجھے بتا کر..... کیا تم اپنی اور میری نظروں میں نہیں گر جاؤ گی؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”میں..... لیکن میں جانتی ہوں یہ بات تم کسی کو نہیں بتاؤ گے۔“ وہ میری طرف ساکت پلکوں سے دیکھنے لگی ”اور تم پھر کچھ دن بعد چلے جاؤ گے اور پھر تم اس میں میرا کوئی دوش نہیں سمجھو گے..... میرا خیال ہے کہ تم مجھے حقیر نہیں سمجھو گے اور نہ ہی اپنی نظروں میں گراؤ گے۔“

”تمہاری جو محبت اور عزت میرے دل میں موجود ہے۔ وہ قائم رہے گی۔“ میں نے کہا۔ ”میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے راز کی حفاظت کروں گا۔“

”تو سنو.....“ پروین کی آواز لہرانے لگی۔ ”پہلے تم میری پوری کہانی سن لو۔ پھر تم جو کچھ کہو گے میں سنوں گی۔ جب میری ماں نے دوسری شادی کی تو میں بہت خوش ہوئی تھی کہ مجھے پھر سے باپ کا سایہ اور محبت اور شفقت مل گئی پھر میرا باپ مجھ سے بڑی محبت سے پیش آتا۔ میرا بڑا خیال رکھتا۔ میں نے کبھی اس کی محبت میں کوئی کھوٹ اس لیے محسوس نہیں کیا کہ اس نے میری ماں سے محبت کی شادی کی تھی بعض اوقات میری کسی بات اور کسی شرارت پر ماں کے سامنے گود میں اٹھا کر صوفے پر ڈال دیتا تو میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ اس میں کون سا جذبہ کارفرما ہو سکتا ہے۔ اس نے کبھی میری پیاری بیٹی کہہ کر میرا رخسار چوم لیا۔ میرے حسن و شباب اور جسمانی نشیب و فراز کی تعریف کر دی تو میں نے اس میں کبھی پراگندگی محسوس نہیں کی۔ وہ چوں کہ زندہ دل ہے۔ میں سمجھتی رہی کہ وہ زندہ دلی کا مظاہرہ کرتا ہے میں اس کا اور مطلب نہ لوں۔

لیکن تین مہینے پہلے کی بات ہے کہ اس کا اصل چہرہ سامنے آ گیا..... رات جب میں سوتی ہوں تو شب خوابی کے لباس میں..... کمرے میں قدرے تیز نائٹ بلب کی روشنی میں..... کیوں کہ اندھیرے میں نیند نہیں آتی ہے۔ یہ لباس ایسا ہے کہ اس میں حجاب نہیں رہتا ہے۔ ایک روز رات کے وقت میری آنکھ کھلی تو میں نے محسوس کیا کہ کوئی مجھے کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر چھپ کر دیکھ رہا ہے۔ میں نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ میں نے اسے وہم سمجھا..... اس کے تیسرے دن رات کے دو بجے میں نے اپنے چہرے پر گرم گرم سانسیں محسوس کیں تو میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو وہ مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی تو وہ بولا کہ..... بیٹی! مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ تمہارے پاس انور افلم کی سی ڈیز ہو گی وہ مجھے دے دو تا کہ میں اسے دیکھوں۔ معاف کرنا میں تمہیں نیند کی حالت میں جگا دیا۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ میں نے پھر بھی اس پر شک نہیں کیا۔ اس کے چوتھے دن ممی کی سال گرہ تھی۔ ممی نے کچھ رشتہ داروں کو مدعو کیا جن میں دو تین لڑکے بھی تھے۔ ان دنوں بجلی کا بحران تھا۔ رات ایک بجے بجلی چلی گئی۔ پورے گھر میں گھپ اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے اندھیرے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ اس لیے میں کمرے سے نکل کر ممی کے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ راہ داری میں کسی نے مجھے دبوچ لیا۔ میں سمجھی کہ کزن ارشی ہے۔ میں نے اسے من مانی کا موقع دیا۔ وہ ایک بار مجھ سے من مانی کر چکا تھا۔ مجھے ذرہ برابر بھی شک نہیں ہوا کہ یہ میرا سوتیلا باپ ہے۔ میں نے صبح ارشد سے کہا کہ یہ رات تم نے کیا حرکت کی تھی.....؟ تو اس نے حلفیہ کہا کہ وہ نہیں تھی۔

اچھا ہوا کہ بات دست درازی سے آگے نہیں بڑھ سکی تھی کیونکہ جب آہٹ ہوئی تو میں اس کی گرفت سے نکل آئی تھی۔ اگر یہ آہٹ نہ ہوتی تو پھر وہ حد سے تجاوز

رجاتا۔ پھر یہ کتنی شرم ناک بات ہوتی۔ جب اس بات
اعلم ہوتا کہ ارشد نہیں میرا باپ تھا۔ جب مجھے ارشد نے
ایا تو پھر بھی میرا خیال اور شک باپ کی طرف نہ گیا لیکن
ب میں نے ناشتے کی میز پر اپنے باپ کی معنی خیز نگاہیں
سوس کی تو میرے دل کے کسی کونے میں شک کا سانپ
ہرایا۔ میں جان گئی کہ وہ میرا باپ ہی تھا جس نے ایک
شتے کے تقدس اور ایک لڑکی کی آبرو کو پامال کیا۔ میں
ناط ہوگئی لیکن میری یہ احتیاط کچھ کام نہ دے سکی۔ میں اس
کے ہاتھ لٹ گئی۔

گزشتہ مہینے میں' میرا باپ اور میری ماں ایک رشتہ دار
ور اس کی بیوی کے ساتھ کاکس بازار پکنک منانے
ئے۔ چاندنی راتیں نہ تھیں۔ رشتہ دار کی بیوی میری ماں
کی بچپن کی سہیلی تھی۔ میری ماں اور وہ ایک کمرے میں سو
گئیں۔ میرا باپ اور اس عورت کا شوہر ایک دوسرے
کمرے میں۔ میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ رات جب
میں گہری نیند میں غرق تھی مجھ پر شب خون مارا گیا۔ میں
نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور نہ تعرض کیا۔ کیوں کہ وہ شخص
مجھے بے حد پسند تھا۔ وہ ٹی وی اداکار بھی رہ چکا تھا۔
میرے حسن کا بڑا دلدادہ تھا۔ صرف اس کی باتیں معنی خیز
ہوتی تھیں۔ اس نے کبھی میرے ساتھ نازیبا حرکت نہیں
کی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ آج اسے موقع ملا تو اس نے فائدہ
اٹھایا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا تھا۔

دوسرے دن میں نے اس کی آنکھوں میں اور ہونٹوں
پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ ہی دیکھی۔ وہ کمینہ بہت خوش اور
مسرور تھا۔

یہ کہانی سنا کر وہ ایک دم سے خاموش ہوگئی۔ اس پر
افسردگی سی طاری ہوگئی۔ وہ حسرت و یاس کی تصویر بنی
بیٹھی تھی۔ میں نے کہا۔

"پروین! سارا قصور تمہارا اور تمہاری ماں کا ہے۔ میں
تمہارے سوتیلے باپ کو کوئی دوش دوں گا اور نہ ہی معدور
الزام ٹھہراؤں گا۔"

"میرا قصور.....؟" پروین ایک دم سے چونک پڑی۔
اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "میری ماں کا قصور.....؟ میرا
باپ بے قصور.....؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو.....؟ مجھے یقین
نہیں آ رہا ہے کہ تم میرے باپ کو بے قصور کہہ رہے ہو؟
کہیں یہ میری سماعت کا قصور تو نہیں ہے؟"

"پروین....." میں نے اس کے ہاتھ کی پشت تھپ
تھپائی۔ "تم میری باتیں غور سے سنو۔ ایک حقیقت پسند
زمانہ شناس لڑکی کی طرح..... پھر تم خود سے اپنا احتساب
کرنا..... پھر خود منصف بن کر فیصلہ کرنا۔ تم جو بھی فیصلہ
کرو گی میں اسے قبول کرلوں گا۔ بات یہ ہے پروین!.....

عورت کی جسمانی بے حجابی بے شرمی اور بے حیائی ایک
ایسی چیز ہے کہ مرد کو بے قابو بے لگام کر دیتی ہے۔ سوتیلا'
سوتیلا ہوتا ہے۔ سوتیلا باپ کبھی سگے باپ کی جگہ نہیں لے
سکتا۔ تم ایک بھرپور جوان لڑکی جس لباس اور جس حالت
میں گھر میں اور سمندر میں نہائے تو کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ اس
کے جذبات بھڑک نہیں اٹھیں گے۔ تمہارے باپ نے جو
کچھ کیا وہ بڑا گھناؤنا اور شرمناک ہے۔ اب تم ایسا کرو اور
ایسا لباس پہنو جس میں جسم کی نمائش نہ ہو۔ سمندر میں
مغربی کاسٹیوم پہن کر نہ نہاؤ اور نہ تیرو..... آخر بے حیائی اور
بے حجابی کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تم اس بات کی کوشش کرو کہ
ماں سے کہہ کر اپنی پسند کے کسی لڑکے سے شادی کر کے گھر
بسا لو..... تمہاری یہ آزادی اور بے راہ روی تمہیں کسی دن
ایسی پستی میں گرا دے گی تم کبھی نکل نہ سکو گی۔"

پروین میری باتیں بڑے غور اور دھیان سے سنتی رہی۔
پھر اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھ سے
زیادہ میری ماں قصوروار ہے جس نے مجھے آزادی دی۔
ڈیسل دی۔ میری پرلاش ایسے' دل ہی کی جو آزادانہ تھا۔
اس نے مجھے بے حجاب بنایا۔ اب میں ایک اچھی لڑکی بننے
کی کوشش کروں گی۔ میرے باپ کو میرے جسم نے
ورغلایا' بہکایا۔ کاش! میں نے اسے حجاب نہ کیا ہوتا اور
میری ماں کو احساس ہوتا....."

بھرے کہنے پر پروین نے اپنے کمرے کا دروازہ بند
کے اندر سے چٹخنی لگا لی تھی۔ میں رات دو بجے تک
تا رہا تھا۔ کیوں کہ میرے ذہن میں طرح طرح کے
یالات کی یورش رہی تھی۔ میں بہت دیر تک سونے کے
رے میں سوچتا رہا تھا۔ جس کی تلاش کے لیے بھیجا گیا
لیکن میں اس کا کھوج لگا نہ سکا تھا۔ میں اپنی یادداشت
سے محروم اپنے آپ کو تلاش کر رہا تھا۔ میری یادداشت
ت کر نہیں آتی تھی۔ میں کیسے کیسے واقعات کی زد میں رہا
تھا اور اب بھی ایسے گرداب میں پھنسا ہوا تھا کہ اس سے
کل نہیں پا رہا تھا۔ رشیدہ بہت یاد آ رہی تھی۔ جواب اس
نیا میں نہیں رہی تھی۔ میں ان خیالات میں گم تھا کہ میں
نے ایک آہٹ سنی۔ راہ داری میں اندھیرا تھا۔ میرے
کمرے کے سامنے پروین کا کمرا تھا۔ ایک سایہ پروین
کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ دروازے پر رکا۔ اس
نے دروازے کو دھکا دے کر کھولنے کی کوشش کی.....
دروازہ نہیں کھلا..... میں نے آہستہ سے کہا۔ "کون
ہے.....؟ کیا راجو بابا ہے.....؟" میری آواز سنتے ہی
سایہ اندھیرے میں گم ہوگیا۔

وہ ہاشم ہی تھا۔ اندھیرے میں شب خون مارنے۔ اس
خیال سے پروین سمجھے گی کہ وہ درندہ میں تھا۔ صبح ناشتے کی
میز پر پروین کو دیکھ کر حیرت اور خوشی ہوئی۔ اس نے جو
لباس پہنا ہوا تھا۔ وہ ایسا تھا جیسا شریف گھروں کی
لڑکیاں پہنتی ہیں۔ اس لباس میں اس کے جسم کا کوئی سا
بھی حصہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ شلوار قمیص میں تھی۔ اس نے
دوپٹا سینے اور شانے پر اس طرح سے ڈال رکھا تھا کہ جسم کی
زنیت ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ جیسا کہ اس نے مجھے بعد میں
بتایا تھا کہ اس کے پاس ایسے دو تین جوڑے ہیں وہ جب
بھی اپنے ماموں کے ہاں جاتی ہے تو پہن کر جاتی ہے
کیوں کہ اس کے ماموں ایک سخت گیر شخص ہیں۔ انہیں
بے حیائی اور عریانی بالکل پسند نہیں ہے۔ اس کی ماں بھی
جب ان کے ہاں جاتی ہیں تو وہ بھی لباس کے معاملے میں
بڑی محتاط ہوتی ہیں۔

"گلنار بیگم اور ہاشم نے بھی پروین کو حیرت سے دیکھا
تھا۔ اس میں جو راتوں رات انقلاب آیا تھا اس کی وجہ سمجھ
میں نہیں آئی تھی اور انہوں نے پوچھا بھی نہیں تھا۔ البتہ
میں نے ہاشم کے چہرے سے محسوس کیا کہ وہ رات کی
ناکامی پر دل میں بری طرح کڑھ رہا ہے۔ خار کھا رہا
ہے۔ اس نے ناشتے کے دوران پروین کو معنی خیز نظروں
سے کئی بار دیکھا تھا۔ اس کی نگاہیں جیسے کہے دے
رہی تھیں تم کب تک میرے ہاتھوں سے بچو گی۔ میں ایک
بار کامیاب ہو چکا ہوں۔ کوئی شکار آج تک میری نظروں
سے نہیں بچا۔

پروگرام یہ تھا کہ گیارہ بجے سمندر میں نہانے اور تیرنے
کے بعد ایک بجے لنچ کرنے کے بعد واپس روانہ ہو
جائیں گے۔ جب گیارہ بجے نہانے کے لیے پہنچے تو گلنار
بیگم تو نہانے کے مختصر لباس میں تھی۔ اس نے کل والا ہی
پیرا کی کا لباس پہنا ہوا تھا لیکن پروین ساڑی اور بلاؤز
میں تھی۔ اس نے بلاؤز کو ساڑی کے پلو سے اس طرح
ڈھک لیا تھا کہ سینہ اور شانے نظر نہیں آتے تھے۔ ماں تو
اسے ساڑی میں دیکھ کر ہنس پڑی تھی اور بولی تھی۔ "پارو!
یہ آج تمہیں کیا ہوگیا ہے.....؟ کیا اس طرح نہایا اور تیرا
جاتا ہے۔"

"نہیں!" پروین نے جواب دیا تھا۔ "اب مجھے
احساس ہو رہا ہے کہ باپ کے سامنے اس لباس میں نہانا
اور تیرنا نہیں چاہیے۔"

"یہ تمہیں بڑی جلدی اس بات کا احساس ہوگیا؟" ہاشم
نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔ "تم ایک برس سے اس لباس
اور حالت میں سمندر میں میرے سامنے اترتی رہی ہو.....
اور پھر میں تمہارا باپ ہوں۔ کوئی غیر نہیں ایسا تو کبھی کبھی
اتفاق ہوتا رہا ہے۔"

"باپ اور بیٹی کے درمیان آخر حجاب تو ہونا چاہیے
نا....." پروین بولی تھی۔ "کل مجھے اس بات کا بڑا احساس

ہوا تھا یہ بے حیائی ہے۔ کل اس وقت ہوٹل کے سامنے ماں اور باپ کے ساتھ ان کی بیٹی بھی سمندر میں تیر رہی تھی لیکن وہ ساڑی میں تھی۔ جب کہ اس کی ماں نے ممی جیسا کاٹیوم پہنا ہوا تھا۔ اس لیے تب مجھے بھی احساس ہوا کہ مجھے ایک باپ کے سامنے اس حالت میں نہانا نہیں چاہیے۔ ہمارے ہاں تالابوں پر عورتیں ساری میں نہاتی ہیں۔ لباس میں نہانے میں بڑا مزا آتا ہے۔"

"یہ تم اچانک اتنی نوسی کیوں بن گئی ہو؟" گلنار بیگم نے کہا تھا۔

"پہلے مجھے ان باتوں کا احساس نہیں ہوا تھا..... شاید اس کہ ماحول کی وجہ سے میں نے محسوس نہیں کیا ہوگا؟"

"کہیں تمہارے اس مسافر اور محسن دوست نے تو تمہیں پٹی نہیں پڑھائی.....؟" ہاشم نے مجھے گھورتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

"نہیں..... انہوں نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی اور نہ ہی مجھے روکا ٹوکا..... البتہ اتنا ضرور کہا تھا کہ..... عورت کو بے حیائی زیب نہیں دیتی ہے۔ زاہد بھی اس بے حیائی سے بے کار ہو جاتا ہے۔ کسی مرد کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا ہے۔ وہ ناگ بھی ہوتا ہے اور مار آستین بھی..... لہٰذا بے حیائی سے بچو..... کسی مرد پر بھروسا نہ کرو۔"

پروین کی یہ بات سن کر ہاشم کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ کچھ کہتا۔ خانساماں نے آ کر کہا تھا کہ کھانا تیار ہے۔

اس وقت ہم اٹھ کھڑے ہوئے لیکن ہاشم کا تمتماتا ہوا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اندر ہی اندر سخت غصے کی حالت میں ہے۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ یہ سارا کیا دھرا ہے میرا ہے۔ میری ان باتوں کے زیر اثر پروین نے رات دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ کھانے کی میز پر ایک تناؤ کی سی کیفیت رہی تھی۔ ہاشم نے مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ جب کہ پروین مجھ سے ہنس کر بات کرتی رہی تھی۔ بڑے اصرار سے کھلاتی اور میرے پلیٹ میں کچھ نہ کچھ بھر دیتی تھی۔ کاکس بازار کے ساحل سمندر میں سفید پاپلیٹ مچھلی کی بہتات تھی۔ لوگ اسے روپ چندا کہتے ہیں۔ رادو نے مچھلی اتنی عمدہ فرائی کی تھی وہ بڑی لذیز اور مزے دار ہو گئی تھی۔ ہاشم کا یہ خیال بھی تھا کہ رات میں نے پروین کے ساتھ فائدہ اٹھایا ہے۔ اس خیال نے اسے اور چڑا دیا تھا۔ وہ جل بھن کر کباب ہو رہا تھا۔ میں اور پروین اس بات کو محسوس کر کے خوش ہو رہے تھے۔ اسے مزید جلانے کے لیے پروین مجھ سے لگاوٹ سے پیش آ رہی تھی۔

ہم لوگ دو بجے واپس چٹاگانگ کے لیے روانہ ہوئے۔ چٹاگانگ جب دو میل کے فاصلے پر رہ گیا ہماری گاڑی میں اچانک کوئی خرابی پیدا ہو گئی۔ ہاشم نے گاڑی سڑک کے کنارے کچے میں اتار لی۔ اس وقت سڑک سنسان اور ویران سی پڑی تھی۔ مخالف سمت سے ایک پجارو جیپ تیزی سے آتی دکھائی دی۔ ہاشم گاڑی سے اتر کر اس کا انجن دیکھ رہا تھا کہ اس لمحے وہ پجارو جیپ ہماری گاڑی کے سامنے آ کر رکی اس کے رکتے ہی اس میں سے دو مسلح نقاب پوش کود ے۔ ان میں سے ایک نے ہم چاروں کو کرخت لہجے میں حکم دیا کہ..... ہم فوراً اس جیپ میں بیٹھ جائیں۔ کسی نے مزاحمت اور پس و پیش کیا تو اسے بھون دیا جائے گا۔ ان کے ہاتھوں میں شارٹ گنیں تھیں۔ میں نے پروین اور گلنار بیگم سے کہا کہ دیر نہ کریں۔ ان کے حکم کی فوری تعمیل کریں۔ چند لمحوں کے بعد ہم چاروں جیپ کے اندر تھے۔ جب جیپ چل پڑی تو ایک بدمعاش نے جیب سے کلوروفارم میں بھیگا رومال ہم چاروں کو باری باری سونگھا دیا۔ ہم بے ہوش ہو گئے تھے۔ سب سے آخر میں رومال ہاشم کو سونگھایا گیا تھا۔

جب ہمیں ہوش آیا تو ہم سب ایک بہت بڑے کمرے میں تخت پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان پر بستر بچھا ہوا تھا۔ اس کمرے کا دروازہ بند تھا۔ باہر سے کنڈی لگا دی گئی تھی۔ سب سے زیادہ خراب حالت گلنار بیگم کی تھی۔ وہ بے حد پریشان، متفکر اور ہراساں تھی۔ اس کی آنکھوں سے خوف و دہشت جھانک رہی تھی۔ پروین چوں کہ مضبوط ا

اعصاب کی تھی اور بدترین واقعہ سے گزر چکی تھی اس لیے اس نے خود پر قابو پایا ہوا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو بہت زیادہ پریشان اور فکر مند ظاہر کیا۔ گو کہ ہاشم اپنے آپ کو بہت زیادہ خوف زدہ ظاہر کر رہا تھا۔ جب کہ ایسا کوئی نقشہ نہیں تھا۔ وہ کس لیے ایسا تاثر دے رہا ہے۔ میں نے جان لیا تھا۔ لیکن میں ابھی خاموش رہنا اور یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا واقعات پیش آتے ہیں۔ اگر میں اس وقت کچھ کہتا تو میری بات کا یقین نہ کیا جاتا۔

"ہاشم!" گلنار بیگم نے لرزیدہ سی آواز میں اپنے شوہر سے پوچھا۔ "یہ سب کیا ہے؟ ہم سب کو کس لیے اغوا کیا گیا ہے؟"

"اس کا جواب تو یہ شخص اور پروین ہی دے سکتے ہیں۔" ہاشم نے بڑے تلخ لہجے میں کہا۔ "اس کے یہ دونوں ہی ذمے دار ہیں۔"

"کیا کہا.....؟" پروین ایک دم سے اس طرح اچھل پڑی جیسے اسے برقی جھٹکا لگا ہو۔ "ہم دونوں اس کے ذمہ دار کیسے ہوئے؟"

"تم دونوں کی وجہ سے منشیات مافیا کو چالیس کروڑ ٹاکا کی منشیات اور چالیس لاکھ کی مالیت کا جو نقصان ہوا ہے۔ وہ معبود حاصل کرنا چاہتے ہوں گے۔" ہاشم نے جواب دیا۔ "چالیس کروڑ کی رقم تو حکومت کے ہاتھ لگ گئی ہے۔ صرف ایک ڈاکٹر اور رشیدہ کے مرنے سے کیا ہوتا ہے۔ جس مافیا نے ڈاکٹر شاہ جہاں سے سودا کیا تھا وہ تو گرفتار نہیں ہوئی ہے۔"

"یہ تم نے کیسے اندازہ کر لیا کہ یہ اس مافیا نے ہمیں گرفتار کیا ہے؟" گلنار بیگم سخت لہجے میں کہا۔ "کیا کوئی اور نہیں ہو سکتا ہے؟"

"ظاہر ہے ان کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟" ہاشم بولا۔ "یہ مصیبت ہم پر اس لیے آئی ہے کہ اس کہانی میں پروین کا نام بھی شامل ہے۔"

"لیکن یہ کارنامہ تو پروین نے نہیں بلکہ مسٹر عبداللہ نے انجام دیا ہے۔" گلنار بیگم نے تکرار کے انداز میں کہا۔ "پروین نے ٹی وی، ریڈیو اور پریس کو بتایا تھا کہ وہ ڈاکٹر کے ہاتھوں یرغمال تھی۔ اس کی جان جو بچی ہے وہ مسٹر عبداللہ کے باعث لہٰذا وہ کیوں....."

ان کے علم میں شاید یہ بات ہے کہ پروین عبداللہ کی محبوبہ ہے اور پھر عبداللہ ایک مسافر ہے۔ حکومت نے اسے جو رقم انعام میں دینے کا اعلان کیا وہ رقم اس نے سیلاب زدگان فنڈ میں دے دی۔ لہٰذا وہ چالیس کروڑ کی رقم تم سے وصول کریں گے۔ کیوں کہ تمہارا کل اثاثہ ایک ڈیڑھ ارب سے کم نہیں ہے۔"

"میں کیوں اور کس لیے انہیں چالیس کروڑ کی رقم دے دوں؟" گلنار بیگم نے بدک کر کہا۔ "میں انہیں چالیس ٹاکا بھی نہیں دوں گا۔"

"تمہیں دینا پڑے گا۔" ہاشم زور دے کر بولا۔ "وہ ہر قیمت پر وصول کر کے رہیں گے۔ انہیں رقم وصول کرنا آتا ہے۔ کیوں کہ وہ لوگ....."

"اگر ہم نے انہیں رقم نہیں دی تو وہ ہمارا کیا بگاڑ لیں گے.....؟" پروین نے تنک کر کہا۔ "وہ رقم حکومت سے وصول کریں۔ ہم سے کیوں.....؟"

"وہ بہت کچھ بگاڑ سکتے ہیں۔" ہاشم کہنے لگا۔ "زیادہ اکڑنے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ ہم ان کے قیدی ہیں اور ان کے رحم و کرم پر ہیں۔ انہیں ہمارے بارے میں تمام معلومات ہوں گی۔ اس لیے انہوں نے ہم پر ہاتھ ڈالا ہے۔ حکومت انہیں رقم کیوں دینے لگی۔"

"پروین ٹھیک کہتی ہے۔" گلنار بیگم نے کہا۔ "میں کسی قیمت پر انہیں رقم نہیں دوں گی۔ کیا میری دولت ان کے باپ کا مال ہے۔ مافیا کا نقصان ہوا ہے تو اس میں ہماری نہیں ڈاکٹر شاہ جہاں کی غلطی تھی۔ اس کا خمیازہ ہم بھگتیں گے۔ کیوں؟ یہ کون سا اصول ہے۔"

"جان من!" ہاشم اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ "ضد اور ہٹ دھرمی کی باتیں نہ کرو۔ اس

سے خطرناک تنظیم ہے۔ اس میں پیشہ ور مجرم، قاتل اور خوں آشام بھیڑیے ہوتے ہیں۔ یہ کسی پر رحم کرنا اور ترس کھانا نہیں جانتے ہیں۔ جب سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکالتا ہے ٹیڑھی انگلی سے نکالا جاتا ہے۔"

"آپ ان کی طرف داری کیوں کررہے ہیں؟" پروین سیخ پا ہوگئی۔ "ہمیں ان سے ڈرا کیوں رہے ہیں؟" ایسا لگتا ہے جیسے وہ آپ کے دوست ہوں۔ ہمیں ڈرانے اور خوف زدہ کرنے کے بجائے ایسی تدبیر سوچنا چاہیے کہ ان سے نجات مل جائے۔"

"میں ان کی طرف داری نہیں کررہا ہوں بلکہ تم ماں بیٹی کی سلامتی کے لیے کہہ رہا ہوں۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"کیا صرف ہماری سلامتی.....؟" پروین نے تیز لہجے میں کہا۔ "آپ کی اور مسٹر عبداللہ کی نہیں.....؟ یہ کیا بات ہوئی؟"

"بات یہ ہے کہ تم دونوں ماں بیٹی بہت حسین اور پرکشش ہو۔" ہاشم کہنے لگا۔ "تمہاری ماں حسین ہی نہیں دولت مند بھی ہے۔ یہ بدمعاش تم دونوں کی عزت سے کھیل سکتے ہیں۔ بلیک میل کرنے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے بھی استعمال کرسکتے ہیں۔ عزت کی بہت بڑی قیمت چکانا پڑتی ہے۔ تمہاری ماں کو تمہاری اور اپنی عزت کے لیے ان کی ہر بات کو ماننا ہوگا۔ ورنہ تم دونوں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوگی۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ اگر انہوں نے بڑی رقم کا مطالبہ کیا تو انہیں دے دی جائے۔ ورنہ وہ جان بھی لے سکتے ہیں..... زندگی سے زیادہ عزیز اور قیمتی شے نہیں ہے۔ دولت کا کیا ہے پھر آجائے گی لیکن زندگی دوبارہ نہیں مل سکتی۔"

"لیکن میں چالیس کروڑ کی رقم کہاں سے لاؤں؟" گلنار بیگم بولی۔ "تم جانتے ہو کہ دس کروڑ کا کاروبار ہے جس میں رقم پھنسی ہوئی ہے۔ باقی پچاس ساٹھ کروڑ کی جائیداد ہے۔ اتنی بڑی رقم کہاں سے اور کیسے دی جاسکتی ہے۔"

"دس کروڑ کی رقم جو تم نے گھر میں رکھی ہوئی ہے اور ہیرے جواہرات کے زیورات اور ہیرے جن کی مالیت ڈیڑھ کروڑ ہے وہ انہیں دے کر عزت اور جان بچائی جاسکتی ہے۔ وہ شاید اس پر راضی بھی ہوجائیں۔" ہاشم نے گہرا سانس لے کہا۔

"وہ دس کروڑ کی رقم میں نے ایک اسٹیمر اور لانچ کی خریداری کے لیے رکھی ہوئی ہے۔" گلنار بیگم نے کہا۔ "اس لیے کہ اسے ڈالر میں تبدیل کرکے ڈرافٹ بنوایا ہے۔ ہم انہیں کیوں بتائیں اس رقم اور ہیرے جواہرات اور ہیروں کے بارے میں۔"

"لیکن اتنی بڑی رقم کے سوا رہائی نہیں ہوسکتی۔" ہاشم نے کہا۔ "اور اس کے سوا چارہ بھی نہیں انہیں صرف مال چاہیے۔"

اس سے پہلے کہ گلنار بیگم کچھ کہتی دروازہ کھلا۔ دو بدمعاش اندر داخل ہوئے لیکن ان کے چہرے پر خاب نہیں تھی وہ چہرے مہرے اور وضع قطع سے پیشہ ور بدمعاش لگ رہے تھے۔ وہ دروازے میں کھڑے ہمیں خوں خوار کتوں کی طرح دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے ہاشم کو کرخت لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تو چل..... تجھے ہمارے باس نے بلایا ہے۔"

ہاشم اپنی جگہ سے اٹھا۔ ہم تینوں کی طرف بے بسی دیکھا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان کے پاس پہنچا تو ایک نے ہاشم کی گردن ناپی اسے ایک زور سے دھکا دیا تو وہ کمرے سے باہر جا گرا۔ دروازہ بند کرکے اسے لے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس پر جیسے تشدد کیا جارہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ آیا تو اس کا چہرہ کا جغرافیہ ہی بدلا ہوا تھا۔

"تم چلو....." جو بدمعاش ہاشم کو لے کر آیا تھا۔ وہ پروین سے بولا۔ "کیا پیاری گڑیا ہے۔ گڈا تمہارا انتظار کررہا ہے۔"

(جاری ہے)

بدخصال

سلیم فرخی

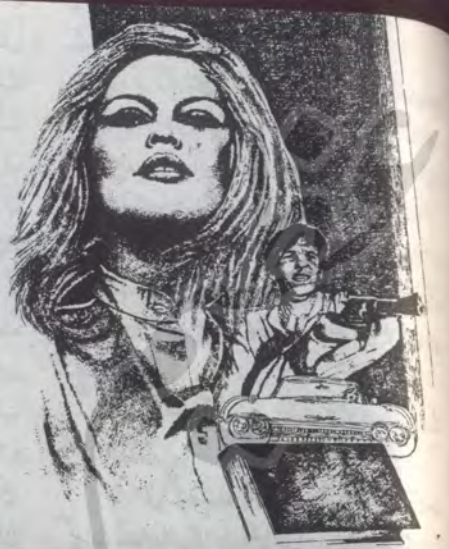

گریسن کو اس پر رشک آنے لگا کہ گولفو پام اسپرنگ جاکر دو ہفتوں تک تفریحی مشاغل سے دل بہلائے گا۔ جب کہ وہ دو روز کی چھٹی لے کر ساحل سمندر تک نہیں جاسکتا۔ جب وہ اپنی کار پارکنگ لاٹ سے نکال رہا تھا تو اس کا دل بہت افسردہ تھا۔ اس لیے کہ آج اس کی شادی کی سالگرہ تھی اور وہ اپنی بیوی کو کہیں سیر کرانے نہیں لے جاسکتا تھا۔ اس نے ایک بیکری سے کیک اور گلدستہ خرید لیا

لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

"صبح بخیر۔" گریسن نے اس کی طرف اپنا ملاقاتی کارڈ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری بیمہ کمپنی کی طرف سے آیا ہوں، اطلاع ملی ہے کہ گزشتہ رات تم سے کار کا حادثہ ہوگیا ہے؟"

"ہاں۔" رچرڈ نے اس کے کارڈ پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ بیمہ کمپنی کا کلیم انسپکٹر تھا۔

"تمہارا تحریری بیان بعد میں لیا جائے گا پہلے زبانی تفصیلات سے آگاہ کرو۔" گریس نے کہا۔

"بیان کرنے کے لیے کوئی خاص بات نہیں ہے۔" رچرڈ نے شانے اچکا کر کہا۔ "گزشتہ رات میں نے اپنے ایجنٹ کو بتا دیا تھا کہ میں نے ایک کار کو ٹکر ماردی ہے۔ وہ سگنل کی سرخ بتی روشن ہونے پر اچانک رک گئی تھی۔ بہر حال زیادہ نقصان نہیں ہوا۔"

"کیا کار کے بریک فیل ہوگئے تھے؟" گریسن نے سوال کیا۔

"اوہ! یہ بات نہیں ہے۔" رچرڈ نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "میں رات کو کھلنے والی ایک مارکیٹ سے دودھ، گوشت اور انڈے لے کر آرہا تھا۔ وہ چیزیں ایک شاپر میں تھیں جو پسنجر سیٹ پر رکھا تھا۔ کار چل رہی تھی تو وہ لڑھک رہا تھا اس لیے کبھی کبھار میری توجہ اس طرف مبذول ہوجاتی تھی اور میں ایک ہاتھ سے اسے سنبھالنے لگتا تھا۔ چوں کہ اس میں انڈے بھی تھے۔ چنانچہ مجھے احتیاط کرنا پڑ رہی تھی۔ ایک بار میں نے شاپر کی طرف دیکھا اور پھر سامنے۔ اتنے میں ایک کار اچانک رک گئی تھی۔ مجبوراً میں نے بھی بریک لگائے لیکن میری کار جاکر اگلی کار سے ٹکرا گئی۔ وہ مسٹر گولفو کی کار تھی۔"

"تمہاری کار کا کیا نقصان ہوا؟"

"ایک ہیڈ لائٹ کا شیشہ ٹوٹ گیا۔" رچرڈ بولا۔

"تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں۔"

"تم اپنی کار میں اکیلے تھے؟"

"ہاں۔"

"کار میں اندھیرا تھا اور رات کا وقت تھا اس لیے میں واضح طور پر دیکھ نہ سکا- آگے ایک موڑ پر ہم لوگوں نے اپنی کاریں روک لیں- مسٹر گولفو اپنی کار سے اتر کر میرے پاس آیا اور معذرت کرنے لگا- مگر میں اندازہ نہ لگا سکا کہ اس کی کار میں اور کون تھا اس لیے اس نے روشنی نہیں کی تھی- اور یہ کہ میں اپنی کار سے اترا بھی نہیں تھا-" رچرڈ نے کہا-

گریسن نے اس کی کار کا معائنہ کیا اور پھر اپنی رپورٹ لکھی اور وہاں سے چل پڑا- سڑک پار شہر کا دوسرا حصہ تھا- وہ البرٹ روڈ پر رک گیا اس لیے کہ وہاں ٹریفک بہت تھا- اسے یاد آیا کہ اس کی کار کا بریک ڈھیلا ہے اس لیے اسے درست کرا لینا بہتر رہے گا- سڑک پار اس کی نگاہ گولفو ریستوران پر پڑی تو وہ سمجھ گیا کہ ریستوران اپنے مالک کے نام پر ہے- جب ٹریفک رک گیا تو وہ اپنی کار وہاں لے گیا- اس نے کار ریستوران کے دروازے پر روکی اور اندر گیا- اس کے آفس میں ایک شخص میز پر اخبار پھیلائے بیٹھا تھا-

"مسٹر گولفو؟" گریسن نے پوچھا-

"ہاں-" وہ بولا- "اندر آجاؤ- تمہاری تعریف؟" گریسن نے اپنا تعارفی کارڈ نکال کر اسے پیش کیا- "اوہ! اچھا!" وہ بولا- "بیٹھو-" پھر اس نے میز کی دراز کھول کر دو کاغذ نکالے اور اس کے سامنے رکھ دیے- "ریستوران کی طرف آتے ہوئے میں دو گیراجوں پر رکا تھا- وہاں سے میں نے کار کی مرمت کا تخمینہ لے لیا ہے-"

اس کے آفس میں داخل ہونے سے پیشتر گریسن کو ایک کار کھڑی نظر آئی تھی جس کا پچھلا حصہ پچک گیا تھا- وہ یقیناً اسی کی کار تھی- گولفو ایک حسین اور وجیہ شخص تھا- جس کی عمر تقریباً ستائیس سال تھی- وہ کافی ہوشیار معلوم ہوتا تھا- اس لیے کہ ابھی تک گریسن کو کسی ایسے شخص کا

کے وقت وہ دو گیراجوں کا تخمینہ لیے بیٹھا ہو!

اسے دیکھ کر گریسن کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس سے حسد کر رہا ہو- اس لیے کہ گولفو نہ صرف یہ کہ نوجوان اور خوب صورت تھا بلکہ دو ریستورانوں کا مالک بھی تھا- ایک تو یہ تھا اور دوسرا شہر کے دوسرے حصے میں تھا جسے پر کلب کہا جاتا تھا- اس ریستوران کا ڈیزائن اس نے خود تیار کیا ہے- اس جگہ مال بردار ٹرکوں کا اڈا ہے- اس لیے ٹرک وہاں ٹھہرتے ہیں اور عملہ ریستوران میں تھوڑی دیر کے لیے ضرور آتا ہے-

گریسن نے سوچا بعض لوگ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوتے ہیں-

"اگر تم اس تخمینے سے مطمئن نہ ہو تو میں ایک آدھ گیراج سے اور اس کا اندازہ کرا لوں-" گولفو نے کہا-

گریسن نے دونوں کاغذ اٹھا کر دیکھے- ایک میں تین سو ستر ہ ڈالر اور دوسرے میں تین سو بائیس ڈالر اور چند سینٹ درج تھے- اس نے سوچا مرمت کی رقم زیادہ نہیں ہے-

"تمہاری کار کا بیمہ ہو چکا ہے؟" اس نے پوچھا-

"ہاں اور پالیسی میں یہ ضمانت دی گئی ہے کہ حادثے کی صورت میں کمپنی اس کا خرچا برداشت کرے گی-" پھر اس نے اپنی بیمہ کمپنی کا نام بتایا-

"کیا تم نے پولیس میں رپورٹ درج کرائی؟"

"پولیس میں رپورٹ درج کرانے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی- اس لیے کہ رچرڈ نے تسلیم کر لیا کہ غلطی اسی سے ہوئی ہے-"

"تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں-"

"کیا کار میں کوئی اور بھی تھا؟"

"نہیں-" وہ بولا- "اس وقت میں تنہا تھا-"

"یہ تخمینے درست ہیں- کمپنی کے اصول کے مطابق ہم

م رقم والا تخمینہ منظور کر لیں گے- اگر تم اپنا تحریری بیان ے دو اور یہ لکھ دو کہ کار میں اس وقت کوئی نہیں تھا تو چار الیم ابھی منظور ہو سکتا ہے-"

"تم جو کہو میں ویسا کرنے کو تیار ہوں-"

"کیا تم شادی شدہ ہو؟"

گولفو نے اثبات میں سر ہلا دیا- پھر مختصر سا بیان لکھ کر ا پر دستخط کر دیے اور اسے گریسن کی طرف بڑھا دیا- ریسن نے اسے تخمینوں سمیت اٹھا لیا- "ٹھیک ہے میں ہیں تین سو ستر ہ ڈالر کا چیک بھجوا دیتا ہوں-"

گریسن کو چھوڑنے کے لیے گولفو دروازے تک آیا- ا نے کہا- "جب کار کی مرمت ہو جائے گی تو میں پام برنگ جاؤں گا اور دو ہفتوں تک وہیں رہوں گا- گولف ا سنو کر کھیلوں گا-"

گریسن کو اس پر رشک آنے لگا کہ گولفو پام اسپرنگ ر دو ہفتوں تک تفریحی مشاغل سے دل بہلائے گا- ب کہ وہ دو روز کی چھٹی لے کر ساحل سمندر تک نہیں سکتا- جب وہ اپنی کار پارکنگ لاٹ سے نکال رہا تھا تو ا کا دل بہت افسردہ تھا- اس لیے کہ آج اس کی شادی ا سالگرہ تھی اور وہ اپنی بیوی کو کہیں سیر کرانے نہیں لے سکتا تھا- اس نے ایک بیکری سے کیک اور گلدستہ ید لیا-

جب وہ اپنے مکان پر پہنچا تو اپنی بیوی کی کار اسے ریکو میں کھڑی دکھائی دی- وہ سوچنے لگا کہ اس کی بیوی پنے کام سے اتنی جلدی کیسے واپس آ گئی! وہ بیرونی کمرے میں داخل ہوا تو اس نے کیرول کو ٹہلتے پایا- وہ صے میں تھی- اس نے کہا- "میں تو سوچ رہی تھی کہ شاید آج تم گھر ہی واپس نہیں آؤ گے-

لنچ کے بعد میرے سر میں درد ہونے لگا- اس لیے میں نے چھٹی کر لی- اس وقت میری کمر اور گردن میں بھی کھنچاؤ ہے-" وہ بولی-

"اوہ! تم پر پولیو کا اثر تو نہیں ہو گیا؟" گریسن نے گھبرا کر کہا-

"نہیں- اس کا پولیو سے کوئی تعلق نہیں ہے- حقیقت یہ ہے کہ میری کمر میں چک آ گئی ہے-"

"کیا!" گریسن کو حیرت ہوئی-

"ہاں- میں تمہیں تفصیل بتا دوں کہ کار کی پشت پر کسی نے ٹکر ماردی تھی- وہ ایک ایکسیڈنٹ تھا-" وہ بولی-

گریسن کو مزید حیرت ہوئی اس لیے کہ کیرول نے اس سے پہلے ایکسیڈنٹ کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا- "میں نے ابھی تمہاری کار دیکھی تھی اس پر کوئی ڈینٹ تو نہیں پڑا ہے-"

"اس وقت میں اپنی کار میں نہیں تھی-" کیرول نے کہا- گریسن ہکا بکا رہ گیا- "ایک شخص عرصے سے میرے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ میں اس کے ساتھ کہیں باہر گھومنے چلوں اور کہیں بیٹھ کر ڈرنک لوں- گزشتہ رات میں اس کے ساتھ باہر نکلی کہ یہ حادثہ پیش آ گیا- بس اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوا تم پریشان نہ ہونا-"

"لیکن تم نے ایسا کیوں کیا کیرول؟" اس نے کھردرے لہجے میں پوچھا-

"اس لیے کہ روز شام کو میں گھر پر تنہا ہوتی ہوں اور اب مرنے کی حد تک بور ہو چکی ہوں-" کیرول نے ہونٹ سکیڑ کر کہا-

گریسن نے گلدستہ اس کے ہاتھ میں دینے کے بجائے صوفے پر رکھ دیا-

"تم مجھ پر غصہ نہیں کر سکتے اس لیے کہ تم روز پڑھائی کے بہانے انسٹی ٹیوٹ جاتے ہو، لیکن کمپیوٹر کی کلاس سے غیر حاضر رہتے ہو اور دوسری عورتوں کے ساتھ گھومتے ہو-"

گریسن آج تک کسی غیر عورت کے ساتھ باہر نہیں گیا تھا- وہ اس پر تہمت لگا رہی تھی-

"کیا اس شخص نے اپنی کار کا بیمہ کرایا ہوا تھا؟"

"ہاں- اس کا نام گولفو ہے اور وہ دو ریستورانوں کا

مالک ہے۔"

"یہ حادثہ کیسے ہوا تھا؟" اس نے سوال کیا۔

کیرول نے اس حادثے کے بارے میں بتایا تو گرین کو یقین ہوگیا کہ یہ وہی کیس ہے جس پر وہ صبح سے تحقیق کر رہا ہے۔ اسے غصہ آ رہا تھا کہ وہ اپنی زندگی بہتر بنانے کے لیے روزانہ رات کو کمپیوٹر کی کلاس میں جاتا ہے اور یہاں بیوی غیر مردوں کی ساتھ تھوم رہی ہے۔ وہ گولفو کے ساتھ اس شام سیر و تفریح کے لیے نکلی تھی جب کہ دوسرے روز اس کی شادی کی سالگرہ تھی۔

گرین کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ آگے بڑھ کر کیرول کی گردن دبا دے اور اس وقت تک دباتا رہے جب تک کہ اس کا دم نہ نکل جائے۔

ایک لمحے کے لیے اس نے دماغ کو ٹھنڈا رکھتے ہوئے صورت حال پر غور کیا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے سارا قصور گولفو کا ہے۔ اگر وہ اصرار نہ کرتا تو کیرول اس کے ساتھ باہر جانے پر آمادہ نہ ہوتی۔ اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ دوسرے روز جا کر گولفو سے بات کرے گا۔

وہ دوسری صبح اس کے ریستوران والے آفس پر گیا تو گولفو اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے کہا۔ "اتنی جلدی تمہیں دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے۔"

"کیرول نے مجھے حادثے کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ وہ اس وقت تمہارے ساتھ تھی۔"

"دوست! میں نے اسے مجبور نہیں کیا تھا کہ وہ راتوں کو میرے ساتھ کلب جائے۔" گولفو نے گھبرا کر کہا۔ اس کے چہرے پر سراسیمگی تھی۔

غصے سے گرین کا دماغ ابلنے لگا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اشتعال دیکھ کر گولفو نے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ ایسی بات تم کو بتا دے گی۔"

گرین نے سوچا کہ اسے مطالبہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ وہ بولا۔ "کیرول کی کمر میں چک آ گئی ہے۔ میں نے اسے ڈاکٹر کو دکھایا ہے۔ اس نے کیرول کو چیک کرلیا ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ وہ صحت یاب ہو جائے گی۔ لیکن اس کے علاج کے اخراجات میں برداشت نہیں کر سکتا۔ جب کہ تمہاری میڈیکل تنخواہ سے ڈاکٹر کا بل ادا کیا جا سکتا ہے۔"

"مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اور میں تمہیں اس کی وجہ بتاتا ہوں۔" گولفو نے کہا۔

پھر اس نے گرین کو بتایا کہ اس نے ایک مالدار لڑکی سے شادی کی ہے۔ اور اسی کی مالی امداد سے اس نے دو ریستوران کھولے ہیں۔ وہ اسے کئی بار تنبیہ کر چکی ہے کہ وہ غیر عورتوں سے تعلقات استوار نہ کرے۔ اگر اس کے کانوں تک یہ کہانی پہنچ گئی تو وہ اسے طلاق دے دے گی۔

"اس لیے اگر میں یہ اعتراف کرلوں کہ میں رات کو اپنی کار میں تمہاری بیوی کو تفریح کرانے لے گیا تھا تو بات یہاں ختم نہیں ہو جائے گی بلکہ بڑھ جائے گی۔ میں تمہاری بیوی سے واقف ہوں وہ مجھ پر مقدمہ چلائے بغیر نہیں رہے گی۔ میری بیوی نے اس کے بارے میں ایک لفظ بھی سن لیا تو وہ فوراً مجھے طلاق دے دے گی۔ جب کہ میں اب عیش و آرام کی زندگی نہیں چھوڑنا چاہتا۔ اس لیے ڈاکٹروں کے بلوں کی ادائیگی وغیرہ کی باتیں چھوڑو اور سیدھا سا معاہدہ کرلو۔ کیا خیال ہے۔ میں تمہیں پانچ سو ڈالر ادا کر دوں؟"

"نہیں گولفو پانچ سو سے کام نہیں چلے گا۔ مجھے دس ہزار ڈالر چاہئیں۔" گرین نے بھاری مطالبہ کیا۔

"دس ہزار! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ اسے زیادہ چوٹ نہیں لگی....."

"تم بھی تو کہہ چکے ہو کہ عیش و آرام کی زندگی ترک نہیں کر سکتے۔ اس کی قیمت تو بہر حال تمہیں ادا کرنا پڑے گی۔ تمہیں دس ہزار ڈالر آج رات تک ادا کرنا ہوں گے۔" گرین نے قطع کلامی کر کے کہا۔

گولفو کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا۔ "ٹھیک ہے میں رقم کی ادائیگی کے لیے تیار ہوں۔ مگر اس کے لیے رات تک کا وقت چاہیے۔ میں اپنی بیوی کے علم میں لائے بغیر رقم جمع کرنا چاہتا ہوں۔ تم رات کے دو بجے مجھ سے رقم اسی جگہ آ کر لے لینا۔"

☆☆☆

اس روز شام کو لیکچر میں گرین کا دل نہیں لگ رہا تھا اس لیے کہ دس ہزار ڈالر اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس رقم سے اسے آسودگی حاصل ہوگی۔ مگر وہ کیرول کو ایک ڈالر بھی نہیں دے گا۔

جب وہ ترقی کرلے گا تو کیرول سے علیحدگی اختیار کرلے گا۔ لیکن کیسے؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ڈیڑھ بجے رات کو گرین اس کیفے سے نکلا جہاں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کافی پیا کرتا تھا۔ پھر وہ اپنی کار میں بیٹھا اور سست رفتاری سے میکال روڈ کی طرف روانہ ہوگیا۔ جہاں گولفو کا ریستوران تھا۔ ایلن روڈ کی کراسنگ پر اسے رکنا پڑا اس لیے کہ وہاں کی بتی سرخ ہوگئی تھی۔

اتفاقاً اس کی نگاہ عقب نما آئینے کی طرف اٹھ گئی تو اسے اپنے پیچھے ایک کار کھڑی دکھائی دی۔ جس کی ہیڈ لائیٹس بجھی ہوئی تھیں۔ اسے غصہ آنے لگا کہ اپنی کار میں خرابی ہونے کے باوجود لوگ کار چلاتے رہتے ہیں۔

دفعتاً اس نے ایک گہرا سانس لیا اس لیے کہ پیچھے سے اس کار نے اس کی کار کو ٹکر ماری تھی۔

گرین کی چھٹی حس اسے خبردار کرنے لگی تو وہ فوراً وہاں سے چل دیا۔ مگر اس وقت وہ آگے جا سکتا تھا اور نہ ہی دائیں جانب مڑ سکتا تھا۔ اس لیے کہ بائیں جانب سے ایک لوڈنگ ٹرک آ رہا تھا جس پر فولادی پائپ لدے ہوئے تھے اور اس کا ڈرائیور مقررہ رفتار سے زیادہ تیز چلا رہا تھا۔ گرین کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے اس لیے کہ اس نے اپنی کار کو آگے سرکتے محسوس کیا تھا۔

اس نے بریکوں پر دباؤ ڈالا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس کی کار پھسلتی ہوئی ٹھیک اس طرف جا رہی تھی۔ جہاں سے اس وزنی ٹرک کو گزرنا تھا۔

گرین نے گیئر بدل کر ایکسلریٹر پر دباؤ ڈال دیا۔ اس کی کار تیر کی طرح اس ٹرک کی طرف جانے لگی۔ ٹرک کی ہیڈ لائیٹس میں کار نہا گئی تھی۔ ٹرک کا ڈرائیور ہارن بجانے لگا۔ ٹرک کے ٹائر چرچرا رہے تھے۔ اور اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا ڈرائیور بریک لگانے کی کوشش کر رہا ہے، لیکن اس کی رفتار انتہائی تیز تھی اور وہ کسی بھی لمحے اس کی کار سے ٹکرا سکتا تھا۔ مگر آخری لمحوں میں وہ اپنی کار اس کے راستے سے ہٹانے میں کامیاب ہوگیا، مگر جیسے ہی اس کی کار چوراہے سے آگے بڑھی اس نے اپنے عقب میں ایک ہول ناک دھماکا سنا۔ ٹرک پیچھے سے آنے والی کار سے ٹکرا گیا تھا اور وہ درمیان میں سے پچک گئی تھی۔

گرین اپنی کار سے اتر آیا اور لڑکھڑاتا ہوا اس سڑک کی طرف بڑھا۔ ٹرک ڈرائیور بھی انجن بند کر کے اسی کی طرف آ رہا تھا۔ اس کی پیشانی سے اسٹیئرنگ ٹکرا گیا تھا۔ اس لیے خون کی ایک لکیر بہتی ہوئی ناک تک آ رہی تھی لیکن باقی کہیں ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی تھی اور وہ ٹھیک ٹھاک تھا۔

دونوں نے ایک دوسرے کی خیریت پوچھی پھر اس کار کی طرف چل پڑے جو حادثے میں چکنا چور ہوگئی تھی اور موم کے کسی کھلونے کی طرح تڑ مڑ گئی تھی۔ گرین اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ کیوں کہ وہ اس نئی کار کو صبح گولفو کے ریستوران کے باہر کھڑا دیکھ چکا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ گولفو کی کار ہے۔

اس میں دو لاشیں مڑی تڑی پڑی تھیں۔ گرین نے انہیں پہچان لیا۔ ان میں سے ایک گولفو اور دوسری اس کی بیوی کیرول تھی!

☆☆☆

پیوند زمین

امان اللہ

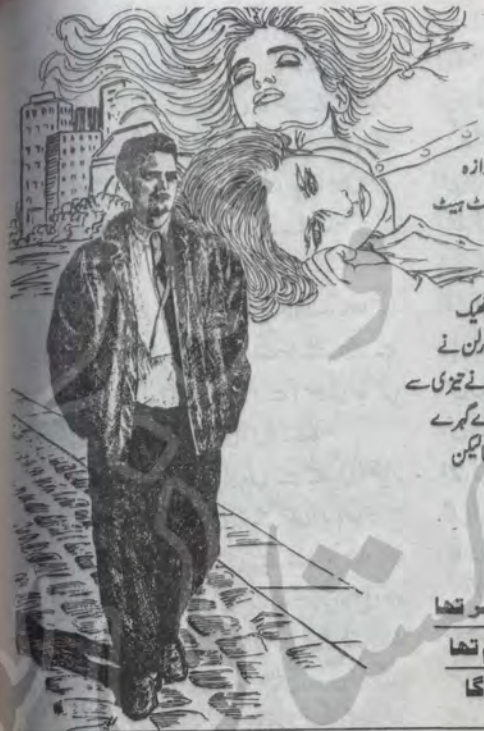

دروازے کے لاک میں چابی گھومنے کی آواز آئی۔ پھر دروازہ کھلا اور اس شخص نے سوئچ آن کر کے روشنی کر دی۔ اپنا فیلٹ ہیٹ اٹھا کر دور پھینکا اور دروازہ بند کر کے آگے آ گیا۔ کارلن نے آڑ سے نکل کر اس کے جبڑے پر ایک مکا رسید کیا۔ اس کے حلق سے "اوغ" کی سی آواز نکلی اور وہ دہرا ہو گیا۔ ٹھیک اسی وقت کارلن کا گھٹنا چل گیا۔ ایڈی الٹ کر فرش پر گرا۔ کارلن نے اس کے بائیں جبڑے اور کمر پر دو لاتیں ماریں۔ تاہم اس نے تیزی سے اپنی حالت پر قابو پا لیا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے گہرے گہرے سانس لے کر اپنی حالت درست کی اور کارلن کی طرف بڑھا لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کارلن نہایت اطمینان سے ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔ اس وقت ایڈی کو گمان ہوا کہ وہ کوئی پولیس والا ہے۔

وہ انجام سے بے خبر تھا
اسے نہیں معلوم تھا
کہ آگے کیا ہوگا

کارلن کو ترقی دے کر سان ڈیگو ٹیلی وژن کا جنرل مینجر بنا دیا گیا تھا۔ کل کی مصروفیات کے بارے میں اس نے ڈائری میں چند نوٹس لکھے اور پھر ڈائری جیب میں رکھنے کے بعد اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کی بیوی باربرا اس سے چھ سال چھوٹی تھی۔ نوخیز اور دلکش۔ ان کی شادی ابھی حال ہی میں ہوئی تھی۔

کارلن نے کافی کی پیالی اٹھالی۔

"ڈارلنگ تھوڑی دیر پہلے میری سہیلی ایما کا فون آیا تھا۔" باربرا بولی۔ "مگر تم اپنی ڈائری لکھنے میں اتنے مصروف تھے کہ تمہیں فون کی آواز ہی سنائی نہیں دی۔"

"ہاں۔ میری ذمے داریاں بڑھ چکی ہیں اس لیے میرا دماغ الجھا رہتا ہے۔ ہاں کس کا فون آیا تھا؟"

"لاس اینجلس سے ایما کا فون۔"

"میں ابھی اس سے نہیں ملا ہوں۔"

"اس وجہ سے کہ ہماری شادی سے پہلے ہی وہ لاس اینجلس چلی گئی تھی پھر وہاں اس نے شادی کر لی۔" وہ بولی۔ "لیکن اب وہ طلاق یافتہ زندگی گزار رہی ہے۔" ان دنوں وہ دل گرفتہ ہے اور افسردہ ہے۔ اس لیے اس نے مجھ سے کہا کہ میں اس کے پاس آ جاؤں۔ میں نے وعدہ کر لیا ہے کہ اس کی تنہائی دور کرنے کے لیے میں اس کے پاس آ رہی ہوں۔ تم میرے بغیر پریشان تو نہیں ہو گے؟"

کارلن کو یہ بات اچھی نہیں لگتی تھی تاہم اس نے باربرا کو اجازت دے دی کہ وہ اپنی سہیلی کے پاس جا سکتی ہے۔

"اوکے ڈارلنگ! تم کتنے اچھے ہو۔" باربرا نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔ "میں ساڑھے گیارہ بجے کی فلائٹ سے چلی جاتی ہوں۔ رات دس بجے میں تمہیں فون کروں گی۔"

☆☆☆

رات دس بجے کارلن اپنے مکان کے لان میں تھا۔ اس نے اپنے لیے کافی کی ایک پیالی تیار کر لی تھی۔ فون سینٹر ٹیبل کے دائیں کونے پر رکھا تھا۔ مگر دس بجے سے گیارہ بج گئے اور باربرا کا فون نہیں آیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر لان میں ٹہلنے لگا۔ اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

کئی بار اسے خیال آیا کہ وہ باربرا کو خود فون کرے۔ لیکن یہ سوچ کر رہ گیا کہ کہیں باربرا اس کی بات کا برا نہ مان جائے۔ وہ رات گئے بستر پر جا کر لیٹ گیا، مگر نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی۔ وہ بے چینی سے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح جب وہ اٹھا تو کسلمندی تھی۔

اس نے نو بجے کے قریب لاس اینجلس انکوائری سے ایما کا فون نمبر معلوم کیا۔ پھر بے چینی سے وہ نمبر ڈائل کیے۔ تھوڑی دیر بعد دوسری طرف سے ہیلو کہا گیا۔ وہ یقیناً ایما تھی۔ اس کی آواز غنودہ تھی۔ "ہیلو تم ایما ہو؟"

"ہاں۔"

"میں کارلن بول رہا ہوں باربرا کا شوہر۔ میں باربرا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"باربرا یہاں نہیں ہے۔ تم تھوڑی دیر بعد فون کرنا۔"

"باربرا کل ساڑھے گیارہ بجے کی فلائٹ سے تمہارے پاس گئی تھی۔ میں رات کو اس کے فون کا انتظار کرتا رہا۔ اب تم کہتی ہو کہ وہ نہیں ہے۔ وہ کہاں چلی گئی؟"

"وہ باہر گئی ہوئی ہے اور واپس نہیں آئی ہے۔" ایما نے کہا۔

"وہ رات کو تمہارے پاس نہیں تھی؟"

"میں.... مم.... میں رات کو جلدی سو گئی تھی۔" وہ ہچکچا کر بولی۔

"ایما سچی بات بتا دو۔ تم مجھے فریب نہیں دے سکتیں۔"

"وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ رات کو باہر گئی تھی۔ ابھی واپس نہیں آئی۔"

"اس کے دوست کا کیا نام ہے؟"

"ایڈی۔ اسے عدالت نے منشیات کی اسمگلنگ میں سزا دی تھی۔ وہ میکسیکو میں پکڑا گیا تھا۔ ممکن ہے باربرا نے اس کا تذکرہ تم سے کیا ہو!"

"ہاں یاد آ گیا۔ وہ خاصا بدنام شخص ہے، مگر وہ اتنی جلدی باہر کیسے آ گیا؟"

"اس کے کیس میں بعض تکنیکی خامیاں تھیں۔ اس کے وکیل نے اس کا فائدہ اٹھا کر اس کی سزا میں کمی کروا دی۔"

"ہوں تو گویا باربرا کے اس سے پرانے تعلقات ہیں اور وہ ان کی تجدید کرنے اس کے ساتھ گئی ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔ اسے ایک مجبوری کے تحت ایڈی کے ساتھ جانا پڑا ہے۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔"

"میں صحیح کہہ رہی ہوں۔ اس معاملے میں بڑی رقم ملوث ہے۔ جیل جانے سے پہلے اس نے ایڈی کے پاس بڑی رقم رکھوائی تھی۔ ممکن ہے باربرا نے تمہیں اس کے متعلق بتایا ہو۔"

"ہاں مگر اس نے کہا تھا کہ رقم اس نے تمہارے پاس رکھوائی تھی۔"

"میں باقی باتیں تمہیں فون پر نہیں بتا سکتی۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ تم میرے پاس آ جاؤ۔"

"اپنا پتا نوٹ کراؤ۔ میں چند گھنٹوں بعد تم تک پہنچ رہا ہوں۔" کارلن نے کہا اور ڈائری ہاتھ میں لے لی۔

☆☆☆

طیارے سے جانے کے بجائے اس نے لاس اینجلس تک کار میں جانے کا فیصلہ کیا۔ جانے سے پہلے اس نے دراز میں سے اپنا ریوالور نکال لیا۔ مگر یہ سوچ کر وہیں رکھ دیا کہ اگر وہ ایڈی کو دیکھ کر مشتعل ہو گیا تو فوراً اسے گولی مار دے گا۔

وہ دوسو پاؤنڈ وزنی تھا اور اس کا قد چھ فٹ تھا۔ وہ باکسنگ کا بہترین کھلاڑی تھا اور اپنے مکوں سے ایڈی کا چہرہ چپٹا کرسکتا تھا۔

وہ گھر سے باہر آیا اور اپنی کار میں بیٹھ کر لاس اینجلس کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستے میں اسے وہ ساری باتیں یاد آنے لگیں جو باربرا نے اسے بتائی تھیں۔ اس نے بتایا تھا کہ ایڈی سے پہلی ملاقات اس کے اسٹور پر ہوئی تھی۔ جہاں وہ نوادرات فروخت کرتا تھا۔ وہ اس کے اخلاق اور خلوص سے متاثر ہوکر اس کے اسٹور میں ملازم ہوگئی اور پھر تھوڑے عرصے کے بعد ایڈی نے اسے اسٹور کا انچارج بنادیا۔

پھر ایک روز پولیس نے اسے منشیات کی اسمگلنگ میں گرفتار کرلیا۔ مگر جب وہ ضمانت پر رہا ہوا تو اس نے ڈیڑھ لاکھ ڈالر باربرا کے پاس رکھوادیے تاکہ مشکل میں کام آسکیں اس نے کہا تھا کہ پولیس اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ اگر ان کی نظر پڑگئی تو وہ اسے ضبط کرلیں گے۔

باربرا نے اس کی بات پر اعتبار کرلیا اور رقم کو لاس اینجلس کے ایک بینک میں رکھوادیا۔ پھر جب وہ کارلن سے شادی کرنے لگی تو اس نے بینک سے وہ رقم نکلوا کر اپنی سہیلی ایما کے پاس رکھوادی۔ ایما نے وعدہ کرلیا تھا کہ وہ جیل جا کر ایڈی کو سب کچھ بتادے گی اور یہ بھی کہہ دے گی کہ باربرا نے شادی کرلی ہے اور کسی دوسری ریاست کی طرف نکل گئی ہے۔

☆☆☆

ایما گرین پارک کے قریب ایک جدید اپارٹمنٹ کی دسویں منزل پر رہتی تھی۔ اپنی کار پارکنگ لاٹ میں کھڑی کرنے کے بعد کارلن لفٹ کے ذریعے اس کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ اس نے اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا تو تھوڑی دیر بعد چوبیس پچیس سالہ ایک لڑکی نے دروازہ کھول دیا۔ ”میں کارلن ہوں۔“

”اچھا اندر آجاؤ۔“ وہ بولی۔

”ڈرائنگ روم میں پہنچنے کے بعد کارلن نے پوچھا۔ ”کیا باربرا کے بارے میں کوئی اطلاع ملی؟“

”ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا۔“

”اچھا۔ اب مجھے تفصیل سے ایڈی کے بارے میں بتاؤ۔ وہ کب یہاں آیا تھا اور اس نے کیا باتیں کیں؟“ کارلن نے کہا۔

”جیل سے رہا ہونے کے بعد ایڈی نے باربرا سے ملاقات کرنا چاہی لیکن ناکام رہا۔ اسے کسی طرح سے میرا پتا چل گیا۔ وہ میرے پاس آیا اور اس نے باربرا کے بارے میں پوچھا میں نے اسے بتایا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ میکسیکو چلی گئی ہے۔ جب اس نے رقم کے بارے میں معلوم کیا تو میں نے کہا کہ وہ باربرا کے پاس ہوگی اور۔“

”ایک منٹ۔“ کارلن نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ”تم نے اسے یہ کیوں نہیں بتایا کہ رقم تمہارے پاس ہے بلکہ تمہیں تو جیل میں ملاقات کرکے اسے یہ بات بتادینا چاہیے تھی۔“

”یہی تو مصیبت ہے کہ رقم میرے پاس تھی اور میں اسے ایڈی کے حوالے کرنا چاہتی تھی، مگر اس اثنا میں میری شادی ہوگئی۔ میں تو کنگال اور مفلس تھی، مگر جو شوہر ملا وہ بھی مفلس نکلا۔ وہ خود کو ماہر سمجھتا تھا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ جوئے میں ایک کے دو بنا سکتا ہے۔ اتفاق سے اسے ایڈی کی رقم کے بارے میں معلوم ہوگیا۔“

”اوہ! کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ ایڈی کی رقم تمہارے جوئے باز شوہر نے لاس اینجلس کے جوئے خانے میں داؤ پر لگادی؟“

”ہاں۔ پانچ ہزار ڈالر میں نے اپنے اخراجات کے لیے الگ کرلیے تھے۔ بس اب وہی رہ گئے ہیں ایک لاکھ پینتالیس ہزار ڈالر میرا شوہر جوئے میں ہار چکا ہے۔“

”اس کے بعد تم نے یہ کیا کہ ایڈی کو باربرا کا پتا بتادیا۔ پھر باربرا کو یہاں آنے پر بھی مجبور کردیا۔“

”میں نے ایڈی کو سچی بات نہیں بتائی ہے۔“ ایما نے ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ”مگر ایڈی کو میری کسی بات پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس نے میرے گھر کا سامان الٹنا پلٹنا شروع کردیا۔ اتفاق سے باربرا کا لکھا ہوا ایک پتا اس کے ہاتھ میں آگیا۔ جس پر اس کا پتا لکھا تھا۔ اس وقت ایڈی نے چاقو نکال کر اس کی نوک میری گردن پر رکھ دی۔ مجھے مجبور کیا کہ میں اسے ایک چھوٹی سی کہانی سنا دوں اور یہاں بلاؤں۔ جب وہ یہاں آگئی تو میں نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ پھر اس نے کچھ سوچ کر کہا کہ وہ ایڈی کو دھوکہ دے کر فرار ہوجائے گی۔ کل ہفتہ تھا اور بینک جلدی بند ہوچکے تھے۔ اب پیر تک کی مہلت مل گئی تھی۔ باربرا کا کہنا ہے کہ اس وقت تک وہ فرار ہوجائے گی۔“

”کیا باربرا نے کوئی مزاحمت نہیں کی؟ اس کے ساتھ خاموشی سے چلی گئی؟“ کارلن نے اضطراب سے پوچھا۔

”پہلے تو بے چاری باربرا نے یہ عذر پیش کیا کہ وہ شادی شدہ ہے اور اس کی ساتھ نہیں جاسکتی مگر جب ایڈی نے اذیت دینے لگا تو.... اوہ خدایا۔ میں بھی یہاں سے کہیں دور چلی جاؤں گی۔ ورنہ ایڈی مجھے قتل کیے بغیر نہیں رہے گا۔“

”تم نے جو کچھ کیا ہے اس کے لیے تم سے ہمدردی نہیں کی جاسکتی۔“ کارلن نے درشتی سے کہا۔ ”پہلے میرا ارادہ تھا کہ میں پولیس کو سارے معاملات سے آگاہ کردوں، مگر پھر خیال آرہا ہے کہ اس طرح سے باربرا کی بازیابی مشکل ہوجائے گی۔ مجھے یہ بتاؤ کہ ایڈی کہاں مل سکتا ہے؟“

”ایڈی کا بڑا بھائی ایک زمانے میں ٹوپانگا روڈ پر ایک کہن رسیدہ مکان میں رہتا تھا۔ وہ بھی منشیات فروش تھا۔ جب وہ مرگیا تو مکان ایڈی کے قبضے میں چلا گیا۔ مجھے یقین ہے کہ ایڈی باربرا کو وہیں لے گیا ہوگا۔“

”ہاں۔ یقیناً اب ذرا جلدی سے ایک کاغذ پر اس مکان کا نقشہ بنادو۔“

☆☆☆

ایڈی کا مکان ایک ویرانے میں تھا۔ کارلن نے اپنی کار اس سے کافی دور کھڑی کی اور پھر دبے قدموں سے اس کے عقب میں پہنچ گیا۔ وہ ایک بوسیدہ سا مکان تھا۔ ہر لمحہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اب گرا اور تب گرا۔ اس کے عقبی حصے میں ایک اسٹیشن ویگن کا ڈھانچہ کھڑا تھا جس کے پہیے گل سڑ چکے تھے۔

کارلن نے عقبی دروازے اور کھڑکیوں کو کھولنا چاہا، مگر معلوم ہوا کہ وہ سب اندر سے بند ہیں۔ کارلن نے ایک کھڑکی کا شیشہ توڑ ڈالا پھر اندر ہاتھ ڈال کر چٹخنی کھولی اور پھر پٹ کھول کر اندر چلا گیا۔

اندر جا کر اس نے کھڑکی بند کردی۔ عرصہ دراز سے بند ہونے کی وجہ سے اندر ناگوار سی بو بس گئی تھی۔ ہر ایک چیز گرد آلود تھی۔ وہ وہاں سے خواب گاہ میں گیا تو وہ صاف ستھرا دکھائی دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے اسے استعمال کیا ہو۔ ڈبل بیڈ پر ایک گاؤن تھا اور نیچے نئے چپل رکھے تھے۔ ہینگر میں ایک جیکٹ تھا۔ دائیں جانب ایک سوٹ کیس تھا جو باربرا کا تھا۔ کارلن نے آگے بڑھ کر وہ سوٹ کیس کھولا تو اسے اپنی بیوی کی ساری چیزیں اس میں رکھی دکھائی دیں۔

اس نے سوٹ کیس بند کردیا اور دروازے کی آڑ میں بیٹھ کر ایڈی کا انتظار کرنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس مکان میں ضرور واپس آئے گا۔ معلوم نہیں اس کمینے نے باربرا کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔

رات کو دس بجے کے قریب کسی کار کے انجن کی مدھم آواز سنائی دی۔ کارلن نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا تو اسے ایک رینالٹ کار دروازے پر رکتی نظر آئی۔ اس کا دروازہ کھول کر ایک طویل القامت شخص باہر آیا۔ اس نے فلیٹ ہیٹ لگا رکھا تھا۔ وہ تنہا تھا۔ جس سے کارلن کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ممکن ہے باربرا فرار ہونے میں

کامیاب ہو چکی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایڈی اسے کہیں اور چھوڑ آیا ہو۔

دروازے کے لاک میں چابی گھومنے کی آواز آئی۔ پھر دروازہ کھلا اور اس شخص نے سوئچ آن کر کے روشنی کردی۔ اپنا فیلٹ ہیٹ اٹھا کر دور پھینکا اور دروازہ بند کر کے آگے آ گیا۔ کارلن نے آڑ سے نکل کر اس کے جبڑے پر ایک مکا رسید کیا۔ اس کے حلق سے ''اوغ'' کی سی آواز نکلی اور وہ دہرا ہو گیا۔ ٹھیک اسی وقت کارلن کا گھٹنا چل گیا۔ ایڈی الٹ کر فرش پر گرا۔ کارلن نے اس کے بائیں جبڑے اور کمر پر دو لاتیں ماریں۔ تاہم اس نے تیزی سے اپنی حالت پر قابو پالیا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے گہرے گہرے سانس لے کر اپنی حالت درست کی اور کارلن کی طرف بڑھا لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کارلن نہایت اطمینان سے ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔ اس وقت ایڈی کو گمان ہوا کہ وہ کوئی پولیس والا ہے۔ ''حرامزادے اگر تم میری گرفتاری کا وارنٹ لائے ہو تو مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟'' اس نے اپنا جبڑہ سہلاتے ہوئے کہا۔

''وحشی درندے میرا پولیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' کارلن نے نہایت اطمینان سے کہا۔ ''میں اپنی بیوی باربرا کے سلسلے میں آیا ہوں۔''

ایڈی نے اس کی طرف دیکھا اور حیرت سے پلکیں جھپکانے لگا۔ ''بس اتنی سی بات تھی جس کے لیے تم میرا قیمہ بنائے دے رہے تھے۔ تمہاری بیوی کو تو تھوڑی دیر پہلے سان ڈیگو جانے والے طیارے میں سوار کرا کے آیا ہوں۔'' اس نے استہزائیہ انداز سے کہا۔

''تم بکواس کر رہے ہو۔ اس کا سوٹ کیس اندر پڑا ہے۔ اگر تم نے مزید جھوٹ بولا تو میں زندگی بھر کے لیے تمہیں معذور کر دوں گا۔''

''اوکے تو پھر سچ یہ ہے کہ میں نے تمہاری بیوی کو ایسی جگہ قید کر دیا ہے جہاں تمہارے فرشتے بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اب اگر تم ڈیڑھ لاکھ ڈالر کا انتظا کر دو گے تو میں اسے رہا کر دوں گا۔'' اس نے توقف سے کہا۔ ''جیل جانے سے پہلے یہ رقم میں نے اس کے حوالے کی تھی۔''

کارلن کا غصہ اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ اس کی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکل رہا تھا۔ البتہ حلق سے درندوں جیسی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ ایڈی کی طرف بڑھنے لگا۔

ایڈی بھاگ کر دوسرے کمرے میں گیا اور اس نے ایک شاٹ گن دیوار سے اتار لی۔ مگر کارلن اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے تابڑ توڑ اس کے چہرے پر مکوں کی بارش کر ڈالی۔ ایڈی کو اپنی گن استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یکبارگی کارلن نے اس کے ہاتھ سے گن جھپٹ لی اور دور پھینک دی۔ اس کی لات مخدوم کر ایڈی کے پیٹ پر پڑی تو وہ تیورا کر گر پڑا۔ کارلن نے اپنا پاؤں اس کی گردن پر رکھ دیا اور دباؤ ڈال کر بولا۔ ''باربرا کہاں ہے؟''

''پہلے میری رقم ادا کرو اس کے بعد بتاؤں گا۔'' ایڈی نے خرخراتی آواز میں کہا۔

کارلن نے دباؤ بڑھا دیا اور کہا۔ ''اگر تم نے اس کا پتا نہیں بتایا تو میں تمہاری گردن توڑ ڈالوں گا۔''

ایڈی خرخرانے لگا مگر اس نے اپنی زبان نہیں کھولی۔ جب کارلن نے اپنا دباؤ کم کیا تو وہ بولا۔ ''میں نے اسے ڈیڑھ لاکھ ڈالر دیے تھے۔ جیل جانے سے پہلے جب تم وہ رقم ادا کر دو گے تب ہی میں اس کا پتا بتاؤں گا۔''

یہ سن کر کارلن آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے اپنے پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ اس کی کنپٹی پر لگاتار ٹھوکریں ماریں۔ جس سے ایڈی کے کانوں کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ پھر اس کی زبان باہر آ گئی۔ وہ تھوڑی دیر تک بے ترتیبی سے سانسیں لیتا رہا پھر ساکت ہو گیا۔ کارلن نے جان لیا کہ اس کے جسم و جان کا رشتہ منقطع ہو چکا ہے۔

کارلن تھکے ہارے انداز میں جا کر اس کے بستر پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ وہ اسے حقیقت میں ہلاک کرنا

نہیں چاہتا تھا۔ مگر یہ سب کیسے ہوا اس پر غور کرنے کا وقت نہیں تھا۔ اب تو یہ سوچنا تھا کہ اس صورت حال سے کیسے نجات حاصل کی جائے۔ ایڈی بے خوف اور نڈر تھا۔ اس نے اپنی جان دے دی لیکن باربرا کا پتا نہیں بتایا۔

تھوڑی دیر بعد اس کا غصہ دور ہو گیا اور وہ سوچنے لگا کہ پولیس اس کی باتوں پر یقین نہیں کرے گی اور اسے آہنی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا جائے گا بہتر ہو گا کہ وہ ایڈی کو دفن کر دے۔ مگر زمین کھودنے کے لیے بیلچہ چاہیے تھا۔ وہ بیلچے کی تلاش میں اٹھا اور مکان میں چکر کاٹنے لگا۔ مکان کے پچھلے حصے میں جہاں باغ بانی کے آلات پڑے تھے وہاں ایک بیلچہ بھی مل گیا۔

باہر چاندنی پھیلی تھی۔ اور سارے ماحول پر سناٹا طاری تھا۔ اس نے ایک مناسب سی جگہ دیکھ کر گڑھا کھودنا شروع کر دیا۔ جب گڑھا تیار ہو گیا تو اس نے ایڈی کی لاش کو اٹھا کر اس گڑھے میں ڈال دیا۔ پھر اس کی مٹی برابر کرنے کے بعد اس نے وہاں جھاڑیاں اور پتیاں بکھیر دیں۔

پھر وہ مکان میں واپس آ گیا اور اس نے ساری امکانی جگہوں پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کر دیے۔ اس کے بعد باربرا کا سوٹ کیس لے کر باہر نکل گیا۔ اس نے ایڈی کی کار مکان سے دور کھڑی کر دی اور پھر اپنی کار میں بیٹھ کر شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

راستے میں ایک جنرل اسٹور سے اس نے ایما کو فون کیا۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ ایڈی کا مکان ویران پڑا ہے۔ اگر ایڈی کے بارے میں کوئی نئی بات معلوم ہوئی تو وہ بتا دے گا مگر اس کے نمبر ڈائل کرنے پر دوسری طرف سے کوئی آواز نہیں آئی۔ تب اس نے اندازہ لگایا کہ وہ شہر چھوڑ کر جا چکی ہے۔

☆☆☆

اس نے اپنی کار کا رخ سان ڈیگو کی طرف کر دیا۔ اس لیے کہ لاس اینجلس میں ٹھہرنا بے سود تھا۔ باربرا کے بارے میں سوچ کر اس کی حالت غیر ہو رہی تھی کہ معلوم نہیں وہ کہاں اور کس حال میں ہو گی؟

جب وہ سان ڈیگو پہنچ کر اپنے مکان پر گیا تو اس نے مکان کو تاریکی میں ڈوبا پایا۔ اس نے باربرا کو آواز دی۔ مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا تھا کہ ممکن ہے وہ گھر پہنچ چکی ہو لیکن جب سناٹا چھایا رہا تب اسے معلوم ہو گیا کہ اندر کوئی نہیں ہے۔

اس نے اندر پہنچ کر روشنی کی تو معلوم ہوا کہ اس کے لباس پر دھبے پڑے ہیں اور کئی جگہوں سے وہ مٹی میں لتھڑا ہوا ہے۔ اس نے فوراً اپنا لباس تبدیل کیا۔ اس کے جوتوں پر بھی خون کے چھینٹے تھے۔ کارلن نے شکر ادا کیا کہ راستے میں کسی گشتی پولیس کی کار نے اسے نہیں روکا تھا ورنہ ایڈی کے قتل کا ثبوت تو وہ خود لیے لیے پھر رہا تھا۔

اس نے اپنے کپڑے اور جوتے لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیے۔ وہ وقت ملنے پر انہیں ٹھکانے لگا سکتا تھا۔ دوسرے روز صبح اس نے ایما کو فون کیا لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس کا یقین پختہ ہو گیا کہ وہ اپنا مکان چھوڑ کر کہیں اور جا چکی ہے۔

تب اس نے فیصلہ کیا کہ اسے پولیس میں باربرا کی گم شدگی کی رپورٹ درج کرا دینا چاہیے۔ وہ اس کو ضرور تلاش کر لیں گے۔ ایڈی کی لاش بہر حال برآمد نہیں کی جا سکتی تھی۔ اگر کسی طرح اس کے بارے میں پتا چل بھی گیا تو کارلن پر کوئی الزام ثابت نہیں ہو سکے گا۔

☆☆☆

چار پانچ ہفتے گزر گئے لیکن سان ڈیگو اور لاس اینجلس کی پولیس باربرا کی گم شدگی کا سراغ نہیں لگا سکی۔ کارلن کی الجھنیں بڑھتی چلی گئیں۔ ایک روز اس نے خودکشی کے لیے ریوالور نکال لیا اور اسے اپنی گود میں لیے بیٹھا رہا۔ پھر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔

ایک روز جب وہ اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر اپنے گھر

پہنچا تو اس نے دو پولیس والوں کو دروازے پر ٹہلتے پایا۔ ان میں سے ایک اس کی طرف بڑھا اور اس نے تصدیق کرنے والے انداز میں کہا۔ ”مسٹر کارلن؟“

”یس؟“

”ہم آپ کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔ مجھے لیفٹیننٹ فرینک کہتے ہیں۔“

”مگر کس جرم میں؟“ کارلن نے ان جان بن کر پوچھا۔

”قتل کے شبے میں۔“ پولیس سراغ رساں نے کہا۔ ”ہمیں آپ کی بیوی کی لاش آپ کے پائیں باغ سے ملی ہے وہیں ایک گڑھے سے آپ کے خون آلود جوتے اور کپڑے بھی برآمد ہوئے ہیں۔“

اس سراغ رساں نے اس کی کلائیوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔

”باربرا کو اعشاریہ تین آٹھ کے ریوالور سے ہلاک کیا گیا ہے اور وہ تمہاری میز کی دراز سے ملا ہے۔ ریوالور کے دستے اور نال پر سے تمہاری انگلیوں کے نشانات ملے ہیں۔ اب تمہیں اپنی صفائی میں جو کچھ کہنا ہے وہ عدالت میں کہنا۔“

☆☆☆

حوالات میں اپنے وکیل کا انتظار کرنے کے دوران کارلن سوچنے لگا کہ حالات وواقعات کس طرح سے پیش آئے ہوں گے؟ یہ ممکن ہے کہ باربرا کسی بہانے سے ایڈی کو گھر لے آئی ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے ایڈی سے کہا ہو کہ بینک لاکر کی چابی گھر میں ہے۔

ایڈی اس کے ساتھ مکان پر چلا گیا۔ باربرا کو یہ بھی معلوم تھا کہ کارلن کا اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور میز کی اوپری دراز میں رہتا ہے۔ اس نے جا کر اس ریوالور کو دراز سے نکال لیا۔ وہ ایڈی کو اس سے شوٹ کرنا ہی چاہتی تھی کہ وہ پیچھے سے آ گیا اور اس نے باربرا سے وہ ریوالور چھین کر اسے شوٹ کر دیا۔ دونوں میں تھوڑی سی کشمکش ہوئی ہوگی مگر ایڈی اسے ہلاک کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ پھر اس نے ریوالور پر سے انگلیوں کے نشانات صاف کر دیے اور اسے لے جا کر پائیں باغ میں دفن کر دیا۔ جب کارلن نے خودکشی کی نیت سے اس ریوالور کو ہاتھ میں لیا تو اس کے دستے پر پھر انگلیوں کے نشانات پڑ گئے۔

ایک تکلیف دہ بات یہ تھی کہ وہ اپنے تحفظ میں کوئی گواہ نہیں پیش کر سکتا تھا۔ دوسری طرف ایما بھی کہیں نہیں مل رہی تھی۔ اگر وہ موجود ہوتی تو اس کے بیان سے شبہ پیدا ہوسکتا تھا کہ کارلن نے اپنی بیوی کے ایڈی سے تعلقات کا علم ہونے پر رقابت کی بنا پر اسے ہلاک کر دیا۔

وکیل نے جب اس سے ملاقات کی تو کارلن نے اس سے تفصیلی گفتگو کی۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”مسٹر کارلن! حالات اور واقعات تمہارے بالکل خلاف ہیں۔ تمہارے اس کیس سے چھوٹنے کے امکانات بہت کم ہیں۔ کیا تم اب بھی کہتے ہو کہ ایڈی نے تمہاری بیوی کو قتل کیا ہے؟“

”ہاں۔ میں درست کہہ رہا ہوں۔“ اس نے اصرار کیا۔ ”کیونکہ میں نے اسے قتل نہیں کیا ہے بلکہ ایڈی نے اسے ہلاک کیا ہے۔“

”اس صورت میں ہمیں ایڈی کو تلاش کرنا پڑے گا تاکہ عدالت اسے سزا سنا سکے۔ اگر آپ سچ کہہ رہے ہیں تو پولیس اسے ضرور ڈھونڈ نکالے گی۔“

”ہوں ہوں۔“ کارلن نے محتاط لہجے میں کہا۔ ”پہلے ایڈی کو تلاش کرنا پڑے گا۔ کیا پولیس اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائے گی؟“

”ہاں ضرور پولیس اسے قبر سے بھی نکال لائے گی۔ تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری رہائی اس صورت میں ممکن ہے۔“ وکیل نے جوش سے کہا۔

کارلن سوچنے لگا۔ جلد یا بدیر ایڈی کی لاش مل جائے گی تو کیا وہ اس صورت میں رہائی پا سکے گا؟

☆☆☆

بھاگ دوڑ

نصرت جہاں

اس تختے میں، میں نے سولہ پہیے لگا رکھے تھے، لیکن ان میں عرصے سے تیل نہیں ڈالا گیا تھا چنانچہ وہ ایسی آوازیں پیدا کر رہے تھے کوئی ڈھانچہ اپنی مرضی کے خلاف چل رہا ہو۔ ان ہول ناک آوازوں کا یہ اثر پڑا کہ گردوپیش کے مکانات کی کھڑکیاں کھلنا شروع ہوگئیں۔ صورت حال یہ تھی کہ ارنسٹ اور میں اس تختے کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ جس پر ایک اکڑی ہوئی لاش پڑی تھی۔ وہ تختہ آگے آگے دوڑ رہا تھا اور ہم اس کے پیچھے تھے۔ قرب وجوار کے لوگ ہمیں دیکھ رہے تھے اور ایک کار ہمارے پیچھے آ رہی تھی۔ مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ بس ایک ہی خیال تھا کہ کسی طرح سے اس تختے کو پکڑ لوں۔

حرکت میں برکت اسی کا نام ہے؟

میں اور ارنسٹ ان دنوں بہت پریشان تھے۔ اس لیے کہ ہماری جیبیں خالی تھیں اور کہیں سے دو ہندسوں والی رقم بھی ملنے کی امید نہیں تھی۔ ارنسٹ نے تھوڑی سی رقم جمع کر رکھی تھی اور وہ اپنی ماں کو کھانے کی دعوت دے چکا تھا۔ گویا اس کی جیب میں جو کچھ تھا وہ اسے داؤ پر لگانے کے موڈ میں تھا۔

وارداتیں کرنے کے لیے ہم نے ایک ویگن لے رکھی تھی۔ اس وقت ہم اسی ویگن پر آوارہ گردی کر رہے تھے۔ دراصل ہمیں شکار کی تلاش تھی۔ ہم خاص قسم کی وارداتیں نہیں کرتے تھے، بس چھوٹی موٹی چوریاں کرتے تاکہ کبھی پکڑے جائیں تو لمبی سزا نہ ہو۔

اپنے ٹھکانے سے دو میل آگے جب ہم ایک گلی سے گزر رہے تھے تو ارنسٹ نے چونک کر ویگن کی رفتار کم کر دی اور اپنے ہاتھ میں دبا ہوا بیئر کا ڈبا پاؤں کے قریب رکھ دیا۔ یہ سوچ کر کہ شاید اس نے کسی پولیس والے کو دیکھ کر ایسا کیا ہے، میں نے بھی اپنے ہاتھ میں دبا ہوا بیئر کا ڈبا نیچے رکھ دیا۔ تھوڑی دور جا کر اس نے ویگن روک دی اور دائیں جانب دیکھنے لگا۔ ایک مکان پر ”کرائے کے لیے خالی“ کا بورڈ لگا تھا اور ایک عورت اور مرد مل کر کوئی چیز اٹھا رہے اور ٹرک میں لاد رہے تھے۔ مرد قوی ہیکل تھا اور اس کا چہرہ ٹماٹر کی طرح سرخ تھا۔ بازو کے اوپر گھنے بال تھے۔ عورت فربہ تھی۔ اور اس کے کولہے بھاری تھے۔ اس کے سر کے بال سرخ اور لہریے دار تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے حال ہی میں انہیں سیٹ کرایا ہو۔

وہ دونوں مکان کے اندر چلے گئے اور ان کا ٹیلی وژن زینے پر رکھا رہ گیا۔ ”کیا خیال ہے ارنسٹ ہم ان کے آنے سے پہلے اسے نہ اٹھا لیں؟“

”تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اتنی جلدی ہم یہ کام نہیں کر سکتے۔“

ہم سرگوشیوں میں باتیں کر ہی رہے تھے کہ وہ دونوں ایک صوفہ سیٹ تھامے زینے سے اتر آئے۔ پھر انہوں نے صوفہ سیٹ، اس کے بعد ٹیلی وژن سیٹ ٹرک میں رکھا، بنگلے کے گیٹ پر تالا لگایا اور چلے گئے۔

”میرا خیال ہے کہ ان میاں بیوی نے کوئی دوسرا مکان خرید لیا ہے اور یہاں سے خود ہی تھوڑا تھوڑا سامان نئے گھر میں منتقل کر رہے ہیں۔“ میں نے قیاس آرائی کی۔

”تمہارا خیال درست معلوم ہوتا ہے آؤ چل کر دیکھتے ہیں۔ ممکن ہے ہمارے لیے کوئی کارآمد چیز ابھی یہاں ہو۔“ اس نے کہا پھر ویگن کو گھما کر پچھلی گلی میں لے گیا۔ وہاں ہم نے پچھلے دروازے کا تالا نہایت آسانی سے کھول لیا اور اندر چلے گئے۔ سب سے پہلے کچن تھا۔ ہم اس میں داخل ہوئے، لیکن وہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جسے فروخت کر کے ہم اپنی غربت دور کر پاتے اس سے آگے ڈائننگ ہال تھا جہاں

فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی- پھر ہم خواب گاہوں میں گئے تو پتا چلا کہ وہاں سے بھی ساری چیزیں لے جائی جا چکی ہیں-

لاؤنج میں جانے پر وہاں ایک پیانو، ایک آرام کرسی اور بڑا سا ریڈیوگرام دکھائی دیا- اس میں ٹیپ ریکارڈر اور ریکارڈ پلیئر بھی تھا- مجھے معلوم تھا کہ مارکیٹ میں اسپیکروں کے بغیر اس کی قیمت ڈیڑھ ہزار ڈالر ہے- میں نے اپنے خیالات کا اظہار ارنسٹ پر کیا تو اس نے کہا- ''اس کا مطلب ہے کہ رالف ہمیں اس کے دو سو ڈالر تو دے ہی دے گا-''

''تو پھر آؤ اسے باہر لے چلیں-'' میں نے کہا- ہم دونوں نے اسے اٹھایا مگر وہ ہماری توقع سے زیادہ بھاری نکلا- ہم دونوں دراز قامت اور طاقت ور تھے اور ہمارا قد تقریباً چھ فٹ تھا مگر اس کے باوجود اس ریڈیوگرام کو اٹھانے میں ہمیں بہت دقت ہوئی- میں نے اندازہ لگایا کہ وہ تقریباً ڈھائی سو پونڈ وزنی ہوگا- گلی تک لے جاتے ہوئے اسے دو تین بار فرش پر رکھنا پڑا-

اسے ویگن میں رکھ کر ہم سروس اسٹیشن تک گئے- میں نے چابی نکال کر اس کا دروازہ کھولا اور اس ریڈیوگرام کو سروس اسٹیشن میں رکھ دیا- یہ میری ملکیت تھا، مگر اپنے نامساعد حالات کی وجہ سے اسے چلا نہیں سکا تھا- حد یہ ہے کہ میں نے اس کے پرزے تک فروخت کر دیے تھے-

''میرا خیال ہے کہ اپنی رہائش گاہ سے ہم اسپیکر لے آئیں تاکہ اسے ٹیسٹ کیا جا سکے-''

ارنسٹ نے گھڑی دیکھ کر کہا- ''اسپیکر لانے میں، میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں، مگر میں ٹیسٹ کرنے کے لیے یہاں نہیں ٹھہر سکتا اس لیے کہ میں نے ممی کو چھ بجے کا وقت دے رکھا ہے-''

ارنسٹ اپنی ممی کا احترام کرتا تھا اور ان کے ساتھ محبت سے پیش آتا تھا-

''ٹھیک ہے تم اپنی ماں کے پاس جاؤ میں تنہا اسے ٹیسٹ کر لوں گا-'' میں نے کہا-

''ہم ویگن میں چار بلاک آگے گئے اور اسپیکر، لانگ پلے اور ایک کیسٹ لے آئے- ارنسٹ نے مجھے وہیں چھوڑا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ اپنی ممی کے ساتھ ڈنر کر کے نو بجے تک واپس آئے گا-

میں نے اس کے جانے کے بعد گیرج کا دروازہ بند کر لیا اور اپنا کام شروع کر دیا- اسپیکروں کو ریڈیوگرام سے منسلک کرنے کے بعد پلگ لگایا تو ریڈیوگرام میں سے کوئی آواز نہیں نکلی- میں نے اس کی ناب گھما کر اسے مختلف اسٹیشنوں پر لگایا لیکن پھر بھی کوئی آواز نہیں آئی- میں نے کیسٹ اور ریکارڈ بجائے لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا-

سب چیزوں کو چیک کیا، وہ درست نکلیں- اس کا مطلب یہ تھا کہ ریڈیوگرام میں کچھ گڑبڑ ہے- میں نے ریڈیوگرام کو پیچھے سے کھول دیا- مگر اس وقت میرے ہاتھ سے اسکریو ڈرائیور گر گیا- جب میں نے اس میں مشینری کے بجائے ایک شخص کی لاش ٹھنسی دیکھی- وہ انگریزی حرف ''یو'' کی شکل میں تھا- دبلا پتلا عمر تقریباً پچاس سال اور سر کے بال سرخی مائل- اس کی پیشانی میں ایک سوراخ تھا جس سے خون نکل کر جم چکا تھا-

میں نے عقبی بورڈ کو اسکریو سے ٹائٹ کر دیا اور ریڈیوگرام کو دیوار سے لگا دیا- پھر میں نے اسپیکر وہیں رہنے دیے مگر لانگ پلے اور کیسٹ اٹھا کر اپنے فلیٹ کی طرف چل پڑا- وہاں پہنچ کر میں نے فریج سے کھانا نکال کر گرم کیا اور پھر اسے کسی نہ کسی طرح سے حلق سے اتارا-

ارنسٹ کو نو بجے اپنی قیام گاہ پر آنا تھا اس سے پہلے اسے فون کرنا بے سود تھا- اس لیے وقت گزاری کے لیے میں بیئر کی ایک بڑی بوتل خرید کر لے آیا-

وہ ساڑھے نو بجے کے قریب آیا- ہم دونوں ویگن میں بیٹھ گئے تو اس نے مجھے سو ڈالر کا ایک نوٹ دیتے ہوئے کہا- ''یہاں آنے سے پہلے میں گیرج گیا تھا- میں نے ریڈیوگرام نکال کر رالف کو فروخت کر دیا ہے- دو سو ڈالر میں- اس میں سے نصف تمہارے لیے-''

میں نے محسوس کیا کہ جیسے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے

ہے ہوں- اس لیے کہ میں نے رالف کے متعلق یہ سنا تھا وہ کاروبار میں بددیانتی پسند نہیں کرتا- اگر کوئی اس سے ایسا کرتا ہے تو یہ بات اسے ناگوار گزرتی ہے- وہ مرنے کے بعد پر تل جاتا ہے- اس سے دو سو ڈالر وصول کرنے کے لیے اسے ایک لاش تھمانا ایسے تھا جیسے ہم نے اپنی موت کے سرٹیفکیٹ پر دستخط کر دیے ہوں-

''غضب ہو گیا ہے ارنسٹ!'' میں نے سراسیمگی سے کہا- ''اس ریڈیوگرام میں کل پرزوں کے بجائے ایک لاش ہے- اس سے واپس لے لو-''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' اس نے بدحواسی سے کہا اور پھر ویگن پر دباؤ ڈال کر ویگن روک لی-

میں نے اسے تفصیل سے لاش کے بارے میں بتایا-

''تمہارا کیا خیال ہے اس ٹرک والے مرد اور عورت نے اسے قتل کیا ہے؟''

''یہی معلوم ہوتا ہے-''

''مگر انہوں نے اسے ریڈیوگرام میں کیوں چھپا دیا؟''

''میرا خیال ہے کہ قتل کی انہوں نے پہلے سے منصوبہ بندی کی تھی- اسے کسی بات پر مشتعل ہو کر قتل کر دیا- وہ سامان نکال کر لے جا چکے تھے- اس لیے لاش کو دن کی روشنی میں کیسے لے جاتے- اس لیے انہوں نے اسے ریڈیوگرام میں ٹھونس دیا-''

''مگر ریڈیوگرام کی مشینری کہاں گئی؟'' اس نے سوال کیا-

''دوسرے سامان کے ساتھ وہ اسے ٹرک میں لے گئے ہوں گے-''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ ان کے نئے گھر میں ہوگی-''

''ہونا تو چاہیے-''

ارنسٹ نے دوبارہ ویگن اسٹارٹ کر دی اور چل پڑا- ''تم کہاں جا رہے ہو؟'' میں نے پوچھا-

''وہ جیسس لینے تاکہ اسے ریڈیوگرام میں لگا سکیں-''

''مگر پہلا مسئلہ تو لاش کو ٹھکانے لگانا ہے- اگر رالف کو معلوم ہو گیا تو وہ ہمیں جان سے مار دے گا-''

''میرا خیال ہے کہ ہم ریڈیوگرام کی مشینری لے آئیں- اسے ریڈیوگرام میں لگا دیں اور لاش نکال کر اس کو ٹھکانے لگا دیں-'' اس نے کہا-

''لیکن ہمیں ان کا مکان تو معلوم نہیں ہے- ہم جیسس لینے کہاں جائیں؟'' میں نے کہا-

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو-'' وہ بولا- تھوڑی دیر بعد اس نے ویگن کو اسی خالی بنگلے پر جا کر روکا جہاں سے ہم نے ریڈیوگرام چوری کیا تھا- اس سے ملحقہ بنگلے کے لان میں ایک شخص بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا- ''تم میرے ساتھ ضرور چلو-'' ارنسٹ نے سرگوشی میں کہا- ''لیکن اپنی زبان بند رکھنا اور اس لیے کہ تم بہک کر الٹی سیدھی باتیں کرنے لگتے ہو-''

ہم ویگن سے اتر کر اس بنگلے تک گئے- وہاں سے مسٹر اینڈ مسز اسٹوک کی نیم پلیٹ غائب ہو چکی تھی اور اب ایک چھوٹا سا کارڈ لگا تھا جس پر ڈون اور ریو تحریر تھا- ارنسٹ اطلاعی گھنٹی بجانے لگا تو میں نے اعتراض کیا کہ وہ خالی بنگلہ ہے-

''میں پڑوسیوں کو جتانے کے لیے ایسا کر رہا ہوں-'' اس نے سرگوشی میں کہا- ''تم خاموش رہنا ورنہ کھیل بگڑ جائے گا-''

پھر وہ ملحقہ مکان کی طرف گیا اور گھنٹی بجانے لگا- ایک فربہ عورت نے دروازہ کھولا- ارنسٹ نے اپنے چہرے پر ایک دل کش مسکراہٹ سجا کر کہا- ''میں اسٹوک فیملی سے ملاقات کرنے آیا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ یہاں سے جا چکے ہیں-''

''ہاں- آج ہی گئے ہیں-''

''میری ممی نے بھیجا ہے کہ میں مسز اسٹوک کے بیس ڈالر واپس کرنے آیا ہوں جو میری ممی نے قرض لیے تھے- کیا وہ لوگ شہر چھوڑ کر چلے گئے ہیں؟''

''ارے نہیں- انہوں نے نزدیک ہی مکان لیا ہے- ٹھہرو، میں تمہیں ان کا پتا بتاتی ہوں-'' عورت نے مڑتے ہوئے کہا-

اس نے گیٹ کھلا چھوڑ دیا تھا- اس آدمی نے اخبار ہاتھ سے رکھ دیا اور ٹہلنے والے انداز میں ہمارے قریب آ گیا-

"تم لوگ اسٹوک فیملی کے رشتے دار ہو؟"

"نہیں میری ممی کی مسز اسٹوک سے دوستی ہے۔" ارنسٹ بولا۔ "میں نے انہیں کم ہی دیکھا ہے۔ وہ سرخ بالوں والی خوب صورت خاتون ہیں۔"

"ہاں۔ وہ ایسی ہی ہے۔"

"اور مسٹر اسٹوک بھاری بھرکم ہیں اور ان کے بازوؤں پر گھنے بال ہیں؟"

"نہیں۔ وہ تو برٹ ہے۔ ڈون کا ملازم۔ ڈون دبلا پتلا ہے اور اس کے سر کے بال سرخ ہیں۔ اچھی کمائی ہے اس کی اور اس نے اچھا مکان خریدا ہے۔"

اس اثنا میں وہ عورت واپس آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک نوٹ بک تھی۔ اس نے ارنسٹ کو پتا نوٹ کرا دیا۔ جب ہم واپس آ کر ویگن میں بیٹھ گئے تو اس نے پوچھا۔ "اس نے جو حلیہ بیان کیا تھا تھا وہ مردہ ڈون پر پورا اترتا ہے؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "یہ ازلی مثلث والی داستان ہے۔ بے چارہ ڈون اس لیے مارا گیا ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو ملازم کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں دیکھ لیا ہے۔"

وہ مکان بنی ڈک میں تھا، جو پہاڑی علاقہ تھا۔ مکان کے سامنے چوں کہ پارکنگ کی کوئی جگہ نہیں تھی چنانچہ ارنسٹ نے ویگن کو آگے لے جا کر پارک کیا۔ وہ مکان سڑک کے موڑ پر ڈھلان پر واقع تھا۔ اگر کوئی تیز رفتار گاڑی وہاں بے قابو ہو جاتی تو سیدھی جا کر اس کے مکان میں گھس جاتی۔

ہم جب وہاں تک آئے تو ہم نے کھڑکی کے شیشوں سے ان لوگوں کو باتیں کرتے دیکھا۔ وہ دونوں کچھ پریشان سے تھے۔ "میرا خیال ہے کہ یہ لاش کے گم شدہ ہونے سے پریشان ہیں۔" ارنسٹ نے کہا۔

"ہاں۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔ "ریڈیو گرام کی چھسس میرا خیال ہے کہ گیرج میں رکھی ہوگی۔"

"سب سے پہلے ہمیں گیرج کو چیک کرنا چاہیے ورنہ ہم مصیبت سے دوچار ہو جائیں گے۔" ارنسٹ بولا۔

"لیکن اس کے لیے ہمیں تاریکی کا انتظار کرنا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اس لیے ابھی کافی روشنی ہے اور اندیشہ ہے کہ آس پڑوس کے لوگ ہمیں دیکھ لیں گے۔"

"پھر کیا ہم واپس چلیں؟"

"ہاں۔ اور گیارہ بجے تک واپس آئیں۔ ہمارے پاس یوں بھی وقت ہے۔ آج ہفتہ ہے اور کل اتوار۔ رالف اتوار کو دکان بند رکھتا ہے۔"

اس اثنا میں ہم دوبارہ سروس اسٹیشن گئے اور اسپیکر اپنے کمرے منتقل کر دیے۔ ریڈیو گرام کھولنے کے لیے ہم نے چھوٹے بڑے اسکریو ڈرائیور بھی رکھ لیے تھے۔

"رالف کی دکان کے گرد آٹھ فٹ اونچی دیوار ہے ہم اس کو کیسے عبور کریں گے؟" اس نے پوچھا۔

"ہم دیوار پھلانگ کر جائیں گے۔"

"اس کے بعد وہاں ایک چھسس اندر لے جائیں گے اور واپسی میں ایک لاش لے کر آئیں گے۔" ارنسٹ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"دفعتاً میری نگاہ اس موٹی رسی کے لچھے پر پڑی جو ایک گوشے میں پڑا ہوا تھا۔ اسے کسی بھی گاڑی کے پچھلے حصے میں باندھ کر دوسری گاڑی کو کھینچا جاتا ہے۔ "بس کام بن گیا۔" میں نے کہا۔ "ہم اس سے لاش کو کھینچ لیں گے۔"

"ارنسٹ فرش پر پڑی کوئی چیز دیکھ رہا تھا اس لیے اس نے فوراً ہی جواب نہیں دیا۔ میں نے اس کا شانہ ہلایا تو اس نے کہا۔ "یہ تختہ بھی لیے چلتے ہیں۔" وہ تختہ گاڑیوں کے نیچے لیٹ کر گھسنے کے کام آتا تھا۔ اور اس میں پہیے لگے ہوئے تھے۔ "ہم لاش کو اس پر رکھ کر گھسیٹ سکتے ہیں۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا اور اس تختے کو بھی ویگن میں رکھ لیا۔ پھر میں اپنے فلیٹ پر گیا اور میں نے اسپیکر ریکارڈ پلیئر کے ساتھ فٹ کر کے اسے آن کر دیا۔ کمرے میں ہلکی ہلکی موسیقی گونجنے لگی۔ وقت گزاری کے لیے میں نے بیئر کی بوتل نکالی اور اس سے ہم دونوں نے پینا شروع کر دی۔

گیارہ بجے کے قریب ہم وہاں سے بنی ڈک کی طرف چل پڑے۔ ارنسٹ نے ویگن پہلے والی جگہ پر کھڑی کر دی۔

ن سے ایک فولادی سلاخ بھی نکال لی تا کہ گیرج کا ڑ پڑ جائے تو وہ کام آ سکے۔

تے کے مکانوں میں تاریکی پھیل چکی تھی اور بیشتر اپنے ں میں جا چکے تھے۔ تاہم مسز اسٹوک کے مکان میں ہو رہی تھی۔ وہ اس مرد کے ساتھ محو گفتگو تھی اور رب میں اپنے بالوں پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

یرج کا دروازہ فولڈنگ تھا یعنی لپیٹ کر اوپر جانے والا۔ ں معمولی قسم کا تالا لگا ہوا تھا۔ ارنسٹ نے سلاخ سے ولی سی ضرب لگائی تو وہ کھل گیا۔ اس کے بعد ہم نے مل دروازے کو اٹھایا تو کافی آواز پیدا ہوئی۔ ہم سہم گئے اور ے ہمیں ڈرانے لگے، لیکن جب کافی دیر تک کچھ نہ ہوا تو نے یہ جان لیا کہ وہ لوگ ذہنی پریشانی میں مبتلا ہیں اس وہ یہ آواز نہیں سن سکے ہیں۔

ر خوب چاندنی ہو رہی تھی۔ چناں چہ ہم ٹارچ جلائے اندر چلے گئے۔ وہ کشادہ سا گیرج تھا اور اس میں ایک ن کار کھڑی تھی۔ حسن اتفاق سے ریڈیو گرام کا چھسس دائیں دیوار کے قریب رکھا نظر آ گیا۔

زیادہ بھاری نہیں تھا۔ اسے اٹھا کر ہم باہر لے آئے۔ زنی نہیں تھا اس کا وزن تقریباً چالیس پونڈ تھا۔ ارنسٹ نہایت احتیاط سے گیرج کا دروازہ بند کیا مگر اس بار پہلے زیادہ تیز آواز نکلی۔ غالباً برٹ اس وقت کچن میں تھا اس نے آوازیں سن لیں۔ ہم جوں ہی چھسس اٹھا کر قدم چلے گیرج پر لگا ہوا بلب روشن ہو گیا اس کے بعد دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ "کون ہے؟" بھاری آواز نے پوچھا۔

ہم نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور بھاگتے چلے گئے۔ جب سڑک پر پہنچے تو برٹ دروازہ کھول کر باہر آیا اور اس نے ت سے کہا۔ "ارے یہ چھسس اٹھا کر کہاں جا رہے ہو؟ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

وہ ہمارے پیچھے دوڑا لیکن ہم آگے جا کر ویگن میں بیٹھ چکے پھر ارنسٹ نے ہیڈ لائٹس روشن کیے بغیر اسے اسٹارٹ کیا اور ہم وہاں سے بھاگ کر آنے میں کامیاب ہو گئے۔

رالف کا گودام چائنا ٹاؤن کے قریب تھا۔ وہ کاروباری علاقہ تھا اور وہاں کوئی بڑا بزنس نہیں ہوتا تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو علاقہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور ساری دکانیں بند تھیں۔ گودام کا سامنے والا دروازہ جس سڑک پر کھلتا تھا۔ اس پر ہلکا پھلکا ٹریفک رواں دواں تھا۔ اس لیے ہم پچھلی گلی میں چلے گئے۔

ارنسٹ ویگن کو بالکل گیٹ کے قریب لے گیا۔ اس وقت ہم نے ایک کتے کے غرانے کی آواز سنی۔ مگر جب ارنسٹ نے اسے ڈانٹا۔ "خاموش رہو جیمنی۔" تو وہ خاموش ہو گیا اور پھر دم ہلانے لگا۔

گیٹ ویگن سے کچھ اونچا تھا لہٰذا میں نے اس کے اوپری سرے سے موٹی رسی باندھی اور دوسری طرف اتر یا۔ جیمنی کوں کوں کر کے دم ہلاتا ہوا قریب آ گیا۔ ارنسٹ کی مدد سے پہیوں والا تختہ اور چھسس میں دکان سے اندر لے آیا۔

آفس کے سامنے والے دروازے میں جو قفل لگا تھا وہ نہایت مضبوط تھا اور ہم اس کا بال بیکا بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے میں نے پتھر مار کر کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا۔ اس لیے کہ ہم گودام سے کوئی چیز چرانے نہیں جا رہے تھے۔ ایسی صورت میں رالف کو کسی پر شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ یہی سمجھتا کہ کسی شرارتی لڑکے نے یہ حرکت کی ہے۔

رالف نے ریڈیو گرام اسٹور میں رکھنے کے بجائے آفس ہی میں رکھ دیا تھا۔ میں نے اسے پشت سے کھولا تو اندر سے لاش نکل آئی۔ وہ "یو" کی حالت میں اکڑی ہوئی تھی۔ ارنسٹ اسے دیکھ کر خوف زدہ تھا اس لیے اس نے لاش کو ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا اور دور جا کر کھڑا ہو گیا۔ مجبوراً سارا کام مجھے ہی کرنا پڑا۔

اس چھسس کو میں نے نٹ بولٹ کے ذریعے سے دوبارہ ریڈیو گرام کے اندر فٹ کر دیا۔ اس کام میں مجھے بیس پچیس منٹ لگے۔ اس کا پچھلا گتا لگانے کے بعد میں نے اسے وہیں رکھ دیا۔ جہاں سے کہ اٹھایا تھا۔

لاش کے معاملے میں ارنسٹ مجھ سے کوئی تعاون نہیں کر رہا تھا اس لیے میں نے لاش کو پہیے والے تختے پر رکھا اور اسے کھڑکی تک لے گیا۔ پھر وہاں سے گھسیٹ گھسیٹ کر چار دیواری تک لے گیا۔ وہ پہیوں والا تختہ بہت کام آ رہا تھا۔

جیمنی لاش دیکھ کر اتنا خوف زدہ ہوا کہ بھاگ کر کسی کونے کھدرے میں چھپ گیا۔ میں نے لاش کی کمر کے گرد رسی باندھی اور اسے ویگن میں جا کر کھینچ لیا۔ اس موقع پر ارنسٹ نے میری مدد کی تھی۔

ہم لاش کو کسی گڑھے یا ڈسٹ بن میں پھینک کر گھر جاتے اور آرام سے سو جاتے لیکن بیئر پینے کے بعد ہمارے دماغ پر سرور چھا گیا تھا۔ ہم ترنگ میں تھے۔ اس لیے ہم نے سوچا کہ لاش کو جہاں سے ہم نے حاصل کیا ہے اسے وہیں چھوڑنا چاہیے۔ یعنی مسز اسٹوک کے مکان پر۔

تیسری بار جب ہم بنی ڈکٹ پہنچے تو اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ ویگن کو ہم نے سابقہ جگہ پر کھڑا کر دیا۔ وہ سڑک سنسان تھی اور مکانوں کی کھڑکیاں تاریک ہو چکی تھیں۔ لیکن مسز اسٹوک کے مکان میں روشنی ہو رہی تھی۔ غالباً وہ اپنے شوہر کی لاش کی گمشدگی سے اضطراب میں مبتلا تھی۔

جب میں نے ویگن کا عقبی دروازہ کھولا تو پہیوں والا تختہ لڑھک کر باہر آ گیا۔ غلطی سے ارنسٹ کا ہاتھ اکڑی ہوئی لاش سے ٹکرا گیا تو وہ بھی تختے کے ساتھ باہر آ گئی۔ اور جوں ہی تختہ ویگن سے باہر گرا، لاش اس پر گر گئی۔ وہ تختی مع لاش کے ڈھلان پر دوڑنے لگا۔ ارنسٹ اضطراب میں اس کے پیچھے دوڑنے لگا۔ ٹھیک اس وقت دوسری طرف سے ایک کار رینگتی ہوئی اس طرف آنے لگی۔ جس کی ہیڈ لائٹس کی روشنی ہم پر پڑنے لگی۔

اس تختے میں، میں نے سولہ پہیے لگا رکھے تھے، لیکن ان میں عرصے سے تیل نہیں ڈالا گیا تھا چنانچہ وہ ایسی آوازیں پیدا کر رہے تھے کوئی ڈھانچہ اپنی مرضی کے خلاف چل رہا ہو۔ ان ہول ناک آوازوں کا یہ اثر پڑا کہ گرد و پیش کے مکانات کی کھڑکیاں کھلنا شروع ہو گئیں۔

صورت حال یہ تھی کہ ارنسٹ اور میں اس تختے کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ جس پر ایک اکڑی ہوئی لاش پڑی تھی۔ تختہ آگے آگے دوڑ رہا تھا اور ہم اس کے پیچھے تھے۔ قریب جوار کے لوگ ہمیں دیکھ رہے تھے اور ایک کار ہمارے پیچھے آ رہی تھی۔ مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ بس ایک ہی خیال تھا کہ کسی طرح سے اس تختے کو پکڑ لوں۔

تختے میں بہر حال پہیے لگے ہوئے تھے اس لیے وہ رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ موڑ پر پہنچنے کے بعد اس کی رفتار میں اضافہ ہو گیا اور پہیوں سے عجیب عجیب آوازیں نکلنے لگیں۔ اس کا رخ مسز اسٹوک کے مکان کی طرف ہو گیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ باہر کیا ہنگامہ ہو رہا ہے برٹ نے مکان کا مین گیٹ کھول دیا۔ گیٹ کے نیچے کنکریٹ کا صلیب لگا تھا۔ تختہ اس سے ٹکرا کر رک گیا مگر قانون حرکت کی رو سے لاش اڑتی ہوئی اندر چلی گئی۔ برٹ سہم کر ایک طرف ہو گیا تھا۔

گھر کے اندر سے ایک زنانہ چیخ بلند ہوئی۔ اس لیے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ مسٹر اسٹوک کی اپنی بیگم سے ملاقات ہو گئی ہے۔ پیچھے سے آنے والی گاڑی پولیس کی گشتی کار تھی۔ وہ ہمارے پیچھے ٹھہر گئی اور اس میں سے دو بوڑھے پولیس والے اترے۔ ارنسٹ اور میں نے پلٹ کر بھاگنا شروع کر دیا۔ ہم جانتے تھے کہ وہ دونوں ہمارے پیچھے نہیں آ سکتے۔ صرف دھمکیاں دے سکتے ہیں۔

"ٹھہر جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

میں جانتا تھا کہ جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ ہم نے کوئی جرم کیا اور فرار ہو رہے ہیں وہ گولی نہیں چلا سکتا۔ لہٰذا اس لیے دوڑتا رہا۔ ارنسٹ مجھ سے بہت آگے تھا۔ جب میں پہاڑی کے قریب پہنچا تو وہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا اور ویگن کو اسٹارٹ بھی کر چکا تھا۔

میں جوں ہی پسنجر سیٹ پر بیٹھا۔ اس نے ویگن چلا دی۔ وہ کسی راکٹ کی طرح وہاں سے نکلی اور مخالف سمت میں دوڑنے لگی۔

☆☆☆

کھڑ پنچ

منزہ خان

ہمارے کلب میں لمبی رقم کا پوکر کھیلا جاتا ہے۔ آپ وہاں قسمت آزمانا چاہتے ہیں؟" جیت کی رقم واپس لینے کا یہ شائستہ طریقہ تھا۔ جیکی کو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ بورمین اس حد تک اخلاق ہے۔ "نہیں۔ آج کے لیے اتنا کافی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے قسمت پر دباؤ نہیں ڈالنا چاہیے۔" وہ بولا۔ "آپ داؤ لگا کر تو دیکھیں۔ صرف آپ کو پتے کاٹنا ہوں گے۔ چند منٹ بعد آپ کی رقم دوگنی ہو جائے گی۔"

بورمین نے اسے ترغیب دی۔ جیکی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

کہتے ہیں لوہے کو لوہا کاٹتا ہے

جیکی چوں کہ بارٹینڈر سے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا ایسے وقت میں شراب خانے میں داخل ہوا جب وہاں سناٹا تھا۔ جیکی کے جسم پر ایک قیمتی سوٹ تھا اور ہونٹوں میں سگار دبا ہوا تھا۔ اس کی کنپٹیوں کے بال سفید تھے اور سر میں بھی کہیں کہیں سفیدی جھلک رہی تھی۔ بارٹینڈر اسے دیکھ کر متاثر ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "شام بخیر جناب۔"

جیکی نے سر کے اشارے سے جواب دیا اور پھر کاؤنٹر کے قریب پہنچ کر کہا..... ایک اسکاچ پلیز۔"

بارٹینڈر نے فوراً ہی حکم کی تعمیل کی اور بوتل اٹھا کر پیمانہ لبریز کرنے لگا۔ جیکی نے اس اثنا میں اس کا جائزہ لیا۔ وہ معقول صورت کا نوجوان تھا اور اس کے جسم پر قیمتی کپڑے تھے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک نگینے والی انگوٹھی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ شادی شدہ ہے۔

"یہ پیگ ساٹھ سینٹ کا ہے جناب عالی!" اس نے پیمانہ جیکی کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"جیکی نے اپنی جیب سے ایک ڈالر کا نوٹ نکالا اور اس کے سامنے رکھ دیا۔ "یہ بہت مناسب قیمت ہے۔ ورنہ میں جہاں سے آیا ہوں۔ وہاں گھٹیا شراب کے ستر سینٹ ادا کرنا پڑتے ہیں!"

اس نے چالیس سینٹ جیکی کے سامنے رکھ دیے اور بولا۔ "آپ کہاں سے آئے ہیں جناب عالی؟"

"کیلیفورنیا سے۔"

"وہ تو بہت دور ہے جناب عالی۔"

"ہوں۔" اس نے سر ہلایا۔ "مجھے تنہا پیتے ہوئے

کوفت ہوتی ہے۔ کیا تم میرا ساتھ دے سکتے ہو؟"

"میرا خیال ہے کہ میں آپ کا ساتھ دے سکتا ہوں۔" بارٹینڈر نے کہا پھر کاؤنٹر کے پیچھے سے ایک بوتل نکال کر پیمانہ بھرا اور چسکیاں لینے لگا۔ چالیس سینٹ اٹھا کر اس نے کیش رجسٹر میں ڈال دیے۔

"اس مخصوص بوتل کو دیکھ کر جیکی کو یقین ہو گیا تھا اس میں سوائے رنگین پانی کے کچھ نہیں ہے۔ جیکی شراب پینے کے دوران مختلف موضوعات پر گفتگو کرتا رہا۔ ایک گھنٹے کے بعد ان کے درمیان اجنبیت کی جو دیوار تھی وہ ختم ہو گئی۔

بارٹینڈر نے اس کی دعوت پر دوسری بار بھی رنگین پانی پی لیا۔ مگر پھر تیسری بار اس نے اصل شراب پی۔

"سیاحوں کا دل بہلانے کے لیے تم لوگ کیا کرتے ہو؟" جیکی نے اس سے دریافت کیا۔

"کیا مطلب؟" بارٹینڈر نے بھنویں سکیڑ کر پوچھا۔

"میرا مطلب ہے تاش کا کھیل یا مشینی کھیل وغیرہ نہیں ہوتا؟"

"یہاں جوا کھیلنا غیر قانونی ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

"یہ بات مجھے پہلے سے معلوم ہے۔" جیکی نے مسکرا کر کہا۔ پھر اس نے اپنا بٹوا نکال کر ایک شناختی کارڈ نکالا اور اس کے سامنے رکھ دیا۔ "لو تم خود دیکھ لو میرا تعلق پولیس سے نہیں ہے۔"

بارٹینڈر نے سارے کاغذات اور پھر شناختی کارڈ کا اچھی طرح سے جائزہ لیا اور پھر بولا۔ "آپ کا کاروبار کیا ہے مسٹر جیکی؟"

"میں سرمایہ کاری کرتا ہوں۔"

"بہت خوب۔" اس نے جیکی سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور پھر بولا۔ "مجھے شارٹی کہتے ہیں۔"

جیکی نے کہا۔ "اچھا تو تم ایسی کسی تفریح گاہ کا پتا بتا سکتے ہو؟"

"مضافات میں ایک کلب ہے جہاں خفیہ طور پر جوا ہوتا ہے۔" بارٹینڈر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "میں کارڈ دکھا کر آپ وہاں داخل ہو سکتے ہیں لیکن میں آپ کو وہاں نہ جانے کا مشورہ دوں گا۔"

"وہ کیوں؟"

"ہمارے شہر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

"یہاں ہوٹل بہت زیادہ تعداد میں ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں سیاح آتے رہتے ہیں۔"

"آپ نے صحیح اندازہ لگایا۔ سیاحوں سے ہمارا کاروبار چل رہا ہے۔ اس وقت سناٹا ہے۔ لیکن جوں جوں ہی رات گہری ہو گی یہاں لڑکیاں آ جائیں گی۔ پھر یہاں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سیاح نظر آئیں گے۔ ہم انہیں اصل شراب دیتے ہیں لیکن لڑکیاں شراب کے بجائے رنگین پانی پیتی رہتی ہیں تاکہ انہیں نشہ نہ ہو اور وہ اپنے حواس نہ گم کر دیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ اس رنگین پانی کے ہم سیاحوں سے شراب کے دام وصول کرتے ہیں۔"

"تم کس کلب کا تذکرہ کر رہے تھے؟"

"بسمارک۔ مگر وہاں سیاحوں کو لوٹا جاتا ہے۔ سچ مچ حقیقی انداز میں۔ آپ کسی میز پر جا کر جوا کھیلنے لگیں۔ قسمت نے آپ کا ساتھ دیا اور آپ بھاری رقم جیت گئے۔ آپ جب وہ رقم جیبوں میں رکھ کر باہر نکلیں گے تو کسی تاریک گلی میں کوئی پہلوان نما شخص آپ کو پیچھے سے دبوچ لے گا۔ پھر آپ کے سر پہ قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ اس کے بعد جیتی ہوئی رقم تو ایک طرف رہی آپ کی جیبوں کی اصل رقم بھی غائب ہو جائے گی۔ آپ بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے۔ ہوش آئے گا تو جیبیں خالی ہوں گی۔"

"اور دوسری بات؟"

"کلب میں ایک مخصوص پانسہ استعمال کیا جاتا ہے

موجودگی میں اچھے سے اچھا جواری بھی نہیں ...۔"

"مخصوص پانسہ کیسا ہوتا ہے؟"

"شکل ایسا ہی جیسے کہ دوسرے ہوتے ہیں۔ بس وزن اندر سے بڑھا دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے پہلو سے گرتا ہے اور جیتنے والے نمبر اوپر نہیں ..."

"وہاں اتنی زیادہ بے ایمانی ہوتی ہے تو پھر وہاں جاتا ہے؟"

"مقامی لوگ بسمارک کلب کی طرف نہیں جاتے مگر اس پر ٹوٹے پڑے رہتے ہیں۔ ہاں ایک بات کہ وہاں ہر کھیل میں بے ایمانی نہیں ہوتی ہے۔ ...ینوں پر جہاں کہ ایک دو ڈالر لگائے جاتے ہیں ...یہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ اسی طرح سے اگر ...سو دو سو ڈالر جیت جائے اسے بھی کچھ نہیں کہا ...مگر جیسے ہی کوئی ایک ہزار ڈالر جیت جائے پانسہ ...ل کر دیا جاتا ہے۔"

"گویا ان سے ہزار روپے کی جیت برداشت نہیں ...؟"

"ہاں۔ اور اگر سیاح اس سے زیادہ جیت لے تو پھر ...کے حق میں نتیجہ اچھا نہیں نکلتا۔ کسی اندھیری گلی ...اس کے سر پہ چوٹ ضرور لگتی ہے۔"

"تو کیا سیاح پولیس میں رپورٹ درج نہیں ...اتے؟"

"کراتے ہیں لیکن بسمارک کلب کا مالک پولیس ...ف کا بہنوئی ہے۔ اور شیرف اس کا خالہ زاد بھائی ...ہے۔ اس لیے شکایتیں درج کرانے سے کچھ نہیں ...تا۔ انہیں یہ کہہ کر بہلایا جاتا ہے کہ تحقیقات ہو رہی ...ہے۔ پھر جب سیاح اس علاقے سے چلا جاتا ہے تو ...ں کا فائل بند کر دیا جاتا ہے۔" بارٹینڈر نے ...صراحت کی۔

"یہ بسمارک کلب تو دلچسپ جگہ معلوم ہوتی ہے۔ میں وہاں ضرور جاؤں گا۔" جیکی نے کہا۔

"مگر میں آپ کو وہاں جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔" بارٹینڈر نے کہا۔ "حالانکہ مجھے وہاں گاہک بھیجنے پر کمیشن ملتا ہے صرف مجھے ہی نہیں بلکہ شہر کے دوسرے شراب خانوں کے بارٹینڈروں کا کمیشن بھی طے ہے۔ اس لیے وہ سیاحوں کو ترغیب دلا کر اس طرف بھیجتے ہیں۔ مگر ضمیر بھی کوئی چیز ہے۔"

"میرے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو دل بہلانے کے لیے کھیلتا ہوں۔ اس لیے میرے کسی مصیبت میں مبتلا ہونے کا چانس نہیں ہے۔ تم مجھے وہاں کا راستہ بتاؤ اور اپنا کارڈ دے دو۔"

بارٹینڈر نے بے پروائی سے اپنے شانے ہلا دیے پھر جیب سے اپنا کارڈ نکالا اور اس کی پشت پر جیکی کا نام لکھ کر دستخط کر دیے۔ جوئے خانے کا راستہ کلب کے عقبی حصے سے ہو کر جاتا ہے۔" اس نے کہا۔ "آپ اپنی گاڑی وہیں کھڑی کیجیے گا۔ وہاں ایک دروازہ دکھائی دے گا جس پر ایک ننھا سا بلب روشن ہو گا۔ آپ اس پر دستک دیجیے گا۔ جو شخص بھی دروازہ کھولے۔ اسے یہ کارڈ دکھا دیجیے گا۔ وہ آپ کو جوئے خانے کے اندر پہنچا دے گا۔"

"تمہارا شکریہ۔"

"وش یو گڈ لک مسٹر جیکی۔" بارٹینڈر نے کہا۔

"ویسے عام طور پر خوش بختی میرا ساتھ دیتی ہے۔ تم سے مل کر خوشی ہوئی۔" جیک نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ شراب خانے سے نکل آیا۔ کار میں بیٹھ کر اپنے ہوٹل پہنچ گیا۔ وہ انٹرکانٹی نینٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔

اس نے دوسرے شہر کی کال بک کرائی اور تھوڑی دیر بعد گفتگو کی۔ "ہیلو جیکی؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"ہاں- سناؤ کیا رہا؟"

"صورت حال مایوس کن ہے-" دوسری طرف سے آواز آئی- "میں دو کلبوں میں جا چکا ہوں- مگر معلوم ہوا کہ قانون بہت سخت ہے اور وہاں جوا نہیں ہوتا-"

"لیکن یہ شہر ہمارے کام کا ہے-" جیکی نے کہا- "تم یہاں آ جاؤ- کب تک پہنچ سکتے ہو؟"

"کل دوپہر تک-"

"تمہیں بسمارک کلب پہنچنا ہے- کلب میں داخلہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب تم کسی بارٹینڈر سے اس کا کارڈ لے جاؤ گے- انہیں اس بات کا کمیشن ملتا ہے- اس لیے کسی بھی شراب خانے میں ایک پیگ پینے کے بعد تم کارڈ حاصل کر سکو گے-"

"ٹھیک ہے- میں پہنچ جاؤں گا-"

"میں کل رات گیارہ بجے وہاں ملوں گا-" جیکی نے کہا-

☆☆☆

دوسری رات اس نے اپنا سامان پیک کیا اور اسے گاڑی میں ڈال کر کلب پہنچ گیا- اس نے کار وہاں کھڑی کی- پھر گھوم کر ایک گلی میں داخل ہوا اور جوئے خانے کے دروازے پر پہنچ گیا- دستک دینے پر ایک مسلح گارڈ نے دروازہ کھولا- اس نے کارڈ دیکھ کر اسے اندر جانے کی اجازت دے دی- پھر وہ اسے لے کر ایک کمرے میں گیا جہاں جوئے خانے کے مالک مسٹر بورمین کی تختی لگی تھی- وہ چالیس سے اوپر کا لگتا تھا- مناسب قامت اور صحت مند جسم کا مالک-

اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر جیکی سے ہاتھ ملایا پھر اسے دوسرے دروازے سے جوئے خانے میں داخل کر دیا- وہ دروازہ شیشے کا تھا تاکہ اس سے وہاں کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جا سکے-

"آپ سیاح ہیں؟" اس نے سوال کیا-

"جی نہیں- میں کیلے فورنیا سے نیو یارک جا رہا ہوں- راستے میں یہ ریاست پڑتی ہے- اس لیے یہاں ٹھہر گیا-" "میرے پاس شناختی کارڈ ہے جو تمہیں مطمئن کر دے گا-"

"اوہ نہیں- اس کی ضرورت نہیں ہے-" بورمین نے جلدی سے کہا- "بارٹینڈر نے پوری طرح اطمینان کرنے کے بعد ہی آپ کو اپنا کارڈ دیا ہوگا- ہمیں احتیاط اس لیے کرنا پڑتی ہے کہ ریاست میں ایسی تفریح کو غیر قانونی سمجھا جاتا ہے- آیئے اندر تشریف لایئے-"

وہ دونوں اندرونی ہال میں چلے گئے- جہاں داخلے کی جانب ایک چھوٹے سے شراب خانے کا کاؤنٹر تھا- اس کے بعد کیشیئر کا کاؤنٹر تھا جو رقم لے کر جوا کھیلنے والوں کو لال نیلی پیلی گوٹیں دیتا تھا- پھر جوئے کی میزیں تھیں- جہاں اس وقت تقریباً پچاس یا پچپن افراد جوا کھیل رہے تھے-

"آپ کو کون سا کھیل پسند ہے مسٹر جیکی؟"

"پانسے کا کھیل-" جیکی نے جواب دیا- "کیا یہاں داؤ پر لگائی جانے والی رقم کی کوئی حد مقرر ہے؟" جیکی نے سرسری لہجے میں پوچھا-

"زیادہ سے زیادہ ایک ہزار ڈالر کی شرط لگائی جا سکتی ہے؟" وہ بولا-

"کیا آپ بڑی رقم کا جوا کھیلتے ہیں مسٹر جیکی؟"

"نہیں- میں تو یوں ہی پوچھ رہا تھا- ورنہ میں تو ایک دو ڈالر کا کھیل کھیلتا ہوں-"

"ٹھیک ہے آپ وہاں سے اپنی رقم تبدیل کر کے گوٹیں لے سکتے ہیں-" اس نے کاؤنٹر کی طرف اشارہ کیا پھر وہاں سے چلا گیا-

"جیکی نے رقم دے کر گوٹیں لیں اور پھر بار سے وہسکی کا ایک جام لے لیا اور اس کی چسکیاں لیتا ہوا پانسے والی میز کی طرف چلا گیا- ہال میں اسے تین تنومند اور بڑے بالوں والے بدمعاشوں کی جھلک بھی

[illegible] دی- وہ ٹہلنے کے علاوہ کوئی کام نہیں کر رہے [illegible] جیکی سمجھ گیا کہ یہ لوگ سیاحوں کو لوٹتے اور مارتے [illegible] ہیں-

وہ ٹہلتا ہوا پانسہ پھینکنے والی میز کی طرف چلا گیا- [illegible] عورت پانسہ پھینک رہی تھی اور لوگ چھوٹی چھوٹی [illegible] لگا رہے تھے- اس نے کئی بار پانسہ پھینکا مگر [illegible]

[illegible] جوا کھلانے والے نے دوسری عورت کی طرف پانسہ [illegible] دیا جس کے بال سرخ تھے- اس کے ساتھی نے [illegible] ایک ڈالر لگایا تو عورت نے پانچ ڈالر لگا دیے- مگر [illegible] پہلی اور دوسری بار ہار گئی- جب وہ تیسری بار داؤ [illegible] لگی تو جیکی نے کہا-

"اس بار میرا خیال ہے کہ تمہارا سات نمبر آئے گا اور [illegible] ہار جاؤ گی- اس لیے میں تمہارے ہارنے پر داؤ [illegible] گا-"

جیکی نے سب سے علیحدہ خانے پر ایک ڈالر کا سکہ [illegible] دیا- جب لڑکی نے پانسہ پھینکا تو اس کا سات نمبر [illegible] زیادہ ہار گئی- جوا کھلانے والے نے بورڈ سے سارے [illegible] سکے سمیٹ لیے مگر جیکی کو ایک کی جگہ دس سکے دیے-

پھر پانسہ اس طرح سے مختلف لوگوں کے پاس جاتا [illegible] رہا- جیکی نے بھی دو بار پانسہ پھینکا اور ہار گیا- سب [illegible] سے آخر میں پانسہ ایک کسرتی نوجوان کے ہاتھ میں چلا [illegible] گیا- اس کے گال ٹماٹر کی طرح سرخ تھے اور بازو کی [illegible] پھلیاں نمایاں تھیں- وہ کافی دیر سے ایک ڈالر والے [illegible] سکے لگا رہا اور مستقل ہار رہا تھا- اسکے پاس چودہ سکے [illegible] تھے دس میں سے وہ چھ ہار چکا تھا- چار اس نے [illegible] لگا رکھے تھے-

کسرتی جسم والے نوجوان نے بلند آواز میں کہا- "آج میری خوش قسمتی کا دن ہے دوستو-" اس نے [illegible] پانچ پانچ ڈالر والے دو سکے داؤ پر لگا دیے- "میں سات [illegible] بار پانسہ پھینکوں گا اور اس جوئے خانے کو کنگال کر دوں گا- یہاں کے مالکان مفلس ہو جائیں گے- آپ لوگ میرے ساتھ بازیاں لگا سکتے ہیں-"

"اور وہ سات کا ہندسہ؟"

"وہ منحوس ہندسہ کبھی نہیں آئے گا-"

سرخ بالوں والی عورت نے ہنستے ہوئے ایک ڈالر کا سکہ داؤ پر لگا دیا- ایک عمر رسیدہ جوڑے نے بھی دو ڈالر لگا دیے- دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی ایک دو ڈالر لگا دیے مگر جیکی نے حصہ نہیں لیا-

"کیا ہے جناب! کیا آپ کو میری خوش قسمتی پر یقین نہیں ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ پہلی ہی بار سات نمبر آ جائے گا-"

"تمہیں بعد میں افسوس ہوگا-" نوجوان بولا پھر اس نے پانسہ پھینکا-

"گیارہ نمبر آیا-

"میرا خیال غلط ثابت ہوا-" جیکی نے کہا اور ایک ڈالر کا سکہ میز پر رکھ دیا-

"آپ لوگ جیت کی رقم ہرگز نہ اٹھائیں-" نوجوان نے پرجوش لہجے میں کہا- "ہم اس کلب کو قلاش کر دیں گے-"

نوجوان کی ہدایت پر کسی نے بھی سکے میز پر سے نہیں اٹھائے- اس نے دوبارہ پانسہ پھینکا- اس بار آٹھ آیا- جوا کھلانے والے نے سب کی رقم دوگنی کر دی-

"کوئی رقم نہ اٹھائے- ابھی پانچ راؤنڈ باقی ہیں- میں کلب کے مالکان کو مفلس کر دوں گا-" نوجوان پرجوش لہجے میں کہہ رہا تھا-

لوگوں نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے سکے نہیں اٹھائے اور سانس روک کر اس کا کھیل دیکھنے لگے- نوجوان نے پھر پانسہ پھینکا- اس بار آٹھ آیا- لوگوں کے چہروں سے مسرت اور انبساط ٹپکنے لگا- ان کی رقموں میں تیزی سے اضافہ ہوتا جا رہا تھا- نوجوان

پانچ بار پانسہ پھینک کر جیت چکا تھا۔

''کلب کے ملازم نے رقم دوگنی کرنے کے بعد پانسے اٹھائے اور غور سے انہیں دیکھنے لگا۔ اس وقت جیکی کو احساس ہوگیا کہ نوجوان کی قسمت زوروں پر ہے اور وہ مسلسل جیت رہا ہے اس لیے پانسے تبدیل کردیے جائیں گے۔

پھر ہوا بھی یہی۔ تبدیل شدہ پانسے نوجوان کی طرف پھینک دیے گئے۔ جیکی کو اسی لمحے کا انتظار تھا۔ اس نے سو ڈالر والے دس سکے اپنی مٹھی میں دبالیے۔ اسے معلوم تھا کہ اب پانسہ بورڈ پر گرنے لگا تو سات کا ہندسہ آئے گا۔ چنانچہ وہ ایک ہزار کے سکے ہار والے خانے میں رکھنا چاہتا تھا تاکہ دوسروں کی ہار اس کی جیت میں تبدیل ہوجائے۔

اگر جیکی اس وقت ایک ہزار کے سکے بورڈ پر رکھ دیتا تو ملازم پانسے کا معائنہ کرنے کے بعد انہیں پھر تبدیل کردیتا اور اصلی پانسے واپس کردیتا۔ اس طرح سے باقی لوگ جیت جاتے اور وہ خود ایک ہزار ڈالر ہار جاتا۔

اس لیے وہ پانسے پھینکے جانے سے چند سیکنڈ پہلے سکے بورڈ پر رکھنا چاہتا تھا تاکہ جوا کھلانے والا نہ دیکھ سکے اور پانسے نہ تبدیل کرسکے۔ پھر جب اس کی نگاہ سکوں پر پڑے تو بازی کھیلی جاچکی ہو۔

''جب نوجوان اپنے ہاتھ لہرا کر پانسے فضا میں اچھال رہا تھا تو جیکی نے ایک ہزار کے سکے ہارنے والے خانے پر رکھے اور ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''پانسے لڑھک کر ساکت ہوگئے تو سات کا ہندسہ آگیا۔ ملازم میز پر پڑے سکوں کو سمیٹنے لگا۔ مگر جب اس کی نگاہ ایک ہزار کے سکوں پر پڑی تو وہ یوں چونکا جیسے اسے کسی بچھو نے ڈس لیا ہو۔ ''یہ ایک ہزار ہیں۔'' جیکی نے مسکرا کر کہا۔ ''اب ان میں نو ہزار اور شامل کردو۔''

''پانسے پھینکے جانے کے بعد آپ داؤ نہیں لگا سکتے جناب۔'' ملازم نے کہا۔

جیکی نے کھیلنے والوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور بلند آواز سے کہا۔ ''کیا میں نے پانسے پھینکے جانے کے بعد داؤ لگایا ہے؟''

''نہیں۔ پانسے پھینکے جانے سے پہلے۔'' عمر رسیدہ جوڑے نے کہا۔ ''انہیں آخری بازی ہارنے کا بہت غم تھا۔

''ہاں۔ میں نے بھی انہیں سکے پہلے رکھتے دیکھا ہے۔'' سرخ بالوں والی عورت بولی۔ یہ جیکی کے حق میں دوسری گواہی تھی۔

ملازم نے سراسیمگی میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ وہ سب اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ''مگر آپ تو ایک ایک ڈالر کے داؤ لگا رہے تھے اچانک ہزار ڈالر والے سکے کہاں سے آگئے؟''

''میں نے تمہارے خزانچی سے لیے تھے۔ یقین نہ آئے تو سکے اسے دکھا کر چیک کرالو۔'' جیکی نے مزے سے کہا۔

''ملازم نے سر کے اشارے سے آفس میں بیٹھے مالک کو بلایا۔ آفس کا دروازہ کھلا اور بسمارک کا مالک بورمین آگیا۔ کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ ڈیگر۔؟''

''ان صاحب نے پانسے پھینکے جانے سے ایک لمحہ پہلے داؤ لگایا۔ حالانکہ اس سے پہلے یہ صرف ایک ڈالر کی بازی لگا رہے تھے۔''

''کیا تم میری جیت کی رقم دبانا چاہتے ہو؟'' جیکی نے برہمی سے کہا اور سب لوگوں کی طرف دیکھا۔ میز کے گرد کھڑے لوگوں کا انداز جارحانہ ہوگیا۔ پھر دوسری میزوں پر سے بھی لوگ آنے لگے۔ صورت حال کلب کے مالک کے لیے ناخوش گوار ہوگئی۔

''ڈیگر تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا انہوں نے پانسے

پھینکے جانے کے بعد داؤ لگایا تھا؟''

''نہیں پہلے لگایا تھا۔'' عمر رسیدہ شخص نے برہمی سے کہا۔ ''اگر سات کا ہندسہ نہ آتا تو تم لوگ فوراً اس کی رقم اٹھا لیتے اور کوئی سوال نہ کرتے۔ مگر اب تفتیش کر رہے ہو۔ آخر مقصد کیا ہے تم لوگوں کا؟''

''اگر ایسی بات ہے تو ان کی رقم فوراً ادا کردو۔'' بورمین نے کہا۔

''میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے جناب۔''

''اوہ آپ میرے ساتھ آیئے جناب۔'' بورمین نے کہا۔ ''میں آپ کو کیشیئر سے دس ہزار ڈالر دلواتا ہوں۔''

''لالچ کا انجام خراب ہوتا ہے۔'' کسرتی جسم والا نوجوان بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ ''میں نے لالچ کیا اور سب کچھ گنوادیا۔ میرا خیال ہے کہ کسی گندے نالے میں ڈوب کر مجھے خودکشی کرلینا چاہیے۔'' وہ سر کو جھٹکتا ہوا دروازے کی طرف چلنے لگا۔

''میرا خیال ہے کہ آپ چھوٹی موٹی رقمیں لگاتے ہیں مسٹر جیکی؟'' وہ بولا۔

''کبھی کبھار بڑی بھی لگالیتا ہوں۔'' جیکی نے مسکرا کر کہا۔

''ہمارے کلب میں لمبی رقم کا پوکر کھیلا جاتا ہے۔ آپ وہاں قسمت آزمانا چاہتے ہیں؟''

جیت کی رقم واپس لینے کا یہ شائستہ طریقہ تھا۔ جیکی کو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ بورمین اس حد تک با اخلاق ہے۔ ''نہیں۔ آج کے لیے اتنا کافی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے قسمت پر دباؤ نہیں ڈالنا چاہیے۔'' وہ بولا۔

''آپ داؤ لگا کر تو دیکھیں۔ صرف آپ کو پتے کاٹنا ہوں گے۔ چند منٹ بعد آپ کی رقم دوگنی ہوجائے گی۔'' بورمین نے اسے ترغیب دی۔

جیکی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

بورمین نے کیشیئر کی کھڑکی کے قریب پہنچ کر اس سے کہا۔ ''ایک ہزار ڈالر ان سکوں کے ادا کرو اور اس کے علاوہ انہیں دس ہزار ڈالر اور دے دو۔''

جیکی جب اس سے رقم لے کر گننے میں مصروف تھا تو اس نے بورمین کو ایک بدمعاش کی طرف دیکھ کر اشارہ کرتے پایا۔ تھوڑی دیر بعد بدمعاش کلب کے دروازے کی طرف جارہا تھا۔ جیکی جانتا تھا کہ اب کسی تاریک گلی میں اس کی جیب سے رقم نکالنے کی کوشش کی جائے گی۔

جب وہ رقم گن چکا تو اس نے بورمین سے مصافحہ کیا۔ ''آپ جب بھی ادھر سے گزریں تو ہمارے ہاں ضرور تشریف لائیں۔'' بورمین نے کہا۔

جیکی نے اثبات میں سر ہلایا اور دروازے کی طرف چل پڑا۔ گارڈ نے نہایت ادب سے اس کے لیے دروازہ کھولا۔ اب وہ تاریک گلی میں تھا۔ اس نے گردوپیش پر نگاہ دوڑائی تو دائیں جانب سے سرگوشی میں آواز آئی۔ اس طرف آجاؤ جیکی۔''

جیکی اس طرف چلا گیا۔ وہاں کسرتی جسم والا نوجوان کھڑا تھا۔ اس کے قریب ہی دیوار کے پاس ایک بدمعاش بے ہوش پڑا تھا۔

''کوئی دشواری تو پیش نہیں آئی کہیں؟''

''نہیں۔ یہ لوہے کا ڈنڈا لیے باہر آیا اور یہاں کھڑا ہوگیا تاکہ تم جیسے ہی نکلو یہ تمہیں شکار کرلے۔ میں نے اس کی پشت پر پہنچ کر جوڈو کا ایک وار کیا تو اس کی گردن چٹخ گئی۔ اور یہ بے ہوش ہوگیا۔''

''میرا خیال ہے کہ ہمیں وقت ضائع کیے بغیر یہاں سے چل دینا چاہیے۔ اس لیے کہ جب یہ کلب میں جلد واپس نہیں پہنچے گا تو بورمین کو تشویش ہوگی اور وہ باہر دو چار آدمی بھیج دے گا اور ہمیں پریشانی ہوجائے گی۔''

''کسرتی جسم والے کین نے اس سے اتفاق کیا اور دونوں تیز قدمی سے اپنی کار کی طرف چلنے لگے۔

☆☆☆

خویش ہوشیار

رقیہ خانم

ڈیل نے اسے ایک عمارت کی طرف کر دیا۔ وہ اپنے اس تجربے سے بہت خوش تھا۔ اپنے انہماک میں اسے وقت گزرنے کا کوئی احساس نہیں ہوا اور وہ شام چار بجے تک مختلف آوازیں سنتا رہا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ تھک گیا ہے اس لیے وہ سو گیا۔ شام کے کھانے سے پہلے لینڈ لیڈی نے اسے اٹھا دیا۔ رات کے کھانے کے بعد اس نے خود کو چاق و چوبند محسوس کیا۔ اس کی طبیعت بہت بہتر تھی۔ اس نے اپنے کمرے کی بتی بجھا دی۔ سامنے والی عمارت کی کھڑکیوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ اس نے ایک کھڑکی کی طرف آلے کا رخ کر دیا اور ہیڈ فون اپنے کان سے لگا لیا۔ آوازیں آنے لگیں

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا ☆ دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

جس وقت ڈیل اسپتال سے رخصت ہو رہا تھا تو ڈاکٹر نے اسے مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ ڈیل پر چند روز پہلے دل کا دورہ پڑا تھا اور وہ مرتے مرتے بچا تھا۔

ڈاکٹر نے اسے گھر جانے کا مشورہ تو دے دیا تھا لیکن یہ بتانا بھول گیا کہ وہ کون سے گھر جائے۔ اس لیے کہ ڈیل کا کوئی گھر ہی نہیں تھا۔ شہر میں تقریباً اس کی ایک درجن بیویاں تھیں لیکن وہ ان میں سے کسی کے گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔

اس نے اپنی جیب کا جائزہ لیا۔ اس کی جیب میں آٹھ سو ڈالر تھے۔ اس نے منصوبہ بندی کی اور ایک ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لے لیا۔ اسے تحفظ کی بھی ضرورت تھی۔ اس لیے کہ اس نے دس بارہ بیوہ خواتین کو شادی کا لالچ بھی دے رکھا تھا۔

کمرہ کرائے پر لینے کے بعد اس نے اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ زندگی گزارنے کے لیے اسے بہر حال کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔ اس لیے کہ پہلے وہ ریوالور یا خنجر دکھا کر لوگوں کو لوٹ لیتا تھا۔ مگر اب وہ ایسی کوئی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ بڑے ڈاکے ڈالنا تو دور کی بات تھی۔ اسے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ اگر واردات کے دوران اس پر دل کا دورہ پڑ گیا تو وہ گر کر مر جائے گا یا پھر پولیس اسے گرفتار کر لے گی۔

ڈیل اپنے کمرے میں آرام کرتا رہتا تھا۔ یا پھر مطالعہ کرنے لگتا۔ وہ اس کمرے کا کرایہ دس ڈالر فی ہفتہ ادا کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ بارہ ڈالر فی ہفتہ اپنی مالکہ مکان کو کھانے کے لیے ادا کر رہا تھا۔ وہ اسے دو

وقت کا کھانا بھی مہیا کرتی تھی- وہ خاموش طبیعت تھا اس لیے مالکہ اس سے خوش تھی-

سر دست رقم کا کوئی مسئلہ نہیں تھا- وہ چار ماہ تک گزارا کر سکتا تھا، مگر یہ سوال اسے پریشان کرنے لگتا کہ اس کے بعد کیا ہوگا- کیوں کہ اس نے اپنی پچاس سالہ زندگی میں اچھے کھانے کھائے تھے اور شراب اور عورت کے ساتھ زندگی گزاری تھی-

شام کے وقت وہ اپنی کھڑکی میں بیٹھ کر باہر کا نظارہ کرتا تھا- سڑک پار سامنے ایک عمارت تھی جس کے کونے پر ایک لیٹر بکس تھا- لوگ اس گلی میں سے گزرتے تھے تو ڈیل یہ سوچ کر آہیں بھرتا تھا کہ وہ کتنے خوش حال لوگ ہیں اور ان کی جیبیں نوٹوں سے بھری ہوں گی- کاش وہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کر لیتا کہ اس کی جیب میں بھی نوٹ آ جاتے-

وہ کوئی ایسا منصوبہ بنانا چاہتا تھا کہ اس میں طاقت اور جسم کا استعمال نہ ہو بلکہ صرف دماغ استعمال کیا جائے - اپنے دل کی کمزوری کے سبب اب وہ ایسا سوچنے پر مجبور تھا-

ایک روز وہ ایک سائنسی میگزین کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اسے ایک ایسے آلے کی تصویر نظر آئی جو سوفٹ کے فاصلے سے آوازوں کو کیچ کر لیتا اور ریکارڈ کر لیتا تھا- اس کی قیمت بیس ڈالر تھی- ڈیل نے بیس ڈالر اس کمپنی کو بھیج دیے تو چار روز بعد وہ آلہ ایک خوب صورت سے پیکٹ میں آ گیا-

وہ بیضوی اور پیالہ نما تھا اور جس میں دو اسٹینڈ لگے تھے- اس کے پچھلے حصے سے دو تاریں نکلتی تھیں اور ایک ہیڈ فون لگا تھا- جس طرف کی آوازیں ریکارڈ کرنا مقصود ہوتیں پیالے کا رخ اس طرف کر کے ہیڈ فون کانوں سے لگا لیا جاتا تو آوازیں سنائی دے جاتی تھیں- اس نے امتحان لینے کی غرض سے اس کا رخ ان دو خواتین کی طرف کر دیا جو ایک کھمبے کے قریب کھڑی تھیں- ان میں سے ایک کہہ رہی تھی- ''دکان دار ساڑھے تین ڈالر کہہ رہا تھا اور ڈبے پر لکھی ہوئی قیمت کی طرف اشارہ کر رہا تھا- لیکن میں نے اس کے سامنے اخبار رکھ دیا جس میں پنیر کے پیکٹ کی قیمت تین ڈالر درج تھی میں نے اس سے کہا....''

پھر ڈیل نے آلے کا رخ دو لڑکیوں کی طرف کر دیا- ''ایلن تم نے دیکھا فیٹ بوائے باب مجھ میں آج کل کتنی دلچسپی لے رہا ہے؟ اس نے کل بھی مجھ کو پارک میں چلنے کی دعوت دی تھی- پتا ہے بعد میں وہ کیا کہنے لگا؟''

ڈیل نے اسے ایک عمارت کی طرف کر دیا- وہ اپنے اس تجربے سے بہت خوش تھا- اپنے انہماک میں اسے وقت گزرنے کا کوئی احساس نہیں ہوا اور وہ شام چار بجے تک مختلف آوازیں سنتا رہا- اس نے محسوس کیا کہ وہ تھک گیا ہے اس لیے وہ سو گیا- شام کے کھانے سے پہلے لینڈ لیڈی نے اسے اٹھا دیا-

رات کے کھانے کے بعد اس نے خود کو چاق و چوبند محسوس کیا- اس کی طبیعت بہت بہتر تھی- اس نے اپنے کمرے کی بتی بجھا دی- سامنے والی عمارت کی کھڑکیوں میں روشنی ہو رہی تھی- اس نے ایک کھڑکی کی طرف آلے کا رخ کر دیا اور ہیڈ فون اپنے کان سے لگا لیا- آوازیں آنے لگیں- ایک نسوانی پختہ آواز تھی- جو اپنے بچے سے کہہ رہی تھی- ''جیک میں نے تمہیں کئی بار سمجھایا ہے کہ کھانے کے بعد ٹیلی وژن کے سامنے مت بیٹھا کرو- چلو جا کر اسکول کا ہوم ورک کرو....''

ڈیل نے آلے کا رخ دوسری کھڑکی کی طرف کر دیا- ''ڈارلنگ میں سچ کہہ رہی ہوں- یہ صرف میک اپ کی کرشمہ سازی ہے- اس کی عمر چالیس سے کم نہیں ہے لیکن اس نے اتنا اچھا میک اپ کروا رکھا تھا بالکل لڑکی....''

ڈیل نے اس کا رخ تیسری کھڑکی کی طرف کر دیا- وہاں ایک بچی اپنی ماں سے سالگرہ کے تحفے کی فرمائش کر رہی تھی- اس کا کہنا تھا کہ وہ پچھلے سال والی چیزیں نہیں لے گی-

ڈیل نے آلے کو دسویں منزل کی کھڑکی کی طرف کر دیا- ایک مردانہ آواز آئی- ''اچھا تو وہ رقم تم نے دیکھ ہی لی- تم کو وہ راز معلوم ہو گیا- اچھا اب بتاؤ کہ اس میں کیا برائی ہے؟''

''سیلوان تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے- پچیس ہزار ڈالر کی رقم کم نہیں ہوتی- تمہارا کیا خیال ہے کسی کو معلوم ہی نہیں ہوگا؟'' ہلین نے خشک لہجے میں کہا-

''میں ایک ذہین شخص ہوں اور اچھے سے اچھا آڈیٹر بھی میرے اس غبن کو نہیں پکڑ سکتا-'' سیلوان نے فخریہ لہجے میں کہا- ''چوں کہ تمہیں تجسس بہت ہے اور چیزوں کو اٹھا کر دیکھنے کی عادت ہے چناں چہ تمہیں اس رقم کا پتا چل گیا-''

''اب یہ بتاؤ کہ تم اس رقم کو کیسے خرچ کرنا چاہتے ہو؟'' ہلین نے پوچھا-

''ابھی میں اس رقم کو خرچ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا- میرا منصوبہ یہ ہے کہ میں ہر ماہ بینک کے کھاتوں سے ایک ہزار ڈالر نکالتا رہوں گا اور جب رقم پچاس ہزار ہو جائے گی تو یہاں سے چلا جاؤں- اگر تم میرے ساتھ جانے پر تیار ہو تو ٹھیک ہے ورنہ....''

''میں تمہارے ساتھ کہاں جاؤں گی؟ جیل؟'' ہلین نے طنزیہ لہجے میں کہا-

''ہلین- میں تمہیں اس رقم کے بارے میں کچھ نہ بتاتا بس یہ کہہ دیتا کہ میری لاٹری نکل آئی ہے- اچھا اب یہ بتاؤ کہ اس میں کیا برائی ہے؟ ہم تیزی سے بوڑھے ہو رہے ہیں- اور ہم نے کوئی خوشی نہیں دیکھی- کیا میں کیشیئر کی حیثیت سے ریٹائر ہو جاؤں یا پھر آخری عمر میں کسی برانچ کا منیجر بنا دیا جاؤں؟ آخر ہماری زندگی کیا ہے ہلین؟ کیا ہم کولھو کے بیل کی طرح سے زندگی بسر نہیں کر رہے ہیں؟ کھانا، پینا اور پھر سو جانا؟ تمہیں اس طرز عمل سے اکتاہٹ نہیں ہوتی؟ ہماری زندگی میں تنوع اور دلچسپی نہیں ہے- ہم مسلسل ایک دائرے میں گھوم رہے ہیں- خشک اور بے رونق زندگی گزار رہے ہیں-''

''مگر سیلوان یہ تو کھلی چوری ہے-'' ہلین نے کہا-

''کہہ سکتی ہو لیکن اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر میں نے بینک کے لاکھوں ڈالر کی حفاظت کی- پیٹ میں گولی کھائی- ڈاکوؤں کا حربہ ناکام بنایا- اس خدمت کے بدلے مجھے کیا حاصل ہوا؟ مجھے ایک شاباشی کا خط دے دیا گیا-''

''انہوں نے تمہیں ڈیڑھ مہینے کی چھٹی دی اور اسپتال کا بل ادا کیا-'' ہلین بولی-

''اس طرح سے انہوں نے میرے اوپر ایک عظیم احسان کر ڈالا-'' سیلوان جھنجلا کر بولا- ''اگر وہ ڈیڑھ ماہ کی چھٹی نہ دیتے تو کیا یوں ہی مجھے مر جانے دیتے؟ میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا ہلین- میں پندرہ سال سے یورپ کی سیاحت کرنے کے خواب دیکھ رہا ہوں- وہاں میرا مصوری کا شوق بھی پورا ہو سکے گا-''

''میں کہتی ہوں سیلوان رقم وہیں رکھ دو ورنہ تم خسارے میں ہو گے-'' ہلین نے اندیشہ ظاہر کیا-

''اس موقع پر اگر میں رقم واپس رکھوں گا تو اس کا یہ مطلب لیا جائے گا کہ میں نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا- میں ایسی حماقت کیوں کروں؟ ہم لوگ کب تک مفلس رہیں گے؟ اس رقم سے ہم اپنے لیے خوشیاں خرید سکتے ہیں- اپنے دل کے سارے ارمان پورے کر سکتے ہیں-''

''میرا تو خیال ہے کہ تم خود کو تباہی اور بربادی کی طرف دھکیل رہے ہو-'' ہلین نے کہا-

ان دونوں میاں بیوی کی آوازیں ڈیل کو بہت واضح

طور پر سنائی دے رہی تھیں۔ اس کے جسم میں سنسنی پھیل رہی تھی اس لیے کہ وہ ایک بڑے جرم سے آگاہ ہونے جا رہا تھا۔

"یہ ناممکن ہے۔ اچھا میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ چہل قدمی کرنے۔ تمہاری بکواس سے دماغ ہل کر رہ گیا ہے۔"

ڈیل نے زور سے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس عمارت سے طویل قامت شخص نکلتا دکھائی دیا۔ اس نے گہرے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور سر پر فیلٹ ہیٹ تھا۔

ڈیل اپنے آلے کا رخ بدستور اس کھڑکی کی طرف کیے رہا۔ اس عورت لیلن کی سسکیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پھر وہ کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ بالآخر اس کی آواز دوبارہ آئی۔ "ہیلو مرنی! میں لیلن بول رہی ہوں.... ہاں میں نے اسے آگاہ کر دیا ہے۔ مجھے رقم کے بارے میں سب کچھ پتا ہے، لیکن اسے یہ مشورہ پسند نہیں آیا۔ وہ رقم واپس نہیں رکھنا چاہتا۔ کہتا ہے کہ یہ ممکن نہیں.... سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کیا کروں؟ ہاں، میں اسے چھوڑ دوں گی۔ معاملہ الجھ گیا ہے۔ اس کے ساتھ گزارا نہیں ہو سکتا۔" چند لمحوں تک خاموشی طاری رہی۔ ظاہر ہے کہ دوسری طرف سے مرنی بول رہا تھا جس کی آواز ڈیل نہیں سن سکتا تھا۔

"ہاں۔ میں اپنے ارادے پر قائم ہوں۔" لیلن کی آواز آئی۔ "اچھا خدا حافظ۔" پھر اس نے فون بند کر دیا اور سسکیاں لینے لگی۔ ڈیل نے ہیڈ فون اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ پھر اس نے دو خواب آور گولیاں کھائیں اور سکون سے سو گیا۔

اگلے روز وہ صبح اٹھ گیا۔ اور اس نے منہ ہاتھ دھونے کے بعد سب سے پہلے آلے کا رخ سیلوان کی کھڑکی کی طرف کر دیا۔ وہاں سے ریڈیو کی موسیقی کی لہریں آ رہی تھیں۔ پھر لیلن کی آواز آئی۔ "سیلوان اب اٹھ جاؤ۔ کب تک سوتے رہو گے۔"

اس کے بعد غسل خانے کی طرف سے پانی گرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ سیلوان کھنکار کر حلق صاف کر رہا تھا۔ سات بج کر پندرہ منٹ پر اس کی بیوی لیلن کی آواز آئی۔ "سیلوان کافی ٹھنڈ ہو رہی ہے جلدی کرو۔ یہ بتاؤ کہ کتنے انڈے کھاؤ گے؟"

"میں صرف ٹوسٹ کھاؤں گا۔"

"میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہاری خوراک روز بہ روز کم ہوتی جا رہی ہے۔" اس کی بیوی نے تشویش سے کہا۔ "اب بھی وقت ہے باز آ جاؤ اور اس رقم کو واپس کر دو۔ یہ تمہارے دماغ پر سوار ہے اور تمہیں بیمار کر رہی ہے۔"

"بکواس بند کرو۔ آج سے تم رقم کا تذکرہ نہیں کرو گی۔" سیلوان نے درشتی سے کہا۔ "تم میرا ساتھ دینا چاہتی ہو کہ نہیں؟"

"لیکن ساتھ دینے والا مرحلہ تو دو سال بعد آئے گا۔ اگر اس عرصے میں بینک کے کسی فرد کو اس بارے میں معلوم ہو گیا تو؟"

"میرا منصوبہ اس قسم کا ہے کہ اگر میں گرفتار ہو گیا تو تنہا جیل جاؤں گا، تم پر آنچ نہیں آئے گی اس لیے کہ تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "بس اب اس رقم کو بھول جاؤ۔"

تھوڑی دیر بعد ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے وہ اپنے فلیٹ میں سے نکل رہے ہوں۔ ڈیل نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ بہت سے لوگ اس عمارت سے نکل رہے تھے اس لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ ان میں سیلوان اور لیلن کون ہے؟

وہ اس آلے کو ایک طرف رکھ کر دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔ نو بجے کے قریب مالکہ مکان اس کے لیے ناشتا لے آئی تو وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ گیا۔ وہ حیرت سے ریکارڈنگ کے آلے کو دیکھنے لگی۔ "اوہ! تو اس کا پارسل کل آیا تھا۔ یہ کیا ہے مسٹر ڈیل؟"

"یہ طاقتور ایریل ہے جس سے دور کے اسٹیشن صاف سنے جا سکتے ہیں۔ میں اس کی مدد سے ساری دنیا کے ریڈیو اسٹیشن سننے میں کامیاب ہو سکتا ہوں۔" پھر اس نے گفتگو کا موضوع تبدیل کرنے کی غرض سے کہا۔ "موسم آج خوش گوار ہو گیا ہے۔ دل چاہ رہا ہے کہ تھوڑی سی چہل قدمی کی جائے۔"

"دن یقیناً خوش گوار ہے اس لیے کہ دھوپ نکل آئی ہے، لیکن تمہاری طبیعت درست نہیں ہے اس لیے تمہیں احتیاط کرنا چاہیے۔"

گیارہ بجے تک وہ اپنے بستر میں لیٹا رہا۔ پھر اٹھا اور سامنے والی عمارت کی طرف چلا گیا۔ ہر منزل پر وہ دروازوں پر لگی تختیاں پڑھتا جا رہا تھا۔ چھٹی منزل پر اسے اے کے سیلوان کی تختی نظر آ گئی۔ اس نے نیچے اتر کر انکوائری سے اس نے سیلوان کا نمبر دریافت کیا۔ پھر جب اس کا ٹیلی فون نمبر معلوم ہو گیا تو وہ واپس اپنے فلیٹ پر آ گیا۔ وہ تھک گیا تھا لیکن اس نے کام کر لیا تھا۔ اب وہ اپنی سابقہ زندگی کی ابتدا کرنے والا تھا۔

چھ بجے شام کو اس نے اپنا آلہ سیلوان کے فلیٹ کی کھڑکی کی طرف کر دیا تو تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ اس کے بعد لیلن نے پوچھا۔ "تم کہاں ہو ڈارلنگ!"

"میں یہاں ہوں۔"

"اچھا اب میں رات کا کھانا تیار کرنے جا رہی ہوں۔" لیلن کی آواز آئی۔

پھر رات گئے تک ان دونوں کے مابین کوئی خاص گفتگو نہیں ہوئی۔ دوسرے روز شام کو ڈیل اپنے فلیٹ سے نکلا اور قریبی ٹیلی فون بوتھ پر گیا۔ اس نے وہاں سے سیلوان کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا گیا۔

"ہیلو سیلوان کیسے ہو؟" اس نے دوستانہ انداز سے پوچھا۔

"ٹھیک ٹھاک۔ تمہاری تعریف؟"

"تمہارا دوست۔"

"نام؟"

"نام کے چکر میں نہ پڑو سیلوان۔ تم یہ تو نہیں چاہو گے کہ بینک والوں کو ان پچیس ہزار ڈالروں کے بارے میں کچھ معلوم ہو جو تم نے غبن کر کے اپنے گھر میں محفوظ کر لیے ہیں؟" ڈیل نے سنجیدگی سے کہا۔

دوسری طرف سناٹا چھا گیا پھر سیلوان کی آواز آئی۔ "تم کون ہو؟"

"آخر تم اس پریشانی میں کیوں مبتلا ہونا چاہتے ہو کہ میں کون ہوں؟ میں اپنی زبان بند رکھنے کے لیے پانچ ہزار ڈالر چاہتا ہوں۔ شہر چھوڑ کر تم کہیں اور نہیں جا سکتے۔ اگر تم ایسا کرو گے تو میں بینک والوں کو آگاہ کر دوں گا۔"

"معلوم نہیں تم کیا بکواس کر رہے۔" سیلوان نے جھنجلا کر کہا اور ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

تھوڑے سے وقفے کے بعد ڈیل نے ایک بار پھر اسے ڈائل کیا۔ اس کی آواز سن کر اس نے کہا۔ "اب تم مجھے چھ ہزار ڈالر ادا کرو گے۔ اگر آئندہ تم نے اس طرح سے ریسیور رکھا تو میرا مطالبہ ایک ہزار ڈالر بڑھتا رہے گا۔" دوسری طرف خاموشی کا تسلط رہا تو اس نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ رقم تم نے الماری کے خفیہ خانے میں رکھی ہے۔ میں تمہیں سوچنے کی مہلت دے رہا ہوں۔ بعد میں فون کروں گا۔" اس نے ریسیور ہک سے لٹکایا اور بوتھ سے باہر آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوگوں میں شامل ہو کر اپنے فلیٹ کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے اپنے فلیٹ میں پہنچ کر اس آلے کا رخ سیلوان کے فلیٹ کی کھڑکی کی طرف کر دیا۔ دو منٹ کے بعد اس کی بیوی لیلن کی آواز آئی۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو کہ میں نے کسی کو اس رقم کے بارے میں بتا دیا؟ میں کیوں بتانے لگی۔ میں تو ہر وقت

اس کے بارے میں سوچ کر پریشان ہوتی رہتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے کسی کو بتانا بھی نہیں۔" سیلوان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں جو بھی کر رہا ہوں تمہاری بھلائی کے لیے کر رہا ہوں۔"

ڈیل نے آلے کو آف کر کے اسے بیڈ کے نیچے رکھ دیا پھر وہ آرام کرنے لگا۔ دوسرے روز شام کو چھ بجے اسی بوتھ سے اس نے سیلوان کو پھر فون کیا۔

"تم نے رات کیسی گزاری پیارے سیلوان۔ سنو اپنی بیوی پر غصہ نہ کرو۔ مجھے جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ میرے اپنے ذرائع ہیں۔"

"تم کون ہو؟" سیلوان نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

"میں گھر کا بھیدی ہوں اور مجھے ساری باتیں معلوم ہیں۔ کیا تم اپنے بینک سے ایک ہزار ڈالر ماہانہ کا غبن نہیں کر رہے ہو؟ اور جب تم پچاس ہزار جمع کر لو گے تو یورپ کی سیر پر روانہ ہو جاؤ گے؟ تم مجھے صرف چھ ہزار ڈالر ادا کر کے تحفظ حاصل کر سکتے ہو۔ ورنہ تمہارے سارے خواب خاک میں مل جائیں گے۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟" سیلوان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"صرف چھ ہزار ڈالر۔ اور میں یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ تمہیں پریشان نہیں کروں گا۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم مجھے دوبارہ پریشان نہیں کرو گے؟"

"میں کوئی ضمانت فراہم نہیں کر سکتا۔ مگر ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ تم چور ہو اور میں تمہارا بھائی۔"

"تم مجھ سے کہاں ملو گے؟"

"وقت اور ملاقات ہم بعد میں طے کریں گے شب بخیر۔" ڈیل نے کہا اور ریسیور ہک سے لٹکا کر بوتھ سے باہر آ گیا۔ جب وہ اپنے فلیٹ پر پہنچا اور اس نے اپنی کھڑکی کھولی تو ایک شخص کو اس کھڑکی میں کھڑا دیکھا جہاں سیلوان رہتا تھا۔ اس شخص کے سر کے بال سرخ رنگ کے تھے۔

رات کے کھانے کے بعد جب ڈیل نے آلے کا رخ سیلوان کی کھڑکی کی طرف کیا تو اس کی بیوی لیلن کی آواز آنے لگی۔ "سیلوان اگلے ہفتے ممی کی سالگرہ ہے۔ کیوں نہ ہم ایک ہفتہ ان کے پاس چل کر رہیں؟"

"تم ہو کر آ جاؤ۔ مجھے دو چار ضروری کام نمٹانا ہیں۔"

"میں جانتی تھی کہ تم یہی کچھ کہو گے۔ تم نے الماری میں دولت بھر رکھی ہے۔ اس لیے تم گھر نہیں چھوڑنا چاہ رہے ہو۔"

"ممی مجھ سے خوش نہیں رہتی ہیں۔" سیلوان نے کہا۔ "اس لیے بہتر ہوگا کہ تم وہاں ہو کر آ جاؤ۔ جمعہ کو جانا اور اتوار کو واپس آ جانا۔ او کے اب ٹیلی وژن لگا دو۔ میرا پسندیدہ پروگرام "لوسی شو" آنے والا ہوگا۔"

☆☆☆

ڈیل نے اس سے اگلے روز سیلوان کو فون کیا۔

سیلوان نے اس کی آواز پہچان لی اور کہا۔ "ہاں یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کہاں مل رہے ہو تاکہ میں تمہیں چھ ہزار ڈالر ادا کر کے اپنی جان چھڑا لوں۔"

"اس بارے میں فکر کیوں کر رہے ہو۔ کبھی اطمینان سے ملاقات کر لیں گے۔" ڈیل نے کہا۔

"آئندہ ہفتے کی شام کیسی رہے گی؟" سیلوان نے خود کہا۔

"مجھے معلوم ہے کہ آئندہ ہفتے لیلن گھر پر نہیں ہوگی اور اپنی ممی کی سالگرہ پر جائے گی... تمہاری بیوی تمہیں ڈبل کراس کر رہی ہے۔ تم نے مرفی کا نام تو سنا ہوگا؟"

"اس بات سے تمہارا کیا مقصد ہے؟" سیلوان نے برہمی سے کہا۔ "تم اپنی بات کرو۔"

"تم رقم تیار رکھو میں تم سے پھر بات کروں گا۔"

ڈیل نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس شام ڈیل نے سیلوان کو کافی دیر تک اپنی کھڑکی میں کھڑے دیکھا۔ وہ گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا۔

ڈیل نے منصوبہ بنا لیا اور علی الصباح سیلوان کو فون کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ اپنے فلیٹ سے اتر کر بوتھ میں پہنچ گیا۔ اس وقت اس کے سینے میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ ڈاکٹر نے اسے مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا۔ اس نے سیلوان کا نمبر ملایا۔ تو دوسری طرف سے اس نے فوراً ہی ہیلو کہا۔ یہ بات ڈیل کو نہایت عجیب معلوم ہوئی۔ "میں تمہارا دوست بول رہا ہوں۔" اس نے کہا۔

"او کے، ہماری ملاقات کہاں ہو رہی ہے؟" سیلوان نے بے تابی سے کہا۔

"جلدی نہیں ہے۔ تم چھ ہزار ڈالر کو اخبار میں لپیٹ کر پیکٹ بنا لو۔"

"اچھا۔ ابھی لو۔" اس نے کہا۔

ڈیل کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ غالباً سیلوان یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہے کہ میں کہاں سے بول رہا ہوں؟ کس ٹیلی فون سے گفتگو کر رہا ہوں۔ اسے اطمینان تھا کہ وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔

ڈیل نے ٹھہر کر پھر سلسلہ ملایا لیکن دوسری طرف سے آواز نہیں آئی۔ اس کا مطلب یہ تھا سیلوان نے ریسیور کو میز پر رکھ دیا ہے۔

اس نے بوتھ کا دروازہ قدرے کھول کر دیکھا۔ باہر دھند پھیلی ہوئی تھی اس لیے واضح طور پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ تاہم وہ دیکھنے میں کامیاب ہو گیا کہ سیلوان اپنی کھڑکی میں کھڑا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک گول پلیٹ نما چیز ہے۔ جس کا رخ ٹیلی فون بوتھ کی طرف ہے۔

ڈیل نے جلدی سے بوتھ کا دروازہ بند کر دیا۔ وہ بدحواس سا ہو گیا تھا۔ گویا سیلوان نے بھی بالکل ویسا ہی ایک آلہ خرید لیا تھا اور اب وہ گرد و پیش کی آوازیں ریکارڈ کر رہا تھا۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ اس کی سن گن کون لے رہا ہے!

وہ تذبذب میں تھا کہ کیا کرنا چاہیے کہ سیلوان اس عمارت کے صدر دروازے سے نکلتا دکھائی دیا جہاں وہ رہتا تھا۔ اس کا رخ ٹیلی فون بوتھ کی طرف تھا۔ ڈیل اس صورت حال سے گھبرا گیا۔ اس نے بوتھ کا دروازہ کھولا اور ایک طرف کو بھاگنے لگا۔ اس وقت اس کے ذہن سے یہ نکل گیا تھا کہ ڈاکٹر نے اسے آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اور اسے بھاگنا دوڑنا منع ہے۔

اس نے تھوڑا سا فاصلہ طے کیا۔ پھر لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس کے سینے کی تکلیف میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اس کی بصارت پر تاریکی کا گہرا اور دبیز پردہ پڑتا چلا گیا۔

ایک گشتی پولیس والا اس کے بے حس و حرکت جسم کے نزدیک کھڑا تھا۔ اس کی تلاشی لینے پر اس کی جیب سے ایک نوٹ بک برآمد ہوئی تھی۔ "یہ کس نے کہا تھا کہ اس پر دل کا دورہ پڑا ہے؟" اس نے مجمع پر نگاہ ڈال کر کہا۔

"کیا یہ مر چکا ہے؟" سیلوان نے آگے بڑھ کر کہا۔

"ہاں۔ کیا تم نے اسے گرتے دیکھا تھا؟"

"جی ہاں جناب! میں اپنے گھر سے ڈبل روٹی اور انڈے لینے نکلا تھا کہ میں نے بوتھ کا دروازہ کھلتے دیکھا۔ پھر یہ شخص نکل کر بھاگنے لگا۔ ممکن ہے تیز چل رہا ہو۔ میں نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ مگر جب یہ سڑک پر پہنچ کر گر پڑا تو میں اس کی طرف لپکا۔"

"کیا تم اسے جانتے ہو؟"

"نہیں جناب۔ اس سے پہلے میں نے اس کی صورت نہیں دیکھی۔ معلوم نہیں کون تھا بے چارہ!" سیلوان نے تاسف سے گہرا سانس لے کر کہا۔

☆☆☆

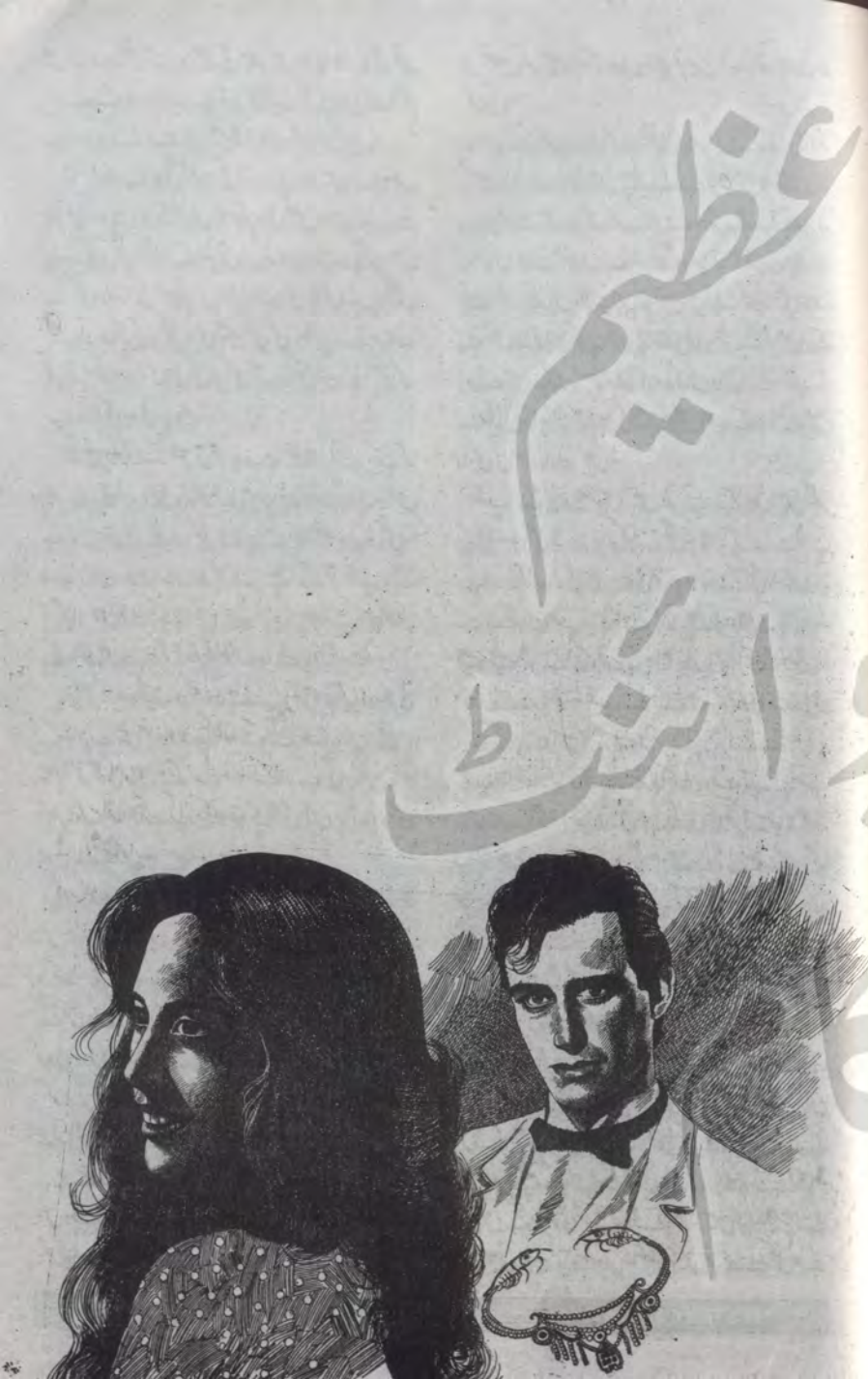

حسن اتفاق

ذیام مصطفےٰ

"نہیں فلپ۔ میں ایسا کوئی کام نہیں کرسکتی۔ یہ سب تو غیر قانونی ہے۔ اگر کہیں سے کچھ ظاہر ہوگیا تو پھر ہم دونوں کو سزا ہو جائے گی۔ میں نے جو رنگین سپنا دیکھا ہے وہ چکنا چور ہو جائے گا۔" وہ خوف زدہ آواز میں بولی۔ وہ معصوم ذہن کی مالک تھی اور اس نے کوئی مجرمانہ بات سوچی تک نہیں تھی اس لیے اس پر سراسیمگی طاری تھی۔ "ہمت سے کام لو۔ ذرا سے حوصلے سے ہماری زندگی بدل سکتی ہے۔"

"مگر میں ایسے کسی کام میں شریک نہیں ہوسکتی جو غیر قانونی ہو۔"

"فلپ اس سے ناراضگی ظاہر کرنے لگا اور اس کی طرف سے منہ پھیر کر کھڑا ہوگیا۔ شرلے نے اسے بانہوں میں لے لیا اور اس کے رخساروں کو چومنے لگی۔ لیکن فلپ نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا اور سرد مہری ظاہر کی۔

راہ جو تیرے گھر کو جاتی ہے ☆ تیرے گھر سے کدھر کو جاتی ہے

فلپ ہارڈی بینک کا ایک ذمے دار آفیسر تھا۔ اس کا کام ان اکاؤنٹس کی دیکھ بھال تھی جو عرصے سے بے کار پڑے ہوں۔ ہر سال سینکڑوں افراد بینک میں اکاؤنٹ کھلوانے کے بعد بھول جاتے تھے۔ یا پھر اتفاق سے دوسری ریاستوں یا ملکوں میں منتقل ہو جاتے۔ ایسے اکاؤنٹس مردہ اکاؤنٹس کہلاتے تھے۔

ہر سال بینک کی طرف سے ان اکاؤنٹس کے بارے میں اشتہارات دیے جاتے تھے۔ جن میں اکاؤنٹ نمبر اور ان کے مالکان کے نام درج ہوتے تھے۔ وینسینک اٹھارہ سال تک ایسے اکاؤنٹس کی حفاظت کرتا تھا اور اس کے بعد ان کی رقم حکومت کے حوالے کردی جاتی تھی۔

فلپ کو ان اکاؤنٹس کے مالکان کو تلاش کرنے میں مزہ آتا تھا۔ یہ کام اس کے لیے ایک دلچسپ مشغلہ بن گیا تھا۔ وہ اکثر و بیشتر ایسے کھاتوں کی جانچ پڑتال کرتا رہتا تھا۔ اس لیے سنسنی خیز باتیں اس کے سامنے آتی رہتی تھیں۔ مثال کے طور پر آج کل اینڈی کاٹ کا کھاتہ اس کے لیے دلچسپی کا باعث بنا ہوا تھا جس میں ڈیڑھ لاکھ ڈالر کی رقم جمع ہو چکی تھی۔

اینڈی کاٹ کی کہانی یہ تھی کہ سترہ سال پہلے اس نے ایک حسین و جمیل لڑکی سے شادی کی تھی، مگر اس نے ایک بچی کو جنم دینے کے بعد کسی اور سے تعلقات استوار کرلیے۔ اس بچی کا نام روزا رکھا گیا۔

اینڈی نے اپنی بیوی اور اس کے شناسا کو قتل کردیا اور بچی روزا کو لے کر فرار ہوگیا، مگر وہ کہاں گیا اور اس کا ٹھکانا کیا تھا یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ ان کے بارے میں متعدد افواہیں تھیں۔ یہ کہ اینڈی اپنی بچی روزا کے ساتھ شمالی امریکہ چلا گیا۔ دوسری افواہ یہ تھی کہ وہ مرگیا اور اب اس دنیا میں نہیں ہے۔

اس بات کو سترہ سال گزر چکے تھے اور ایک سال بعد ڈیڑھ لاکھ ڈالر حکومت کے حوالے کیے جانے تھے۔ فلپ نے دونوں باپ بیٹی کا سراغ لگانے کی کوشش کی لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔

کافی سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ یہ رقم حاصل کرنے کی کوشش کرے گا، اور کسی دوسری لڑکی کو روزا بنا کر پیش کردے گا۔ مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ لڑکی یتیم ہو۔ کم از کم ایک بات تو حقیقت سے ہم کنار ہو۔ پہلے اس نے سوچا کہ کسی فلاحی ادارے میں جائے وہاں سے یتیموں کے بارے میں معلوم کرنا آسان تھا لیکن اس

میں قباحت تھی کہ وہ عملے کی نگاہ میں آجاتا- کافی غور کرنے کے بعد اسے یاد آیا کہ ایک بیکری کا مالک یتیم ہے اور اس نے اپنے ہاں یتیم لڑکیاں رکھی ہوئی ہیں-

شام کو جب ڈیوٹی ختم ہوگئی تو وہ اپنی کار میں بیکری تک چلا گیا- وہاں چار لڑکیاں کام کر رہی تھیں- ان میں سے ایک دبلی پتلی لڑکی کے نقوش اسے روزا جیسے لگے- اس نے ننھی روزا کی تصویریں اخبارات کی فائل میں دیکھی تھیں اور وہ لڑکی بالکل اسی جیسی لگتی تھی- فلپ نے حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ اس کی عمر بھی تقریباً اتنی ہی ہے جتنی کہ اب روزا کی ہونی چاہیے-

بیکری پر لوگ کنفکشنری خرید رہے تھے اور اسے پیک کر وا رہے تھے- وہ بیس سالہ لڑکی مصروف دکھائی دی- اس کے بال سنہری تھے اور چہرے پر بے پناہ معصومیت تھی- جب دکان سے سارے گاہک چلے گئے تو فلپ اندر آگیا- اس نے ایک ڈبل روٹی خریدی اور پیسے اسی لڑکی کے ہاتھ میں دے کر آگیا، تاکہ وہ اسے یاد رکھ سکے-

باہر آکر وہ ایک درخت کے نیچے کھڑا ہوگیا اور لڑکی کے بارے میں غور کرتا رہا- نصف گھنٹے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ لڑکی اس کے لیے مناسب رہے گی، لیکن کام خطرناک تھا- اب یہ دیکھنا تھا کہ لڑکی اس پر آمادہ بھی ہوتی ہے یا نہیں-

دوسرے روز جب فلپ اپنی پرانی کار میں وہاں پہنچا تو اس نے لڑکی کو ایک خاتون سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا- جب وہ خاتون چلی گئی تو فلپ آگے بڑھا اور اس نے کل والی ڈبل روٹی کی تعریف کرکے کہا کہ وہ ایک ایسی روٹی روز اس کے لیے رکھ لیا کرے- ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد فلپ نے اپنا تعارف بھی کرا دیا- لڑکی نے باتوں ہی باتوں میں اپنا نام بتا دیا- وہ شرلے تھی-

چوتھے روز وہ ذرا تاخیر سے بیکری کی طرف گیا- بیکری اس وقت بند ہونے والی تھی- اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر نہایت شائستگی سے شرلے سے کہا- ”اگر تم برا نہ مانو تو میں تمہیں گھر چھوڑ سکتا ہوں- کیا تم میرے ساتھ چلنا پسند کروگی؟“

سنہرے بالوں والی لڑکی ہچکچائی پھر اس نے کہا- ”اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو میں چلنے کے لیے تیار ہوں-“

وہ راستے میں باتیں کرتے رہے- شرلے نے بتایا کہ وہ میاں بیوی جنہوں نے اسے گود لیا تھا؟ اب دنیا سے کوچ کر چکے ہیں، البتہ اس خاتون کی ایک بہن ابھی زندہ ہے جس نے اس کو پروان چڑھایا تھا- شرلے کو اس کے بارے میں یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں رہتی ہے- شرلے نے خیال ظاہر کیا کہ اس کی خالہ کو بھی اس کے بارے میں واجبی سی معلومات ہیں-

فلپ نے چند ہفتوں میں شرلے کے دل میں گھر کرلیا- وہ بھی اسے پسند کرنے لگی- پھر ایک رات فلپ نے اسے کھانے کی دعوت دی تو وہ انکار نہ کرسکی- پھر اس سے اگلے دن فلپ نے اسے تھیٹر چلنے کی دعوت دی- وہ جیسے جیسے شرلے کے قریب ہوتا جارہا تھا اس کا جوش و خروش بڑھ رہا تھا- فلپ نے اسے تاکید کردی کہ وہ اپنی کسی سہیلی سے اس کا تذکرہ نہ کرلے- شرلے نے اس پر تعجب کا اظہار کیا تو فلپ نے کہا کہ وہ وقت آنے پر سب کچھ بتا دے گا- احتیاطاً اس نے بیکری کی طرف جانا چھوڑ دیا تھا اور شرلے کے فلیٹ کی طرف وہ آج تک نہیں گیا تھا- وہ چاہتا تھا کہ اس کا منصوبہ نہایت احتیاط سے پایہ تکمیل کو پہنچ جائے-

شرلے اس کے بہت قریب آچکی تھی مگر فلپ کسی جذباتی لغزش سے بنا بنایا کھیل خراب نہیں کرنا چاہتا تھا- ایک شام وہ شرلے کو ایک خوب صورت پارک میں لے گیا- ایک جگہ گھنی جھاڑیوں میں جہاں تنہائی تھی وہاں اس نے شرلے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور سہلانے لگا- پھر فلپ نے اس کے گلابی رخساروں کا بوسہ لے لیا- اور اس نے سرگوشی کرنے والے انداز میں کہا- ”شرلے میں تمہیں بہت چاہتا ہوں- معلوم نہیں تم مجھ سے کتنی محبت

کرتی ہو- اگر کوئی حرج نہ ہو تو ہم آپس میں شادی کرلیں-“

شرلے کو یہ سن کر بہت خوشی ہوئی اور وہ کپکپاتی آواز میں کہنے لگی- ”میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہوسکتی ہے- میں اس شادی پر دل و جان سے تیار ہوں-“

فلپ نے اسے بازوؤں میں لے لیا اور پھر ملائم لہجے میں بولا- ”مگر میں اس وقت تک تم سے شادی نہیں کرسکتا جب تک کہ میرے مالی حالات بہتر نہ ہوجائیں- مجھے ابھی جو تنخواہ مل رہی ہے اس میں ہم خوش گوار زندگی نہیں گزار سکتے-“

”میں انتظار کرلوں گی فلپ-“ شرلے نے کہا-

فلپ نے غیر متعلق باتیں چھیڑ دیں اور پھر اسے اینڈی کاٹ کے کھاتے کے بارے میں بتایا- اس پر افسوس کا اظہار کیا کہ حکومت کی تحویل میں ڈیڑھ لاکھ ڈالر جانے والے ہیں- ”اگر یہ رقم ہمیں مل جائے تو کتنا اچھا ہو-“ وہ بولا-

”مگر وہ رقم ہمیں کیسے مل سکتی ہے؟“ شرلے نے گھبرا کر پوچھا-

”میں تمہیں روزا کاٹ کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتا ہوں- میں تمہیں ایسے کاغذات تیار کرا کے دوں گا کہ تم ان کے ذریعے خود کو روزا کی حیثیت سے پیش کرسکوگی-“

”نہیں فلپ- میں ایسا کوئی کام نہیں کرسکتی- یہ سب تو غیر قانونی ہے- اگر کہیں سے کچھ ظاہر ہوگیا تو پھر ہم دونوں کو سزا ہوجائے گی- میں نے جو رنگین سپنا دیکھا ہے وہ چکنا چور ہوجائے گا-“ وہ خوف زدہ آواز میں بولی- وہ معصوم ذہن کی مالک تھی اور اس نے کوئی مجرمانہ بات سوچی تک نہیں تھی اس لیے اس پر سراسیمگی طاری تھی-

”ہمت سے کام لو- ذرا سے حوصلے سے ہماری زندگی بدل سکتی ہے-“

”مگر میں ایسے کسی کام میں شریک نہیں ہوسکتی جو غیر قانونی ہو-“

”فلپ اس سے ناراضگی ظاہر کرنے لگا اور اس کی طرف سے منہ پھیر کر کھڑا ہوگیا- شرلے نے اسے بانہوں میں لے لیا اور اس کے رخساروں کو چومنے لگی- لیکن فلپ نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا اور سرد مہری ظاہر کی-

”غالباً اسی لیے تم نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں اپنی سہیلیوں سے اس کا تذکرہ نہ کروں-“

”ہاں- اسی وجہ سے- اس لیے کہ اس منصوبے پر ہماری باقی زندگی کا انحصار ہے- اگر تم ہمت سے کام لو تو مجھے یقین ہے کہ ہم لوگ اس میں ضرور کامیاب ہوجائیں گے-“

”مگر مجھے یقین نہیں ہے کہ ہم اس رقم کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکیں گے-“ شرلے نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا-

”تم میں اتنی ہمت و حوصلہ نہیں ہے تو ہم ایک ساتھ کیسے رہ سکیں گے؟ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ہماری شادی بھی نہیں ہوسکتی-“

”فلپ! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ شرلے نے روہانسی آواز میں کہا-

فلپ نے اپنی ناراضگی برقرار رکھی اور اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا- پھر وہ پانچ روز تک بینک سے سیدھا گھر آتا رہا اس نے شرلے سے ملنا ترک کردیا- چھٹے روز شرلے نے اسے فون کیا اور گلوگیر آواز میں کہا کہ اسے فلپ کی ہر بات منظور ہے اس کی جدائی گوارہ نہیں!

☆☆☆

سب سے پہلے فلپ نے ان خاتون کو تلاش کرنے کی کوشش کی جنہوں نے شرلے کو گود لیا تھا اور اس کی پرورش کی تھی، لیکن ان کے بارے میں کچھ پتا نہ چل سکا- وہ برسوں پہلے شہر چھوڑ کر چلی گئی تھیں-

اس طرف سے اطمینان حاصل ہونے کے بعد فلپ نے شہر کے سب سے بڑے جعل ساز کی خدمات حاصل

کیں اور اس سے کہا کہ وہ شرلے کا پیدائشی سرٹیفکیٹ تیار کرلے اور اس کے علاوہ خاندانی کاغذات۔

اس جعل ساز نے ایک ہفتے میں ایسے کاغذات تیار کردیے جن پر ماہر سے ماہر شخص بھی شبہ نہیں کرسکتا تھا۔

پھر فلپ نے شرلے کو ذہنی طور پر تیار کرنا شروع کردیا۔ اس سے کہا جب ایک خاتون نے اسے گود لیا تھا تو یہ دستاویزات مہربان عورت کے سپرد کردی گئی تھیں، مگر اسے اب تک ان کاغذات کا پتا نہیں چل سکا تھا۔ اس نے شرلے کو نہ صرف یہ کہ منصوبے کی تفصیل سے آگاہ کیا بلکہ اسے ریہرسل بھی کرائی۔

شرلے کو یہ تربیت دینے میں تین ہفتے لگ گئے۔ اس نے بتایا کہ روزا کس طرح بینک آکر اس دولت پر اپنا حق جتائے گی۔

ایک رات وہ شرلے کو اس کے فلیٹ پر پہنچانے گیا تو کار پارکنگ کے تاریک گوشے میں کھڑا ہوا بھاری تن و توش کا ایک شخص اچانک سامنے آگیا۔ فلپ اسے دیکھ کر گھبرا گیا اس نے فلپ کی طرف اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور کہنے لگا۔

''میں کئی گھنٹوں سے تمہارا انتظار کررہا تھا شرلے۔ تم اس آدمی کے ساتھ کہاں گئی تھیں؟''

''مجھے افسوس ہے کہ تمہیں انتظار کرنا پڑا جانسن۔'' شرلے نے ملائم لہجے میں کہا۔ ''تم طویل عرصے کے بعد آئے ہو اس لیے تم میں بہت تبدیلی آگئی ہے۔''

''جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے ویسے ویسے تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ تم سے ملاقات کرنے نہیں آؤں گا۔ اس لیے کہ میں ایک مفلس انسان ہوں لوگ مجھے تمہارے ہاں آتا جاتا دیکھتے ہوں گے تو یقیناً تمہیں شرمندگی ہوتی ہوگی۔ مگر مجھے تم سے ہمدردی ہے اس لیے میں بے اختیار ہوکر آجاتا ہوں۔''

''نہیں جانسن میں تمہاری آمد پر شرمندہ نہیں ہوتی۔'' شرلے نے اس کا شانہ تھپ تھپاتے ہوئے کہا۔

''مسٹر اس لڑکی کو ورغلانے اور دھوکا دینے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ میں تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گا۔ میں نے تمہاری کار کا نمبر نوٹ کرلیا ہے۔'' اس نے کہا۔

فلپ کو معلوم تھا کہ رجسٹریشن آفس سے وہ بھدا اور بدوضع شخص جسے شرلے نے جانسن کہہ کر مخاطب کیا تھا نہایت آسانی سے اس کا پتا معلوم کرلے گا۔

جب شرلے نے اس کا تعارف فلپ سے کرادیا تو اس نے خشک لہجے میں کہا۔ ''تم اس معصوم لڑکی کو کہاں لے گئے تھے؟''

''جانسن! اس سے ایسے لہجے میں بات مت کرو۔'' شرلے نے تیز آواز میں کہا۔ ''یہ میرا دوست بلکہ منگیتر ہے۔ ہم جلد ہی شادی کرنے والے ہیں۔''

''ٹھیک ہے تم اس سے شادی کرلو مگر تم نے اسے دھوکا دیا تو میں تم سے نمٹ لوں گا۔'' اس نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا پھر شرلے کی پیشانی پر بوسہ دے کر چلا گیا۔

''یہ جنگلی جانور کون تھا؟'' فلپ نے اس کے جانے کے بعد پوچھا۔

''یہ جانسن تھا میرے ڈیڈی کا دوست۔ وہ ڈیڈی جنہوں نے میری پرورش کی تھی۔ اس کا ذہنی توازن درست نہیں ہے مگر بے ضرر سا آدمی ہے اور میری دیکھ بھال کرتے رہنا چاہتا ہے۔''

''یہ کہاں رہتا ہے اور کیا کام کرتا ہے؟''

''یہ ایک آوارہ منش شخص ہے اور اس کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ دریا کے شمالی جانب جو کھنڈرات ہیں یہ وہاں رہتا ہے۔ شراب خانوں میں چھوٹے موٹے کام کرکے گزر بسر کرتا ہے۔ کبھی کبھار چوری کرلیتا ہے اور جب گرفتار ہوجاتا ہے تو چند ہفتوں کے لیے جیل کی ہوا کھاتا ہے۔''

فلپ نے شانے اچکائے اور اس بے ڈھنگے شخص کو فراموش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر جب بینک کی طرف سے مردہ کھاتوں کا اشتہار شائع ہونے والا تھا تو اسے جانسن کی طرف سے تشویش ہونے لگی۔ اس نے

جانسن کا ٹھکانا معلوم کرکے اسے دوست بنالیا اور تھوڑی بہت رقم اس کی جیب میں ڈالتا رہا۔ پھر اس نے ایک روز اس سے کہا کہ وہ شرلے سے شادی کرنے جارہا ہے اور اگر جانسن نے شرلے سے ملنا ترک نہیں کیا تو وہ بدنام ہوجائے گی۔

''تم کیا کرتے ہو؟''

''میں بینک میں ملازم ہوں۔''

''واہ! تب تو تم اسے دولت مند بنادو گے۔''

''ہاں۔ جب شرلے مجھ سے شادی کرلے گی تو اس کی زندگی خوش گوار ہوجائے گی۔''

''ٹھیک ہے میں تم لوگوں کی زندگی سے نکل جاؤں گا۔ لیکن تم اسے نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرنا۔''

فلپ اس سے ہاتھ ملا کر چلا آیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جانسن کا ریکارڈ خراب ہے اس لیے وہ پولیس کے پاس نہیں جائے گا۔

پھر اس نے شرلے کو آخری ریہرسل کرائی۔ دو روز بعد مردہ کھاتوں کا اشتہار اخبارات میں شائع ہوگیا تو اس نے شرلے کو ہدایت دی کہ دوسرے روز اسے بینک آنا ہے اور گارڈ سے آکر یہ کہنا ہے کہ وہ روزا کاٹ ہے۔ پھر یہ پوچھنا ہے کہ مردہ کھاتوں کا متعلقہ افسر کون ہے؟ گارڈ اسے فلپ تک پہنچادے گا۔

شرلے نے یہ شک ظاہر کیا تھا کہ ممکن وہ کانگر سے گفتگو کے دوران نروس ہوجائے۔ فلپ نے اسے تسلی دی کہ وہ ہر موقع پر اس کے قریب رہے گا۔ وہ اس کی ہدایت پر عمل کرتی رہے گی تو اسے کوئی پریشانی نہیں اٹھانا پڑے گی۔

شرلے کی ڈھارس بندھانے کے لیے اس نے کانگر کی طرف سے بہت سے سوالات کیے۔ اسے معلوم تھا کہ روز کانگر گیارہ بجے کے قریب اس کے کمرے میں آتا ہے۔ اس نے منصوبہ بنا رکھا تھا کہ وہ نادانستگی میں اس کی مدد کرے گا۔

☆☆☆

دوسرے روز صبح وہ آفس میں شرلے کا انتظار کررہا تھا۔ وہ مقررہ وقت پر اعتماد سے چلتی ہوئی آگئی۔ اس نے گارڈ سے بات کی تو گارڈ نے اسے فلپ کے پاس پہنچا دیا۔ فلپ بظاہر ایک فائل کی طرف متوجہ تھا۔ شرلے نے اعتماد سے اخبار کے اشتہار کی کٹنگ اس کے سامنے رکھ دی۔ پھر اینڈی کاٹ کے نام پر انگلی رکھ دی۔ اس نام کے سامنے ڈیڑھ لاکھ ڈالر کی رقم لکھی تھیں۔ کیا آپ اس اکاؤنٹ کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہیں؟'' فلپ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''جی۔ میرا نام روزا کاٹ ہے اور میں اینڈی کاٹ کی بیٹی ہوں۔''

''کیا واقعی آپ روزا کاٹ ہیں؟'' فلپ نے حیرت سے کہا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

شرلے نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے کاغذات اس کی طرف بڑھادیے۔ فلپ ان کاغذات کو اس طرح سے دیکھنے لگا جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہو۔ وہ ایک آدھ دو سوال بھی کرتا جارہا تھا۔ شرلے ان کے وہی جواب دے رہی تھی۔ جو اسے پیشگی بتائے گئے تھے۔

پھر کانگر ٹہلتا ہوا وہاں آیا تو فلپ نے اسے اپنے کمرے میں بلالیا۔ ''یہ مس شرلے میکلین ہیں۔'' اس نے سنجیدگی سے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ''ان کا کہنا ہے کہ اس نام سے ان کی پرورش کی گئی ہے۔ جب کہ اصل نام روزا کاٹ ہے۔''

فلپ کو معلوم تھا کہ اس انکشاف پر کانگر کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی جائیں گی۔ اور ایسا ہی ہوا۔ وہ شرلے کو یوں گھورنے لگا جیسے وہ مریخ کی مخلوق ہو۔ خاتون آپ کے پاس اپنی شناخت کے کاغذات ہیں؟'' اس نے سوال کیا تو شرلے نے فلپ کی میز پر پڑے کاغذات کی طرف اشارہ کردیا۔

کانگر نے وہ کاغذات اٹھالیے اور پھر کہا۔ ''آپ میرے ساتھ آیئے۔''

شرلے اس کے پیچھے وہاں سے چلی گئی۔

کانگر اسے بینک کے صدر مسٹر ہومز کے پاس لے گیا تھا- کچھ وقفے سے فلپ بھی وہاں چلا گیا- کانگر نے شرلے کا تعارف مسٹر ہومز سے کرایا اور اس کے بعد انکشاف کیا کہ وہ روزا کاٹ ہے-

مسٹر ہومز نے اپنی عینک کے شیشے صاف کیے اور پھر حیرت سے شرلے کی طرف دیکھا- پھر سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا- شرلے نے ان کے سامنے رٹی رٹائی کہانی سنادی- وہ فلپ کی ہدایت کے مطابق کسی سے متاثر نہیں تھی- انہوں نے شرلے سے کئی سوالات کیے- شرلے نے ان کے درست جوابات دیے- اس نے بتایا کہ اسے والدین کے نام ٹھیک سے یاد نہیں ہیں اس لیے کہ جب انہوں نے اسے گود لیا تھا تو اس کی عمر صرف تین سال تھی!

''اوکے! ہم آپ کے معاملات پر گفتگو کرتے ہیں اس وقت تک آپ مسٹر فلپ کے کمرے میں بیٹھیے؟'' مسٹر ہومز نے کہا-

شرلے نے اپنا پرس اٹھایا اور وہاں سے چلی گئی- مسٹر ہومز نے فلپ سے پوچھا- ''کیا لڑکی کے دعویٰ پر یقین کیا جاسکتا ہے؟''

فلپ اس جواب کی ریہرسل آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر کرچکا تھا- اسے معلوم تھا کہ جب وہ جواب دے گا تو بینک کے دو بڑے عہدے دار اسکے چہرے کے تاثرات دیکھ رہے ہوں گے- اس نے سنجیدگی سے کہا- ''پہلے ہمیں ان کاغذات کو چیک کرنا پڑے گا کہ یہ کس حد تک درست ہیں- یہ جعلی تو نہیں ہیں-''

''تم ٹھیک کہتے ہو-'' مسٹر ہومز نے کہا- ''ہمیں اس بارے میں تحقیق کرنا پڑے گی-''

کانگر نے شرلے کا پیدائشی سرٹیفکیٹ اٹھایا اور کہا- ''تمہارا کیا خیال ہے، یہ جعلی ہے؟''

''میرا کوئی خیال نہیں ہے- میں نے صرف ایک امکان ظاہر کیا ہے-'' وہ بولا- ''ہمیں یہ بھی پوچھنا چاہیے کہ یہ دستاویزات اس لڑکی تک کیسے پہنچیں؟ کیا وہ اخبارات میں اشتہار دیے جانے کا انتظار کررہی تھی؟ اسے یہ سب کاغذات اچانک کیسے مل گئے؟''

''اس کا کہنا ہے کہ اس کا اصلی نام روزا کاٹ ہے اور اس کے باپ کا نام اینڈی کاٹ تھا- اور یہ بات حال ہی میں اسے معلوم ہوئی ہے؟''

''مگر اس سے پہلے میں تحقیق کرچکا ہوں اور مجھے کوئی سراغ نہیں ملا-'' فلپ نے کہا-

''یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم نے غلط سمت قدم اٹھایا ہو-'' کانگر نے کہا-

کانگر کے اس اختلاف سے فلپ خوش ہوا کیوں کہ اس کی پوزیشن مضبوط ہوگئی تھی وہ جانتا تھا کہ جتنا وہ شرلے کی مخالفت کرے گا کانگر اس سے ذاتی خار بازی کی بنا پر شرلے کی حمایت کرنے لگے گا-

''اس لڑکی کو روزا کاٹ ثابت کرنے کے لیے یہ دستاویزات ناکافی ہیں-'' فلپ نے کہا- ''ڈیڑھ لاکھ ڈالر کا معاملہ ہے، ہمیں ہر طرح سے اطمینان کرلینا چاہیے-''

''ٹھیک ہے تم اپنی تفتیش جاری رکھو، اگر کوئی نئی بات سامنے آئے تو بتانا-'' مسٹر ہومز نے کہا-

''تم اس کیس پر وقت صرف کرو اور اس لڑکی کی حقیقت معلوم کرو-'' کانگر نے کہا- اس معاملے میں کوئی غلطی نہیں ہونا چاہیے-''

فلپ نے اطمینان کا سانس لیا- کیوں کہ اب وہ شرلے کے ساتھ آزادی سے گھوم پھر سکتا تھا- اس نے اپنا کام ختم کیا اور شرلے کے ساتھ باہر آگیا- اس روز وہ اس کے فلیٹ پر گیا اور اس نے فلیٹ کی مالکہ سے بھی بات کی- پھر شرلے نے اپنے خاندان کی چیزیں اسے دکھائیں اور دوسری دستاویزات جو فلپ نے پہلے ہی اسے دے رکھی تھیں-

''میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ اس بیکری تک چلیں جہاں کہ آپ کام کرتی تھیں-'' فلپ نے مالکہ مکان کے سامنے کہا-

شرلے اسے بیکری لے گئی جہاں فلپ نے اس کے ساتھیوں سے ملاقات کی- ان میں سے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ پہلے بھی وہاں آچکا ہے- پھر وہ شرلے کے ساتھ محکمہ صحت اور عدالت بھی گیا تاکہ ان دستاویزات کی تصدیق ہوسکے- شرلے جس محلے میں پلی بڑھی تھی- فلپ نے بہت سے لوگوں سے ملاقات کرکے بیانات لیے اور لوگوں سے دستخط کرائے- اس کے بعد اپنی رپورٹ مرتب کی-

دو گھنٹے بعد وہ شہر کے دور افتاد علاقے میں ایک چینی ریستوراں میں بیٹھے تھے- شرلے لرزتی آواز میں کہہ رہی تھی- ''فلپڈ ارمجھے ڈر لگ رہا ہے- کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم لوگ گرفتار ہوجائیں اور ہمیں سزا ہوجائے-''

''تم ناکامی کے بارے میں کیوں سوچنے لگتی ہو؟'' فلپ نے ناک سکیڑ کر کہا- ''مایوسی کو دل میں جگہ مت دو-''

پھر شرلے کئی مرتبہ بینک آئی اور فلپ نے اس سے وہاں گفتگو کی مگر یہ دھیان رکھا کہ ان کی گفتگو کوئی اور بھی سن سکتا ہے- پھر اس نے شرلے کو کانگر کے سامنے مشورہ دیا کہ اسے بینک میں اکاؤنٹ کھلوالینا چاہیے- فلپ نے اب بھی اس کی اصلیت پر شبہ ظاہر کیا تو کانگر نے جھنجھلا کر کہا- ''اب کیا رہ گیا ہے؟ ساری کارروائی تو مکمل ہوگئی- میں نے اس لڑکی کو روزا ناکاٹ کے طور پر تسلیم کرلیا ہے-''

پھر دو روز بعد یہ خبر مشہور ہوگئی کہ شرلے کا دعویٰ درست تسلیم کرلیا گیا ہے اور اس کے باپ کی دولت اس کے حوالے کردی جائے گی- اس روز شام کو اخباری نمائندوں اور میگزین کے مدیروں نے اسے گھیر لیا اور اس کے چہرے پر فلیش بلب کے جھماکے ہونے لگے- اس کی سینکڑوں تصاویر اتاری گئیں اور متعدد سوالات کیے گئے-

دوسرے روز کے اخبارات کے صفحہ اول اسی خبر سے بھرے ہوئے تھے- اور شرلے کی تصاویر نمایاں طور پر شائع کی گئی تھیں- فلپ ہیجان میں مبتلا تھا کہ اس مرحلے پر ایسی کوئی غلطی نہ ہوجائے کہ بھانڈا پھوٹ جائے- شرلے اگر نروس ہوگئی تو کام بگڑ جائے گا-

اس نے شرلے کو تسلی دی کہ جیسے ہی اس کے کھاتے میں رقم منتقل ہوگی وہ اس سے شادی کرلے گا- اس روز شام کو وہ شرلے کے فلیٹ پر گیا تو وہ موجود نہیں تھی مگر وہاں جانسن سے ملاقات ہوگئی جو پہلے سے بیٹھا تھا- ''تم یہاں کیوں آئے ہو؟'' فلپ نے بگڑ کر کہا-

''میں نے تمہیں تلقین کی تھی کہ تم شرلے کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا اور اس کی معصومیت ختم نہ کرنا لیکن تم نے وہی کچھ کیا-'' اس نے تنبیہی انداز سے کہا-

''رقم حاصل کرنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا جانسن-'' اس نے فوراً ملائم لہجے میں کہا- ''ورنہ میرے حالات ایسے نہیں ہیں کہ میں اس سے شادی کرسکوں-''

''وہ بھوکی تو نہیں مر رہی ہے- اور شادی کے لیے عمر پڑی ہے- اسے تم سے اچھے آدمی مل جائیں گے-''

''میں نے اصل روزا کو تلاش کرنے کی کوشش کی وہ نہ ملی تب میں نے شرلے کو روزا کی حیثیت سے پیش کرنے کا فیصلہ کیا ورنہ ایک معقول رقم حکومت کے کھاتے میں چلی جاتی- اب ہم ایک خوش گوار زندگی کا آغاز کریں گے-''

''تم نے ایک معصوم لڑکی کو مجرم بنادیا-'' جانسن نے سرد اور سفاک لہجے میں کہا اور اس نے جیب سے چاقو نکال لیا- ''میں نے اس کے والدین سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس کی دیکھ بھال کروں گا- اور شرافت کی زندگی گزارنے میں اس کی مدد کروں گا مگر تم نے ساری خوشیاں خاک میں ملادیں-''

''تم کیا چاہتے ہو؟'' فلپ نے سہم کر کہا-

''تم نے ایک جرم کیا ہے اس لیے میں اس کی سزا دینا چاہتا ہوں-'' اس نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا-

وہ خوف ناک انداز میں اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا- فلپ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور وہ پیچھے ہٹنے لگا- پھر جانسن نے اس پر حملہ کردیا فلپ مدافعت نہ کرسکا- اس کا اور جانسن کا کوئی

مقابلہ بھی نہیں تھا- اس نے اپنے پیٹ میں ایک شدید ٹیس اٹھتی محسوس کی کیوں کہ وہاں چاقو کا پھل پیوست ہوگیا تھا- جانسن نے چاقو نکالا اور ایک بار پھر اس کے پیٹ میں پیوست کردیا- فلپ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ تھام لیا- اس کی انگلیاں خون میں لت پت ہوگئیں-

جانسن جب اس فلیٹ سے نکلا تو فلپ فرش پر گر چکا تھا- جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ اسپتال میں تھا- مگر اس کے گرد جو لوگ کھڑے تھے وہ انہیں پہچان نہیں پا رہا تھا- کافی دیر بعد اس کی آنکھوں کی دھندلاہٹ دور ہوئی- اس کے سرہانے ایک نرس اور ڈاکٹر تھے- دائیں جانب کانگر، شرلے کے ساتھ کھڑا تھا- شرلے کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں- اس کے علاوہ ایک پولیس والا بھی تھا-

اچانک شرلے نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور گلوگیر آواز میں بولی- ''فلپ!''

فلپ کو محسوس ہوا کہ اس کا آخری وقت قریب آ گیا ہے- وہ نقاہت محسوس کر رہا تھا- پولیس آفیسر اس کے قریب آیا اور اس نے کہا- ''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ پر قاتلانہ حملہ کس نے کیا ہے؟''

فلپ اسے جانسن کا نام بتانے والا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اس طرح سے ساری باتیں منظر عام پر آ جائیں گی- ''معلوم نہیں وہ کون تھا- فلیٹ میں بہت تاریکی تھی-'' اس نے مبہم سا جواب دیا- پھر پولیس آفیسر نے کئی بار اپنا سوال دہرایا مگر فلپ نے اپنی زبان نہیں کھولی-

جب سب چلے گئے اور کانگر اور شرلے وہاں تنہا رہ گئے تو کانگر نے کہا- ''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ صورت حال اتنی سنگین ہو جائے گی تو میں معاملے کو آگے نہ بڑھنے دیتا-''

''کیا مطلب؟'' فلپ نے نقاہت سے پوچھا-

''میں نے اس معاملے کی تفتیش کے لیے ایک پرائیویٹ سراغرساں کی خدمات حاصل کی تھیں- اس نے پتا لگا لیا کہ تم شرلے کو پہلے سے جانتے تھے- یعنی جب اس نے روزا کاٹ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا- اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ یہ منصوبہ تمہارا تیار کردہ تھا- تم نے ہی اسے تربیت دی تھی- دوسرے یہ کہ جس خاتون نے شرلے کی پرورش کی تھی اس کی بہن ہمارے پاس آئی تھی- مگر یہ بات ہم نے تم سے چھپائی- راس نے ایک حیرت انگیز بات بتائی-''

''وہ کیا؟''

''شرلے حقیقت میں روزا کاٹ ہی ہے- اور اس کا اس کے پاس ٹھوس ثبوت تھا-''

فلپ نے قہقہہ لگایا مگر آواز حلق سے نہ نکل سکی- وہ اٹھ کر بیٹھنا چاہتا تھا مگر یہ بھی ممکن نہ ہوا- اس نے کہا- ''تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''ہاں- یہ بات اس کی خالہ کو معلوم تھی کہ مسٹر اینڈی کاٹ نے روزا کو مسٹر میکلین اور اس کی بیوی کے سپرد کیا ہے- اس نے مسٹر میکلین کو بھاری رقم بھی دی تھی پھر اس کے بعد وہ شمالی امریکا چلا گیا اور وہاں سے لوٹ کر نہیں آیا- اس نے میکلین کو کوئی خط بھی نہیں لکھا-''

''اس شہر میں لاکھوں لڑکیاں ہیں-'' فلپ نے کہا-

''میں نے اتفاق سے اصل روزا کا انتخاب کیسے کرلیا؟''

''یہ حسن اتفاق ہے- چوں کہ تم نے اینڈی کی لڑکی کی تصویریں غور سے دیکھی ہیں اس لیے اس کا سراپا تمہارے ذہن میں جم گیا- اس کی ساری جزئیات تمہاری آنکھوں میں بسی ہوئی تھیں اس لیے جب تم نے بیکری پر کام کرنے والی لڑکیوں کو دیکھا تو ان میں سے اصل روزا کا انتخاب کرلیا- بہرحال اب اس کی دولت اسے ملنے والی ہے اور تم کو مات ہو چکی ہے-''

درد کی ایک لہر فلپ کے بدن میں اٹھی اور وہ کانپنے لگا- واقعی اسے مات ہو چکی تھی اس لیے کہ وہ فرشتہ اجل کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سن رہا تھا- صرف چند لمحوں کی بات تھی پھر اس کی روح پرواز کر جاتی- وہ آخری سانسیں لے رہا تھا.....

☆☆☆

نیا لباس

وہ ایسے پاجی انسان کے قابل نہیں تھی۔ بلکہ مسٹر فوسٹر نے یہ واقعہ سنتے ہی اس سے شادی کی درخواست کردی جو قبول کرلی گئی اور اس کے بعد ڈورا ایک متمول شریف خاتون کی طرح آرام و آسائش سے اپنی زندگی بسر کرنے لگی جو اسے برٹ کے ہاں قیامت تک بھی نہ مل سکتی تھی

ایک دلچسپ تحریر

ڈورا حسین تھی۔ گو اس کے جسم کی نزاکت اور رنگت کی زردی، بری خوراک اور تنگ کمروں کی رہائش نے اس کے حسن کو دبا رکھا تھا۔ اگر اسے اچھا لباس میسر آتا اور ارغوانی شراب کے ایک دو جام اس کی رگوں میں رقصاں حرارت بیدار کرسکتے تو اس کا حسن ضرور چمک اٹھتا۔

کارخانے کا جونیئر پارٹنر اس کی کمزور حالت کو دیکھ کر اکثر مایوس ہو جاتا ہے۔ جب وہ اس کے سامنے بیٹھ کر زرد زرد ہاتھوں سے کاغذ پر لکھتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ تیز دوڑنے والی تیتریاں کاغذ پر رقص کر رہی ہیں۔ وہ اس کے کام کو دیکھ کر زیر لب مسکرانے لگتا تھا۔

ڈورا سے سات آدمی شادی کی درخواست کر چکے تھے جن میں سے تین معزز نوجوان تھے۔ لیکن آٹھواں آدمی ایک ایسا خوش بخت انسان تھا۔ جسے ڈورا نے پسند کرلیا اور ان کی شادی ہوگئی۔

یہ مسٹر برٹ تھے جو گھڑ دوڑ کے میدان میں جوکیوں سے ساز باز کر کے روپیہ پیدا کرتے تھے۔ جب یہ جوڑا گرجے سے باہر نکلا تو مسٹر برٹ نے ایک دو بار اس فرسودہ کوٹ پر نظر ڈالی جو ڈورا پہنے ہوئے تھی۔ جب وہ گھر پہنچے تو اس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ''تمہیں کپڑوں کی ضرورت ہے ڈورا! آج لڑکیاں تمہارے لباس پر نکتہ چینی کر رہی تھیں۔''

کیا وہ اپنی بیوی کے لیے کچھ خریدنا نہیں چاہتا تھا۔ یا وہ قلاش تھا۔ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا؟ ڈورا کی تنخواہ صرف ۱۵ شلنگ ہفتہ وار تھی۔ اس تنخواہ میں وہ نیا لباس کیسے خرید سکتی تھی!

ڈورا ہر روز دفتر جاتے وقت اس نیلے لباس کی طرف لالچ بھری نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ جو ایک مشہور دکان کی کھڑکی میں لٹکتا ہوا نظر آیا کرتا تھا۔ اس کی خوابوں کی دنیا میں یہ نیلا حسین لباس ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔

زمانہ سرعت سے گزرتا جاتا ہے۔ ان کی شادی کو بھی چند ہفتے ہو چکے تھے۔ ایک دن جمعرات کو اسے برٹ کا خط ملا جس میں اس نے بتلایا تھا کہ وہ ہفتے کے دن اسے کھانے پر لے جانا چاہتا ہے۔ جہاں اس کے چند معزز دوست بھی ہوں گے۔ اس کے بعد سینما چلنا ہوگا۔

بشرطے کہ وہ مناسب لباس پہن کر آئے۔ اس کی ہمشیرہ اکثر سیکنڈ ہینڈ مال خرید کر پہن لیتی ہے۔ اور کیسی باعزت معلوم ہوتی ہے۔

وہ یہ خط پڑھ رہی تھی کہ مسٹر فوسٹر جونیئر پارٹنر نے طلبی کی گھنٹی بجائی۔

وہ کیوں نہ مسٹر فوسٹر سے کچھ قرض لے لے۔ وہ کبھی کبھی ایسے انداز میں اس کی طرف دیکھا کرتا ہے۔ گویا وہ اسے پسند کرتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ وہ انکار نہیں کرے گا۔ اگر وہ لنچ نہ کھایا کرے اور کچھ زائد وقت دفتر کا کام کرے تو یہ قرضہ اتر سکتا ہے۔

جب وہ جونیئر پارٹنر کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ اس کو دیکھ کر متعجب ہوا۔ کیونکہ ہیجانِ جذبات کے ماتحت اس کے رخساروں پر گلاب کی پتی کی سی سرخی جھلک رہی تھی۔ اور اس کے ہونٹوں میں بدخشانی رنگ کروٹیں لے رہا تھا۔ اس نے اس کی مقررہ نشست پر اسے بیٹھنے کو کہا اور خود کاغذات دیکھنے بھالنے لگا..... یکایک وہ اس کی طرف جھک گئی۔ ''مسٹر فوسٹر مجھے کچھ روپے قرض چاہئیں؟''

مسٹر برٹ ہفتے کے دن اپنی بیوی ڈورا کو سرج کے نئے نیلے سوٹ میں دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ وہ نئے لباس اور چمکیلے جوتوں میں کیسی حسین معلوم ہوتی تھی۔ اس نے سر سے لے کر پاؤں تک اسے بہ غور دیکھا۔ مگر تعریف و توصیف کی بارش کی پشت پر شک و شبے کے بادل بھی منڈلانے لگے تھے۔

ڈورا نے کہا کہ میں نے اسے سیکنڈ ہینڈ خریدا ہے۔ اور اس کی آنکھیں اس کے سامنے خم نہ ہوئیں۔ ''اچھا یہ بات ہے؟'' برٹ نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا! انہوں نے دوستوں سمیت ایک اچھے ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا۔ وہ اپنی بیوی کا اتنا متوالا کبھی نظر نہ آیا تھا۔ مگر صرف اس نئے لباس کے طفیل جو وہ پہنے ہوئے تھی۔ برٹ نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ ''آؤ اب چلیں تماشے کا وقت ہو رہا ہے۔''

کوٹ پہناتے وقت۔ اس کی نگاہ اس فیتے پر پڑی۔ جس پر لباس بنانے والوں کا پتہ درج ہوتا ہے۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ جب اس نے فرم کا پتا پڑھا۔

''اچھا یہ ہے تمہارا سیکنڈ ہینڈ بیچنے والا کارخانہ جس شخص نے اس فراک کی قیمت ادا کی ہے۔ اس کو تم نے کیا دیا؟''

''برٹ!'' ڈورا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ''یہ جھوٹ ہے!''

برٹ نے چلا کر کہا۔ تمہارے پاس پہننے کو چیتھڑے بھی نہیں تھے اور آج تم ایک شہزادی کی طرح ملبوس ہو۔ یہ سیکنڈ ہینڈ مال ہے نا!

''برٹ! میں قسم کھاتی ہوں۔'' وہ اس دیوار کو سچائی سے گرانا چاہتی تھی۔ جو برٹ اپنی حماقت کے طفیل اس کے اردگرد بنا رہا تھا۔ ''یہ سب کچھ تمہارے لیے تھا۔ تمہارے حکم کی تعمیل میں۔ تاکہ میں تمہیں اور تمہارے دوستوں کو حسین نظر آؤں۔ اس کی تہ میں کوئی راز نہیں۔ مسٹر فوسٹر میرے مالک نے یہ روپے مجھے قرض دیے اور مجھ سے کہا کہ جب تمہارے پاس ہوں تو واپس دے دینا۔ میں تھوڑا تھوڑا واپس انداز کر رہی ہوں۔ تاکہ یہ قرض اتار دوں۔''

''اچھی کہانی ہے ڈورا۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا خیال ہے کہ میں اس سفید جھوٹ پر اعتبار کر لوں گا۔ میں اس قسم کا مرد نہیں ہوں۔ اچھا تم اپنے فوسٹر کے پاس جا سکتی ہو۔ میں کل تمہیں طلاق بھیج دوں گا۔''

ڈورا پریشان حال واپس آئی' اس نے خوب صورت نیلا لباس اتار کر رکھ دیا۔ صبح اسے ایک رجسٹرڈ لفافے میں طلاق کاغذ بھی مل گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ لیکن اس کی قسمت ہنس رہی تھی۔ وہ ایسے پاجی انسان کے قابل نہیں تھی۔ بلکہ مسٹر فوسٹر نے یہ واقعہ سنتے ہی اس سے شادی کی درخواست کر دی جو قبول کر لی گئی اور اس کے بعد ڈورا ایک متمول شریف خاتون کی طرح آرام و آسائش سے اپنی زندگی بسر کرنے لگی جو اسے برٹ کے ہاں قیامت تک بھی نہ مل سکتی تھی۔

☆☆☆

دلدل

الف صدیقی

معاشرے کی بھرپور عکاسی کرتی ایک خوبصورت تحریر

ہاں۔ارشاد نے کہا۔اس لیے ہمیں ہوشیار ہو جانے کی ضرورت ہے۔میرا خیال ہے کہ ہم لوگ ایک ایک ریوالور ہاتھ میں ضرور لے لیں۔

ان سب لوگوں نے ارشاد کی ہدایت پر عمل کیا اور ایک ایک ریوالور اپنے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

جلوس آہستہ آہستہ آگے بڑھتا جا رہا تھا اور اب وہ کافی قریب آ گیا تھا۔اب چارپائی نظر آ رہی تھی۔

اور پھر انہوں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔

چارپائی کے اوپر کوئی لیٹا ہوا تھا۔لیکن اس طرح کہ اس کا پورا جسم ایک چادر سے ڈھکا ہوا تھا..... سر سے پاؤں تک چادر ہی چادر تھی، جیسے کسی لاش کو چادر سے ڈھانک دیا گیا ہو۔

یہ..... یہ تو..... یہ تو کوئی لاش معلوم ہوتی ہے۔ارشاد نے پرتشویش انداز میں آہستہ سے کہا۔

ہاں استاد۔شرفو نے غور سے چارپائی پر پڑے ہوئے جسم کو دیکھتے ہوئے کہا۔کوئی لاش ہی معلوم ہوتی ہے۔

اتنی رات گئے..... یہ لوگ لاش کو لے کر کہاں جا رہے ہیں۔رحمت علی نے کہا۔یہ تو کوئی بڑا پراسرار معاملہ معلوم ہوتا ہے۔

یہ اگر واقعی کوئی لاش ہے تو پھر یہ یقیناً قتل کی واردات ہوگی۔ارشاد نے سرگوشی میں کہا۔یہ لوگ لاش کو دفنانے کے لیے لے جا رہے ہیں۔

بالکل..... بالکل یہی بات ہے استاد۔فیضو نے جلدی سے کہا۔ان لوگوں نے کسی آدمی کو مار دیا ہے اور اب اس کی لاش کو دفنانے کے لیے لے جا رہے ہیں۔

یہ صرف پانچ آدمی ہیں۔رحمت علی نے کہا۔اس سے مزید یہ شبہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے کسی کو قتل کیا ہے اور اب خاموشی سے اس کی لاش ٹھکانے لگانے کے لیے جا رہے ہیں۔اگر باقاعدہ تدفین ہوتی تو اس میں بہت سے لوگ شریک ہوتے۔

اور باقاعدہ تدفین اگر ہوتی تو وہ آدھی رات کے بعد، اندھیرے میں چوروں کی طرح نہ ہوتی۔فیضو نے کہا۔مرنے والے کو دن کے اجالے میں سب کی نظروں کے ساتھ دفن کیا جاتا۔

جلوس جنازہ ان لوگوں کے قریب پہنچ گیا تھا اور پھر ان سبھوں نے محسوس کیا کہ چلنے والوں کی رفتار دھیمی پڑ گئی ہے۔وہ لالٹین کی روشنی میں ادھر ادھر کا جائزہ لے رہے تھے۔ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کوئی چیز تلاش کر رہے ہوں۔لیکن اس اندھیری رات میں وہ کیا تلاش کر رہے تھے۔

ان چاروں پر ایک عجیب سی تشنجی کیفیت طاری تھی۔وہ غور سے ان لوگوں کی اس نقل و حرکت کو دیکھ رہے تھے اور زیادہ قریب آ جانے کی وجہ سے وہ ان لوگوں کو زیادہ صاف طور پر دیکھ سکتے تھے۔

اچانک وہ جلوس جنازہ ایک جگہ ٹھہر گیا اور ان لوگوں نے چارپائی کو کندھوں سے اتار کر نیچے رکھ دیا۔

چارپائی کو فرش پر رکھنے کے بعد، ان لوگوں نے چارپائی کے اوپر رکھی ہوئی دو کدالیں اٹھالیں اور ارد گرد کی زمین کا جائزہ لینے لگے۔

چارپائی کے پائے سے بندھی ہوئی لالٹین کو پائے سے کھول کر ایک اونچے سے پتھر پر رکھ دیا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ سارا منظر زیادہ روشن اور واضح ہو گیا تھا۔

پھر انہوں نے ایک جگہ کا انتخاب کیا اور وہاں کھدائی شروع کر دی۔

دو آدمی بہ یک وقت کھدائی کر رہے تھے اور تیسرے آدمی نے کھدی ہوئی مٹی کو ایک بیلچے کی مدد سے باہر نکال کر ایک طرف ڈھیر کرنا شروع کر دیا تھا۔ دو آدمی ان کے پاس ہی کھڑے ہوئے تھے۔

جہاں وہ لوگ کھدائی کر رہے تھے، وہ جگہ پتھریلی نہیں تھی، بلکہ وہاں نسبتاً نرم مٹی تھی اور اس نرم مٹی میں کچھ چھوٹے بڑے پتھر بھی ملے ہوئے تھے، جنہیں وہ آدمی بیلچے سے ایک طرف کرتا جا رہا تھا۔ اس کا کام بھی خاصا مشکل تھا۔ لیکن اصل محنت تو کھدائی کرنے والے کر رہے تھے۔

کافی کھدائی ہو چکی تھی کہ انہوں نے کام روک دیا۔ لیکن اصل میں کام رکا نہیں تھا، بلکہ کام کرنے والے ہاتھ بدل گئے تھے۔ اب ان دوسرے دو آدمیوں نے کدالیں سنبھال لیں جو کہ ابھی تک خالی کھڑے ہوئے تھے اور انہوں نے کھدائی شروع کر دی۔ پہلے والے دونوں آدمی ستانے لگے۔

وہ چاروں، خاموشی سے اس ساری کارروائی کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے لیے یہ سب کچھ بہت پراسرار بھی تھا اور حیرت انگیز بھی..... رات کے اس پچھلے پہر میں، ایک بالکل سنسان اور ویران جگہ میں، ایک قبر کھودی جا رہی تھی..... کسی نامعلوم لاش کو دفن کرنے کے لیے..... کسی بھیانک جرم کی پردہ پوشی کرنے کے لیے۔

ان لوگوں نے کوئی بہت زیادہ گہرا گڑھا نہیں کھودا۔ اتنا گہرا بالکل نہیں کھودا جتنی گہری کوئی باقاعدہ قبر کھودی جاتی ہے۔ مٹی نکالنے والے آدمی نے بیلچے سے ساری کھدی ہوئی مٹی باہر نکال لی تھی۔

انہوں نے آہستہ آہستہ آپس میں کچھ باتیں کیں، جنہیں ارشاد اور اس کے ساتھی سن نہیں سکے، کیونکہ فاصلہ زیادہ تھا۔ تاہم، رات کے گہرے سناٹے میں آوازوں کی کچھ بھنبھناہٹ ان کے کانوں تک آ رہی تھی، لیکن الفاظ واضح نہیں تھے۔

پھر وہ لوگ چارپائی کے پاس آئے اور چارپائی کو اٹھا کر اس تازہ کھدی ہوئی قبر کے بالکل قریب لے گئے۔

ایک آدمی نے کدال کی نوک کی مدد سے چارپائی پر پڑے ہوئے جسم کے چہرے پر سے کپڑا ہٹایا۔ یہ بڑا عجیب و غریب عمل تھا۔ اس شخص نے چادر کو ہاتھ سے ہٹانے کے بجائے، کدال کی نوک سے ہٹایا تھا۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ لوگ مقتول سے شدید نفرت کرتے تھے۔ اتنی زیادہ نفرت کہ وہ اس کی لاش کے چہرے پر سے کپڑا ہٹانے کے لیے اپنا ہاتھ بھی استعمال نہیں کرنا چاہتے تھے۔

اس شخص نے کدال کی نوک سے لاش کے چہرے پر سے کپڑا ہٹایا اور دوسرے آدمی نے لالٹین ہاتھ میں لے کر اس طرح ذرا اوپر اٹھائی کہ لاش کے چہرے پر روشنی پڑنے لگی۔

لاش کے چہرے پر ایک گھنی کھچڑی داڑھی کے علاوہ اور کوئی چیز صاف طور پر نظر نہیں آ رہی تھی۔ گھنی کھچڑی داڑھی اس طرح اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی کہ اس نے اس کے سارے چہرے کو تقریباً ڈھانپ لیا تھا اور اس کے خدوخال واضح نظر نہیں آ رہے تھے۔

ذرا دیر تک اس لاش کا چہرہ کھلا رہا اور وہ لوگ اس کو دیکھتے رہے۔ اس کے بعد اس شخص نے اسی طرح، کدال کی نوک سے، چادر کے کونے کو اس کے چہرے پر ڈال دیا۔

ارشاد اور اس کے ساتھیوں نے اس بات کو فوراً ہی محسوس کر لیا تھا کہ اس لاش کو کفنایا نہیں گیا تھا۔ اس کے جسم پر کفن نہیں تھا، بلکہ شاید عام لباس ہی تھا۔ اگر کفن ہوتا تو چہرہ بھی کفن کے اندر ہونا چاہیے تھا۔ لیکن چہرے پر کفن نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ باقی جسم پر بھی کفن نہیں تھا۔ لاش پر جو چادر پڑی ہوئی تھی۔ وہ بھی لٹھے کی کوئی سفید چادر نہیں تھی، بلکہ ایک میلی کچیلی، پرانی اور بوسیدہ سی چادر معلوم ہو رہی تھی۔

چار آدمیوں نے چارپائی پر پڑی ہوئی لاش کو، جو کہ ایک چادر کے اوپر تھی، اس طرح اٹھایا کہ ان میں سے ہر ایک نے چادر کا ایک کونا پکڑ لیا اور پھر لاش کو چادر سمیت اٹھا لیا۔ پانچویں آدمی نے لاش کی کمر کے نیچے بیلچے سے سہارا دیا اور اس کو دہرا ہو کر مڑ جانے سے بچایا۔

عجیب و غریب منظر تھا! چار آدمی، چادر پر پڑی ہوئی ایک لاش کو اٹھا کر لے جا رہے تھے اور پانچویں آدمی نے لاش کو کمر کے نیچے سے بیلچے سے سہارا دیا ہوا تھا۔ اس طرح لاش کو سیدھا رکھا تھا۔

وہ چاروں افراد لاش کو قبر کے بالکل اوپر لے آئے۔ چارپائی قریب لے آنے کے باعث ان کو زیادہ چلنا نہیں پڑا تھا۔

قبر کے اوپر پہنچ کر انہوں نے آہستگی کے ساتھ لاش کو قبر کے اندر ڈال دیا۔ یہ دفن کرنے والا انداز بالکل نہیں تھا۔ میت کو تو بڑی احتیاط کے ساتھ قبر کے اندر اتارا جاتا ہے اور اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ میت کو قبر میں، پیٹھ کے بل، بالکل سیدھا لٹا دیا جائے۔ اس غرض سے عام طور سے دو آدمی پہلے سے قبر کے اندر اتر جاتے ہیں اور وہ میت کو نیچے لانے میں سہارا دیتے ہیں۔

لیکن یہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔ ان لوگوں نے میت کو قبر میں اتارتے ہوئے کوئی خاص احتیاط نہیں برتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی نہ کسی طرح اس لاش کو گڑھے میں پھینک کر اپنی جان چھڑا لینا چاہتے ہوں۔ انہوں نے اس لاش کو چادر سمیت گڑھے کے اندر گرا دیا اور شاید اس بات کی کوئی فکر بھی نہیں کی کہ لاش قبر میں سیدھی پڑی ہے یا نہیں۔

اس کے فوراً ہی بعد انہوں نے بیلچے کی مدد سے گڑھے میں مٹی واپس ڈالنا شروع کر دی۔

ارشاد کا دل کانپ اٹھا۔

یہ تدفین کا بھلا کون سا طریقہ تھا۔ ان لوگوں نے کوئی قبر نہیں کھودی تھی۔ ان لوگوں نے تو محض ایک گڑھا کھودا تھا اور اس مقتول کی لاش کو اس گڑھے میں پھینک کر اب اوپر سے مٹی ڈال رہے تھے۔

کوشش کر کے ان پانچوں کی شکلیں پہچان لو۔ ارشاد نے اپنے ساتھیوں سے بہت ہلکی سرگوشی میں کہا۔ اگرچہ روشنی بہت کم ہے۔

اس نے خود بھی ان پانچوں کے چہروں کو خوب غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ ان کے چہروں کے نقوش کو بہت اچھی طرح اپنے دل و دماغ میں بٹھا لینا چاہتا تھا۔

اس نے ایک ایک کر کے ان سب کی شکلوں کو اپنے دماغ میں محفوظ کر لیا۔ اس کے دوسرے ساتھی بھی یہی کام کر رہے تھے۔

ان لوگوں نے جلدی جلدی گڑھے کو مٹی سے بھر دیا اور پھر اس کے اوپر مزید مٹی ڈال دی۔ مٹی ڈالنے کے بعد انہوں نے اس ڈھیر پر بہت سے پتھر بھی رکھ دیے۔ اب یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہاں کسی لاش کو دفن کیا گیا ہے اور اس جگہ کوئی قبر ہے۔ بس پتھروں کا ایک ڈھیر تھا اور اس علاقے میں تو پتھروں کے ایسے ڈھیر جا بہ جا موجود تھے۔

تدفین مکمل ہو گئی تو پھر ایک اور ناقابل یقین اور حیرت انگیز منظر دیکھنے میں آیا۔

وہ پانچوں افراد قبر کے گرد ادھر ادھر کھڑے ہو گئے

اور انہوں دعا کے انداز میں ہاتھ اٹھا دیے۔ ان میں سے ایک نے بہ آواز بلند فاتحہ پڑھنی شروع کر دی۔

وہ پانچوں فاتحہ پڑھ رہے تھے..... لالٹین کی مدھم روشنی میں یہ بڑا ہی پراسرار اور ناقابل فہم قسم کا منظر معلوم ہوتا تھا۔ ایک مٹی کے ڈھیر کے پاس، جسے بہ مشکل ہی ایک قبر کہا جا سکتا تھا، ایک خالی چارپائی پڑی ہوئی تھی اور پانچ آدمی اس قبر کو گھیرے کھڑے تھے۔ وہ پانچوں ہاتھ اٹھائے ہوئے فاتحہ پڑھ رہے تھے۔

ارشاد اور اس کے ساتھیوں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ بہت ہی حیران کن بات تھی..... یہ لوگ، جو اس انسان کے قاتل تھے جسے انہوں نے ہلاک کر کے، رات کی تاریکی میں یہاں ویرانے میں لا کر خاموشی سے دفن کر دیا تھا، اب اس کو دفن کر دینے کے بعد اس کے لیے فاتحہ بھی پڑھ رہے تھے۔

فاتحہ خوانی اپنے اختتام کو پہنچی اور ان لوگوں نے واپسی کی تیاری شروع کر دی۔ اس مرتبہ وہ زیادہ ہلکے ہو چکے تھے۔ چارپائی خالی تھی۔

!ان میں سے ایک نے چارپائی کو اٹھا کر اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ دوسرے آدمی نے ایک کدال ہاتھ میں لے لی، تیسرے نے دوسری کدال اور چوتھے آدمی نے ایک ہاتھ میں بیلچہ اٹھا لیا۔ پانچویں آدمی نے لالٹین ہاتھ میں تھام لی اور اس کے بعد وہ مختصر سا قافلہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

راستے کی سمت کو ذہن میں رکھو۔ ارشاد نے اپنے ساتھیوں سے سرگوشی کی۔ ہم کل دن میں اس بستی میں پہنچنے کی کوشش کریں گے جہاں سے یہ لوگ آئے ہیں۔

وہ سب لوگ اس جاتے ہوئے قافلے کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر تک نظر آتے رہنے کے بعد وہ منظر اب آہستہ آہستہ دھندلا ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک بار پھر وہ ایک نقطے میں تبدیل ہو گیا اور وہ نقطہ ٹمٹمانے لگا۔ ٹمٹماتے ہوئے، وہ اور زیادہ دور ہوتا جا رہا تھا۔

ان لوگوں کی واپسی اسی سمت میں ہو رہی تھی جدھر سے وہ آئے تھے۔ ارشاد اور اس کے ساتھی غور سے اس طرف دیکھ رہے تھے۔ سمت کے صحیح تعین کے لیے اور سمت کو یاد رکھنے کی غرض سے انہوں نے ایک بار پھر دوربینوں کا سہارا لے لیا تھا۔

وہ لوگ تقریباً کسی طرف مڑے نہیں تھے اور سیدھے ہی چلے گئے تھے۔ جب تک روشنی کا وہ نقطہ نظر آتا رہا، ارشاد اور اس کے ساتھی اسے دوربینوں کی مدد سے دیکھتے رہے۔ پھر وہ تاریکی میں کہیں جا کر گم ہو گیا۔ کم ہوتے ہوتے وہ بالکل ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

وہ لوگ سامنے، سیدھے ہی گئے ہیں۔ نقطے کے نظروں سے اوجھل ہو جانے کے ساتھ ہی رحمت علی نے کہا۔ اس طرف ضرور کوئی آبادی ہو گی۔ یہ لوگ اسی آبادی کی طرف سے یہاں آئے تھے۔

اس آبادی کو ڈھونڈ نکالنا کوئی ایسا زیادہ مشکل کام نہیں ہو گا۔ شرفو نے کہا۔ صرف یہ ہے کہ تھوڑی سی محنت کرنی ہو گی۔ ذرا ادھر ادھر چلنا پھرنا ہو گا۔ ہم اس جگہ کو ڈھونڈھ نکالیں گے۔

لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ اس نامعلوم بستی کی تلاش میں ہم شیر خاں کے ٹھکانے کا راستہ بھلا بیٹھیں۔ ارشاد نے کہا۔

نہیں استاد۔ فیضو نے بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ ایسا نہیں ہو گا۔ میں نے شیر خاں کے ٹھکانے کے پتے کو تو اپنے دل پر لکھ رکھا ہے۔ اس کو میں نہیں بھول سکتا۔

ٹھیک ہے، پھر صبح دیکھیں گے۔ ارشاد نے کہا۔ اب تم اور رحمت علی سو جاؤ..... تمہاری تو سونے کی باری ہے۔ تمہیں زبردستی نیند سے جگانا پڑا۔ اب سو جاؤ۔

رات کافی گزر چکی تھی اور صبح ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں تھی۔ رحمت علی اور فیضو لیٹ گئے اور سونے کی

کوشش کرنے لگے۔ ذرا دیر میں ان کو نیند آ گئی۔ ارشاد اور شرفو جاگتے رہے اور سرگوشیوں میں اس واقعے کے بارے میں قیاس آرائیاں کرتے رہے جو ابھی کچھ دیر پہلے پیش آیا تھا۔

وہ دونوں پوری طرح محتاط تھے اور ان کی نگاہیں بار بار اس طرف اٹھ جاتی تھیں جدھر ان لوگوں نے وہ لاش دفن کی تھی۔ شاید کوئی اور شخص یا اشخاص اس لاش کی تلاش میں وہاں آن پہنچیں..... شاید..... کوئی اور واقعہ رونما ہو جائے۔ لیکن پھر کوئی نہیں آیا۔ آس پاس، دور ونزدیک، کہیں کوئی نہیں تھا۔ کوئی آواز نہیں تھی۔ زندگی کی کوئی علامت نہیں تھی۔

دور کہیں سے کسی پرندے کے بولنے کی آواز سنائی دی اور آمد سحر کا اعلان ہوا۔ ارشاد اور شرفو تو پہلے ہی سے جاگ رہے تھے۔

ابھی اندھیرا تھا۔ اجالا پھیلنے میں دیر تھی۔ رحمت علی اور فیضو سو رہے تھے۔ ابھی ان کو جاگنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

ہلکا ہلکا اجالا پھیلنا شروع ہوا تھا کہ رحمت علی اور فیضو بھی بے دار ہو گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ چاروں اس جگہ کھڑے ہوئے تھے جہاں وہ مٹی کا ڈھیر تھا جسے بہ مشکل ہی ایک قبر کہا جا سکتا تھا۔ اس ڈھیر کے نیچے ایک نامعلوم لاش دفن تھی۔

وہ چاروں غور سے اس جگہ کو دیکھ رہے تھے۔ اس جگہ میں تو ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی، سوائے اس کے کہ یہاں کی زمین پتھریلی اور چٹانی نہیں تھی اور یہاں نرم مٹی زیادہ تھی جس کی بنا پر اسے زیادہ آسانی کے ساتھ کھود لیا گیا تھا۔

کچی زمین پر قدموں کے نشانات دیکھے جا سکتے تھے۔ کسی نے ان کو مٹانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ان نشانوں سے دور رہنا۔ ارشاد نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ہو سکتا ہے، کسی کو ان کی ضرورت ہو۔

ہاں استاد۔ رحمت علی نے کہا۔ شاید پولیس کوئی تحقیقات وغیرہ کرے۔

وہ لوگ قدموں کے نشانات سے دور رہے اور دوسری طرف سے اس جگہ کا جائزہ لیتے رہے۔ لاش کو دفن کرنے والوں نے وہاں بہت سارے پتھر رکھ کر اس جگہ کو نمایاں کر دیا تھا اور ارشاد اور اس کے ساتھی اس کو دور سے پہچان سکتے تھے۔

کچھ دیر کے بعد ان لوگوں نے تھوڑا کھانا کھایا، چائے بنا کر پی اور پھر وہ وہاں سے چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔

جانے سے پہلے انہوں نے اس جگہ کا ایک بار پھر اچھی طرح سے معائنہ کیا جہاں وہ قبر واقع تھی اور اس جگہ کو پورے طور سے اپنے ذہن نشین کر لیا جہاں انہوں نے یہ رات گزاری تھی۔

سارے نقشے کو اچھی طرح ذہن میں بٹھا لینے کے بعد وہ لوگ وہاں سے روانہ ہو گئے۔

سمت کا خیال رکھنا۔ ارشاد نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ کوئی غلطی نہ ہونے پائے۔

نہیں استاد۔ فیضو نے کہا۔ خدا نے چاہا تو کوئی غلطی نہیں ہو گی۔ ہم لوگ صحیح سمت میں ہی سفر کریں گے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ بستی ہمیں کتنی دور جا کر ملتی ہے۔

یہ بھی دیکھنا ہے کہ ہم صحیح بستی تک پہنچ پاتے ہیں یا نہیں۔ رحمت علی نے کہا۔

یہ لوگ کسی بستی سے آئے تھے اور ایک آدمی کی لاش دفن کر کے چلے گئے۔ ارشاد نے کہا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مقتول اسی بستی کا، یا آس پاس کی کسی دوسری بستی کا رہنے والا ہو گا۔ ہم اگر کسی بستی میں جائیں گے تو ہمیں کسی نہ کسی طرح وہاں یہ معلوم کرنا ہو گا کہ آیا اس بستی میں کسی شخص کی موت واقع ہوئی ہے یا نہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے گاؤں اور چھوٹی چھوٹی بستیاں

ہیں۔ یہاں کسی شخص کی موت کا واقعہ چھپا نہیں رہ سکتا۔ سب کو معلوم رہتا ہے کہ فلاں آدمی فلاں دن مر گیا، یا اسے مار دیا گیا، یا وہ غائب ہو گیا، یا اس کے ساتھ کوئی ایسا سانحہ پیش آیا۔ ہم کوشش کر کے یہ بات معلوم کریں گے۔

ہاں استاد۔ شرفو نے کہا۔ اور یہ بات معلوم کر لینا کوئی ایسا مشکل بھی نہیں ہے۔ مرنے والے کے بارے میں کسی نہ کسی طرح تو معلوم ہو ہی جائے گا۔

گاؤں یا بستی میں داخل ہونے پر کوئی نہ کوئی طریقہ سوچ لیں گے۔ رحمت علی نے کہا۔ سب سے پہلے تو آبادی کو تلاش کرنا ہے۔

وہ لوگ لاش کو دفنانے کے لیے رات کو پیدل آئے تھے۔ ارشاد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ایک چارپائی پہ ایک انسانی لاش ان کے کندھوں پر تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ کوئی بہت زیادہ دور سے نہیں آئے ہوں گے۔ اگر انہوں نے اپنے گاؤں میں کسی کو قتل کیا ہوگا، تو وہ اس کو گاؤں سے بہت زیادہ دور تو دفن نہیں کر سکتے۔ قریب بھی دفن نہیں کریں گے۔ لیکن اتنی دور بھی دفن نہیں کریں گے کہ لاش کو اٹھائے اٹھائے، پیدل چلتے چلتے، ان کے جسم تھک کر چور ہو جائیں۔

یہ بات ٹھیک ہے استاد۔ فیضو نے کہا۔ وہ لوگ اپنی بستی سے بہت دور نہیں آئے ہوں گے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں بھی ان کی تلاش میں بہت زیادہ دور نہیں جانا پڑے گا۔

وہ چاروں وہاں سے روانہ ہوئے تو پہلے ارشاد نے ایک اونچے ٹیلے پر کھڑے ہو کر اپنی آنکھوں سے دوربین لگائی اور دور دور تک کے مناظر کو دیکھنے لگا۔

چاروں طرف ویرانی کا راج تھا۔ تاحد نظر کوئی آبادی نظر نہیں آتی تھی اور نہ ہی کسی آبادی کے آثار دکھائی دیتے تھے۔ کہیں کوئی مویشی وغیرہ بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ کوئی کھیت یا باغ قسم کی چیز بھی نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ اونچے نیچے ٹیلوں کے پیچھے، جہاں تک نظر کام کر سکتی تھی۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

چلو بھئی۔ ارشاد نے ٹیلے سے نیچے اترتے ہوئے کہا۔ ابھی تو دور دور تک کسی بستی کے آثار نظر نہیں آ رہے ہیں۔ آگے چل کر دیکھیں گے۔ کہیں نہ کہیں کوئی بستی ہوگی تو ضرور۔

وہ لوگ چل پڑے۔ انہوں نے اپنے اندازے سے سمت کا صحیح تعین کیا تھا اور وہ چاروں اس بات پر متفق تھے کہ وہ صحیح راستے پر جا رہے ہیں۔

انہیں چلتے چلتے تقریباً ایک گھنٹہ ہو گیا تھا کہ اچانک ارشاد رک گیا۔ اس کے ہاتھ میں دوربین تھی اور وہ بار بار رک کر ادھر ادھر کے مناظر کا جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ ابھی تک اسے کوئی خاص چیز نظر نہیں آئی تھی۔ لیکن اب اچانک اسے کچھ دکھائی دے گیا تھا۔

یہ ایک چٹان کے نیچے ایک کھلا ہوا غار تھا۔ اس کی شکل ایسی تھی کہ اس کے اوپر ایک چٹان کی چھت سائبان کی طرح قائم تھی۔ اس کے دونوں اطراف میں بھی چٹانیں تھیں اور سامنے کا رخ کھلا ہوا تھا۔ یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں آدمی دھوپ گرمی اور کسی حد تک بارش سے بھی محفوظ رہ کر زندہ رہ سکتا تھا۔ البتہ سردیوں کے موسم میں یہاں رہنا ممکن نہیں تھا، کیونکہ یہ سامنے سے کھلی ہوئی جگہ تھی اور شدید سردی اور برفانی ہواؤں کے موسم میں یہاں کوئی نہیں رہ سکتا تھا۔ دن کو تو شاید آگ جلا کر کسی طرح گزارہ بھی ہو جاتا، لیکن رات کو رہنا ممکن نہیں تھا۔

اس جگہ پتھروں کا بنا ہوا ایک چولہا موجود تھا اور جلے ہوئے سیاہ پتھر اس بات کی علامت تھے کہ یہاں رہنے والے لوگ کھانا پکاتے تھے۔ پتھروں کے چولہے کے آس پاس کچھ برتن وغیرہ بھی پڑے ہوئے تھے۔ لیکن وہ بالکل بے ترتیبی کی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔

ارشاد نے دوسرے ساتھیوں کو بھی وہ منظر دکھایا۔

یہاں اس ویرانے میں اس پہاڑی غار میں کون رہتا ہوگا۔ شرفو کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ یہاں آس پاس تو اور کوئی آبادی بھی نہیں ہے۔

لیکن یہاں کوئی نہ کوئی رہتا ضرور ہوگا۔ رحمت علی نے کہا۔ یہ تو ایک اچھا پتھر کا کمرا ہے۔ کافی محفوظ۔ گرمی اور دھوپ سے بچاؤ کا یہاں پورا قدرتی بندوبست ہے۔

یہاں آدمی بڑے آرام سے رہ سکتا ہے۔ شرفو نے کہا۔ لیکن صرف گرمیوں اور برسات کے موسم میں۔ سردیوں میں مر جائے گا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کوئی یہاں رہتا تھا۔ وہ اب نہیں رہتا ہے۔ ارشاد نے ساری صورت حال کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ برتن اوندھے سیدھے پڑے ہوئے ہیں۔ چولہا ٹھنڈا ہے اور اس کی راکھ اڑ اڑ کر سارے غار میں پھیل گئی ہے اور پانی کا گھڑا بھی الٹا پڑا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ وہ خالی ہے جو بھی یہاں رہتا تھا۔ وہ یہاں سے چلا گیا ہے۔ ہمیں اس جگہ کے قریب جا کر جائزہ لینا چاہیے۔

وہ چاروں اس پہاڑی سائبان کے قریب پہنچ گئے اور اب وہ اس جگہ کو زیادہ اچھی طرح سے دیکھ سکتے تھے۔

ایک کونے میں کچھ پھٹے پرانے اور بوسیدہ سے کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ وہ بالکل گودڑ کی سی حالت میں تھے۔ ایک طرف ایک برتن میں کچھ آٹا رکھا نظر آ رہا تھا۔ دو ایک تھیلیاں بھی رکھی تھیں، جن میں شاید کھانا پکانے کی ہی کچھ چیزیں ہوں گی۔ سائبان کے باہر ایک چٹان پر کچھ سوکھی ہوئی لکڑیوں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر بھی دکھائی دے رہا تھا۔

یہاں کی کسی بھی چیز کو ہاتھ مت لگانا۔ ارشاد نے اپنے ساتھیوں کو خبردار کیا۔ ہمیں یہ بات نہیں بھولنا چاہیے کہ اس علاقے میں ایک قتل ہو چکا ہے۔ معلوم نہیں وہ کون شخص تھا..... کیا خبر، اس غار سے مقتول کا کوئی تعلق ہو۔

ہاں، ٹھیک ہے۔ رحمت علی نے کہا۔ ہمیں بس دور سے ہی سب کچھ دیکھنا چاہیے۔ پاس نہیں جانا چاہیے۔ کوئی چیز بھی چھونی نہیں چاہیے۔

وہ چاروں سائبان کے اندر بھی داخل نہیں ہوئے، بلکہ باہر سے ہی اندر کا جائزہ لیتے رہے۔

انہیں ایک طرف پڑی ہوئی ایک پھٹی پرانی دری بھی دکھائی دی اور ایک بوسیدہ سا تکیہ بھی۔ یہ یہاں رہنے والے کا بستر استراحت تھا۔

ہو سکتا ہے وہ شخص ذرا دیر کے لیے کہیں گیا ہوا ہو اور ابھی واپس آ جائے۔ فیضو نے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

میرے خیال میں تو اس کا امکان ذرا کم ہی ہے۔ ارشاد نے کہا۔ اس جگہ کی بے ترتیبی سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں رہنے والا شخص یہاں سے شاید ہمیشہ کے لیے جا چکا ہے، یا اسے زبردستی یہاں سے نکال دیا گیا ہے۔

ہو سکتا ہے۔ وہ شخص اپنے دشمنوں سے بھاگ کر یہاں آیا ہو اور چھپ کر زندگی گزار رہا ہو۔ فیضو نے کہا۔ لیکن دشمنوں کو اس کے بارے میں معلوم ہو گیا ہو اور انہوں نے اس کو تلاش کر لیا ہو۔

اور پھر قتل کر دیا ہو۔ شرفو نے کہا۔

ایسا ہونا ناممکن نہیں ہے۔ ارشاد نے کہا۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ اسی لیے، ہمیں یہاں کی کسی بھی چیز کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیے۔ جو کچھ جس طرح سے پڑا ہوا ہے، اسے اسی طرح سے پڑا رہنے دینا چاہیے۔

وہ لوگ کچھ دیر تک اس جگہ کے باہر رکے رہے اور اس انتظار میں رہے کہ شاید کوئی شخص اس پتھریلے سائبان میں واپس آئے۔ لیکن وہاں کوئی نہیں آیا۔ سارا سامان اسی طرح بکھرا پڑا تھا۔

چلو۔ ارشاد نے کہا۔ اب یہاں رکنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اب یہاں سے چلتے ہیں۔ ہمیں بستی تلاش کرنی ہے۔

وہ لوگ وہاں سے چل پڑے اور کچھ دیر تک چلتے رہے۔

کہیں آس پاس بستی ضرور ہونی چاہیے۔ ارشاد نے کہا۔ اور پھر وہ ایک اونچے سے ٹیلے پر چڑھ گیا۔ اس نے آنکھوں سے دوربین لگالی اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

اوہ.....! اس نے جوش اور ہیجان کے عالم میں کہا۔ ایک بستی کے آثار نظر آرہے ہیں۔ ادھر..... اس طرف۔ اس نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

کوئی آبادی موجود ہے۔ شرفو نے بے تابی کے ساتھ پوچھا۔

مجھے ایک پہاڑی کے دامن میں بھیڑوں کا ایک گلہ چرتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ ارشاد نے کہا۔

اس کا مطلب ہے کہ قریب ہی کوئی گاؤں موجود ہوگا۔ رحمت علی نے کہا۔

ہاں۔ ارشاد نے ٹیلے پر سے اترتے ہوئے کہا۔ مجھے وہ بھیڑیں ننھے ننھے سفید دھبوں کی طرح حرکت کرتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔ وہ جگہ یہاں سے کافی دور معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں جلد از جلد وہاں پہنچ جانا چاہیے۔

ان لوگوں کے قدموں کی رفتار خود بہ خود تیز ہوگئی۔ وہ اضطراب اور ہیجان کا شکار تھے اور جلد از جلد اس گاؤں تک پہنچ جانا چاہتے تھے۔

بالآخر انہیں دوربین کی مدد کے بغیر، دور سے بھیڑوں کا ایک گلہ نظر آنے لگا۔ یہ گلہ گویا ان کے لیے نشان راہ کا کام کر رہا تھا۔ اس گلے کے قریب ہی کہیں گاؤں بھی ہونا چاہیے تھا۔

زیادہ قریب آنے پر انہیں کچھ کھیت دکھائی دیے۔ ان میں کچھ لوگ کام بھی کر رہے تھے۔ لیکن بہت کم۔ زیادہ تر کھیت تو خالی پڑے ہوئے تھے۔ شاید ابھی فصل کا زمانہ نہیں آیا تھا۔

وہ لوگ کھیتوں کے پاس سے گزرے تو انہیں دور سے گاؤں بھی نظر آ گیا۔

گاؤں قدرے نشیب میں واقع تھا اور اسی لیے یہ انہیں دور سے نظر نہیں آیا تھا۔ اب بھی انہیں مکانات کے صرف بالائی حصے دکھائی دے رہے تھے۔ مکان کے نچلے حصے انہیں نظر نہیں آ رہے تھے، کیونکہ وہ نشیب میں تھے۔ آبادی تین طرف سے اونچے اونچے پہاڑوں سے گھری ہوئی تھی۔

چلو..... شروع ہو جاؤ۔ ارشاد نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ہم اس گاؤں میں گانا گاتے ہوئے داخل ہوں گے۔

گانا گاتے ہوئے۔ رحمت علی نے خوشی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہاں۔ ارشاد نے کہا۔ گانا گاتے ہوئے..... تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ فوری طور پر ہماری طرف متوجہ ہو جائیں۔ تم سب لوگوں کے ذہن میں ان پانچوں آدمیوں کی شکلوں کے خاکے تو موجود ہیں نا! جنہیں ہم نے کل رات کو لاش کو دفناتے ہوئے دیکھا تھا۔

ہاں..... ہیں۔ شرفو نے کہا۔ ویسے، اجالا تو بہت کم تھا، لیکن پھر بھی ہم نے ان کی شکلیں ذہن میں محفوظ رکھی ہیں۔

اس گاؤں میں اپنی آنکھیں اچھی طرح کھلی رکھنا۔ ارشاد نے کہا۔ دیکھنا کہ ان میں سے کسی شخص کی شکل یہاں نظر آتی ہے یا نہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک شخص بھی اس گاؤں میں نظر آ جائے تو شاید ہم قتل کے اس واقعے کی تہ تک پہنچ سکیں۔

ٹھیک ہے۔ فیضو نے کہا۔ ہم سب لوگ اپنی آنکھیں کھلی رکھیں گے۔

ان چاروں نے مل کر کورس میں ایک پنجابی گیت گانا شروع کر دیا، جو ان چاروں کو اچھی طرح یاد تھا اور جسے وہ پہلے بھی ساتھ مل کر گاتے رہے تھے۔

چاروں کی آواز آپس میں مل کر ایک آواز کی شکل اختیار کر گئی تھی اور یہ ایک آواز، خوب تیز و تند آواز، فضا میں اچانک گونج اٹھی تھی۔

وہ لوگ جیسے ہی گاؤں کے اندر داخل ہوئے، ادھر ادھر سے بہت سارے لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

انہوں نے چاروں طرف نظریں دوڑا کر دیکھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ایک دوسرے کے قریب قریب بنے ہوئے نیم پختہ مکانات کا سلسلہ کچھ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے بعد کھیت شروع ہو جاتے تھے۔

گاؤں کے سامنے وسیع میدان تھا۔ یہاں بہت سارے مویشی ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ کچھ بچے میدان میں کھیل رہے تھے۔ چند آدمی اور عورتیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ ایک شخص اپنی گدھا گاڑی پر کچھ سامان کی بوریاں لاد رہا تھا۔

ان لوگوں کی تیز آواز سنتے ہی، جو شخص جہاں تھا۔ وہیں اسی حالت میں رک گیا اور نو واردوں کی طرف دیکھنے لگا۔

گاؤں والوں کے لیے یہ ایک حیرت انگیز منظر تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا پہاڑی گاؤں تھا اور دور دراز کوہستانی علاقے میں واقع تھا۔ یہاں باہر سے تو شاذ و نادر ہی کبھی کوئی آتا تھا اور جب کوئی آتا تھا تو یہ بات گویا ایک اہم خبر کی حیثیت رکھتی تھی۔ چاہے آنے والا کوئی فقیر ہی کیوں نہ ہو اور اب ایک ساتھ، گاتے بجاتے چار فقیروں کی آمد یہاں کے لوگوں کے لیے ایک اہم واقعہ تھی۔ وہ جلدی جلدی ان لوگوں کے پاس پہنچنے لگے۔

ان چاروں نے اپنے گانے کی لے اور تیز کر دی۔ فضا میں ان کی آواز کی گونج اور زیادہ ہوگئی۔ لوگ ان کے گرد جمع ہونے لگے۔ وہ چاروں ایک درخت کے نیچے کھڑے ہو گئے تھے اور وہیں کھڑے ہو کر زور زور سے گا رہے تھے۔

ذرا دیر میں ان کا گانا ختم ہو گیا اور وہ چاروں اسی درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنے اپنے تھیلے اپنے پاس رکھ لیے تھے۔

کون ہو تم لوگ اور کہاں سے آئے ہو۔ ایک عمر رسیدہ، باریش شخص نے ان لوگوں کے قریب آ کر ان سے سوال کیا۔ ان لوگوں نے جو گانا گایا تھا وہ پنجابی زبان کا تھا۔ اس لیے باریش شخص نے ان سے جو سوال کیا وہ اس کی ٹوٹی پھوٹی اردو میں تھا اور پھر اگلی ساری گفتگو میں اردو ہی ذریعہ اظہار بنی رہی۔ گاؤں کے لوگ پشتو بولنے والے تھے اور وہ چاروں فقیر پنجابی تھے، جو پشتو سے ناواقف تھے۔ چنانچہ دونوں فریقوں کے درمیان صرف اردو ہی ذریعہ اظہار بن سکتی تھی۔

فقیر ہیں بابا۔ ارشاد نے کہا۔ گھومتے گھومتے ادھر آ نکلے ہیں۔ گا بجا کر لوگوں کا دل خوش کرتے ہیں اور اس کے بدلے میں ٹکڑا روٹی کا مل جاتا ہے تو خدا کا شکر ادا کر کے کھا لیتے ہیں۔

کہاں سے آ رہے ہو۔ ایک اور شخص نے سوال کیا۔

کسی خاص جگہ سے نہیں۔ ارشاد نے جواب دیا۔ مہینوں پہلے ملتان سے نکلے تھے۔ پنجاب میں دور دور تک گھومتے پھرتے ادھر صوبہ سرحد میں آ نکلے اور اب یہاں گھوم رہے ہیں۔ آج اس گاؤں میں تو کل اس بستی میں۔ کوئی ایک ٹھکانا نہیں ہے۔ کسی بھی جگہ ایک دو دن سے زیادہ نہیں رکتے۔ بس لوگوں سے مل کر اور انہیں دعائیں دے کر وہاں سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

اچھا..... اس شخص نے کہا۔ کوئی گھر۔ کوئی ٹھکانا۔ کوئی رہنے کی جگہ تو ہوگی تم لوگوں کی۔ جہاں سے آ رہے ہو

ملتان سے، وہاں تمہارا گھر بار تو ہوگا۔

نہیں بھائی۔ ارشاد نے جواب دیا۔ ہمارا کوئی گھر نہیں ہے۔ ہم چاروں میں سے کسی کا بھی کوئی گھر نہیں ہے۔ ہم بے گھر لوگ ہیں۔

بے گھر نہیں ہیں۔ شرفو نے ہنستے ہوئے کہا۔ ہمارا گھر ہے اور وہ بہت بڑا گھر ہے۔ یہ ساری دنیا ہمارا گھر ہے۔ یہ آسمان ہمارے گھر کی چھت ہے اور یہ زمین ہمارے گھر کا فرش۔

اور یہ پہاڑیاں، یہ چٹانیں، یہ ہمارے گھر کی دیواریں ہیں۔ فیضو کو بھی جوش آ گیا اور وہ بھی شاعروں کے سے انداز میں گفتگو کرنے لگا۔

تم لوگ باتیں بہت اچھی کرتے ہو۔ باریش شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی اردو کا لب ولہجہ زیادہ صاف تھا اور وہ بالکل صحیح زبان بول رہا تھا۔ اچھا آرام سے بیٹھو۔ ہم تمہیں کھانا وغیرہ سب دیں گے۔

بہت بہت مہربانی بابا جی۔ ارشاد نے اس کی لمبی سفید داڑھی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ہم فقیروں کو زیادہ کچھ نہیں چاہیے ہوتا۔

ہمارا جی تو چاہتا ہے کہ تم سے بہت سے گانے سنیں۔ ایک نوجوان نے قدرے افسردگی کے ساتھ کہا۔ ایک مدت کے بعد ہمارے گاؤں میں کچھ گانے بجانے والے لوگ آئے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ہم اپنے گاؤں میں گانے بجانے کی کوئی محفل منعقد نہیں کر سکتے اور تم لوگوں سے خوشی کے کوئی گیت نہیں سن سکتے۔ صرف غم کے گیت ہی سن سکتے ہیں۔

مگر کیوں۔ ارشاد نے فوراً اس نوجوان کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔ اس بات کی کوئی خاص وجہ۔

ہاں.....! نوجوان نے ایک لمبی اور گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ہمارے گاؤں میں ایک آدمی کا انتقال ہوگیا ہے۔ ہم لوگ مرنے والے کا سوگ منا رہے ہیں اور ابھی کچھ دنوں تک ہمارے گاؤں میں خوشی کی کوئی محفل نہیں ہوسکتی۔

بہت افسوس کی بات ہے۔ ارشاد نے کہا۔ اس نوجوان کی بات سن کر اس کے دل میں تجسس جاگ اٹھا تھا۔ نوجوان کی بات سے اس امر کی تو تصدیق ہوگئی تھی کہ اس گاؤں میں کسی کا انتقال ہوا ہے۔

مرنے والے کا انتقال کب ہوا۔ ارشاد نے اس نوجوان کو مزید کریدتے ہوئے پوچھا۔

کل۔ نوجوان نے جواب دیا۔ کل دن میں اس کا انتقال ہوا تھا۔

خدا مرنے والے کی مغفرت کرے۔ ارشاد نے کہا۔

کیا..... کیا..... مرنے والا کچھ بیمار تھا۔ ارشاد نے محتاط لیکن جچے تلے الفاظ استعمال کر کے معاملے کی تہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کے باقی ساتھی بھی اس صورت حال کو خوب سمجھ رہے تھے اور اس ساری گفتگو کو بڑے غور سے سن رہے تھے۔

ہاں، بیمار تھا۔ نوجوان نے آہستہ سے کہا۔ کافی دنوں سے بیمار تھا۔ پھر خدا نے اس کو اپنے پاس بلا لیا۔

ارشاد نے آہستہ سے گردن ہلائی۔ سب کو ایک نہ ایک دن جانا ہے بھائی..... کسی کو آگے، کسی کو پیچھے..... انجام تو سب کا ایک ہی ہے۔

ہاں شاہ جی..... ٹھیک کہتے ہو۔ نوجوان نے آہستہ سے کہا۔

ارشاد اور اس کے ساتھیوں پر اب یہ بات واضح ہوچکی تھی کہ گزشتہ رات کو پراسرار حالات میں دفن کیے جانے والے مردہ شخص کا تعلق اس گاؤں سے نہیں تھا۔ اس گاؤں میں جس شخص کی موت ہوئی تھی، وہ بیمار ہو کر مرا تھا اور گاؤں کے سب لوگ اس کی موت سے واقف تھے۔ ظاہر ہے کہ اس کی تدفین بھی عام طریقے سے ہوئی ہوگی اور اس میں چھپانے کی کوئی بات نہیں تھی۔ لہٰذا یہ وہ شخص نہیں ہوسکتا تھا جس کو گزشتہ رات

خفیہ طور پر دفن کیا گیا تھا۔

خدا تمہارے گاؤں کو اپنے حفظ وامان میں رکھے اور سب لوگوں کو صحت وتندرستی دے۔ شرفو نے کہا۔ تمہارے گاؤں میں امن وسکون قائم رہے۔

بس شاہ جی، دعا چاہیے۔ سفید داڑھی والا شخص بولا۔ ہمارے گاؤں میں اللہ کے فضل وکرم سے بڑا امن و سکون ہے۔

گاؤں میں امن وسکون کی خوش خبری نے ارشاد اور اس کے ساتھیوں کے تجسس کو مہمیز دی۔ ان لوگوں کو اب کسی دوسرے گاؤں کا رخ کرنا تھا۔ مقتول کا تعلق اس گاؤں سے تو نہیں تھا۔ اس گاؤں میں کسی آدمی کو قتل نہیں کیا گیا تھا۔ یہاں تو سب امن وامان تھا۔

ہم تمہارے گاؤں میں زیادہ نہیں رکیں گے۔ ارشاد نے کہا۔ آج ہی یہاں سے آگے چلے جائیں گے۔ تم لوگوں کو دعائیں دیتے ہوئے یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔

نہیں نہیں شاہ جی۔ نوجوان نے جلدی سے کہا۔ تم کو جلدی جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب تک تمہارا جی چاہے، تم ہمارے گاؤں میں رہو۔ ہم لوگ تو فقیروں کی عزت کرتے ہیں اور ہمارے گاؤں میں کبھی کبھی تو کوئی باہر سے آتا ہے، تم لوگ ہمارے مہمان ہو۔

وہ نوجوان کچھ اور بھی کہہ رہا تھا، لیکن ارشاد اس کی بات پوری توجہ کے ساتھ نہیں سن رہا تھا۔ اس کا دھیان اچانک بری طرح سے ہٹ گیا تھا۔ کیونکہ اسی وقت ایک اور شخص ایک طرف سے نمودار ہو کر ادھر آ رہا تھا۔

ارشاد کی نظریں اس شخص کے چہرے پر جم گئی تھیں اور اس کے دل ودماغ میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ اس نے اس شخص کو پہچان لیا تھا اور اسے پورا یقین تھا کہ اس سے کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے۔

یہ شخص ان پانچ آدمیوں میں سے ایک تھا جو گزشتہ رات کی تاریکی میں اس پراسرار لاش کو خفیہ طور پر دفن کرنے کے لیے اس ویرانے میں آئے تھے۔

ارشاد اس شخص کو پہچان رہا تھا۔ یہ وہ آدمی تھا جو بیلچے سے مٹی نکال نکال کر باہر ڈال رہا تھا۔ یہ کدال سے کھدائی کرنے والوں میں شامل نہیں تھا، بلکہ اس نے مٹی نکالنے کا اور بعد میں گڑھے میں مٹی واپس ڈالنے کا زیادہ تر کام انجام دیا تھا۔

ارشاد نے کن انکھیوں سے شرفو کی طرف دیکھا۔ شرفو نے بڑے غور سے اس آدمی کو دیکھا تھا اور پھر اس نے بہت آہستہ سے اپنی گردن اس طرح ہلائی کہ وہاں موجود گاؤں کے لوگوں میں سے کوئی بھی اس حرکت کو محسوس نہیں کر سکا۔ البتہ ارشاد کو اپنے سوال کا جواب مل چکا تھا۔

ارشاد نے باری باری رحمت علی اور فیضو کی طرف بھی دیکھا۔ وہ دونوں بھی اس شخص کے چہرے کو غور سے دیکھ رہے تھے اور انہوں نے بھی بڑے غیر محسوس انداز میں اپنی گردنیں ہلا دیں۔

اب ان چاروں کو یہ بات معلوم ہوچکی تھی کہ اس گاؤں میں کم از کم ایک ایسا شخص موجود ہے جو کل رات کے واقعے میں شامل تھا۔ یہ شخص گویا واقعہ قتل کے رازداروں میں سے ایک تھا۔

ارشاد اس آنے والے کو غور سے دیکھ رہا تھا اور ایک بات واضح طور پر محسوس کر سکتا تھا اور وہ یہ کہ اس کے چہرے پر غم کی پرچھائیاں لہراتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

کون آیا ہے۔ آنے والے شخص نے وہاں موجود لوگوں سے سوال کیا۔

ہمارے گاؤں میں کچھ فقیر آئے ہیں طاہر خاں۔ نوجوان نے کہا۔ بہت دور سے کہیں سے گھومتے پھرتے آ رہے ہیں۔ مگر کہہ رہے ہیں کہ جلدی یہاں سے چلے جائیں گے۔ ہم لوگ تو چاہیں گے کہ یہ چند روز تک ہمارے گاؤں میں رہیں۔ ہم ان کے کھانے

پینے کا بندوبست کریں گے۔ یہ لوگ گاتے بھی بہت اچھا ہیں۔ مگر افسوس کہ ہم انہیں فی الحال یہاں گانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔

کوئی بات نہیں امجد خاں۔ طاہر خاں نے اور بھی زیادہ افسردہ لہجے میں کہا۔ مرنے والا تو اس دنیا سے چلا گیا۔ ایک آدمی کے گزر جانے سے دنیا کے کام تو نہیں بند ہو جاتے..... اور پھر..... اس کو تو بہت پہلے ہی مر جانا تھا..... ہم سب تو دل سے چاہتے تھے کہ وہ جلدی مر جائے۔ لیکن اس نے تو مرنے میں بہت دیر کر دی۔

موت اور زندگی آدمی کے اپنے اختیار میں تو نہیں ہے طاہر خاں۔ امجد خاں نے کہا۔ ہر شخص کی موت کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ جب تک وہ وقت آ نہیں جاتا، تب تک انسان زندہ رہنے کے لیے مجبور ہے۔

ان دونوں افراد کی یہ عجیب و غریب گفتگو ارشاد اور اس کے ساتھیوں کو سخت الجھن میں ڈال رہی تھی۔ کچھ عجیب معما تھا جو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

تم لوگ کس کی بات کر رہے ہو۔ ارشاد نے محتاط انداز میں پوچھا۔ وہ کون شخص تھا جس کے لیے تم چاہتے تھے کہ وہ جلد مر جائے۔

وہ میرا بھائی تھا۔ طاہر خاں نے ایک لمبی اور گہری سانس لیتے ہوئے، افسردگی کے ساتھ کہا۔ جعفر خاں..... مجھ سے دو سال چھوٹا تھا..... کل اس کا انتقال ہو گیا اور کل رات میں نے اس کو اپنے ہاتھ سے قبر میں اتارا۔

رات میں کیوں۔ ارشاد نے فوراً کہا۔ اچھا ہوتا کہ تم اس کو دن کے وقت دفن کرتے..... رات میں دفن کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

بس شاہ جی..... بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا سمجھنا دوسروں کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ طاہر خاں نے افسردگی کے ساتھ کہا۔ ہمیں جعفر خاں کی موت کی اطلاع کل رات کو ملی تھی اور یہ ضروری تھا ہم کل رات کو ہی اس کو دفن کر دیں..... اس لیے ہم کل رات کو اس کو دفن کر دیا اور وہ بھی اپنے گاؤں بہت دور لے جا کر..... ایک سنسان اور ویران جگہ ارے۔ ارشاد نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے ایسا کیا ہو گیا تھا۔ کیوں تم اسے رات ہی کو دفن کر چاہتے تھے۔

لمبی کہانی ہے شاہ جی۔ طاہر خاں کے بجائے خاں نے جواب دیا۔ مگر اب تو کسی سے کوئی پردہ ، کیونکہ وہ بے چارا اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ مر والا تو رخصت ہو گیا۔ اگر طاہر خاں کا جی چاہے گا تو کو اپنے بھائی کے بارے میں تفصیل کے ساتھ کچھ بتا دے گا اور اگر وہ نہیں بتانا چاہے گا تو یہ اس مرضی ہے۔ ہم اس کو مجبور تو نہیں کریں گے۔

نہیں نہیں۔ طاہر خاں نے جلدی سے کہا۔ میر پاس چھپانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے اور وہ فقیروں سے..... جعفر خاں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اب اس کے بارے میں کسی سے بھی بات کر سکتے ہیں۔ ان درویشوں سے اس کے بارے میں بات کروں اس کے متعلق سب کچھ بتاؤں گا ان کو اور ان درخواست کروں گا کہ وہ اس کے لیے مغفرت کی کریں۔ فقیروں کی دعا میں تو بڑا اثر ہوتا ہے۔

ہم تو مرنے والے کے بارے میں کچھ جانے بغیر اس کی مغفرت کے لیے دعا کر چکے ہیں۔ ارشاد کہا۔ اور تم کہو گے تو اور بھی دعا کر دیں گے۔ فقیر کے پاس دعاؤں کی کمی نہیں ہوتی۔

تم لوگ کچھ دیر آرام کرو۔ امجد خاں نے کہا۔ دور سے چلتے ہوئے آ رہے ہو۔ ذرا سانس لو کھاؤ۔ چائے پیو۔ اس کے بعد طاہر خاں سے اس بھائی کی دکھ بھری زندگی کے بارے میں سنو اور مر والے کے لیے ایک بار پھر دعائے خیر کرو۔

میں تمہیں اپنے بھائی جعفر خاں کے بارے میں سب کچھ بتاؤں گا۔ طاہر خاں نے کہا۔ اور ساتھ ہی تم سے اس کی دعائے مغفرت کے لیے درخواست بھی کروں گا۔

وہ تو ہم لوگ دل و جان سے کریں گے۔ ارشاد نے کہا۔ تم ہمیں اس کے بارے میں بتاؤ۔

بتائیں گے، ضرور بتائیں گے۔ طاہر خاں نے کہا۔ پہلے میں تم لوگوں کے لیے کھانے کا بندوبست کر کے آتا ہوں۔ آج اس وقت کا کھانا..... میری طرف سے..... تم چاروں کے لیے۔

نہیں طاہر خاں۔ امجد خاں نے کہا۔ اکیلے تمہاری طرف سے کیوں۔ کچھ مل جل کر کر لیتے ہیں۔

نہیں بھائی۔ طاہر خاں نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ میں ان درویشوں کو یہ کھانا بھی اپنے معصوم بھائی کی روح کے ایصال ثواب کے لیے کھلانا چاہتا ہوں۔ مجھے اس سے مت روکو اور دوسروں کو بھی اس کے بارے میں بتا دینا۔ میں ابھی ذرا دیر میں آتا ہوں۔ ذرا گھر تک ہو آؤں۔

اس کے ساتھ ہی طاہر خاں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس اثنا میں اور بھی کئی لوگ وہاں آ چکے تھے اور ان لوگوں سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کی باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ باہر کی دنیا کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے تھے، کیونکہ ان کے اپنے گاؤں کی دنیا بہت محدود تھی اور اس دور افتادہ پہاڑی مقام پر شاذ و نادر ہی کوئی باہر سے آتا تھا۔ فقیروں کی یہ ٹولی تو ملتان سے سفر کرتی ہوئی چلی آ رہی تھی اور نہ جانے کہاں کہاں ہوتی ہوئی آئی تھی۔

ارشاد کو اپنے ساتھیوں سے بات کرنے کا موقع تو نہیں مل سکا تھا۔ لیکن وہ اور اس کے ساتھی ان ساری باتوں کو سمجھ چکے تھے جو انہوں نے یہاں سنی تھیں اور اب وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ وہ غلط جگہ نہیں آئے تھے اور انہیں اب کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی تلاش و جستجو کا مرکز یہی گاؤں تھا اور اپنے تمام سوالوں کے جواب انہیں یہیں ملنے تھے۔ وہ سب، یہ بات جان چکے تھے کہ گزشتہ رات کو جو لاش پراسرار حالات میں دفن کی گئی تھی، وہ اسی گاؤں کے ایک شخص کی تھی جس کا نام جعفر خاں تھا اور جو کسی بیماری کا شکار ہو کر مر گیا تھا۔ اسے راتوں رات ہی دفن کر دینا کیوں ضروری سمجھا گیا اور اس کی تدفین میں اتنے مختصر سے لوگوں نے کیوں شرکت کی، ان سوالوں کے جوابات ابھی نہیں ملے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد طاہر خاں وہاں دوبارہ آیا۔ اس وقت امجد خاں وہاں سے جا چکا تھا۔ لیکن کچھ اور لوگ موجود تھے۔

ابھی تھوڑی دیر میں کھانا آنے والا ہے۔ طاہر خاں نے ان لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ میں خود ہی لے کر آؤں گا اور تم لوگوں کو پیٹ بھر کر کھلاؤں گا۔

خدا تم کو نیکی دے۔ ارشاد نے ممنونیت کے ساتھ کہا۔

میں ابھی جا رہا ہوں۔ طاہر خاں نے کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد کھانا لے کر ہی آؤں گا۔ اور وہ وہاں سے چلا گیا۔

فقیروں کے پاس کئی لوگ آ کر بیٹھ گئے تھے اور ان سے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ کسی نے ان لوگوں کو چائے لا کر دے دی تھی جس کی وہ سخت ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے چائے پی تو وہ اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کرنے لگے۔

ان کے ذہنوں پر سے ایک بوجھ تو ہٹ چکا تھا۔ وہ صحیح جگہ آ گئے تھے اور انہیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس پراسرار تدفین کا تعلق اسی گاؤں سے تھا اور اب باقی باتیں بھی جلد ہی معلوم ہو جانے والی تھیں۔

طاہر خاں جب دوبارہ واپس آیا تو وہ ان لوگوں کے

لیے کھانا لے کر آیا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکا اور تھا جو ایک سینی میں کھانے کی چیزیں رکھ کر لایا تھا۔

لو تم لوگ کھانا کھالو۔ طاہر خاں نے ان لوگوں کو کھانا دیتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد ہم اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے اور میں تم کو اپنے مرحوم بھائی جعفر خاں کے بارے میں تفصیل سے بتاؤں گا۔

ضرور بتانا۔ ارشاد نے کہا۔ ہمارے دل میں یہ جاننے کی بہت شدید خواہش پیدا ہو چکی ہے کہ تمہارے بھائی کے ساتھ کیا کچھ پیش آیا تھا اور ہم اس کے بارے میں سب کچھ سننا چاہتے ہیں۔

تم لوگ اطمینان سے کھانا کھالو۔ طاہر خاں نے کہا۔ مجھے کچھ ضروری کام ہیں۔ وہ ختم کر کے میں تمہارے پاس آؤں گا اور پھر تمہیں اپنے بھائی کے بارے میں بتاؤں گا۔

طاہر خاں انہیں کھانا دے کر چلا گیا اور وہ چاروں کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔ کھانا کافی لذیذ تھا اور مقدار میں بھی کسی طرح کم نہیں تھا۔

ہمیں اب یہاں سے جانے کی جلدی نہیں ہے۔ ارشاد نے موقع نکال کر سرگوشی میں اپنے ساتھیوں سے کہا۔ اگر باتیں لمبی ہو گئیں تو ہم آج کی رات یہاں رک بھی سکتے ہیں۔ تم لوگ کھانا اچھی طرح کھالو۔

اس وقت وہ لوگ تقریباً اکیلے تھے۔ جو دو چار لوگ وہاں موجود تھے۔ وہ ان کے قریب نہیں تھے، بلکہ فاصلے پر تھے اور انہوں نے ان کو اطمینان سے کھانا کھانے کے لیے تنہا چھوڑ دیا تھا۔

ہاں استاد۔ رحمت علی نے آہستہ سے کہا۔ بہت کچھ تو ہمیں معلوم ہو ہی چکا ہے۔ اب باقی بھی معلوم ہو جائے گا۔

اگر ضرورت پڑی تو ہم یہاں رک جائیں گے۔ شرفو نے آہستہ سے کہا۔

کچھ دیر کے بعد انہوں نے کھانا ختم کر دیا۔ طاہر خاں کے ساتھ جو لڑکا آیا تھا، وہ ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھا ہوا کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ ان لوگوں نے کھانا کھالیا ہے، تو وہ ان کے پاس آ کر خالی برتن لے کر چلا گیا۔

ذرا دیر بعد کسی اور گھر سے ان کے لیے چائے آ گئی اور یہ لوگ ابھی چائے پی ہی رہے تھے کہ اسی وقت طاہر خاں بھی واپس آ گیا۔

کھانا کھالیا تم لوگوں نے۔ اس نے پوچھا۔

ہاں۔ کھالیا.....! شرفو نے سب کی طرف سے جواب دیا۔ بہت اچھا تھا۔ ہم سب لوگوں کو بہت پسند آیا۔

آج رات کا کھانا بھی یہیں کھانا۔ طاہر خاں نے کہا۔ رات کو ادھر ہی رکنا۔ تم سے گانا سننا ہے۔ بہت سے لوگوں نے تو تمہارا گانا سنا ہی نہیں ہے اور میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔

گانا..... ارشاد نے جھجکتے ہوئے کہا۔ مگر..... گانا تو..... یہاں تمہارے گاؤں میں۔

تم یہی کہنا چاہتے ہو کہ کل میرے بھائی کا انتقال ہوا ہے۔ طاہر خاں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ لیکن تم کوئی درد بھرا گیت سنا دینا۔ گیت بھی تو کتنی طرح کے ہوتے ہیں۔ ایسے گیت بھی ہوتے ہیں جو انسان کو رلا دیتے ہیں۔

رونا اور ہنسنا..... زندگی میں ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ ارشاد نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ آدمی ہنستے ہنستے رونے لگتا ہے اور روتے روتے ہنسنے لگتا ہے۔

ہاں شاہ جی۔ طاہر خاں نے اداسی کے ساتھ کہا۔ اچھا، اب میں تمہیں اپنے بھائی جعفر خاں کے بارے میں بتاتا ہوں۔

اس کے بعد طاہر خاں نے اپنے بھائی کے بارے میں تفصیلات ان لوگوں کو بتائیں۔

طاہر خاں اور جعفر خاں، دونوں سگے بھائی تھے اور

ں گاؤں میں رہتے تھے جس کا نام بلبن خیل تھا۔ ان کے باپ کا نام اکبر خاں تھا۔ طاہر خاں بڑا تھا۔ اس کی شادی ہو چکی تھی اور اس کے دو چھوٹے بچے بھی تھے جعفر خاں، طاہر خاں سے کوئی چھ سال چھوٹا تھا۔ تھوڑی سی آبائی زمین تھی۔ تینوں باپ بیٹے مل کر اس پر کام کرتے تھے اور اس سے ان کو اتنا حاصل ہو جاتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح گزارہ ہو جاتا تھا۔ کسی کا کوئی قرض وغیرہ ان کے اوپر نہیں تھا۔ سارا کنبہ خوش و خرم زندگی گزار رہا تھا۔ اکبر خاں کی بیوی کا نام زرجان اور بہو کا نام صفیہ تھا۔

یہ آج سے تقریباً سات آٹھ سال پہلے کی بات ہے کہ بلبن خیل سے کوئی چار میل کے فاصلے پر واقع بادان نامی ایک گاؤں میں ایک بابا رہا کرتا تھا۔ یہ بابا گنڈے تعویذ اور عملیات وغیرہ کیا کرتا تھا۔ اس نے دو ایک نوعمر لڑکوں کو اپنا شاگرد بھی بنا رکھا تھا اور ان سے خدمت لیتا تھا۔ ان لڑکوں میں جعفر خاں بھی شامل تھا۔ اسے عملیات سیکھنے کا بہت شوق تھا اور وہ اپنا خاصا وقت بابا کے پاس گزارتا تھا۔ اس بابا کا یہ دعوا تھا کہ دنیا کا کوئی مرض ایسا نہیں ہے جس کا علاج اس کے پاس موجود نہ ہو اور دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کو وہ حل نہ کر سکے۔ لیکن جب اس کے علاج کے باوجود کوئی شخص اچھا نہیں ہوتا تھا، یا جب اس کے گنڈے تعویذ کے باوجود کسی شخص کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا تھا، تو بڑی آسانی سے یہ کہہ کر اپنی جان چھڑا لیتا تھا کہ اللہ کا حکم نہیں تھا۔

جعفر خاں اپنے گاؤں سے میلوں کا فاصلہ طے کر کے روز بادان گاؤں جاتا تھا اور دن کا کافی حصہ بابا عبدالشکور کے پاس گزارتا تھا۔ معلوم نہیں، بابا عبدالشکور اسے کون سے عملیات سکھاتا تھا، کیونکہ جعفر خاں اس بارے میں زبان نہیں کھولتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بابا عبدالشکور نے اس کو رازداری کا پابند کیا ہوا ہے اور سختی کے ساتھ یہ ہدایت دے رکھی ہے کہ وہ اس کے بارے میں کسی کو نہ بتائے، ورنہ جو کچھ علم وہ سیکھ رہا ہے، وہ اس سے چھن جائے گا۔ البتہ یہ بات سب کو معلوم تھی کہ وہ بابا عبدالشکور کی بہت خدمت کرتا تھا۔ وہ اس کے نوکروں کی طرح کام کرتا تھا۔ اس کے کپڑے دھوتا تھا۔ کھانا تیار کرنے میں اس کی مدد کرتا تھا، گھر کی صفائی ستھرائی کرتا تھا اور بابا کے دیگر بہت سے ذاتی کام کرتا تھا۔

بابا عبدالشکور اکیلا رہتا تھا۔ اس کی بیوی کا چند سال پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ اس کا ایک بیٹا تھا، جو ماں کے انتقال سے بہت پہلے ہی محنت مزدوری کے لیے کسی خلیجی ریاست میں چلا گیا تھا اور پھر کبھی واپس نہیں آیا تھا۔ شروع کے کچھ عرصے میں تو اس کا کوئی خط بھی آ جاتا تھا۔ جس میں وہ اپنی خیریت سے مطلع کر دیتا تھا۔ پھر ایک خط میں اس نے اطلاع دی کہ اس نے ایک مسلمان بنگالی لڑکی سے، جو کسی گھر میں کام کرتی ہے۔ نکاح کر لیا ہے۔ اس کے بعد سے اس کے خط آنا تقریباً بند ہو گئے اور پھر اس کی کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ نہ تو وہ خود آیا اور نہ اس نے کوئی پیغام بھجوایا۔

بیوی کی موت کے بعد سے بابا عبدالشکور اکیلا رہتا تھا۔ وہ اس گاؤں بادان خیل کا رہنے والا نہیں تھا۔ بلکہ کچھ عرصہ پہلے کہیں اور سے آ کر یہاں آباد ہو گیا تھا۔ اس گاؤں بادان خیل میں، یا اس کے آس پاس کے کسی گاؤں میں اس کا کوئی رشتے دار موجود نہیں تھا۔ چنانچہ بیوی کی موت کے بعد وہ اپنے گھر میں بالکل اکیلا رہتا تھا اور گنڈے تعویذ اور عملیات وغیرہ کا کاروبار کرتا تھا۔ اس کے پاس اردگرد کے گاؤں اور بستیوں سے بھی بعض لوگ آیا کرتے تھے۔

پھر یوں ہوا کہ بابا عبدالشکور بیمار رہنے لگا۔ اس کو کوئی عجیب و غریب بیماری ہو گئی تھی۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ پہلے تو ایسے دھبے نمودار ہونے لگے جن کا رنگ سرخی

مائل سفیدی لیے ہوئے تھا پھر رفتہ رفتہ ان میں زخم بننے لگے۔ بابا عبدالشکور، اپنی تیار کردہ طرح طرح کی دوائیں استعمال کر رہا تھا۔ لیکن اس کو کسی دوا سے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی حالت اتنی خراب ہوگئی کہ اس کے زخموں سے سخت بدبو اٹھنے لگی اور ان میں مسلسل خون اور پیپ رستا رہتا تھا۔ کوئی دوا کارگر نہیں ہو رہی تھی اور بابا سخت تکلیف اور عذاب کا شکار تھا۔ یہ عجیب سی بیماری تھی، جس کے باعث بابا عبدالشکور کی شکل بھی بگڑتی جا رہی تھی۔ اس کا چہرہ بہت زیادہ پھول گیا تھا اور ناک چپٹی ہو کر بیٹھتی جا رہی تھی۔ گالوں کا گوشت جگہ جگہ سے بے ہنگم انداز میں پھول کر لٹکنے لگا تھا۔

لوگوں نے اب بابا عبدالشکور کے پاس آنا چھوڑ دیا تھا۔ اب دوا علاج کے لیے یا اپنے مسائل کے حل کے لیے کوئی بھی اس کے گھر کا رخ نہیں کرتا تھا۔ لوگ تو اب اس کی شکل دیکھتے ہوئے ڈرتے تھے۔

جو دوسرے دو ایک لڑکے بابا عبدالشکور کے پاس بہ طور شاگرد رہتے تھے۔ وہ بھی بھاگ گئے۔ صرف جعفر خاں رہ گیا۔ اس خطرناک اور تکلیف دہ بیماری میں جعفر خاں ہی بابا عبدالشکور کا واحد سہارا تھا۔ جعفر خاں اس کے لیے کھانا پکاتا تھا اور صرف پکاتا ہی نہیں تھا بلکہ اپنے ہاتھ سے اس کو کھلاتا بھی تھا، کیونکہ بابا کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں تو زخموں سے اس بری طرح بھری ہوئی تھیں کہ وہ خود سے کھانا نہیں کھا سکتا تھا۔ گھر کے دوسرے تمام کام کاج بھی جعفر خاں ہی کرتا تھا۔ بابا عبدالشکور کے گھر میں کوئی دوسرا شخص اب قدم بھی نہیں رکھتا تھا۔ لوگوں کو تو اب اس کی صورت دیکھ کر بھی ڈر معلوم ہوتا تھا۔

بابا عبدالشکور تقریباً ایک سال تک اس انوکھی بیماری میں مبتلا رہا۔ اس کا سارا جسم گلنے اور سڑنے لگا تھا۔ جعفر خاں نے اس کی ہدایات کے مطابق بہت سی دوائیں اس کے لیے تیار کیں اور اسے استعمال کرائیں۔ لیکن کسی بھی دوا سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا..... اس کو کھانسی بھی رہنے لگی اور وہ کھانستے کھانستے بے حال ہو جاتا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگتے اور سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگتی۔

آخر اسی عالم میں ایک دن بابا عبدالشکور مر گیا۔ اس کے گھر میں کسی شخص نے ایک عرصہ دراز سے قدم نہیں رکھا تھا۔ بس جعفر خاں ہی تھا جو اس حال میں بھی اس کی خدمت کرتا تھا اور اس کو دوائیں اور کھانا پینا دیتا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی شخص اس گھر میں نہیں آتا تھا۔

بابا عبدالشکور مر گیا اور اسے دفن کر دیا گیا۔ اس کے مرنے کا اگر کسی کو واقعی سب سے زیادہ افسوس تھا تو وہ جعفر خاں تھا۔ لیکن ساتھ ہی جعفر خاں کا یہ بھی خیال تھا کہ بابا عبدالشکور کا مر جانا اچھا تھا، کیونکہ جس دکھ اور اذیت کی زندگی وہ گزار رہا تھا، اس سے موت بہ درجہا بہتر تھی۔

بابا عبدالشکور تو مر گیا، لیکن جعفر خاں گنڈے تعویذ اور عملیات وغیرہ کے میدان میں کوئی بھی کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔ وہ بابا عبدالشکور کا جانشین نہیں بن سکا تھا۔ کیونکہ اس کو یہ سب کچھ آتا ہی نہیں تھا۔

جعفر خاں نے اس کے بعد اپنا زیادہ تر وقت بڑے بھائی اور باپ کے ساتھ زمین اور گھر کے کاموں میں صرف کرنا شروع کر دیا۔ وہ اب کام میں بھرپور حصہ لیتا تھا۔

اکبر خاں اپنے بیٹے میں اس تبدیلی سے بہت خوش تھا۔ وہ تو کئی سال سے اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ جعفر خاں بابا عبدالشکور کا ساتھ چھوڑ دے اور زمین اور گھر کے کاموں میں حصہ لے۔ وہ اکثر جعفر خاں کو سمجھاتا تھا کہ وہ بابا عبدالشکور بننے کی کوشش نہ کرے، کیونکہ ایسے کاموں میں کچھ نہیں رکھا تھا لیکن جعفر خاں اس کی بات

پر توجہ نہیں دیتا تھا اور بابا عبدالشکور کا ہی خادم اور شاگرد بنا رہا تھا۔

پھر جب بابا عبدالشکور مر گیا تو جعفر خاں کا یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا اور وہ اپنی زمین اور گھر کے کاموں پر توجہ دینے لگا۔

تقریباً تین سال کا عرصہ گزر گیا۔ بابا عبدالشکور اب ایک بھولی بسری بات بن چکا تھا۔ جعفر خاں اب پورے طور سے اپنے باپ اور بھائی کے ساتھ زمین اور گھر کے کاموں میں مصروف رہتا تھا۔

اس روز جب کھیت میں کام کرتے کرتے جعفر خاں کی نظر اپنے دائیں ہاتھ پر پڑی تو اسے ہاتھ کے اوپر ایک جگہ ایک دھبا سا نظر آیا۔ ویسے تو وہ گزشتہ کئی دن سے اس دھبے کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس نے اس کی جانب کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ مگر آج اسے ایسا لگا جیسے وہ دھبا پہلے کے مقابلے میں کچھ زیادہ بڑھ گیا ہو۔

لیکن وہ صرف بڑا ہی نہیں ہوا تھا۔ ایک اور بات تھی جو جعفر خاں محسوس کر رہا تھا۔ یہ کچھ ایسی بات تھی جو ٹھیک سے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ مگر یہ بات تھی ضرور۔

جعفر خاں کو اس بات کا بہ خوبی تجربہ تھا کہ ہاتھ یا پاؤں کو اگر بہت دیر تک ایک ہی حالت میں اس طرح رکھا جائے کہ اس میں ذرا سی بھی حرکت نہ ہو، تو پھر وہ سن ہو جاتا ہے۔ اسے یہ تو نہیں معلوم تھا کہ ایسا ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جسم کے اس حصے میں خون کا دوران رک جاتا ہے اور وہ حصہ سن ہو جاتا ہے۔ اسے کسی نے نہیں بتایا تھا کہ دوران خون کیا چیز ہوتی ہے۔ تاہم، وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ جسم کے کسی حصے کا اس طرح سے سن ہو جانا ایک عارضی عمل ہوتا ہے اور پھر جیسے ہی اس عضو کو ہلنے جلنے کا موقع ملتا ہے، تو اس میں بڑے زور کی سنسناہٹ شروع ہو جاتی ہے اور سن ہو جانے والی کیفیت ختم ہونے لگتی ہے۔ پھر دھیرے دھیرے یہ کیفیت بالکل ختم ہو جاتی ہے اور جسم کا وہ حصہ اپنی اصلی اور سابقہ حالت پر واپس آ جاتا ہے۔

اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے ہاتھ پر جس جگہ یہ داغ نمودار ہوا تھا۔ اتنی جگہ جیسے سن ہو گئی تھی۔ جب وہ اس پر ہاتھ پھیرتا تھا تو اسے آس پاس کی جلد پر اور اس داغ والے حصے پر، احساس کا واضح فرق محسوس ہوتا تھا۔ داغ والے حصے کی کیفیت سن ہو جانے والی تھی۔ لیکن یہ کیفیت عارضی نہیں، بلکہ مستقل نوعیت کی تھی۔

اس نے گھاس کا ایک سوکھا تنکا لیا اور اسے اس داغ والے حصے پر آہستہ آہستہ پھیرنا شروع کیا۔ اسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ وہاں پر کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ اپنے جسم پر نہیں، کسی دوسرے کے جسم پر گھاس کا تنکا پھیر رہا ہو۔

اسے بہت تعجب ہو رہا تھا۔ اس نے گھاس کے تنکے کو داغ کے ملحقہ حصے پر پھیرا، وہاں فوراً ہی چھوئے جانے کا احساس بے دار ہوا۔ وہ بار بار اس تجربے کو دہراتا رہا اور اسے اس بات کا پورا یقین ہو گیا کہ اس کے ہاتھ کے اس حصے کی حس مر گئی ہے جہاں وہ سرخ دھبا نمودار ہوا ہے۔ لیکن اس نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

داغ ٹھیک ہوگا تو سن بھی اتر جائے گا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ یہ سن اسی داغ کی وجہ سے ہوا ہے۔

کئی دن مزید گزر گئے۔ جعفر خاں نے اس داغ کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ یہ داغ جعفر خاں کو کوئی تکلیف نہیں دے رہا تھا۔ اس میں نہ کوئی درد، دکھن یا تکلیف تھی۔ نہ اس میں کوئی خارش ہوتی تھی، نہ کسی قسم کی جلن وغیرہ ہوتی تھی۔ سب کچھ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ بس یوں تھا کہ اس کے ہاتھ کے اوپر وہ سرخ اور سفید رنگ کا دھبا موجود تھا اور جتنے حصے پر وہ دھبا پھیلا ہوا تھا، اتنی جگہ سن تھی۔ وہاں کی کھال حس سے عاری ہو چکی تھی۔ چونکہ جعفر خاں کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں تھی، اس لیے اس نے اس چیز کا کو

سے کوئی ذکر بھی نہیں کیا۔

لیکن اس وقت اس کی پریشانی میں ذرا اضافہ ہوگیا جب وہ دھبا پہلے کے مقابلے میں زیادہ بڑا ہونے لگا اور جتنی جگہ وہ پھیلتا جاتا تھا، اتنی جگہ کی جلد سن ہوتی جاتی تھی۔

پھر اگلے چند روز میں دو باتیں ایک ساتھ نمودار ہوئیں۔

دھبا جعفر خاں کے سیدھے ہاتھ کی پشت پر نمودار ہوا تھا۔ جعفر خاں کو ایسا لگا جیسے اس کے اس ہاتھ کی انگلیوں کی حرکت میں کچھ فرق پڑ رہا ہے۔ یہ بہت ہی معمولی سا فرق تھا۔ شروع شروع میں تو جعفر خاں نے اس کو محض اپنا وہم سمجھا، لیکن جلد ہی اس کا یہ وہم حقیقت میں بدل گیا۔ انگلیوں کی حرکت میں واقعی ہلکی سی رکاوٹ پیدا ہو رہی تھی۔

اور اس کے ساتھ ہی، ایک اور ایسا ہی سرخ اور سفید دھبا اس کے دوسرے ہاتھ کی پشت پر بھی نمودار ہوگیا تھا اور وہ جگہ بھی سن ہوگئی تھی۔ تاہم، اس ہاتھ کی انگلیوں کی حرکت میں ابھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

گاؤں بادان خیل میں کسی ڈاکٹر کی موجودگی کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ یہاں تو کوئی حکیم تک موجود نہیں تھا۔ یہاں بیمار ہونے والے لوگ بس دعاؤں اور گھریلو دواؤں کے ذریعے ہی اپنی بیماریوں کے علاج کی کوشش کرتے تھے۔ کسی زمانے میں اس گاؤں میں کوئی حکیم موجود تھا، لیکن پھر وہ مر گیا تھا اور اس کی موت کے بعد کوئی دوسرا حکیم اس گاؤں میں موجود نہیں تھا۔ حکیم کا کوئی بیٹا نہیں تھا اور اس کی بیٹی بیاہ کر ایک دوسرے گاؤں میں چلی گئی تھی۔

جعفر خاں نے اپنی اس تکلیف کا ذکر سرسری انداز میں اپنے گھر میں کیا اور اس کی ماں نے اسے کچھ گھریلو دوائیں دیں اور ہاتھوں پر ابھرنے والے داغوں پر لگانے کے لیے ہلدی اور چونا ملا کر دیا۔ سب کو یقین تھا کہ یہ معمولی سی تکلیف ہے اور گھریلو علاج کے ذریعے ٹھیک ہو جائے گی۔

لیکن ایسا ہوا نہیں۔ جعفر خاں برابر دوا استعمال کرتا رہا اور اس کے گھر والوں کے علاوہ گاؤں کے کچھ دوسرے بڑے بوڑھوں نے بھی اس کے لیے بعض دوائیں تجویز کیں، لیکن اس کو کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ بلکہ دونوں ہاتھوں پر نمودار ہونے والے دھبے بڑھتے اور پھیلتے گئے اور جتنی جگہ میں دھبے پھیلتے گئے، اتنی جگہ سن ہوتی گئی۔ ساتھ ہی ہاتھوں کی انگلیوں کی حرکت بھی متاثر ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

جعفر خاں اس صورت حال سے پریشان ہونے لگا۔ اگرچہ دھبوں میں کسی قسم کا درد یا تکلیف نہیں تھی۔ لیکن ان جگہوں کی کھال کا سن ہو جانا ایک ایسی بات تھی جو جعفر خاں کو تشویش میں مبتلا کر رہی تھی، کیونکہ اس کے نتیجے میں اس کی انگلیوں کی حرکت میں کمی واقع ہو رہی تھی۔

پھر کچھ دنوں کے بعد جعفر کے جسم کے بعض دوسرے حصوں پر بھی ایسے داغ نمودار ہونا شروع ہو گئے اور جہاں جہاں داغ نمودار ہوئے تھے، وہاں وہاں کھال سن ہوتی جا رہی تھی۔ دھبے اب اس کے دونوں پیروں پر بھی نمودار ہونے شروع ہو گئے تھے۔

کسی وجہ سے دونوں ہاتھوں کی رگیں اکڑ گئی ہیں۔ گاؤں کی ایک بہت بوڑھی عورت نے کہا، جس کے ناتی پوتوں کی بڑی تعداد تھی اور جو زندگی اور صحت کے بہت سارے مسائل سے گزر چکی تھی۔ اسی وجہ سے انگلیوں کی حرکت میں بھی فرق پڑ رہا ہے اور ہاتھوں کی جلد بھی سن ہوتی جا رہی ہے۔ گرم دواؤں کے استعمال سے رگیں کھل جائیں گی۔ اور اس نے کچھ گرم دوائیں تجویز بھی کر دیں۔

لیکن ان تمام گرم دواؤں وغیرہ سے جعفر کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا، بلکہ اس کے برعکس اس کی طبیعت

زیادہ خراب ہوتی گئی۔ اس کے دونوں ہاتھوں اور پیروں میں زخم نمودار ہو گئے اور عجیب بات یہ تھی کہ ان زخموں میں درد نہیں ہوتا تھا۔ یہ زخم اپنی جگہ موجود تھے۔ ان میں سے خون اور پیپ نکلتا تھا۔ لیکن یہ رکتے نہیں تھے۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں کی کھال سن اور بے جان ہوتی جا رہی تھی۔ وہاں تکلیف کا احساس ختم ہو گیا تھا۔

زخموں میں تو تکلیف نہیں تھی، لیکن اس کے علاوہ دوسری تکالیف تھیں۔ اسے بعض اوقات سارے جسم میں بڑی تیز اور عجیب قسم کی سرسراہٹ اور سنسناہٹ محسوس ہوتی تھی اور ایسا لگتا تھا جیسے اس کے جسم پر کوئی منوں اور ٹنوں بوجھ ڈال رہا ہے جس کے نتیجے میں وہ دبا چلا جا رہا ہے۔ بعض اوقات اسے ایسا لگتا جیسے اس کا سارا ہی بدن سن ہوتا چلا جا رہا ہے۔ وہ تیزی سے کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے دونوں کانوں کی لویں بھی پھولنا شروع ہو گئی تھیں اور اس کے چہرے میں بھی بعض ناخوش گوار تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں۔

ہاتھوں کے ساتھ اب پیروں کی انگلیوں کی حرکت میں بھی فرق محسوس ہونے لگا تھا۔

پھر ایک رات بڑا عجیب واقعہ ہوا۔

جعفر خاں اپنی چارپائی پر لیٹا ہوا سو رہا تھا۔ وہ گرمیوں کے دن تھے اور وہ کوئی چادر وغیرہ نہیں اوڑھے ہوئے تھا۔ اچانک سوتے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس کو ایسا لگا جیسے کوئی چیز اس کی ٹانگوں کے اوپر پھدک رہی ہے۔ اس چیز کے وزن سے ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ نیم تاریکی میں اس نے دو بڑے بڑے چوہوں کو اپنے پیروں پر سے کود کر بھاگتے ہوئے دیکھا۔

اس نے اس بات پر کوئی خاص توجہ نہیں دی اور دوبارہ لیٹ گیا۔ لیکن کہیں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور تھی۔

اس کو اپنی بائیں ٹانگ میں کچھ غیر معمولی قسم کی سنسناہٹ اور دباؤ کا سا احساس ہو رہا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے کونے میں رکھی ہوئی لالٹین کو روشن کر دیا۔

کمرے میں لالٹین کی مدہم روشنی پھیلی اور جعفر خاں نے اپنے پیر پر نظر ڈالی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ خوف و دہشت کے عالم میں اس پر لرزہ سا طاری ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جو منظر دیکھ رہی تھیں، وہ ناقابل یقین تھا۔

اس کے پیر کے اوپر کئی جگہ سے گوشت غائب ہو گیا تھا۔

جہاں جہاں سے گوشت غائب ہو گیا تھا۔ وہاں چھوٹے بڑے گڑھے پڑ گئے تھے اور ان میں سے بے تحاشا خون بہہ رہا تھا۔ اس کا سارا پیر لہولہان ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے بستر پر نظر ڈالی۔ پیروں کے پاس سے سارا بستر خون آلود تھا۔ چوہوں نے اس کے پیر کو بری طرح بھنبھوڑا تھا اور اس کا گوشت نوچ نوچ کر کھا لیا تھا۔

اور ناقابل یقین اور انتہائی دہشت زدہ کر دینے والی بات یہ تھی کہ چوہے اس کے پیر کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتے رہے اور اس کو ذرا بھی تکلیف نہیں ہوئی! اس کو یہ احساس بھی نہیں ہوا اس کے جسم سے گوشت کو کاٹ کاٹ کر جدا کیا جا رہا ہے..... اس کا سارا پیر بری طرح لہولہان ہو رہا تھا اور اسے کوئی خبر ہی نہیں تھی۔

اس کے حلق سے نکلنے والی دہشت آمیز چیخ سن کر سب سے پہلے اس کے باپ اکبر خاں کی آنکھ کھلی جو اس سے کچھ فاصلے پر ہی سو رہا تھا۔

کیا ہوا۔ اکبر خاں نے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ اس نے دیکھا کہ کمرے میں لالٹین جل رہی تھی اور جعفر خاں گھبرایا ہوا اپنے پیروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

کیا ہوا۔ اکبر خاں نے اپنے بستر سے اٹھ کر جعفر خاں کی طرف بڑھتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔ کیا ہوا جعفر خاں۔

میرا پیر..... میرا پیر بابا۔ جعفر خاں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ اس میں چوہوں نے کاٹ لیا ہے۔

پیر میں چوہوں نے کاٹ لیا ہے۔ اکبر خاں نے حیرت سے کہا اور جب اس نے قریب آ کر جعفر خاں کے پیر کی حالت دیکھی تو وہ بھی ایک دم چیخ پڑا۔

ارے..... یہ کیا ہوگیا۔ اس نے وحشت کے عالم میں چلاتے ہوئے کہا۔ یہ تمہارے پیر کا گوشت اتنا بہت سا گوشت۔

اکبر خاں کو اپنی بات کہنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

چوہوں نے کھا لیا بابا۔ جعفر خاں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

چوہوں نے کھا لیا۔ اور تم کو پتا نہیں چلا۔ اکبر خاں نے تشویش کے ساتھ کہا۔ تم کتنی گہری نیند سو رہے تھے جو تمہیں معلوم ہی نہیں ہوا کہ چوہے تمہارے پیر کا گوشت ادھیڑ رہے ہیں۔

یہ گہری نیند کا معاملہ نہیں ہے بابا۔ جعفر خاں نے کہا۔ مجھے پتا اس لیے نہیں چلا کہ میرے پیر میں کوئی تکلیف ہی نہیں ہوئی اور اب بھی کوئی تکلیف نہیں ہو رہی ہے۔

کیا۔ اکبر خاں نے سخت حیرت کے عالم میں کہا۔ اسے جعفر خاں کی بات کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ تم کیا کہہ رہے ہو۔ تمہارا مطلب ہے کہ چوہے تمہارے پیر کا گوشت ادھیڑ ادھیڑ کے کھاتے رہے اور تم کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔

ہاں بابا۔ جعفر خاں نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ اور مجھے اب بھی کوئی تکلیف نہیں محسوس ہو رہی ہے۔

اس اثنا میں جعفر خاں کا بڑا بھائی طاہر خاں، ان دونوں کی ماں زرجان اور طاہر خاں کی بیوی صفیہ بھی جاگ گئے تھے اور وہ سب لوگ اس کمرے میں جمع ہوگئے تھے جہاں جعفر خاں اور اس کا باپ اکبر خاں سوتے تھے۔

تمہارے ہاتھ پیروں پر جو پہلے سے زخم موجود ہیں تم کہتے ہو کہ کوئی خاص تکلیف تو ان میں بھی نہیں ہوتی۔ طاہر خاں نے جعفر خاں کے پیر کے ادھڑے ہوئے گوشت کو دیکھتے ہوئے کہا۔ لیکن..... اس طرح کاٹے جانے کے بعد بھی کوئی تکلیف نہ ہو..... بڑی عجیب بات ہے۔

جعفر خاں کے پیر کے زخموں کو پانی سے دھو کر اور پٹی باندھ دی گئی اور جعفر خاں نے دوبارہ سونے سے پہلے ایک موٹی سی چادر اپنے جسم کے گرد بہت اچھی طرح لپیٹ لی۔ اس کو خدشہ تھا اس کے سو جانے کے بعد چوہے پھر اس پر حملہ آور ہوں گے اور اس کے جسم کو کاٹیں گے۔

چادر اچھی طرح لپیٹ کر وہ سو گیا۔ اسے بہت سے نیند آئی۔ اس تازہ صورت حال سے وہ بہت خوف زدہ اور سراسیمہ تھا۔ اس طرح تو چوہے دوسرے جانور اس کے جسم کا جگہ جگہ سے گوشت کھا جائیں گے اور اس کو اس کا پتا ہی نہیں چلے گا۔

رات کو دو ایک بار چوہوں کی بھاگ دوڑ سے آنکھ کھل گئی۔ چوہے اس کے جسم کے اوپر کود رہے تھے اور وہ اندر گھسنے کے لیے راستہ تلاش کر رہے تھے۔ خاں نے جاگ کر ان کو بھگا دیا۔

صبح کو اس کے زخموں پر کچھ گھریلو دوائیں لگائی گئیں۔

لیکن جعفر خاں کے زخموں میں اندمال کی صورت پیدا نہیں ہوئی، بلکہ آنے والے دنوں میں اس کے زخموں کی حالت اور زیادہ خراب ہوگئی۔ جہاں چوہوں نے کاٹا تھا۔ بہت گہرے گھاؤ [illegible] تھے اور اب وہ مزید گہرے ہوتے جا رہے [illegible]

کے علاوہ، جو زخم جسم پر پہلے سے موجود تھے، ان کی حالت بھی مزید خراب ہوتی جا رہی تھی۔ طرح طرح کی گھریلو دوائیں استعمال کی جا رہی تھیں، لیکن کوئی دوا برابر فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس، اس کی حالت اور بھی زیادہ خراب ہوتی جا رہی تھی۔ گاؤں میں کوئی معالج یا حکیم وغیرہ موجود نہیں تھا جس سے رجوع کیا جاتا۔ بس گنڈے تعویذ اور جھاڑ پھونک پر ہی گزارا تھا۔

اس رات کو طاہر خاں کی بیوی صفیہ نے اپنے شوہر سے ایک ایسی بات کہی کہ طاہر خاں کے دل میں پہلے سے موجود خوف اور تشویش میں اچانک بہت زیادہ اضافہ ہوا۔

مجھے یاد پڑتا ہے، آج سے تقریباً چار سال پہلے، جب وہ بابا عبدالشکور بیمار پڑا تھا، جس کے پاس جعفر خاں جاتا تھا اور جس سے وہ عملیات سیکھ رہا تھا۔ تو تم لوگوں نے بتایا تھا کہ وہ بھی کچھ ایسی ہی بیماری میں مبتلا تھا۔ صفیہ نے کہا۔ اس کے جسم پر بھی بے شمار زخم ہوگئے تھے جو کسی طرح اچھے ہی نہیں ہو [illegible] اور شاید اس کے جسم کے بھی کچھ حصے سن ہوگئے تھے۔

طاہر خاں کے دماغ میں بجلی سی کوند گئی۔ بابا عبدالشکور ایک بھولی بسری داستان تھا۔ اس کی موت کو تقریباً تین سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ وہ کم و بیش ایک سال تک بیمار رہا تھا اور پھر اسی موذی اور عجیب و غریب بیماری میں اس کی موت واقع ہوگئی تھی۔ اس کی بیماری کے [illegible] عرصے کے دوران جعفر خاں [illegible] اور اس کی خدمت کرتا [illegible] قریب جاتا تھا۔

طاہر خاں نے بابا عبدالشکور کی بیماری کے بارے میں زیادہ تر تو جعفر خاں ہی کی زبانی سنا تھا، لیکن ایک بار اس نے بابا عبدالشکور کو بیماری کی [illegible] تھا۔ یہ عبدالشکور کی [illegible]

بات تھی اور بابا عبدالشکور کی حالت دیکھ کر وہ لرز گیا تھا۔ اس کے تو سارے جسم کی شکل ہی بدل گئی تھی۔ چہرہ جگہ جگہ سے بری طرح پھول کر ناقابل شناخت ہوگیا تھا۔ ناک بیٹھ گئی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ ہاتھوں کی انگلیاں پھول کر کپا ہو رہی تھیں اور ان میں موجود زخموں سے خون بہ رہا تھا۔ غرضیکہ مجموعی طور پر اس کی حالت ایسی تھی کہ اس کی طرف دیکھا بھی نہیں جاتا تھا۔ طاہر خاں اس دن کسی کام سے اس گاؤں میں گیا تھا اور جعفر خاں سے کچھ ضروری بات کرنے کے لیے بابا عبدالشکور کے مکان پر گیا تھا۔ جہاں جعفر خاں موجود تھا۔

طاہر خاں وہاں چند منٹ سے زیادہ ٹھہر نہیں سکا تھا اور اپنے بھائی کو ساتھ لے کر فوراً ہی وہاں سے چلا آیا تھا۔

کیا گاؤں کا کوئی اور آدمی بابا کے پاس نہیں آتا۔ راستے میں طاہر خاں نے اپنے بھائی سے پوچھا۔

چونکہ میں آ جاتا ہوں، اس لیے اور کوئی نہیں آتا۔ جعفر خاں نے جواب دیا۔ جب میں نہیں آتا ہوں، کسی وجہ سے، تو پھر ماما احمد گل یہاں آ کر اس کو کھانا پانی وغیرہ دے دیتا ہے۔

یہ تو خود دوسروں کا علاج کرتا تھا۔ طاہر خاں نے کہا۔ اپنا علاج نہیں کر سکا۔ کس قدر خوف ناک حالت ہے اس کی۔ سارا جسم زخموں سے بھرا ہوا ہے۔

اس نے اپنا علاج بہت کیا۔ جعفر خاں نے جواب دیا۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس کے زخم تو بڑھتے ہی چلے گئے اور یہاں گاؤں میں کوئی دوسرا شخص ایسا ہے بھی نہیں جو بیماریوں کا علاج کر سکے۔

نہ جانے یہ کیسی بیماری ہے۔ طاہر خاں نے پرتشویش انداز میں کہا۔ اس کے سارے جسم سے سخت بدبو اٹھ رہی [illegible] آ رہی ہے۔

[illegible] ہفتوں کے بعد ہی بابا عبدالشکور مر گیا تھا

اور پھر رفتہ رفتہ لوگ اس کے اور اس کی بیماری کے بارے میں سب کچھ بھول گئے تھے۔ یہ ساری باتیں گئی گزری ہوگئی تھیں۔

لیکن آج اپنی بیوی صفیہ کے یاد دلانے پر طاہر خاں کو سب کچھ یاد آ گیا۔ اسے بابا عبدالشکور کے زخموں بھرے جسم کا وہ منظر بھی یاد آ گیا جو اس نے آخری بار دیکھا تھا اور اسے اپنے چھوٹے بھائی کے وہ الفاظ بھی یاد آ گئے جو انہی دنوں اس نے بابا عبدالشکور کی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے کہے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ بابا عبدالشکور کے جسم کے بہت سے حصے جیسے بے جان ہو گئے ہیں۔

تو کیا..... جعفر خاں کو بابا عبدالشکور والی بیماری۔ اس نے ڈرتے ڈرتے سوچا۔ مگر اس بات کو بہت عرصہ گزر چکا ہے۔ بابا عبدالشکور کو مرے ہوئے تین سال سے زیادہ کی مدت بیت گئی۔ اگر جعفر خاں کو یہی بیماری ہونی تھی تو وہ اب سے بہت پہلے ہو جانی چاہیے تھی۔

بابا عبدالشکور کو بھی کچھ ایسی ہی بیماری تھی نا۔ وہ اپنی بیوی صفیہ کی آواز سن کر اپنے خیالات سے چونک پڑا۔ صفیہ اسے خاموش پا کر ایک بار پھر اپنا سوال دہرا رہی تھی۔

ہاں.....! طاہر خاں نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ میں نے اس کو اس کی بیماری کے آخری دنوں میں دیکھا تھا۔

اس نے اپنا کوئی علاج نہیں کروایا تھا۔ صفیہ نے کہا۔ اور وہ اسی بیماری میں مر گیا تھا۔ ہمیں جعفر خاں کے علاج پر توجہ دینی چاہیے۔ اس کا ٹھیک سے کوئی علاج کروانا چاہیے۔

میں..... میں بابا سے بات کروں گا۔ طاہر خاں نے کہا۔

اگلے پندرہ بیس دن اسی سوچ بچار اور غور و فکر میں گزر گئے اور اس دوران جعفر خاں کی بیماری میں بڑی تیزی کے ساتھ اضافہ ہوتا گیا۔ اس کے پیر میں، جہاں چوہوں کے کاٹنے سے گوشت ادھڑ گیا تھا۔ زخم اور بھی زیادہ گہرے ہوتے گئے اور پھیلتے گئے۔ علاوہ ازیں ،اس کے چہرے میں بڑی تیزی کے ساتھ تبدیلیاں نمودار ہو رہی تھیں۔ اس کی شکل مسخ ہوتی جا رہی تھی اور طاہر خاں جب اس کی طرف دیکھتا تھا تو اس کو بے ساختہ بابا عبدالشکور کا وہ چہرہ یاد آ جاتا جو اس نے آخری بار دیکھا تھا اور وہ سر سے پاؤں تک کانپ جاتا۔

آخر باپ بیٹے نے اس کو ایک دوسرے گاؤں میں لے جانے کا فیصلہ کیا، جہاں ایک حکیم رہتا تھا۔ اس حکیم کی آس پاس علاقے میں کافی شہرت تھی۔ وہ دیسی دواؤں سے علاج کرنے کے ساتھ ساتھ گنڈے تعویذ وغیرہ بھی کرتا تھا۔

دونوں باپ بیٹے جعفر خاں کو ایک گدھا گاڑی میں ڈال کر اس گاؤں تک لیگئے۔ فاصلہ خاصا تھا اور جعفر خاں تو بالکل ہی پیدل نہیں چل سکتا تھا۔

حکیم ایک بوڑھا آدمی تھا۔ اس نے مریض کو دیکھا ،مریض کے ساتھ آنے والوں کی زبانی اس کا حال سنا اور پھر مریض سے بھی کچھ دیر تک سوال جواب کرتا رہا۔ اس سارے عرصے کے دوران وہ مریض سے دور ہی رہا اور اس نے مریض کے جسم کے کسی بھی حصے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ کچھ فاصلے سے ہی مریض کے چہرے کو اور اس کے جسم کے خوف ناک زخموں کو غور سے دیکھتا رہا۔

حکیم نے اکبر خاں اور طاہر خاں سے علیحدگی میں بات کی۔ اس نے مریض کو کمرے سے باہر بھجوا دیا تھا۔

تم لوگ جانتے ہو اس کو کیا بیماری ہے۔ اس نے اکبر خاں اور طاہر خاں کی طرف باری باری غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی بیماری لا علاج ہے اور بہت خطرناک بھی۔

یہ کون سی بیماری ہے۔ طاہر خاں نے جلدی سے

پوچھا۔

یہ کوڑھ ہے۔ حکیم نے کہا۔ بہت ہی زیادہ خوف ناک بیماری۔ اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ اس بیماری میں آدمی کے ہاتھ پیر، کان، ناک گل گل کر، سڑ سڑ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ اس بیماری کے زخم ٹھیک نہیں ہوتے..... اور سب سے زیادہ خطرناک بات تو یہ ہے کہ یہ بیماری لگنے والی ہوتی ہے۔ یہ چھوت کی بیماری ہے۔ ایک سے دوسرے کو لگتی ہے۔ تمہارے لیے ضروری ہے کہ اپنے گھر اور گاؤں کے دوسرے لوگوں کو اس سے بچاؤ۔ ورنہ جو حال اس مریض کا ہو رہا ہے ،وہی کچھ دوسرے لوگوں کا بھی ہو سکتا ہے۔

بچاؤ کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے حکیم صاحب۔ طاہر خاں کی زبان پر بے ساختہ سوال آیا۔

اس کو سب سے الگ تھلگ کر دو۔ حکیم نے کہا۔ گاؤں سے باہر کسی جگہ لے جا کر رکھ دو اسے۔ کھانے پکانے کا سامان دے دو..... خود ہی پکائے اور کھائے..... اس کے جسم کو ہاتھ مت لگاؤ اور اس سے دور رہو..... جو بھی شخص اس بیماری کا شکار ہو جائے گا۔ اس کا یہی حشر ہوگا۔

لیکن..... یہ اپنے لیے کھانا کیسے پکا سکے گا۔ اکبر خان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ یہ تو بہت زیادہ بیمار ہے اور زخمی بھی۔

جیسے بھی پکا سکے۔ حکیم نے کہا۔ جب بھوک لگے گی تو کچھ نہ کچھ کر لے گا۔ ویسے بھی ،اسے زیادہ دن نہیں جینا ہے۔ یہ بہت جلد مر جائے گا اور اس کا مر جانا ہی اچھا ہے۔ اس کو خود بھی تکلیف سے نجات مل جائے گی اور دوسرے لوگ بھی بیماری کے خطرے سے بچ جائیں گے۔

طاہر خاں کو حکیم کی بات بالکل ٹھیک معلوم ہو رہی تھی۔ بابا عبدالشکور کے ساتھ بھی تو ایسا ہی ہوا تھا۔ لیکن کیا تین سال کے بعد۔

اس نے حکیم کو بابا عبدالشکور اور اس کی بیماری کے بارے میں بتایا اور اس سے پوچھا کہ کیا تین سال کے بعد بھی ایسا ہونا ممکن ہے۔ حکیم اسے کوئی خاطر خواہ جواب تو نہیں دے سکا، لیکن اس نے اس خیال سے اتفاق کیا کہ جعفر خاں کو یہ بیماری بابا عبدالشکور سے ہی لگی ہوگی۔

وہ دونوں جعفر خاں کو واپس گھر لے آئے۔ حکیم نے اس کو ایک مرہم کے علاوہ اور کوئی دوا نہیں دی تھی اور یہ مرہم بھی اس لیے تھا کہ اس کو لگانے سے زخم مکھیوں وغیرہ سے محفوظ رہتے تھے۔

دونوں باپ بیٹے گہرے دکھ کا شکار تھے اور جب انہوں نے گھر آ کر زرجان اور صفیہ کو اس کے بارے میں بتایا تو وہ دونوں بھی بدحواس ہو گئیں۔ گھر میں جیسے صف ماتم بچھ گئی۔

میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ صفیہ نے روتے ہوئے، سہم کر کہا۔ میں ان کو لے کر اپنی ماں کے پاس چلی جاؤں گی۔

نہیں۔ اکبر خاں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ تمہیں اور بچوں کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم جعفر خاں کو کسی دوسری جگہ رکھنے کا بندوبست کر دیں گے۔ میری تو اب اس کے لیے یہی دعا ہے کہ خدا اس کی مشکل آسان کر دے۔ وہ بہت تکلیف میں ہے اور کسی بھی دوا سے اس کا علاج نہیں کیا جا سکتا اور..... اور..... اس کی وجہ سے دوسروں کو بھی خطرہ ہے۔

سارے گاؤں میں خبر پھیل گئی اکبر خاں کا چھوٹا بیٹا جعفر خاں کوڑھی ہو گیا ہے اور اسے لاعلاج قرار دے دیا گیا ہے۔ اس گاؤں کے لوگ کوڑھ کے بارے میں جو بھی تھوڑا بہت جانتے تھے، اس میں سب سے زیادہ نمایاں یہ بات تھی کہ یہ مرض لاعلاج ہے اور ساتھ ہی نہایت خوف ناک بھی۔ یہ کہ اڑ کر ایک سے دوسرے کو لگتا ہے اور جو بھی اس کا شکار ہو جائے، پھر درد ناک

موت اس کا مقدر بن جاتی ہے۔

گاؤں سے باہر ایک جگہ تلاش کر لی گئی۔ یہ چٹان کی چھت والا ایک سائبان جیسا پہاڑی غار تھا۔

گرمیوں میں یہاں آسانی سے گزارہ ہو جائے گا۔ گاؤں کے کئی لوگوں کے ساتھ غار کا معائنہ کرنے کے بعد اکبر خاں نے غمگین آواز میں کہا۔ لیکن سردیوں میں یہاں گزارا نہیں ہو سکے گا۔ ویسے تو ابھی سردیاں دور ہیں۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ خدا نے کتنی زندگی لکھی ہے۔

سردیوں کے لیے اس کے برابر والا غار ٹھیک رہے گا۔ ایک دوسرے شخص نے کہا۔ یہ سامنے سے بھی زیادہ تر بند ہی ہے۔ بس تھوڑا سا حصہ کھلا ہوا ہے۔ زیادہ ہوا اندر نہیں جا سکے گی۔ جب آگ جلالے گا تو سردی سے پوری طرح محفوظ ہو جائے گا۔

جعفر خاں کو گاؤں سے خاصی دور، اس پہاڑی سائبان میں منتقل کر دیا گیا اور اس کے لیے وہ چیزیں فراہم کر دی گئیں جو کم ترین ضروریات زندگی پر مشتمل تھیں۔

جعفر خاں کو معلوم ہو چکا تھا کہ اسے کون سی بیماری ہے۔ اپنے گاؤں کے دوسرے لوگوں کی طرح، وہ خود بھی اس بیماری کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا، سوائے اس کے کہ یہ ایک لاعلاج، ہولناک بیماری ہے اور ایک سے دوسرے کو لگ جاتی ہے۔

جعفر خاں کو معلوم ہو چکا تھا کہ اب وہ کبھی اچھا نہیں ہوگا اور جب تک وہ زندہ رہے گا، اسی حال میں رہے گا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ خراب حال میں۔

اگرچہ وہ ذہنی طور پر موت کے لیے تیار ہو چکا تھا، لیکن زندہ رہنے کی خواہش تو انسان کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتی۔ زندگی جیسی بھی تھی، اسے گزارنا تھا.....

چنانچہ اس نے اس کھلے ہوئے پہاڑی غار میں رہنا شروع کر دیا۔

شروع کے دنوں میں تو گھر والوں میں سے کوئی ،دن میں کم از کم ایک بار وہاں آ جاتا تھا اور دور سے اس کو کچھ کھانے پینے کی چیزیں دے جاتا تھا۔ صفیہ اور اس کے بچے یہاں کبھی نہیں آتے تھے، کیونکہ خود اکبر خاں نے ان کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ وہ مریض کے پاس نہ جائیں۔ طاہر خاں بھی کم آتا تھا۔ زیادہ تر تو اکبر خاں خود ہی آتا تھا، یا زرجان آتی تھی اور یہاں سے جانے کے فوراً بعد انہیں نہانا اور کپڑے بدلنا پڑتا تھا۔ حکیم نے ان کو بہت زیادہ محتاط رہنے کی تاکید کی تھی، خاص طور سے اس وجہ سے بھی کہ ان کے گھر میں چھوٹے بچے تھے۔

پھر رفتہ رفتہ وہ وقت بھی آیا جب کئی کئی دن تک جعفر خاں کے پاس کوئی نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے زخمی اور نیم مردہ وجود کے ساتھ اس سنگی سائبان میں پڑا رہتا۔ وہ آگ جلا سکتا تھا اور کچھ نہ کچھ پکا لیتا تھا۔ اس کے پاس کھانا پکانے کا سارا سامان موجود رہتا تھا۔ اسے زیادہ کی تو ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس کو بھوک بھی کم لگتی تھی اور اس سے بہت ذرا سا کھایا جاتا تھا۔

شدید سردیوں کا موسم شروع ہوا تو جعفر برابر والے دوسرے غار میں منتقل ہو گیا جو سامنے سے کافی بند تھا اور اس میں ہوا سے بچاؤ تھا۔ لیکن رات کو آگ پھر بھی جلانی پڑتی تھی۔

وہ وقت بھی گزر گیا اور موسم بدل گیا۔ جعفر خاں کی حالت خراب ہی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بڑی عذاب ناک زندگی گزار رہا تھا۔ سارا جسم زخموں سے چور تھا اور گل سڑ رہا تھا۔ بائیں ہاتھ کی دو انگلیاں، آدھی آدھی غائب ہو چکی تھیں۔ اس کے پاس کوئی آئینہ نہیں تھا جس میں وہ اپنی شکل دیکھ سکتا۔ اگر وہ آئینہ دیکھتا تو اسے نظر آ جاتا کہ اس کا چہرہ کسی بھوت کے چہرے کی طرح سیاہ، بدہیئت اور ڈراؤنا ہو چکا ہے۔ اس کا اصلی، خوب صورت چہرہ تو کب کا، نہ جا

ں م ہو چکا تھا۔

ری کے علاوہ، جعفر خاں کے ساتھ ایک اور بہت زاب یہ تھا کہ وہ بالکل تنہا تھا۔

ؤں کا تو کوئی بھی آدمی اس کے پاس نہیں آتا تھا۔ اس سے دور بھاگتے تھے۔ اس کے گھر والوں میں بھی صرف اس کے والدین میں سے کوئی کبھی کبھار کے پاس آ جایا کرتا تھا اور دور سے اس سے بات تا تھا۔ اس وقت جعفر خاں کو شدید ذہنی اذیت ۔ وہ کس قدر ناپسندیدہ اور ناقابل قبول شخصیت کا تھا۔

فر خاں کو گاؤں سے باہر غار میں رہتے ہوئے یا ایک سال کا عرصہ گزر گیا تھا اور اس عرصے میں ی حالت برابر ابتر ہی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے گھر ے اس کی موت کی دعائیں مانگتے تھے، لیکن وہ ابھی مر انہیں تھا۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جائے جا رہا تھا۔

☆

ان گل تقریباً پانچ سال کے طویل عرصے کے بعد گاؤں یادان خیل آیا۔

ان گل کے والدین اسی گاؤں میں رہتے تھے۔ کے باپ کا نام فیاض گل اور ماں کا نام پری بانو رحمان گل کا ایک چھوٹا بھائی اور بھی تھا۔ اس کا نام کل تھا۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ گاؤں میں ہی تھا۔

ان گل کو بچپن سے ہی پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا اس کا یہ شوق گاؤں میں رہ کر پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ ں میں تو کوئی اسکول بھی نہیں تھا۔ رحمان گل ایک ے گاؤں کے پرائمری اسکول میں پڑھنے جاتا تھا ں کے لیے اسے روزانہ کئی میل کا پیدل فاصلہ طے تا تھا۔

مری اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد فیاض نے اس کو اپنے ایک عزیز کے پاس پشاور بھیج دیا اور رحمان پشاور میں رہنے اور تعلیم پانے لگا۔ وہ نئی جگہ آ کر بہت خوش تھا، کیونکہ اس کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع مل رہا تھا جو اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔

رحمان گل پشاور آیا تو پھر یہیں کا ہو رہا۔ اس نے ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کر لی۔ اس دوران وہ بس چھٹیوں میں ہی اپنے گاؤں جاتا تھا اور باقی سارا وقت شہر میں پڑھائی میں گزارتا تھا۔

رحمان گل بہت ذہین لڑکا تھا۔ بچپن سے ہی اس کی خواہش تھی کہ وہ ڈاکٹر بنے۔ چنانچہ وہ اس کے لیے شروع سے ہی محنت اور تیاری کر رہا تھا۔ اس کے والدین بہت خوش تھے کہ رحمان گل پڑھ رہا تھا اور بہت اچھے نمبروں سے کامیاب ہو رہا تھا۔ انہوں نے رحمان گل کی شادی بھی اس عزیز کی بیٹی سے طے کر دی تھی جس کے گھر رحمان گل رہ رہا تھا۔

رحمان گل نے انٹر سائنس کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا اور اسے میڈیکل کالج میں بہ آسانی داخلہ مل گیا۔ وہ بڑی محنت اور ذوق وشوق کے ساتھ میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے لگا۔

جس سال اس نے ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا، اسی سال اس کی شادی ہو گئی۔ وہ کچھ عرصے تک اپنی بیوی کے ساتھ اپنے آبائی گاؤں میں رہا۔ لیکن پھر پشاور چلا گیا جہاں اس کو ایک سرکاری اسپتال میں ملازمت مل گئی تھی۔

اس نے کئی سال کا عرصہ پشاور میں گزارا اور پھر اس کو اعلا تعلیم کے لیے بیرون ملک جانے کا موقع مل گیا۔ وہ باہر چلا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد اس نے اپنی بیوی کو بھی بلا لیا۔ اس نے باہر اپنی تعلیم جاری رکھی اور جلدی امراض کے ماہر کی ڈگری حاصل کی۔ کچھ عرصے تک وطن میں خدمات انجام دینے کے بعد، وہ اور اس کی بیوی ایک بار پھر بیرون ملک چلے گئے تھے

اور ڈاکٹر رحمان گل پانچ سال کے طویل عرصے کے بعد ایک بار پھر کچھ دنوں کے لیے اپنے آبائی گاؤں بادان خیل آیا تھا۔

اس کے والدین اس کی آمد سے بہت خوش تھے۔ ڈاکٹر رحمان گل پورے خاندان کے لیے سرمایہ افتخار تھا۔ اس خاندان میں تو کسی شخص نے میٹرک بھی پاس نہیں کیا تھا اور رحمان گل اتنا بڑا ڈاکٹر بن گیا تھا۔ وہ گاؤں بادان خیل کے لیے بھی عزت، احترام اور شہرت کا باعث بنا ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے اس کے گاؤں کا نام بہت روشن ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر رحمان کا مستقل قیام اب بیرون ملک تھا۔ لیکن وہ برابر وطن آتا جاتا رہتا تھا اور اکثر کئی کئی مہینے یہاں رہتا تھا اور پشاور کے کسی نہ کسی اسپتال میں تھوڑا بہت کام بھی کرتا رہتا تھا۔ وہ اپنے ملک میں پائے جانے والے جلدی امراض کے بارے میں زیادہ سے زیادہ عملی معلومات اور تجربات حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔

پانچ سال کے طویل عرصے کے بعد رحمان گل جب اپنے گاؤں آیا تو وہ بہت خوش تھا۔ بادان خیل میں اس کا گھر تھا، والدین تھے، رشتے دار تھے، بچپن کے دوست تھے، ساتھی تھے، بہت کچھ تھا۔

اس کے بچپن کے دوستوں میں طاہر خاں بھی شامل تھا۔

ڈاکٹر رحمان گل گاؤں آیا تو جو لوگ اس سے ملنے آئے اس کے گھر گئے ان میں طاہر خاں بھی شامل تھا۔ طاہر خاں جب رحمان گل کے گھر پہنچا تو اس وقت گاؤں کے اور بھی کئی لوگ وہاں موجود تھے جو رحمان گل سے ملنے کے لیے آئے تھے۔

ڈاکٹر رحمان گل اپنے بچپن کے دوست سے بڑے تپاک سے ملا اور سب لوگوں کی خیریت معلوم کرتا رہا۔ ماما کی خیریت معلوم کرنے کے لیے تو میں خود تمہارے گھر آؤں گا۔ اس نے کہا۔ اتنے عرصے کے بعد گاؤں آیا ہوں۔ سب لوگوں سے ملنا ہے۔ سب کے گھر جانا ہے۔

ضرور آنا.....! طاہر خاں نے کہا۔ تم اتنے دن کے بعد آتے ہو۔ تم سے تو بہت باتیں کرنی ہیں۔ باہر کی دنیا کے بارے میں باتیں کرنی ہیں۔ تم نے تو کتنا وقت باہر کی دنیا میں گزارا ہے۔ بلکہ اب تو تم باہر کے ہی ہو کر رہ گئے ہو۔

لیکن میں اپنے گاؤں کو اور اپنے لوگوں کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ طاہر خاں نے کہا۔ اصل زندگی تو میں نے یہیں گزاری ہے۔ تم لوگوں کے درمیان۔

دونوں کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر اچانک رحمان گل کو طاہر خاں کے چھوٹے بھائی کا خیال آ گیا۔

جعفر خاں کیسا ہے۔ اس نے پوچھا۔ اس کی شادی ہو گئی یا ابھی نہیں۔

نہیں۔ طاہر خاں نے جواب دیا۔ اس کی شادی نہیں ہوئی۔ وہ فوری طور پر رحمان گل کو جعفر خاں کی حالت زار کے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ رحمان گل اتنے عرصے کے بعد گاؤں آیا تھا اور اپنے لوگوں سے مل کر بہت خوش تھا۔ طاہر خاں اس کی اس خوشی کو غارت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جعفر خاں کے بارے میں بتا کر اس کو اداس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ بعد میں اسے جعفر خاں کے بارے میں تفصیل سے بتا دے گا۔

اسی وقت کوئی اور شخص بھی ملنے کے لیے آ گیا اور بات خود ہی ادھوری رہ گئی۔ طاہر خاں کو اپنے بھائی کے بارے میں کچھ بتانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔

اس کے چند روز کے بعد جب ڈاکٹر رحمان گل کو ذرا فرصت ملی، تو وہ اپنے بچپن کے دوست طاہر خاں سے ملاقات کے لیے اس کے گھر آیا۔ طاہر خاں اور اس کے گھر کے لوگ اس کے آنے سے بہت خوش ہوئے۔

رحمان گل نے جعفر خاں کو گھر میں موجود نہیں پایا اور اس نے قدرے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے، اس کے بارے میں پوچھا۔

میں جب سے آیا ہوں، جعفر خاں مجھے ایک بار بھی نظر نہیں آیا۔ اس نے کہا۔ کیا وہ گاؤں میں نہیں ہے۔ کہیں باہر گیا ہوا ہے۔

نہیں۔ طاہر خاں نے افسردگی کے ساتھ جواب دیا۔ وہ گاؤں میں ہی موجود ہے۔

گاؤں میں ہے۔ مگر کہاں ہے۔ ڈاکٹر رحمان گل نے پوچھا۔ اس سے ملاقات تو کرواؤ..... آخر وہ ہے کہاں۔

تمہیں اس سے ملاقات کر کے کوئی خوشی نہیں ہوگی، بلکہ افسوس ہی ہوگا۔ طاہر خاں نے کہا۔

وہ کیوں۔ ڈاکٹر رحمان گل نے سخت حیرت کے عالم میں کہا۔ کیا ہوا ہے اس کو۔ مجھے اس سے مل کر افسوس کیوں ہوگا۔

جعفر خاں بہت بیمار ہے۔ اکبر خاں بولا۔ وہ اتنا زیادہ بیمار ہے کہ کسی وقت بھی ختم ہو سکتا ہے۔

ارے۔ رحمان گل نے حیرت اور افسوس کے ساتھ کہا۔ مگر وہ ہے کہاں۔ اور کیا بیماری ہے اس کو۔ کدھر ہے وہ۔

وہ گھر میں نہیں ہے۔ اکبر خاں نے آہستہ سے کہا۔ ہم نے اس کو گھر سے باہر، بلکہ گاؤں سے بھی باہر رکھا ہوا ہے۔

مگر کیوں۔ رحمان گل نے سخت حیران ہو کر پوچھا۔ تم لوگوں نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا ہے۔ تم نے اسے گاؤں سے کیوں نکال دیا ہے۔

بات یہ ہے بیٹا کہ بدقسمتی سے وہ ایک بہت بھیانک بیماری میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اکبر خاں نے گہری افسردگی کے ساتھ کہا۔ اس کو کوڑھ ہو گیا ہے اور اس کا سارا جسم گل سڑ رہا ہے۔ تم تو جانتے ہو..... خود ڈاکٹر ہو..... یہ بیماری ایک سے دوسرے کو لگتی ہے۔

مجھے اس کے پاس لے چلو۔ رحمان گل ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

تم..... تم اس کے پاس جا کر کیا کرو گے بیٹا۔ کوئی اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔

میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر رحمان گل نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کے پاس لے کر چلو۔

اسے دیکھنے کوئی نہیں جاتا بیٹا۔ اکبر خاں نے دکھ کے گہرے احساس کے ساتھ کہا۔ ہم لوگ خود بھی بس کسی کسی دن اس کے پاس چلے جاتے ہیں اور اس کی خیر خبر لے آتے ہیں۔ ورنہ تو کئی کئی دن تک ہمیں اس کی کوئی خبر نہیں ملتی۔

اف میرے خدا..... رحمان گل نے کہا۔ چلو..... طاہر خاں..... مجھے اس کے پاس لے چلو..... ابھی..... فوراً..... میں اس کو دیکھنا چاہتا ہوں۔

طاہر خاں اور اکبر خاں، رحمان گل کو ساتھ لے کر گاؤں کے باہر اس غار کی طرف روانہ ہو گئے۔ جہاں جعفر خاں کی رہائش تھی۔

ماما..... کیا آپ کے خاندان میں کبھی کسی کو کوڑھ کی بیماری ہوئی تھی۔ راستے میں رحمان گل نے اکبر خاں سے پوچھا۔ کچھ یاد ہے آپ کو۔

یاد ہے۔ اکبر خاں نے جواب دیا۔ میرے خاندان میں، میرے بزرگوں میں، کسی کو بھی یہ بیماری نہیں ہوئی تھی۔ کم از کم میں نے اپنے بزرگوں سے اس کے بارے میں کبھی نہیں سنا۔

اور..... آپ کو یہ کس نے بتایا کہ جعفر خاں کو کوڑھ ہے۔ رحمان گل نے پوچھا۔

ایک حکیم نے..... ایک دوسرے گاؤں کے حکیم نے..... ہم لوگ جعفر خاں کو اس کے پاس لے کر گئے تھے۔ اس بات کو بھی اب تقریباً ایک سال ہو چکا ہے

اور اس عرصے میں جعفر خاں کی حالت اور زیادہ خراب ہوگئی ہے۔

اس حکیم کے ہی کہنے پر ہم نے جعفر خاں کو گاؤں سے باہر نکال دیا۔ اکبر خاں نے کہا۔ اس نے ہم کو یہ بتایا کہ یہ لاعلاج بیماری ہے اور ایک سے دوسرے کو لگتی ہے۔

کیا آپ لوگوں کے جاننے والوں میں، آس پاس، کوئی ایسا شخص کبھی موجود تھا، یا ہے، جسے یہ بیماری لاحق ہو۔

ہاں تھا۔ طاہر خاں نے فوراً جواب دیا۔ مگر اس بات کو تو اب کافی زمانہ گزر چکا ہے۔ وہ بابا عبدالشکور تھا۔ اور طاہر خاں نے رحمان گل کو بابا عبدالشکور کی بیماری اور بابا کے ساتھ جعفر خاں کی قربت کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ اس نے بابا کی بیماری کی تفصیلات بھی بیان کیں۔

جعفر خاں کو یہ بیماری اسی سے لگی ہے۔ ڈاکٹر رحمان گل نے کہا۔ یہ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے۔

لیکن بابا کی موت کے بعد تین سال تک تو جعفر خاں بالکل ٹھیک رہا۔ اکبر خاں نے کہا۔ اس میں کسی بیماری کی کوئی علامت نمودار نہیں ہوئی۔

میں اس بیماری کے بارے میں آپ کو تفصیل سے بتاؤں گا ماما۔ ڈاکٹر رحمان گل نے کہا۔ پہلے میں جعفر خاں کو دیکھ کر اس بات کی تصدیق کرلوں کہ وہ واقعی کوڑھ کا شکار ہوا ہے یا یہ کوئی اور بیماری ہے۔

اور اگر وہ کوڑھ کا ہی شکار نکلا تو پھر۔ اکبر خاں نے پوچھا۔

تو پھر ہم دیکھیں گے کہ ہم اس کی کیا مدد کرسکتے ہیں۔ رحمان گل نے کہا۔ ہم اس کو اس طرح مرنے کے لیے تو نہیں چھوڑ سکتے۔

لیکن..... اس کا تو کوئی بھی علاج نہیں ہے۔ طاہر خاں نے کہا۔ حکیم کا کہنا ہے کہ یہ مرض لاعلاج ہے۔

ایسا نہیں ہے۔ رحمان گل نے کہا۔ علاج موجود ہے۔ کوڑھ لاعلاج مرض نہیں ہے۔

کیا۔ اکبر خاں نے حیرت اور خوشی کے عالم میں کہا۔ کیا جعفر خاں کا علاج ممکن ہے۔ کیا وہ اچھا ہوجائے گا۔

وہ کس حد تک اچھا ہوسکتا ہے، یہ تو میں اس کی حالت دیکھنے کے بعد ہی بتا سکتا ہوں۔ رحمان گل نے کہا۔ لیکن اس کا علاج ممکن ہے۔ اس حکیم نے یہ بالکل غلط بات کہی کہ اس مرض کا علاج موجود نہیں ہے۔ علاج موجود ہے..... یقینی علاج موجود ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہم لوگ ابھی تک پتھر کے زمانے میں رہ رہے ہیں۔

پتھر کے زمانے میں۔ اکبر خاں نے چونک کر کہا۔ وہ کون سا زمانہ ہوتا ہے بیٹا۔

اس کا مطلب ہوتا ہے ماما، بہت پرانا زمانہ.....!

ڈاکٹر رحمان گل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ وہ زمانہ جب انسان بالکل ہی جہالت اور بے عملی کی حالت میں زندگی گزار رہا تھا، وہ چیزوں کے بارے میں بہت کم جانتا تھا اور پتھروں اور ہڈیوں وغیرہ سے اوزار اور ہتھیار بناتا تھا اور ان کو استعمال کرتا تھا۔ اب دنیا بہت ترقی کرگئی ہے ماما، مگر ہم لوگ ابھی تک پرانے زمانے میں سانس لے رہے ہیں۔ کتنی بیماریوں کا علاج دریافت ہوچکا ہے، ہمارے گاؤں کے لوگ اس کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتے۔

وہ لوگ باتیں کرتے ہوئے اس جگہ تک پہنچ گئے جہاں اس سائبان جیسے غار میں جعفر خاں مقیم تھا۔

جعفر خاں اس وقت فرش پر لیٹا ہوا تھا اور اس کا رخ سامنے کی ہی طرف تھا۔ اس نے جیسے ہی اپنے باپ اور بھائی کو ایک تیسرے شخص کے ساتھ وہاں موجود دیکھا، تو وہ فوراً ہی متوجہ ہوگیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر خوشی کے آثار نمودار ہوئے۔ کوئی اس

کے پاس آیا تھا۔

اس نے اجنبی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ اسے پہچاننے کی کوشش کررہا تھا اور پھر اس نے اس کو پہچان لیا..... یہ رحمان گل تھا..... جو کبھی اس گاؤں میں رہتا تھا۔ لیکن پھر پڑھائی کے لیے پشاور چلا گیا تھا۔

جعفر خاں نے تو رحمان گل کو پہچان لیا، لیکن رحمان گل نے جعفر خاں کو بالکل نہیں پہچانا۔

رحمان گل کی نظروں کے سامنے جو چہرہ تھا۔ وہ جعفر خاں کا چہرہ نہیں تھا۔ جعفر خاں کی شکل تو اس کو بہت اچھی طرح یاد تھی۔ وہ تو بڑا خوب صورت لڑکا ہوا کرتا تھا۔ اس کی رنگت سرخ و سفید تھی، آنکھیں غیر معمولی طور پر بڑی بڑی تھیں، چہرہ قدرے لمبوترا اور نک سک سے درست تھا اور اس کے نقوش بہت دل کش تھے۔

لیکن وہ جعفر خاں تو نہ جانے کہاں غائب ہوچکا تھا۔

اس کی جگہ جو شخص رحمان گل کی نظروں کے سامنے تھا۔ وہ ایک ٹوٹا پھوٹا، ٹیڑھا میڑھا، شکستہ و ریختہ انسان تھا، جس کا چہرہ کسی انسان کا نہیں، کسی بھوت کا چہرہ معلوم ہوتا تھا۔ اس چہرے کے سارے نقوش بے ترتیب اور غیر متناسب تھے۔ جگہ جگہ سے پھولا ہوا، جگہ جگہ سے پچکا ہوا، کہیں سے دبا ہوا، کہیں سے ابھرا ہوا، یہ ایک غیر انسانی چہرہ تھا۔ اس چہرے کی عمومی رنگت تو سیاہ تھی۔ لیکن اس کا کوئی ایک رنگ نہیں تھا۔ اس میں جگہ جگہ طرح طرح کے رنگ نظر آرہے تھے۔ کہیں کوئی پھولا ہوا حصہ گہرے سیاہ رنگ کا تھا، کہیں کم سیاہ رنگ کا، کہیں سرخ کہیں کم سرخ، کہیں زیادہ سرخ، کہیں مٹیالا، کہیں سفید..... پورا چہرہ بدہیئتی اور بدنمائی کا ایک نمونہ بنا ہوا تھا۔

ڈاکٹر رحمان گل نے اس کو دیکھا اور لرز کر رہ گیا۔ لیکن اس نے خود پر قابو پانے کی پوری کوشش کی۔

وہ ایک دم سیدھا اس کے پاس چلا گیا۔ جب کہ اکبر خاں اور طاہر خاں غار کے باہر ہی کھڑے رہے۔

کیسے ہو جعفر خاں.....! رحمان گل نے غار کے اندر داخل ہوتے ہوئے پرجوش اور محبت آمیز لہجے میں اس سے کہا۔

رک جاؤ.....! جعفر خاں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ وہیں رک جاؤ رحمان گل..... آگے نہ آؤ..... میں بہت بری بیماری میں مبتلا ہوں۔

مجھے معلوم ہے۔ رحمان گل نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ لوگ بیمار تو ہوتے ہی ہیں جعفر خاں..... اور پھر ٹھیک بھی ہوجاتے ہیں..... خدا نے چاہا تو تم بھی ٹھیک ہوجاؤ گے۔

وہ جعفر خاں کے بالکل قریب پہنچ گیا اور غور سے اس کو دیکھنے لگا۔ وہ اس کے جسم کی حالت کو دیکھ بھی رہا تھا اور ساتھ ہی اس سے باتیں بھی کرتا جارہا تھا۔ وہ اس سے اس کی بیماری اور تکالیف کے بارے میں تفصیلات پوچھ رہا تھا۔ جعفر خاں اس کے سوالات کے جوابات دے رہا تھا۔ رحمان گل نے اپنی جیب میں سے قلم اور ایک چھوٹی سی نوٹ بک نکال لی تھی اور وہ جلدی جلدی اس میں کچھ لکھتا جارہا تھا۔

رحمان گل بڑی دیر تک جعفر خاں کے پاس رہا اور اس سے اس کی بیماری کے بارے میں تفصیلی طور پر سوال جواب کرتا رہا اور اپنی نوٹ بک میں لکھتا گیا۔

میں جلدی امراض کا ہی ڈاکٹر ہوں جعفر خاں۔ رحمان گل نے آخر میں جعفر خاں سے کہا۔ میں تمہاری بیماری کو پوری طرح سمجھ چکا ہوں اور میں تمہارا علاج کروں گا۔

میرا علاج۔ جعفر خاں نے حیرت اور بے یقینی کے ساتھ، منہ پھاڑتے ہوئے کہا۔ مگر میرا علاج تو ممکن ہی نہیں ہے۔ میرا علاج تو کوئی بھی نہیں کرسکتا۔

تمہارا مرض لاعلاج نہیں ہے جعفر خاں۔ ڈاکٹر رحمان گل نے کہا۔ تمہارا علاج ہوگا اور وہ کامیاب بھی ہوگا..... میں دو تین دن بعد دوائیں لے کر

تمہارے پاس دوبارہ آؤں گا اور خود تمہارا علاج شروع کروں گا۔

مجھے یقین نہیں آ رہا ہے رحمان گل۔ جعفر خاں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ میرا علاج۔ بھلا میرا علاج بھی ہوسکتا ہے۔ نہیں رحمان گل..... میں تو اپنی موت کے انتظار میں ایک ایک دن گن رہا ہوں۔

اب دن گننا چھوڑ دو۔ رحمان گل نے مسکرانے کی کوشش کی۔ اب مرنے کے بجائے زندہ رہنے کی باتیں کرو۔

اچانک جعفر خاں کی گدلی گدلی، اندر کو دھنسی ہوئی اور بے رونق آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ زور زور سے رونے لگا۔ وہ کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ صرف زور زور سے رو رہا تھا۔ اس کے ان آنسوؤں میں اس کی زندگی کے سارے موجودہ دکھ شامل تھے اور ساتھ ہی امید کی روشنی بھی..... یہ غم اور خوشی کی ایک ایسی ملی جلی کیفیت تھی جس نے بہتے ہوئے آنسوؤں کی شکل اختیار کر لی تھی۔

خدا پر بھروسا رکھو جعفر خاں۔ رحمان گل نے بھرائی ہوئی آواز میں اس کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ خدا تمہاری مدد کرے گا..... میں جلد ہی تمہارے پاس دوبارہ آؤں گا۔ پھر ہم مل جل کر اس بیماری کے خلاف لڑیں گے اور انشاءاللہ کامیاب بھی ہوں گے۔

اکبر خاں اور طاہر خاں گھر سے کھانے پینے کا خاصا سامان لے کر آئے تھے۔ وہ انہوں نے جعفر خاں کے حوالے کر دیا اور پھر وہ تینوں افراد وہاں سے چل پڑے۔

بہت دیر ہوگئی ہے۔ رحمان گل نے گہری افسردگی کے ساتھ اکبر خاں اور طاہر خاں سے کہا۔ بیماری نے اس کے جسم کو تباہ کر دیا ہے۔ تم لوگوں نے بہت وقت ضائع کر دیا..... اس کو تو فوراً ہی علاج کے لیے شہر لے جانا چاہیے تھا۔ اگر تم لوگ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتے تو آج اس کی یہ حالت نہ ہوتی۔

ہم اسے حکیم کے پاس لے گئے تھے بیٹا۔ اکبر خاں نے سہمے ہوئے، دھیمے لہجے میں کہا۔ اور حکیم نے یہی بتایا کہ یہ بیماری ناقابل علاج ہے۔ ہمیں خود بھی کوڑھ کے بارے میں بس یہی معلوم تھا کہ یہ بیماری ناقابل علاج ہے۔

اس حکیم نے آپ لوگوں کو گمراہ کیا ماما۔ ڈاکٹر رحمان گل نے کہا۔ اس نے مرض کی تشخیص تو صحیح کی اور مرض کے بارے میں جو دوسری باتیں بتائیں وہ بھی تقریباً ٹھیک تھیں۔ لیکن اس نے یہ بات بالکل غلط کہی کہ یہ مرض لاعلاج ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ اگر شروع میں مرض کی تشخیص ہو جائے اور اس کا علاج شروع کر دیا جائے تو مریض ٹھیک ہو جاتا ہے۔ افسوس کہ جعفر کے معاملے میں بہت زیادہ دیر ہو چکی ہے۔

مگر تم تو ابھی کہہ رہے تھے کہ اس کا علاج ہوسکتا ہے۔ طاہر خاں نے کہا۔

ہاں۔ رحمان گل نے کہا۔ اس کا علاج ہوسکتا ہے اور میں اس کا علاج کروں گا۔ اس بیماری کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ اس کی وجہ سے جسم کے جتنے حصے سن اور بے جان ہو چکے ہوتے ہیں، وہ تو کبھی اپنی اصلی حالت پر واپس نہیں آتے، لیکن مزید نقصان رک جاتا ہے اور مریض دوسروں کے لیے بھی خطرہ نہیں رہتا۔ وہ بالکل عام آدمی کی طرح زندگی گزار سکتا ہے۔ لیکن اسے بہت طویل عرصے تک اور بعض صورتوں میں زندگی بھر، دوائیں کھانی پڑتی ہیں۔

تو..... تو..... جعفر خاں کے سلسلے میں ہم کیا امید رکھ سکتے ہیں۔ اکبر خاں نے بے چینی کے ساتھ پوچھا۔ ہمیں اس کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ ہم تو اس کے مرنے کی دعائیں مانگتے رہے ہیں۔

(جاری ہے)